فورٹ ولیم کالج

کی

ادبی خدمات

ڈاکٹر عبیدہ بیگم

باسمہ تعالےٰ

فورٹ ولیم کالج

کی

ادبی خدمات

ڈاکٹر عُبیدہ بیگم

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اترپردیش کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

فورٹ ولیم کالج

کی

ادبی خدمات

ڈاکٹر عبیدہ بیگم

تقسیم کار

نصرت پبلشرز لکھنؤ

نام کتاب ——— فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات

ناشر ——— ڈاکٹر عبیدہ بیگم

سنہ اشاعت ——— ۱۹۸۳ء

اڈیشن ——— پہلا

تعداد اشاعت ——— چھ سو

کتابت ——— شوکت علی دار العلوم روڈ متونا تھ بھنجن

مطبع ——— فائن آفسٹ ورکس الہ آباد

قیمت ——— RS

Max. Retail Price Rs.

226018

AMI

تقسیم کار

نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ نزد گل مرگ ہوٹل

امین آباد لکھنؤ

مُشفقِ اُستاذ

پروفیسر محمود الٰہی

کے

نام

"تری شعاعوں نے ذرّے کو آفتاب کیا"

اس مقالے پر مُصنّفہ کو گورکھپور یونیورسٹی نے
پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔

ترتیب

دیباچہ

انیسویں صدی کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج کا قیام اردو نثر کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔اس کالج نے نہ صرف یہ کہ اردو نثر کی نشوونما کے بہترین فرائض انجام دیئے بلکہ آئندہ کے لئے ایک ایسی سمت وراہ متعین کی جس کے ذریعے اردو نثر ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھ ملانے کے قابل ہوگئی

کام کی طوالت اور پریشانیوں سے قطع نظر، فورٹ ولیم کالج کی ادبی سرگرمیوں کا احاطہ میرے نزدیک ایک خوشگوار فرض تھا۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے بیحد مسرت کا احساس ہو رہا ہے کہ زیر نظر مقالے کی تکمیل کے لئے مجھے مشفق و محترم پروفیسر محمود الٰہی کے زیر نگرانی کام کرنے کا فخر حاصل ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کے موضوع پر مواد کی فراہمی کا مسئلہ بہت پیچیدہ اور سخت مشکل تھا جب کہ راقم السطور کے وسائل از حد محدود تھے لیکن استاذ محترم کی صحیح رہنمائی اور سرپرستی نے ہر ہر قدم پر حوصلہ افزائی کی اور کسی دشواری کا احساس نہ ہونے دیا۔ مختلف تحقیقی اور تنقیدی مسائل پر موصوف نے اہم نکتوں سے روشناس کرایا جس کے نتیجے میں یہ مقالہ تکمیل کی منزل تک پہنچ سکا۔ شکریہ کی ادائیگی رسمی اور روایتی بات سہی لیکن اپنے بے پناہ جذبات واحساسات کی ترجمانی کا کوئی دوسرا ذریعہ بھی تو نہیں۔ کاش جذبۂ تشکر کے اظہار کی کوئی اور زبان بھی ہوتی۔

استاذی ڈاکٹر احمر لاری کے مشوروں اور کرم فرمائیوں کا اعتراف بھی میرا خوشگوار فرض ہے۔انہوں نے دشواریوں کے ہر مرحلے میں میری مدد کی اور اپنے مفید مشوروں سے ہمت افزائی فرماتے رہے، ورنہ تحقیق وتنقید کے ان خارزاروں سے گزر جانا میرے لئے انتہائی مشکل ہوتا۔

میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کی بھی شکر گذار ہوں جنھوں نے میرے لئے پاکستان سے بعض مفید اور نایاب کتابیں ارسال فرمائیں اور خطوط کے ذریعے نادر معلومات بہم پہنچاتے رہے۔

کلکتہ میں مواد کی فراہمی کا مسئلہ میرے لئے بہت دشوار تھا لیکن ڈاکٹر عبدالرؤف، پروفیسر مشتاق احمد، ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ اور انیس رفیع کے مخلصانہ تعاون سے یہ مسئلہ بھی آسان ہوگیا۔ میں ان حضرات کی بھی بیحد شکر گذار ہوں۔

میں عطاء اللہ ابوالخیری صاحب کی نوازشوں کا بھی اعتراف کرنا چاہتی ہوں جنھوں نے پاکستان سے میرے لئے کئی مفید کتابیں فراہم کیں۔

میں نیشنل آرکائیوز آف انڈیا (نئی دہلی) گورکھپور یونیورسٹی لائبریری (گورکھپور)، دارالمصنفین لائبریری (اعظم گڑھ)، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) اور نیشنل لائبریری (کلکتہ) کے منتظمین اور اراکین کی بھی بے حد ممنون ہوں جنھوں نے مواد کی فراہمی کے سلسلے میں مجھے ہر طرح کا تعاون دیا۔

میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور اردو اکیڈمی (اتر پردیش) کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جن کی اسکالرشپ کی وجہ سے مجھے مالی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

آج کے دور میں کسی ضخیم کتاب کی اشاعت کا مسئلہ بھی ایک سوالیہ نشان ہے۔ میں فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش کی شکر گذار ہوں جس نے ایک خطیر رقم کے تعاون سے اس کتاب کی اشاعت کے لئے آسانیاں فراہم کیں۔

آخر میں اپنے والدین کے بے پناہ لطف وکرم کا اعتراف کرنا ضروری سمجھتی ہوں جنھوں نے اس مقالے کے لئے مواد کی فراہمی سے لیکر اس کی ترتیب اور طباعت کی ہر منزل میں

خندہ پیشانی کے ساتھ میری ہمت افزائی کی اور مجھے کبھی کسی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔

ڈاکٹر عُبیدہ بیگم
شعبۂ اردو
سوامی سہجانند ایس۔ ڈی۔ ڈگری کالج
غازی پور

۱۶ جولائی ۱۹۸۳ء

حرفِ آغاز

فورٹ ولیم کالج محتاجِ تعارف نہیں۔ اردو نثر کی ترویج و ترقی میں فورٹ ولیم کالج نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ گورنر جنرل مارکوئس ویلزلی کی سرپرستی میں اس کالج کے شعبۂ ہندوستانی کے پہلے پروفیسر ڈاکٹر جان بورتھوک گل کرسٹ کی کوششوں سے اردو نثر نے ایک نئے دور میں قدم رکھا حالانکہ کالج کے قیام کا مقصد خالص سیاسی تھا، لیکن اردو نثر پر اس کے جو مثبت اثرات مرتب ہوئے ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ "صاحبانِ عالی شان" ملک کے گوشے گوشے سے اربابِ علم و ہنر کو بلواتے، ان کی پذیرائی کرتے اور ان سے تصنیف و تالیف کا کام لیتے۔ ان میں سے کچھ اہلِ قلم کالج کے باقاعدہ ملازم تھے اور بعض نے اپنی تصانیف پیش کرکے انعام و اکرام حاصل کیا۔ یوں اردو نثر کا ذخیرہ جو کالج کے قیام سے قبل برائے نام تھا نہ صرف کافی وسیع ہو گیا بلکہ "بول چال" کی زبان کے استعمال سے عوام کے نزدیک بھی آ گیا۔ فورٹ ولیم کالج کے ادبی کارناموں میں طبع زاد تصانیف کی تعداد بہت کم ہے۔ ان میں سے بیشتر عربی، فارسی، سنسکرت اور برج بھاشا سے ماخوذ ہیں۔ لہٰذا ان تصانیف سے اس عہد کے سیاسی، سماجی و معاشی حالات اور ذاتی تجربات کی بلاواسطہ تو تشفی تو نہیں ہوتی لیکن زبان و بیان اور تہذیب کی سطح پر یہ ضرور اپنے عہد کی آئینہ دار ہیں۔

یوں تو فورٹ ولیم کالج پر تاریخ ادب اردو سے متعلق تقریباً ہر کتاب میں کچھ نہ کچھ مواد مل جاتا ہے۔ مشہور ترین کتابوں میں سیر المصنفین (محمد یحییٰ تنہا)، نمونۂ منثورات (احسن مارہروی)، تاریخ ادب اردو (رام بابو سکسینہ)، داستان تاریخ اردو (حامد حسن قادری) کے علاوہ اربابِ نثر اردو (سید محمد) تو فورٹ ولیم کالج کے مصنفین ہی پر مبنی ہے۔ کریم الدین کے

طبقات الشعرائے ہند میں بھی فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کے حالات دستیاب ہوجاتے ہیں۔ موجودہ دور میں عتیق صدیقی کی "گل کرسٹ اور اسکا عہد" اور جاوید نہال کی "انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" فورٹ ولیم کالج کے ذیل میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ "گل کرسٹ اور اسکا عہد" کو ہند و پاک میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے لیکن یہ کتاب صرف گل کرسٹ کے عہد (فروری ۱۸۰۴ء تک) کی سرگرمیوں کا احاطہ کرتی ہے اور وہ بھی تشنہ اور نامکمل۔ دراصل یہ کتاب کالج کونسل کی کارروائیوں پر مبنی ہے لیکن اصل ماخذ سے مواد لیتے وقت مؤلف سے بعض تسامحات بھی ہوگئے ہیں جو دوسرے ایڈیشن میں بھی بجنسہ موجود ہیں۔ جاوید نہال صاحب کی دسترس میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال اور نیشنل لائبریری کے سارے نادر و نایاب مواد اور مخطوطات تھے لیکن موصوف نے ان سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کیا۔ اپنی تصنیف میں انہوں نے جسقدر غلط معلومات فراہم کی ہیں اور جتنا غیر تحقیقی انداز اختیار کیا ہے اس کی مثال کم ہی ملے گی۔

ان اردو کتابوں کے علاوہ بعض انگریزی اور ہندی کی اہم کتابوں کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا جن میں کالج سے متعلق قابل قدر معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ "Annals of the College of Fort William" (Thomas Roebuck) فورٹ ولیم کالج سے متعلق ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ مؤلف فورٹ ولیم کالج میں برسرکار تھا۔ اس نے اس کتاب میں کالج کی ابتداء سے لے کر ۱۸۱۹ء تک کی روداد پیش کی ہے۔ لیکن یہ کتاب محض سرکاری سرگرمیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے سلسلے کی ایک اہم کتاب Cladious Buchanan کی College of Fort William In Bengal بھی ہے۔ لیکن یہ زیادہ تر کالج کے قوانین و ضوابط کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہے۔ صدیق الرحمٰن قدوائی کی Gilchrist and the

Language of Hindoostan اور شاردا دیوی ویدالنکار کی "The Development of Hindi Prose Literature..." بھی فورٹ ولیم کالج کے کسی نہ کسی گوشے کی نقاب کشائی کرتی ہیں۔ لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ کتابیں بھی تشنہ اور نامکمل مواد پیش کرتی ہیں۔ قدوائی صاحب کی کتاب تو گل کرسٹ ہی کی تصانیف کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ ہندی میں لکشمی ساگر وارشنے کی کتاب "فورٹ ولیم کالج" میں کالج کے قیام اور اس کے بعد کی روداد کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ انتہائی مفید اور اہم کتاب ہے لیکن اس سے کالج کے مصنفین اور ان کی ادبی خدمات کا تنقیدی اور تجزیاتی پہلو سامنے نہیں آتا۔

مندرجہ بالا تالیفات بے ترتیب اور تشنہ معلومات فراہم کرتی ہیں۔ یوں فورٹ ولیم کالج جیسے اہم موضوع پر اب تک کوئی ایسی کتاب سامنے نہیں آئی ہے جو کالج کے قیام کے سیاسی اور سماجی پس منظر، اغراض و مقاصد، ظاہری خد و خال، قوانین و ضوابط، کالج کے مصنفین کے حالات زندگی اور ان کے ادبی کارناموں کا مکمل طور سے احاطہ کرتی ہو۔

اس مقالے میں فورٹ ولیم کالج اور خصوصاً شعبۂ ہندوستانی کے صحیح خط و خال کو نمایاں کرنے اور ایسی غلطیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو برسوں سے تاریخ ادب اردو کی کتابوں میں رائج رہی ہیں۔ اس سلسلے میں راقم السطور نے حتی الامکان اصل ماخذ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

"فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات" سے متعلق یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اوّل میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے اغراض و مقاصد سے تفصیلی بحث کی گئی ہے اور ان حالات اور پالیسیوں کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جو کالج کے

قیام کے سلسلے میں معاون و مددگار بنیں۔ اس کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے سلسلے کی دیگر تفصیلات بھی بحث و تنقید کے ساتھ درج کی گئی ہیں۔

باب دوم میں فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی سے وابستہ مصنفین کے سوانحی حالات پیش کئے گئے ہیں۔ کالج کے باضابطہ ملازمین کے سوانحی حالات درج کرنے میں تمام تر جزئیات اور تفصیلات کو مدنظر رکھا گیا ہے لیکن جو مصنفین کالج کے باضابطہ ملازم نہیں تھے اور انھوں نے کالج کونسل سے انعام حاصل کرنے کے لئے یا شعبۂ ہندوستانی کے اعلیٰ عہدے داروں کی فرمائش پر تصنیف و تالیف کا کام انجام دیا تھا ان کے حالات زندگی بیان کرنے میں اجمال سے کام لیا گیا ہے۔ چونکہ شعبۂ ہندوستانی ہی سے منسلک بھاکا کی شاخ بھی تھی اس لئے بھاکا کے اہم مصنفین سدل مشرا اور للّوجی لال کوی کے حالات بھی بیان کئے گئے ہیں۔

باب سوم میں شعبۂ ہندوستانی کی تصانیف کا سیر حاصل تحقیقی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کی جتنی تصانیف دستیاب ہوسکیں وہ سب اس میں شامل ہیں۔ البتہ للّوجی لال کوی اور سدل مشر کی تصانیف کے علاوہ دیگر کسی بھاکا منشی کے کارنامے شامل نہیں کئے گئے ہیں۔ بعض تصانیف کے مصنفین کے بارے میں غلط فہمیاں پائی جاتی تھیں۔ جیسے کالج کی ایک تصنیف "قصہ دل آرام و دل رُبا" کے مصنف کا نام کاشی راج بتایا گیا ہے۔ اس باب میں مذکورہ قصے کے اصل مصنف کی نشاندہی کی گئی ہے۔ کالج کی دو کتابوں "نقلیات ہندی" اور "نقلیات لقمانی"، کو بعض محققین نے ایک ہی کتاب سمجھا تھا۔ اس باب میں ان دونوں کتابوں کا فرق واضح کیا گیا ہے۔ انگریز مصنفین کی تصانیف کے سلسلے میں بڑی مبہم اور الجھی ہوئی تفصیلات دستیاب ہوئیں۔ بعض جگہ ایک ہی کتاب کے مختلف نام ملے اور بعض تصانیف کو مختلف مصنفین کے نام سے منسوب کیا گیا ہے، جس سے نتائج اخذ کرنے میں بڑی دشواریوں کا سا

کرنا پڑا۔ مگر بڑی چھان بین کے بعد ان تصانیف کا بیان ان کے اصل مصنف کے ذیل میں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر کتابوں سے متعلق بعض تحقیقی خلیجوں کو پر کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ مطبوعہ کتابوں اور خصوصاً قلمی نسخوں سے اقتباسات بجنسہ نقل کئے گئے ہیں۔ کہیں کوئی تصحیح نہیں کی گئی ہے۔

باب چہارم میں فورٹ ولیم کالج کی نثر کے اسلوب سے بحث کی گئی ہے۔ اسلوب کے سلسلے میں کالج کے ذمہ داران خصوصاً ڈاکٹر گل کرسٹ کی ایک خاص پالیسی تھی، ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے استحکام کے پیش نظر انہیں ایسی کتابوں کی ضرورت تھی جو انگریز ملازمین کو ہندوستان کے عوام وخواص کی بول چال کی زبان سے روشناس کرا سکیں۔ پھر بھی ایسا نہیں ہے کہ کالج کی تمام تصانیف "صاحبان عالیشان" کے اس حکم کی پاسداری کرتی ہوں یا ان کا اسلوب یکساں ہوں لیکن زیادہ تر کتابوں کا اسلوب سادہ سلیس اور بول چال کی زبان سے قریب رہا ہے اس لئے اسی اسلوب کو کالج کا نمائندہ اسلوب تسلیم کیا گیا ہے۔

باب پنجم میں اردو نثر پر فورٹ ولیم کالج کے اثرات کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج نے نثر کے علاوہ اردو ادب کے کسی اور گوشے کو متاثر نہیں کیا۔ کالج میں چند ایک منظوم تصانیف بھی تخلیق کی گئی ہیں جن سے ہندوستان کے عوام کے تہذیبی اور ثقافتی سرشتوں تک رسائی ہوتی ہے۔ لیکن کالج کے ارباب حل وعقد نے بنیادی طور پر اردو نثر کو اپنے مقاصد کی فراہمی کا وسیلہ بنایا۔ اس لئے اس کے تمام تر اثرات بعد کی اردو نثر ہی پر مرتب ہوئے چنانچہ سرسید کی "سائنٹفک نثر" بھی فورٹ ولیم کالج کے انداز نثر کا براہ راست نتیجہ ہے۔ اسی بنا پر کالج کے قیام کے دوران اور اس کے خاتمے کے بعد کی اردو نثر کا اجمالی جائزہ لیکر کالج کی نثر کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔

اس باب کے شروع میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے قبل کی اردو نثر پر اس انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ ایک ایسا کینوس تیار ہو جائے جس پر فورٹ ولیم کالج کی نثر کے اثرات کی متحرک اور واضح تصویر نمایاں ہو سکے۔

ماخذ و مصادر کے عنوان کے تحت مقالے کے آخر میں ان کتابوں، قلمی نسخوں اور اخبار و رسائل کی ایک فہرست شامل کی گئی ہے، جن سے مقالے کی تکمیل میں براہ راست استفادہ کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں آخر میں کالج کے مصنفین اور ان کی تصانیف کی فہرست بھی دیدی گئی ہے تاکہ کتاب میں انہیں تلاش کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔

میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ اردو ادب کے سیاق و سباق میں فورٹ ولیم کالج کے موضوع پر یہ پہلا مسبوط اور مکمل مقالہ ہے مگر میں نے یہ کوشش ضرور کی ہے کہ کالج اور خصوصاً شعبۂ ہندوستانی سے متعلق کوئی اہم نکتہ نظر انداز نہ ہونے پائے۔ میں اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئی ہوں، اس کا فیصلہ اہلِ ادب کریں گے۔ میں تو صرف اتنا کہوں گی کہ تحقیق کے میدان میں کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوتی۔

عبیدہ بیگم

باب اول

فورٹ ولیم کالج کے اغراض و مقاصد

فورٹ ولیم کالج کے قیام (۱۰ر جولائی ۱۸۰۰ء) سے قبل کی تعلیمی سرگرمیوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور عیسائی مشنریوں کی کاوشیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ایک تجارتی ادارہ تھی۔ اس کا پہلا جہاز ۱۶۰۸ء میں ہندوستان آیا تھا۔[1] اپنے ابتدائی دور میں کمپنی نے قدرتی طور سے تجارت کے فروغ کی جانب زیادہ توجہ کی۔ ہندوستانی عوام کی تعلیم اور فلاح و بہبود سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ لیکن تجارتی جدوجہد کے اس دور میں بھی کمپنی کی تعلیمی سرگرمیوں کی کچھ جھلکیاں ملتی ہیں۔ یہ سرگرمیاں کمپنی کے زیر اقتدار علاقے میں تبلیغ مذاہب اور اس سے متعلق تعلیم تک محدود تھیں۔ اس دور میں تبلیغ مذہب اور عیسائیت کی تعلیمی کاوشوں ہی کو ہندوستانی عوام کی تعلیم سے تعبیر کیا گیا۔

اس عہد میں ہندوستان کی تیزی سے بدلتی ہوئی سیاسی صورت حال نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب حل و عقد کے حوصلے بلند کر دیئے۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہو گیا اور ملک میں ہر طرف نزاع اور بدامنی پھیل گئی۔ کمپنی نے اب تجارت میں ترقی کے علاوہ حکومت کا خواب بھی دیکھنا

---

[1] India — A Modern History, by Percival Spear. P. 167.

شروع کر دیا۔ نوابوں اور راجاؤں کے آپسی نفاق نے ان کے لئے راہیں ہموار کیں ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ میں کلائیو نے فتح حاصل کر کے انگریزوں کے قدم بنگال میں مضبوط کر دیئے۔ اس کے بعد تقریباً نصف صدی تک وہ سیاسی اور فوجی سطح پر حکومت کی بنیادیں مستحکم کرتے رہے۔ پولیس اور مالیات کے شعبوں پر اپنا عمل دخل بڑھانے میں انھوں نے خصوصی دلچسپی لی۔ مقامی نواب بس نام ہی کے نواب رہ گئے کمپنی نے انکے سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیئے تھے۔ اس بات کی توثیق اس مراسلے سے ہوتی ہے جو ۱۷ر اگست ۱۷۷۲ء کو کورٹ آف ڈائرکٹرز نے ہیسٹنگز کو لکھا تھا۔[1] اس مراسلے میں یہ وضاحت کی گئی تھی کہ کمپنی کی خواہش ہے کہ کمپنی کے ملازمین کے ذریعہ مال گذاری کے سارے انتظام پر تصرف حاصل کر لیا جائے۔ یوں پورا سول ایڈمنسٹریشن کمپنی کے زیر اقتدار آگیا۔

سول ایڈمنسٹریشن کو اپنے ہاتھ میں لے لینے کے بعد کمپنی کو اسے چلانے کے لئے تجربہ کار اور لائق عملے کی ضرورت محسوس ہوئی اور ایسے عملے کی تعلیم و تربیت کے لئے انھیں تعلیم گاہوں کی ضرورت کا بھی احساس ہوا۔ کمپنی کے بیشتر ملازمین اور افسران مقامی زبانوں سے ناواقف تھے۔ انھیں مقامی زبانوں کی تعلیم دینا بھی ضروری تھا۔ اس سلسلے میں ابتدائی کوششیں ذاتی طور پر چند ایک انگریز افسروں نے کیں اسکے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی اس جانب متوجہ ہوئی۔

---

[1] Memoirs of Hastings, I, 214

بحوالہ British Orientalism P. 16

کمپنی کی ابتدائی کاوشوں میں مدراس کے فورٹ سینٹ جارج کالج کا نام سرفہرست ہے۔ اس کالج کو مدراس کے گورنر مسٹر جوزف کلکٹ (JOSEPH COLLECT) نے ۱۸۱۲ء میں اس مقصد سے قائم کیا تھا کہ جو نو وارد رائٹرس[1] انگلینڈ سے ہندوستان آتے ہیں انھیں ہندوستان کی زبان اور تہذیب و تمدن سے واقف کرایا جائے۔ اس کالج کو رائٹرس کالج بھی کہا گیا ہے۔ یہ کالج ایک عرصے تک فورٹ سینٹ جارج کے احاطے میں کام کرتا رہا۔[2]

وارن ہیسٹنگز[3] (۸۵-۱۷۷۴ء) نے ہندوستان میں تعلیم گاہوں کے قیام کی جانب خصوصی توجہ کی۔ اسکے پس پشت اس کی سیاسی مصلحتیں بھی کارفرما تھیں۔ اسکے نزدیک ہندوستانیوں پر انگریزوں کے اقتدار کو مستحکم بنانیکے لئے یہ بے حد ضروری تھا کہ ہندوستانی علم و ادب کی ترویج کیجائے اور سول ملازمین کو مقامی زبانوں سے روشناس کرایا جائے۔

---

[1] کمپنی کی ملازمت میں سب سے کم درجہ کے ملازم کو رائٹر کہا جاتا تھا۔

[2] فورٹ سینٹ جارج کالج، افضل الدین اقبال، ص ۱۳-۱۴۔

[3] وارن ہیسٹنگز ۱۷۷۲ء میں بنگال کے گورنر کی حیثیت سے ہندوستان آیا اور اکتوبر ۱۷۷۴ء میں پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے اس کی تقرری عمل میں آئی۔ فروری ۱۷۸۵ء میں وہ اس عہدے سے مستعفی ہوگیا۔

ہیسٹنگز خود بھی مشرقی زبانوں سے واقف تھا۔[1] اس نے حکومت کی ضرورتوں سے قطع نظر معزز ہندوؤں اور مسلمانوں سے قربت حاصل کرنے کیلئے بھی یہ زبانیں سیکھی تھیں اس کی پالیسی کے نتیجے میں کلکتہ مدرسہ کا قیام عمل میں آیا۔

کلکتہ مدرسہ ۱۷۸۰ء

ستمبر ۱۷۸۰ء میں کلکتہ کے معزز مسلمانوں نے ہیسٹنگز سے یہ درخواست کی تھی کہ اعلیٰ سطح پر انکی باقاعدہ تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ ہیسٹنگز نے اس موقعے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اکتوبر ۱۷۸۰ء میں اس نے کلکتہ مدرسہ قائم کر دیا۔[2] اس وقت ملازمتوں میں ہندوؤں کا عمل دخل زیادہ تھا۔ مدرسے کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے اعلیٰ خاندان کے لڑکوں کو اسطرح تعلیم و تربیت دی جائے کہ وہ بھی ذمہ دار اور اعلیٰ عہدوں کی ملازمت کے قابل ہو سکیں اور یوں اعلیٰ عہدوں پر صرف ہندوؤں

---

[1] ہیسٹنگز کے تعاون سے ۱۷۸۴ء میں ولیم جونس (WILLIAM JONES) نے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی بنیاد رکھی۔ سوسائٹی کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ ایشیا کے علوم وفنون اور دیگر تاریخی خصوصیات کی ترویج واشاعت کا کام عمل میں لایا جائے۔ ولیم جونس سوسائٹی کے صدر تھے۔ انکے ساتھ کول بروک اور ولسن (WILSON) کے علاوہ دیگر مشہور مستشرق بھی سوسائٹی کے ممبر تھے۔

[2] History of Vernacular Education In Bengal, by N.L. Basak, P. 215; 216.

ہی کا اجارہ نہ رہے بلکہ مسلمانوں کو بھی ترقی کرنے کا موقع ملے۔

ہیسٹنگز نے یہ مدرسہ کمپنی کے ڈائرکٹرس سے اجازت لئے بغیر قائم کر دیا تھا اور ابتدا میں سارا خرچ اس نے خود برداشت کیا تھا۔ مدرسے میں زبان فارسی کے علاوہ قرآن، مذہبیات، قانون، ریاضی، علم نجوم، فلسفہ اور قواعد کی تعلیم دیجاتی تھی۔ یہ مدرسہ اپنے نظم وضبط اور بہترین تعلیم کی بنا پر کافی مشہور ہوا۔ حتیٰ کہ اسکی شہرت کمپنی کے ڈائرکٹرس تک پہنچی۔ انھوں نے ہیسٹنگز کی بہت تعریف کی اور کمپنی کو حکم دیا کہ وہ ہیسٹنگز کے روپے لوٹا کر مدرسے کا خرچ خود برداشت کرے[۱]۔

اس مدرسے میں ہندوستانی طلبہ کے علاوہ انگریز ملازمین بھی تعلیم حاصل کرتے تھے اور ایک دو سال کے اندر تھوڑی بہت فارسی سیکھ کر نکل آتے تھے۔

سنسکرت کالج ۱۷۹۱ء

مشرقی زبانوں کی ترویج و ترقی سے متعلق ہیسٹنگز کی پالیسی کو بنارس کے ریذیڈنٹ جوناتھن ڈنکن (JONATHAN DUNCAN) نے آگے بڑھایا۔ ڈنکن نے ۱۷۹۱ء میں بنارس میں سنسکرت کالج قائم کیا[۲]۔ اس کام میں اسے گورنر جنرل لارڈ کارنوالس[۳] (LORD CORNWALLIS) (۱۷۸۶-۹۲ء) کا بھی تعاون

۱؎ History of Vernacular Education In Bengal P. 216

۲؎ لارڈ کارنوالس کے عہد ہی سے ہر انگریز ملازم کو تیس روپے ماہانہ بطور وظیفہ دیا جاتا تھا تاکہ وہ پرائیویٹ طور پر منشی رکھکر فارسی کی تعلیم حاصل کر لیا کریں۔ یا پھر انگریز افسران خود ہی اپنے ماتحت ملازمین کیلئے اردو کی تعلیم کا انتظام کر دیا کرتے تھے۔ ۳؎ بھارتی شکشا کا اتہاس۔ ڈاکٹر سرجو پرساد۔ ص ۲۶۴-۲۶۵

حاصل تھا۔ اس کالج کا مقصد جہاں اہل ہنود کے قانون، مذہب و ادب کا تحفظ اور نشو و نما تھا وہیں ہندوؤں کو اس قابل بنانا تھا کہ وہ انگریز جوں کے ماتحت رہ کر انھیں معاملات سلجھانے اور نمٹانے میں مدد دے سکیں۔[1]

اس کالج کو ڈنکن نے ایک ایسی عوامی "دانش گاہ" قرار دیا تھا جس کے دروازے سب کے لئے یکساں طور پر کھلے تھے اور جو ہندوؤں کے سامنے تحقیق اور تعلیم کے نئے زاویے پیش کرتی تھی۔[2]

کچھ دنوں بعد کمپنی نے ان دونوں تعلیم گاہوں کو اپنے زیر انتظام لے لیا اور انکو مالی امداد بھی دی۔ یوں ایک طرح سے کمپنی نے اپنے افسران کو مشرقی زبانوں کی ترقی کے لئے مناسب اقدامات کرنے کی اجازت دے دی۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان دونوں درسگاہوں اور ہندوستان میں تعلیم کی ترویج و ترقی سے کمپنی کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تو نظام حکومت چلانے کیلئے ججوں اور مجسٹریٹوں کو ہندو و مسلم قوانین سے واقف کرانے کیلئے ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو انکی رہنمائی کرسکیں تاکہ انھیں فرائض منصبی کی ادائیگی میں دشواریوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اور ملک کا انتظام بھی اچھی طرح چلتا رہے۔ کمپنی کی

---

[1] The Development of Hindi Prose Literature in the Early Nineteenth Century by Sharda Devi Vedankar, P. 123.

[2] British Orientalism and the Bengal Renaissance P. 30.

اس پالیسی نے اسے دوہرے فائدے سے ہمکنار کیا۔ اوّل تو اسے ہندو اور مسلم دونوں قوموں سے اعلیٰ خاندان کے تربیت یافتہ ملازم مل گئے۔ دوم ان قوموں کا تعاون اور خوشنودی بھی حاصل ہوئی۔ اس صورتِ حال نے انگریزی حکومت کو ہندوستان میں اپنے پیر جمانے میں تقویت پہنچائی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے تعلیم کے سلسلے میں جتنے رخ اختیار کئے ان سے قطع نظر اس میدان میں عیسائی مشنریاں بھی سرگرم کار تھیں۔ ان کا واحد مقصد عیسائیت کی تبلیغ تھا۔ یوں تو اسکول قائم کرکے عوام کو تعلیم سے روشناس کرانا ان کے مقصد میں شامل نہیں تھا لیکن مشنریوں کے قبل کے تجربات نے انھیں اسکولوں کے قیام پر مجبور کیا۔[1] ان اسکولوں کے ذریعہ وہ تعلیم کے علاوہ عوام کے ذہن و دماغ کی تربیت کر سکتے تھے۔ عوام میں اپنے اثر کو فروغ دے سکتے تھے اس کے علاوہ تبلیغ کا کام بھی جاری رہ سکتا تھا۔ ابتدا میں تو ان مشنریوں کے ساتھ کمپنی کا رویہ ہمدردانہ رہا لیکن جلد ہی وہ اسکی مخالف ہوگئی کیوں کہ عوام کے مذہبی عقائد میں دخل اندازی انھیں مشتعل کر سکتی تھی۔ اور یہ بات کمپنی کے حق میں مضر ثابت ہوتی۔ گورنر جنرل لارڈ کارنوالس تو مشنریوں کا سخت مخالف تھا۔

لیکن ۱۸ ویں صدی کا اختتام اور ۱۹ ویں صدی کا آغاز عیسائی مشنریوں کیلئے

---

[1] تاریخ تعلیم ہند۔ مترجم مسعود الحق ص ۶۳۔

سازگار ثابت ہوا۔[1] ملک کے مختلف حصوں میں جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ عوام عدم تحفظ کا شکار تھے۔ اس صورت حال نے مشنریوں کے فروغ کے دروا کر دیئے۔ انھوں نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

فورٹ ولیم کالج کا قیام اور اسکے استحکام سے متعلق تمام کاوشوں کا سہرا گورنر جنرل لارڈ ویلزلی (LORD WELLESLEY) کے سر ہے۔ وہ ۱۷۹۸ء میں گورنر جنرل ہوا اور ۱۸۰۵ء تک اپنے عہدے پر قائم رہا۔

گورنر جنرل ویلزلی کا عہد آتے آتے مغلیہ سلطنت کے انحطاط کے ساتھ ساتھ فارسی کا بھی زوال ہو رہا تھا۔ ویلزلی نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی مقامی حکمرانوں کو مغلوب کرنے کی تدبیریں شروع کر دیں۔ خوش قسمتی سے اسے ہر سیاسی محاذ پر فتح حاصل ہوتی گئی اور یوں جنوبی ہند سے لیکر شمالی ہند میں لکھنؤ کے نواب و وزیر تک کو اس نے اپنی پالیسیوں کے دام میں اسیر کر لیا۔ (ان علاقوں میں ہندوستانی زبان بولی اور سمجھی جاتی تھی) اسکے بعد ویلزلی نے محسوس کیا کہ اتنے وسیع علاقے پر قبضہ کر لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اسے منظم رکھنے اور حکومت کرنے کیلئے ضروری ہے کہ حکمران طبقہ یہاں کی زبان اور تہذیب سے بخوبی واقف ہو۔ اسی نکتے نے اس پر مشرقی زبانوں کی اہمیت

---

[1] ۱۷ویں اور ۱۸ویں صدی میں جو عیسائی مشنریاں سرگرم کار تھیں انہیں بنگال کی سیرام پور مشنری (۱۸۳۵ء۔ ۱۷۹۹ء) بڑی فعال تھی اسکے بانی اور روح رواں ولیم کیری (WILLIAM CAREY) تھے۔ یہ نومبر ۱۷۹۲ء میں ہندوستان آئے تھے۔ انکے رفقائے کار میں مارش مین (MARSHMAN) اور وارڈ (WARD) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ظاہر کی۔ چنانچہ ہیسٹنگز اور ڈنکن کیطرح اس نے انڈین سول سروس میں داخل ہونیوالے ملازمین کے لئے فارسی کی تعلیم اور روزانہ کے استعمال کے لئے ہندوستانی کی واقفیت پر زور دیا۔ ان ایام میں صورت حال یہ تھی کہ فارسی عوامی زندگی سے خواہ کتنی ہی دور کیوں نہ ہو گئی ہو۔ لیکن دفتروں اور عدالتوں میں اسکی عملداری پھر بھی قائم تھی۔ (مغلیہ سلطنت میں نظام سلطنت اور قوانین کا ذریعہ فارسی ہی تھی)

سول ملازمین کو مذکورہ دونوں زبانوں سے واقف کرانے کیلئے ویلزلی نے باقاعدہ تعلیمی سلسلہ شروع کیا۔ تاکہ نظام سلطنت عمدہ طور سے چلایا جاسکے اور برٹش حکومت کو مستحکم کیا جاسکے۔ اس خیال کے پیش نظر اس نے جو پہلا قدم اٹھایا وہ اورینٹل سیمنری (ORIENTAL SEMINARY) تھا۔ اسکے علاوہ ۲۱ دسمبر ۱۷۹۸ء کو گورنر جنرل نے ایک اطلاع نامہ بھی جاری کیا جس کے تحت بنگال کے سول ملازمین کیلئے مشرقی زبانوں اور آئین سے واقفیت ضروری قرار دی گئی:۔

"یکم جنوری ۱۸۰۱ء کے بعد کوئی بھی ملازم کسی بھی ایسے عہدے کیلئے مستحق نہیں سمجھا جائے گا، جو عہدے کہ اسکے بعد بتائے جائینگے جب تک کہ وہ ان قوانین، قواعد اور زبانوں میں ایسا امتحان (جسکی نوعیت اس کے بعد بتائی جائے گی) پاس نہ کرلے جس کی واقفیت اسکے

ساتھ ہی لازمی اعلان کی جارہی ہے"[1]

اس اعلان کے تحت بنگال، بہار، اڑلیسہ اور بنارس کے صوبوں کی عدالتوں کے جج یا رجسٹرار کے عہدوں کے لئے فارسی و ہندوستانی، بنگال اور اڑلیسہ صوبوں میں مال و چنگی کے محکموں کے محصلوں کیلئے نیز تجارتی ریذیڈنٹ اور نمک کے ٹھیکہ داروں کیلئے بنگلہ اور بہار و بنارس کے صوبوں کے مال و چنگی کے محکموں کے محصلوں نیز تجارتی ریذیڈنٹ یا افیون کے ٹھیکہ داروں کے لئے ہندوستانی زبان کی واقفیت ضروری قرار دی گئی۔[2]

ولزلی کو اس زمانے کے انگریزوں میں گل کرسٹ ہندوستانی زبان کا ماہر نظر آیا۔ چنانچہ اسی کی رائے سے یکم جنوری ۱۷۹۹ء میں کلکتہ میں "اورینٹل سیمنری" قائم کی گئی۔[3] فروری ۱۷۹۹ء میں جونیر سول ملازمین کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ "اورینٹل سیمنری" میں ہی تعلیم حاصل کریں۔ چنانچہ نووارد جونیر سول ملازمین یہاں ایک سال تک تعلیم حاصل کرتے تھے۔[4] اس ادارے کے دیگر مراحل اسکے قیام سے قبل ہی طے کر لئے گئے تھے۔ بحیثیت استاد گل کرسٹ کا تقرر ۲۵ دسمبر ۱۷۹۸ء میں ہوا۔ فروری ۱۷۹۹ء سے باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوگیا۔[5] فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد اس ادارے کو ختم کر دیا گیا۔

---

[1] The Public Department, Dec 21, 1798 بحوالہ The Development of Hindi Prose Literature P. 30.

[2] گل کرسٹ اور اسکا عہد۔ محمد عتیق صدیقی ص ۱۱۲۔ [3] فورٹ ولیم کالج (ہندی) لکشمی ساگر وارشنے ص ۹

[4] The Development of Hindi Prose Literature P. 30.

[5] فورٹ ولیم کالج (ہندی) لکشمی ساگر وارشنے ص ۸

"اورینٹل سیمنری" اس وسیع وعریض منصوبہ کی جانب ایک ابتدائی اور تجربا تی قدم تھا جس کے تحت ویلزلی نے سوچا تھا کہ صرف زبانیں ہی نہیں بلکہ ان آئین وقوانین اور ضوابط کی بھی تعلیم دیجائیگی جس کی واقفیت مال گذاری اور تجارتی شعبوں کے لئے بے حد ضروری تھی ۔[1]

زبان اور نظام سلطنت سے متعلق ان تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے پس پشت کئی مقاصد تھے اور اس پر زور دینے کی کئی وجوہات تھیں ۔ ۱۷۹۸ء میں ہی برٹش اقتدار کے تیزی سے بڑھتے ہوئے قدموں کو دیکھ کر ویلزلی نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی اب محض ایک تجارتی ادارہ نہیں ہے بلکہ اسمیں حکمرانی کی بھی طاقت آتی جارہی ہے اور اسے باصلاحیت اور ماہر ارباب نظم ونسق کی ضرورت ہے[2] لیکن ہندوستان میں انگریزوں کی عملداری قائم ہوجانیکے باوجود ان کا سابق تجارتی تصور اسوقت بھی قائم تھا ۔ تاجرانہ رموز ونکات نظام سلطنت سے متعلق افسروں اور دیگر شعبوں میں پیوست تھے ۔ اسی صورت حال کو ویلزلی نے ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء[3] کے نوٹس میں بڑی ناگواری اور تلخی سے

---

[1] The Development of Hindi Prose Literature by Sharda Devi, P. 31.

[2] The Educational Policy of East India Company in Bengal to 1854 by D.P. Sinha P. 13.

[3] یہی نوٹس ۱۸ اگست ۱۸۰۰ء کو MINUTE IN COUNCIL کے طور پر منظور ہوئے اسی دن ویلزلی نے کورٹ کے ڈائرکٹروں کو بھی ان نوٹس کے متعلق ایک خط لکھا ۔

لکھا ہے کہ اگرچہ ہندوستان میں برطانوی اقتدار قائم ہوچکا ہے لیکن وہ تجارت والی بات اب بھی اس سے منسوب ہے۔ سول ملازمین اب جج، سیاست داں، اور مدبر جیسے عہدوں کے پیچیدہ فرائض انجام دے رہے ہیں لیکن ان کا رائٹر فیکٹر، جونیر، سینئر والا تجارتی نام اب بھی برقرار ہے۔ وہ ایک طاقتور حکومت میں وزیروں اور افسروں کے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں لیکن انکی تعلیم و تربیت مناسب نہیں ہے۔[۱]

ویلزلی نے مذکورہ نوٹس میں ان تمام نکات اور وجوہات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جو ایک نیا تعلیمی ادارہ قائم کرنے پر دلالت کرتے ہیں۔ اس نے کالج کے قیام کو ناگزیر ثابت کرتے ہوئے ان تمام اختلافات اور نکتہ چینیوں کو بھی بیان کیا ہے جو کالج کے متعلق زیر بحث تھیں۔ کالج کے قیام پر زور دیتے ہوئے اس نے واضح طور سے لکھا ہے:

" ایسے کسی طریقۂ حکومت کو قائم رکھنے کیلئے ہمکو ہر شعبے میں قابل مجسٹریٹ، فاضل ججوں اور باصلاحیت مدبروں کی ضرورت پڑیگی جو حکومت کی انتظامیہ کا بار سنبھالنے کے قابل ہوں۔"[۲]

---

۱ A Selection from the Despatches, Treaties and Other Papers of the Marquess of Wellesley - K.G. During his Government of India edited by Sidney. J. Owen P. 722 - 719.

۲ " " " " " " " P. 731

۱۰ر جولائی ۱۸۰۰ء کے ہی نوٹس میں ویلزلی نے ایک دوسری جگہ لکھا ہے :-

"اسکے مفید نظام کی وسعت کے تناسب سے "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے یوروپین سول ملازمین کی ڈیوٹیاں اور زیادہ وسیع اور اہم تر ہوگئی ہیں۔ رائٹر، فیکٹر اور مرچینٹ کے نام، جن سے کہ اب تک سول سروس کے مختلف درجات کو سمجھا جاتا ہے اب انکی ڈیوٹیو نکی نوعیت و وسعت اور کمپنی کے سول ملازمین کے ذریعہ کئے جانیوالے پیشوں کے لحاظ سے ان پر بالکل چسپاں نہیں ہوتے۔ [1]

ویلزلی کی دوربین نگاہوں نے یہ بات دیکھ لی تھی کہ جب تک حکمراں طبقہ یہاں کی زبان و تہذیب سے اچھی طرح واقف ہونیکے ساتھ ساتھ باصلاحیت اور قابل نہ ہوگا۔ اس وقت تک نہ تو نظام حکومت ہی عمدہ طور سے چل سکے گا اور نہ برٹش حکومت کو استحکام ہی مل سکے گا۔ [2] اس زمانے میں جو لوگ اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے ان میں عموماً صلاحیت اور اہلیت کا فقدان تھا۔ وہ اونچے عہدوں پر بغیر تربیت کے اور کبھی کبھی تو صرف کورٹ آف ڈائرکٹرس کے ممبروں سے رشتہ داری

---

[1] A Selection from the Dispatches, P. 719.

[2] History of India (from the earliest Period to the Close of Lord Dalhousie's administration) Vol. II by John Clark Marshman, P. 123.

کی بنا پر پہنچ جاتے تھے [۱] اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ بہت سے ایسے قوانین جو عوام
کے مفاد اور فلاح کے پیش نظر رائج کئے گئے تھے ان سے انھیں کوئی فائدہ نہیں
پہنچ رہا تھا۔ اسکی ایک بڑی وجہ ان افسران کی دیسی زبانوں سے ناواقفیت تھی۔
جسکی وجہ سے انھوں نے بے عملی اور نا اہلی کی بڑی افسوس ناک مثالیں پیش کیں۔
دوسری لیکن بڑی اہم بات یہ بھی تھی کہ نو وارد سول ملازمین بہت ہی کم عمری میں
ہندوستان چلے آتے تھے۔ انکی عمر سولہ سال سے اٹھارہ سال کے درمیان ہوا کرتی
تھی۔ اتنی کم عمری میں مکمل تعلیم اور باقاعدہ تربیت کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔
چنانچہ ان میں سے بیشتر کی تعلیم ادھوری ہوا کرتی تھی۔ انھیں نہ تو کسی قسم کی تربیت
ملی ہوتی تھی نہ ان کا شعور پختہ ہوتا تھا، اور نہ ہی وہ ذہنی طور سے بالغ ہوتے تھے [۲]
ہندوستان آنے پر انکا سابقہ ایک بالکل نئے ماحول، نئے حالات سے پڑتا
تھا لیکن یہاں انکی رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ انکی تعلیمی اور اخلاقی حالت
درست کرنیکے لئے بھی کوئی کوشش نہیں کیجاتی تھی۔ یہاں آنیکے بعد ملازمت کی
ذمہ داریوں میں دب کر اور دولت کی فراوانی دیکھکر انھیں اپنے نقائص اور خامیونکی

---

[۱] History of Bengal (1757—1905) by Narindra Sinha, P. 151

[۲] Wellesley's Minutu بحوالہ. College of Fort William in Bengal by Cladious Buchanan P. 8.

اصلاح کا موقع نہیں مل پاتا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ دولت کمانیکی فکر میں پڑ جاتے تھے۔ اسکے علاوہ ہندوستان میں انکی اصلاح اور نقائص کو درست کرنیکا کوئی ذریعہ تو یوں بھی نہیں تھا۔ نو وارد سول ملازمین ہندوستان کی ملازمت میں خاص کشش بھی محسوس کرتے تھے چنانچہ جتنی بھی تعلیم حاصل کر پاتے اسکے بعد یہاں آکر دولت سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ اس میں صرف ملازمین ہی نہیں بلکہ انکے والدین اور دیگر متعلقین بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ یہی کوشش کرتے تھے کہ جلد از جلد اپنے وابستگان کو ہندوستان روانہ کر دیں۔[1] چنانچہ یہ نوارد سول ملازمین ادھوری تعلیم اور بغیر کسی تربیت کے کمپنی کی ملازمت میں رائٹر یا کلرک کی جگہ پا جاتے تھے۔ انھیں حکومت کے قوانین اور قواعد سے مکمل طور پر واقفیت نہیں ہوتی تھی۔ معلومات عامہ (جنرل نالج) بھی بس برائے نام ہی ہوتی تھی۔[2]

اس زمانے کا ہندوستان اپنی دولت و ثروت کی بنا پر غیر ملکیوں کے لئے کشش کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ان نوواردان نے دیسی زبانوں سے ناواقفیت اور نامکمل تعلیم و تربیت کے باعث اپنے فرائض کی انجام دہی میں لاپروائی اور مقامی لوگوں سے بد اخلاقی اور بدکرداری کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا۔ ویلزلی نے جب یہ صورت حال دیکھی

---

[1] Wellesleys Minute کالج College of fort William in Bengal P. 8.

[2] The Educational Policy of East India Company P. 13.

تو اسے برٹش انڈیا کا استحکام خطرے میں نظر آیا۔ چنانچہ اس نے ان نقائص کو دور کرنیکے لئے سول ملازمین کو باقاعدہ تعلیم دینے کی بابت غور کیا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ یہ نو وارد سول ملازمین دو یا تین سال کسی درسگاہ میں زبان۔ قوانین و آئین اور نظم و ضبط کی تعلیم حاصل کریں۔[1]

لیکن ایسا ہر گز نہیں تھا کہ اس صورتِ حال کے باعث نکما اور نا اہل عملہ سرگرم کار ہو گیا ہو۔ تعلیم و تربیت کے فقدان کے باوجود سول ملازمت میں بعض بڑے باصلاحیت ملازمین بھی تھے۔ اور انکا تاجرانہ رتبہ انکی صلاحیت کو قطعی متاثر نہ کر سکا تھا۔ ویلزلی نے اپنی یادداشت (MINUTE) میں خود لکھا ہے کہ سکریٹریٹ میں بہت سے ایسے افسر بھی تھے جو یوں تو کلرک کی طرح محنت کرتے تھے لیکن ان میں مدبرانہ صلاحیتیں بھی موجود تھیں۔ اپنی صلاحیتوں کی بنا پر ہی ان ملازمین نے سول سروس میں بہت سی خوبیاں پیدا کی ہیں جبکہ سول سروس میں جو نقائص تھے انکی وجہ یہ سول ملازمین نہیں بلکہ خود سروس سے متعلق قوانین و ضوابط ہیں۔[2]

اسکے باوجود ویلزلی اچھی طرح جانتا تھا کہ محض ذاتی صلاحیت اور اہلیت پر نہ تو کوئی حکومت بہت دنوں تک چلائی جا سکتی ہے اور نہ کوئی پائیدار اقتدار کی بنیاد ہی قائم کی جا سکتی ہے بلکہ اس کیلئے تو کچھ ایسے قاعدے اور قانون کی ضرورت ہے جو

---

[1] The Development of Hindi Prose Literature P. 33.

[2] Wellesley's Minule on the College of fort William in Bengal P.14.

سب کے لئے یکساں ہوں اور جن کے زیر اثر محض چند ہی نہیں بلکہ پورا عملہ باصلاحیت ملازمین پر مشتمل ہو اور یہ بات تبھی پیدا ہو سکتی ہے جب ہندوستان میں نو قائم شدہ اقتدار کو دائمی اور ایک مقدس امانت تصور کیا جائے۔[1]

ویلزلی آہنی عزم و حوصلہ کا مالک تھا۔ ان تمام خرابیوں اور خامیوں سے نمٹنے کے لئے اور باصلاحیت عملہ پیدا کرنے کیلئے اس نے نووارد سول ملازمین کی باقاعدہ تعلیم و تربیت کے مقصد سے ایک ایسی تعلیم گاہ قائم کرنے کی بات سوچی جسمیں نہ صرف دیسی زبانوں کی بلکہ قواعد و قوانین اور آئین و ضوابط کے ساتھ ساتھ مغربی سائنس اور ادب کی بھی تعلیم دیجائے۔ ویلزلی جانتا تھا کہ یہ سول ملازمین بڑے پیچیدہ فرائض انجام دیتے ہیں اور انکو مشرقی اور مغربی دونوں ہی پالیسیوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ چنانچہ سول ملازمین کی تعلیم کے بارے میں اسنے فیصلہ کیا کہ :۔

> "تعلیم لازمی طور پر مخلوط ہونی چاہیئے جسکی بنیاد لازمی طور پر انگلینڈ میں رکھی گئی ہو اور بالائی تعمیر منظم طریقے سے ہندوستان میں مکمل کی جائے"[2]

ظاہر ہے کہ وہ اتنے وسیع پیمانے پر کوئی درسگاہ چشم زدن میں قائم نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ ابتدار میں اسنے "اورینٹل سیمنری" قائم کیا۔ اسکے امید افزا اور روشن

---

[1] Wellesley's Minute بحوالہ College of Fort William in Bengal, P 17.

[2] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 P.19.

امکانات کو دیکھکر ویلزلی کے حوصلے اور عزائم بلند ہوگئے اور اسنے "اورینٹل سیمنری" کی جگہ اس شاندار وعظیم الشان درسگاہ کا خواب دیکھا جو ہماری ادبی تاریخ میں "فورٹ ولیم کالج" کے نام سے موسوم ہے۔

واضح طور سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ "اورینٹل سیمنری" ہی فورٹ ولیم کالج کے قیام کی بنیاد تھا لیکن ہیسٹنگز نے فورٹ ولیم کالج کے قیام سے تقریباً ۳۵ سال قبل آکسفورڈ یونیورسٹی میں فارسی زبان کی تعلیم کیلئے ایک فارسی استاذ کے تقرر کی تجویز پیش کی تھی۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ فورٹ ولیم کالج یا اس کالج جیسی کسی تعلیم گاہ کا خاکہ یا خیال رکھتا تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ ہیسٹنگز کے ذہن میں بھی سول ملازمین کو اسوقت کی مقبول ترین اور سرکاری زبان فارسی کی تعلیم دینے کا خیال آیا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے موقع پر اسنے لکھا ہے کہ چونکہ میرے اس منصوبے کی حوصلہ افزائی نہیں ہوئی اسلئے میں نے یہ خیال ہی چھوڑ دیا۔[۱] یوں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہیسٹنگز کا دھندلا اور غیر واضح خواب ویلزلی کے اس شاندار اور وسیع وعریض خیال کی ایک کڑی تھا۔

ایک ایسی درسگاہ کی ضرورت اور اہمیت کو ویلزلی بہت دنوں سے محسوس کر رہا تھا جو کیمبرج (CAMBRIDGE) اور آکسفورڈ (OXFORD) کی ہم پلہ ہو۔ جس میں مختلف علوم وقوانین کی تعلیم دیجائے۔ تاکہ سول ملازمین کی فہم وفراست میں دماغی اور ذہنی وسعتیں پیدا ہوں۔ وہ یہ بات بخوبی جانتا تھا کہ کوئی ایسا تعلیمی

---

[۱] British Orientalism and The Bengal Renaissance P. 18.

منصوبہ جو مکمل طور سے مشرقی ہو یا مکمل طور سے مغربی وہ نہ تو ملازمین کے تعلیمی اور اخلاقی نقائص کو دور کر سکتا ہے۔ اور نہ انکو ایسی تربیت ہی دے سکتا ہے کہ انمیں مثبت اور مفید صلاحیتیں پیدا ہوں تاکہ وہ اپنے فرائض منصبی سے عہدہ برآ ہو سکیں۔

اپنے وسیع و عریض تعلیمی منصوبے پر عمل پیرا ہونے سے قبل اس نے اپنے دوست اور بورڈ آف کنٹرول کے چیئرمین ہنری ڈنڈاس (HENRY DUNDAS) کو ذاتی طور سے ایک خط میں اپنے ارادے سے مطلع کیا کہ وہ بنگال کی سول ملازمت میں اصلاح کے لئے جلد ہی ایک اہم قدم اٹھانیکا ارادہ رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں ویلزلی نے اسکی توجہ سول ملازمین کی نااہلی اور مجہولیت کی جانب مبذول کرائی جو بغیر کسی درسگاہ میں تعلیم و تربیت کے دور نہیں کیا سکتی تھی۔[1] ویلزلی نے اس بات سے ڈنڈاس کو مطلع تو کر دیا لیکن کالج کی ضرورت کو وہ روز بروز بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا اور وہ جلد از جلد اسے قائم کر دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسنے ڈنڈاس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کلکتہ کے فورٹ ولیم میں کالج قائم کرنیکا فیصلہ کر لیا۔ اسے عجلت اسلئے بھی تھی کہ اگر وہ زیادہ صلاح و مشورہ کریگا تو کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ بلکہ وقت گذرتا جائے گا۔ یہانتک کہ اسکے ہندوستان چھوڑ دینے کا وقت آ جائے گا۔[2]

---

[1] The Development of Hindi Prose Literature P. 32.

[2] The Men Who Ruled India The Founders By Philip Woodrufe, Vol I P. 279.

۱۰ر جولائی ۱۸۰۰ء کو ویلزلی نے فورٹ ولیم کالج کا افتتاح کیا۔[1] اس نے یہ کالج سرنگا پٹم میں ٹیپو سلطان پر انگریزوں کی فتح کی پہلی سالگرہ کے موقع پر قائم کیا تھا۔ لہٰذا افتتاح تو اسنے مذکورہ تاریخ کو کیا لیکن جب آئین و قوانین مرتب کرکے کالج کو قطعی، اور آخری شکل دی گئی تو اس مسودہ پر گورنر جنرل کی کونسل نے اور پیچھے ہٹاکر ۴ر مئی ۱۸۰۰ء کی تاریخ لکھی ہے۔[2] دراصل ۴ر مئی ۱۷۹۹ء کو انگریزی فوجوں نے سرنگاپٹم میں فتح حاصل کی تھی ہے۔[3] اس یادگار موقع پر خصوصی تمغے بھی جاری کئے گئے جسکے ایک جانب ٹیپو سلطان کا دارالسلطنت اور دوسری جانب اس کی شکست کی تاریخ کندہ تھی۔[4]

یہ کالج ویلزلی نے بنگال، مدراس اور بمبئی کی ریاستوں کے جونیر سول ملازمین کی بہترین تعلیم و تربیت کے لئے قائم کیا تھا جسکا واضح اور واحد مقصد یہ تھا کہ وہ دیسی زبانوں کی تعلیم حاصل کرکے ملکی معاملات اور دیگر فرائض عمدہ طور سے انجام دے سکیں اور اسطرح برطانوی اقتدار کو استحکام نصیب ہو۔ ویلزلی نے ۱۰ر جولائی ۱۸۰۰ء کے

---

[1] بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۳۲
O:C (Supplement), July 10, 1800 (Copies Obtained from the India Office) جیمس برگس نے (کرونولوجی آف انڈین ہسٹری) کالج کے قیام کی تاریخ ۱۸ر اگست ۱۸۰۰ء درج کی ہے جو غلط ہے۔

[2] Wellesley's Minute in Council بحوالہ College of Fort William in Bengal P. 38.

[3] Mysore Gazetteer, Vol. II, Part IV, P. 3165.

[4] Gilchrist and the Language of Hindoostan By Sadiqur Rahman Kidwai P. 14.

نوٹس (اور ۱۸ ؍ اگست ۱۸۰۰ء کی عرضداشت) میں کالج کے آئین و قوانین کے تحت درج کیا تھا کہ :۔

" چونکہ مشیت ایزدی نے پسند فرمایا ہے کہ ہندوستان میں برطانیہ عظمیٰ کے مشیروں اور فوجوں کو مسلسل خوشحالی اور شان و شوکت عطاء فرمائے اور چونکہ متعدد جنگوں میں مسلسل فتوحات اور ایک باانصاف عقلمندانہ و معتدل پالیسی کے تحت ہندوستان اور دکن کے وسیع علاقے برطانیہ عظمیٰ کے قلمرو میں شامل ہو گئے ہیں اور عزت مآب ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت وقت کے ساتھ ساتھ ایک طاقتور سلطنت کی بنیاد پڑ چکی ہے اسلئے متعدد آباد اور زرخیز صوبوں اور مختلف قوموں کو دیکھتے ہوئے جو اپنے مذہبی رسوم، زبان، طور و طریقوں اور عادات و اطوار میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور علی الترتیب عجیب و غریب رسوم، فلسفے اور قواعد کے ذریعہ حکومت کئے جانے کی عادی رہی ہیں۔ اور (چونکہ) برطانوی قوم کی مقدس ڈیوٹی سچا مفاد، عزت اور پالیسی کا تقاضا یہ ہے کہ ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی عمدہ حکومت قائم کرنیکے لئے ہمیشہ کے واسطے موثر انتظام کیا جائے۔[1]

---

[1] Wellesley's Minute ہاکی College of Fort William in Bengal P. 23.24.

ولیزلی نے فورٹ ولیم کالج کیلئے جو نصاب مرتب کیا تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسکے ذہن میں ایک عظیم الشان دانشگاہ کا خاکہ بن چکا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کا نصاب مندرجہ ذیل تھا:۔

(۱) **زبانیں**:۔ عربی، فارسی، سنسکرت، ہندوستانی، بنگالی، تلنگی، مراٹھی، تامل، کنڑ

(۲) اسلامی قانون، ہندو قانون، علم الاخلاق، علم قانون، قوانین اقوام، قانون انگلستان گورنر جنرل کی کونسل یا قلعہ سینٹ جارج اور بمبئی پریسیڈنسی کے گورنروں کے نافذ کردہ آئین و قوانین۔

(۳) سیاسی معاشیات، تجارتی اداروں خصوصاً ایسٹ انڈیا کمپنی کے مفاد کی تعلیم، جغرافیہ اور ریاضی۔

(۴) **یورپ کی جدید زبانیں**، یونانی، لاطینی اور انگریزی کلاسیکی ادب۔

(۵) **جنرل ہسٹری**، جدید اور قدیم، ہندوستان اور دکن کی قدیم و جدید تاریخ۔ طبی تاریخ۔

(۶) علم نباتات، علم کیمیا اور علم نجوم یہ[1]

فورٹ ولیم کالج کی انتظامیہ کے لئے اس نے پرووسٹ (PROVOST) اور وائس پرووسٹ (VICE PROVOST) کے عہدے مقرر کئے تھے۔ پرووسٹ کے عہدے کے لئے لازمی شرط یہ تھی کہ پرووسٹ انگلستان کے

---

[1] Wellesley's Minute بحوالہ College of fort William in Bengal P. 27 . 28

کلیسا کا کلرجی مین ہو۔ کالج کیلئے سالانہ ۵ ہزار کی رقم منظور کی گئی تھی[۱] کالج فی الحال فورٹ ولیم میں قائم کر دیا گیا تھا۔ یہیں اسمیں تعلیم شروع کی گئی۔ ارادہ تھا کہ گارڈن ریچ پر زمین خرید کر کالج کی عمارت تعمیر کی جائے گی[۲] لیکن اس کی نوبت نہ آئی۔

ویلزلی نے تمام نشیب و فراز پر غور کرنیکے بعد یہ منصوبہ بنایا تھا کہ ہر نووارد تین سال اس کالج میں تعلیم حاصل کرے گا۔ اس سلسلے میں یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ اس مدت میں کیا وہ ملکی انتظام سے دور رکھے جائیں گے؟ ویلزلی نے اسکو حق بجانب ثابت کرنیکے لئے یہ دلیل پیش کی کہ نووار دان تو یوں بھی زبان وقانون سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اسلئے انکی کارگذاریاں تو ویسے بھی صفر کے برابر ہوتی ہیں[۳] کالج میں انکے یہ تین سال ضائع نہیں ہوں گے۔ رہا ان کا تعلیمی خرچ تو یہ ہر ملازم کی تنخواہ سے کاٹ لیا جائے گا[۴]۔ یہ بات اسنے اس خیال کے تحت سوچی تھی کہ

---

[۱] Wellesley's Minute on College of fort William in Bengal P. 26

[۲] History of India (from the earliest Period to the Close of lord Dalhousie's administration) Vol. II P. 124

[۳] Wellesley's Minute P. 39

[۴] India under Wellesley by P.E. Roberts P. 152

[۵] Wellesley's Minute on College of fort William in Bengal P. 37

کورٹ آف ڈائرکٹرس تعلیمی خرچ کا سوال نہ اٹھا سکے۔ کالج کا نظم و نسق مغرب کی اعلیٰ دانشگاہوں کے معیار کا ہوگا۔ کالج کا عملہ مع مستشرقین کے ممتاز اساتذہ پر مشتمل ہوگا ویلزلی کا خیال تھا کہ کالج میں جب مختلف ریاستوں کے ملازمین ایک جگہ جمع ہوں گے۔ تو انکے مابین حسد و نفاق کے جذبے کی جگہ فراخ دلی اور وسیع القلبی کا جذبہ پیدا ہوگا۔ کلکتہ میں رہنے سے مرکزی حکومت کو طلبہ اور انتظامات پر قابو پانے میں بھی آسانی ہوگی ۔ کالج میں طلبہ کو کیمبرج اور آکسفورڈ جیسی ہی مراعات اور سہولتیں فراہم کی جائیں گی بلہ

اس طول امل اور کاروائی کا سب سے کمزور پہلو یہ ہے کہ ویلزلی نے کالج قائم کرنے سے پہلے کورٹ آف ڈائرکٹرس سے اجازت نہیں لی تھی۔ اور نہ اس نے اپنے منصوبے کی تفصیلات ہی سے اسکو مطلع کیا۔ اتنا اہم قدم اٹھانے میں ویلزلی کو کورٹ آف ڈائرکٹرس کے اس مراسلے سے تقویت پہونچی تھی جو اس نے ویلزلی کے ایک مراسلے کے جواب میں" اورینٹل سیمنری" کے متعلق ۲۵ دسمبر ۱۷۹۸ء کو لکھا تھا جسمیں بڑے پیمانے پر تعلیمی پروگرام کا اشارہ کیا گیا تھا۔ کورٹ آف ڈائرکٹرس نے لکھا تھا کہ :۔

"ہمارے عام سرکاری ملازمین کے لئے ملکی زبانوں میں

India under Wellesley P. 153.

یاقت حاصل کرنے اور ان تازہ قائم شدہ ضابطہ ہائے آئین و
قوانین کے صحیح علم کی عظیم اہمیت کا، جیساکہ ہمیں شدید احساس ہے
تاکہ محکمات عدل و مال و تجارت میں کام کرنیوالے متعدد افسروں
(کے فرائض سے) انکو ہم آہنگ کیا جا سکے (اسکے پیش نظر) ہم ہز لارڈ
شپ (ویلزلی) کے تجویز فرمودہ انتظام جو ان اصولوں پر قائم ہے جنکی
صراحت گورنر جنرل کی مذکورہ سابق کارروائی (جسکا آغاز ۱۸۰۱ء سے
ہونا قرار پایا ہے) سے منسلک اعلان عام میں کی گئی ہے اسکے لئے
اپنی تائید مزید کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔[1]

ویلزلی نے اس سے یہ مطلب اخذ کیا کہ کورٹ آف ڈائرکٹرس اسی قسم کی
تعلیم گاہ کا قیام چاہتا ہے لیکن درحقیقت اسکا یہ خیال غلط نکلا۔ بہرحال اس خط سے
اسے اپنے منصوبے کو قطعی شکل دینے کا ایک بہانہ مل گیا۔ اسنے کالج قائم کر لیا اور
اسکے تھوڑے ہی دنوں بعد اسنے سارے ملک میں ایک اطلاع نامہ جاری کیا۔
جسمیں ویلزلی نے کالج کے قیام کی اطلاع دی اور مختلف صوبوں کے ادیبوں اور
تعلیم یافتہ لوگوں کو کلکتہ آنے کی دعوت دی کہ وہ کالج میں آکر اساتذہ کا منصب

---

[1] Vide Public Letter to Bengal, May 7, 1800 Home Misc. PP 5, 6, India office Records.
بحوالہ The Development of Hindi Prose Literature

قبول کریں۔ اسکے جواب میں ۵۰ سے زائد لوگوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔
ویلزلی کی دوربین نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ برٹش حکومت اور کمپنی دونوں کی
جڑوں کو دور دور تک پھیلانے، انکو استحکام عطا کرنے نیز ملازمت میں انگریز
ملازمین کو مضبوطی سے آباد کرنیکا یہی موقعہ ہے۔ چنانچہ اس کا خیال تھا کہ ملازمت
کو کچھ ایسی شکل عطا کیجائے کہ اس سے کمپنی اور برٹش حکومت دونوں کو فائدہ پہونچے۔
کیونکہ یہ بات اس کو بار بار کھٹک رہی تھی کہ کمپنی کے ملازمین کو خواہ انکے تجارتی ناموں سے
ہی کیوں نہ پکارا جائے لیکن بہرحال وہ اونچے عہدوں پر فائز ہیں اور ذمہ دارانہ
فرائض انجام دے رہے ہیں۔ چنانچہ اسنے اعلان کیا کہ وہ جونیر سول ملازمین کی بہترین
تعلیم و تربیت کے لئے فورٹ ولیم کالج قائم کر رہا ہے :۔

"بنگال میں بہ مقام فورٹ ولیم ایک ایسا کالج فی الفور
قائم کیا جاتا ہے جسکا مقصد کمپنی کے جونیر سول ملازمین کو ادب و
سائنس اور دیگر علوم کے ان شعبوں میں بہتر تعلیم دینا ہے جن کو کہ
شرق الہند (EAST INDIA) میں واقع برطانوی مقبوضات
کے حکومتی انتظام کیلئے قائم کردہ مختلف دفاتر سے متعلق فرائض کی
بجا آوری کا اہل بنانیکے لئے ضروری قرار دیا گیا ہو"[۲]

---

[۱] Gilchrist and the Language of Hindusto P.14.

[۲] Wellesley's Minute بحوالہ. College of Fort William in Bengal P. 25

کالج کے قیام سے ہندوستان میں تو سب لوگ واقف ہوگئے لیکن ویلزلی نے
کورٹ آف ڈائرکٹرس کو اسکی اطلاع نہیں دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ کورٹ آف ڈائرکٹرس
اتنے بڑے پیمانے پر تعلیم گاہ کے قیام کی اجازت کبھی نہیں دے گا۔ اسکی ایک وجہ تو
یہ ہے کہ ویلزلی متعدد "لشکرکشی" میں کمپنی کا کافی روپیہ برباد کرچکا تھا جس کیوجہ سے
کورٹ آف ڈائرکٹرس اس سے پہلے ہی سے کچھ ناراض تھا۔ اور اب ویلزلی کو اس کی
خاطر کورٹ آف ڈائرکٹرس کا دوبارہ کسی منصوبے پر روپیہ لگانا خود اسے محال نظر
رہا تھا۔ چنانچہ اسے یہ خوش فہمی ہوگئی کہ اگر کورٹ آف ڈائرکٹرس کی لاعلمی میں وہ
کالج قائم کرے گا اور اسکے بعد مطلع کرے گا تو وہ ایک دم برافروختہ ہوکر کالج کو توڑنے
حکم دینے یا کوئی دوسرا قدم اٹھانے سے پیشتر ضرور کچھ نہ کچھ غور کریگا۔ چنانچہ ویلزلی نے
کالج کے قیام سے متعلق سارے انتظامات مکمل کرنیکے بعد کورٹ آف ڈائرکٹرس کو
۱۰ اگست ۱۸۰۰ئ کو ایک مختصر سا خط بھیجا۔ اسمیں کالج کے قیام کے موقع پر اس نے جو
طویل نوٹ لکھا تھا وہ اور کالج کے آئین و قوانین کی ایک نقل منسلک تھی۔ اپنے
خط میں اسنے تحریر کیا تھا:۔

"اس خط کو قطعیت کیساتھ باضابطہ سرکاری مراسلے کا درجہ
نہیں دیا جاسکتا۔ آئندہ پہلے جانے والے جہاز سے میں ایک تفصیلی مراسلہ
روانہ کرنیوالا ہوں لیکن میری خواہش ہے کہ ممبران کورٹ کو جلد سے جلد اس
کالج کی نوعیت کا اندازہ ہوجائے جو میں نے کلکتے میں قائم کیا ہے۔"

Marlin : Wellesley Despatches Vol. II P. 366.

۔۔۔ گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۱۴۰

مذکورہ نوٹس میں ویلزلی نے اپنے اقدام کو حق بجانب ثابت کرنیکے لئے وہ ساری وجوہات بیان کیں جن کے تحت اس نے کالج قائم کیا تھا۔ انگلینڈ سے اجازت نامہ حاصل کئے بغیر کالج قائم کرنیکی اسنے تین توجیہات بیان کیں۔ اوّل تو یہ کہ اسے اپنی تعلیمی اسکیم پر عمل درآمد سے فوری طور پر عظیم فوائد حاصل ہونیکا یقین تھا۔ خواہ یہ عمل درآمد جزوی ہی کیوں نہ ہو۔ دوم اسنے ان فوائد کا مشاہدہ کیا تھا جو گل کرسٹ کے زیر تعلیم رہ کر نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد نے حاصل کیا تھا۔ سوم یہ کہ اسے تین سال کے اندر یورپ سے آئے ہوئے نو جوانوں کو مذکورہ بالا فوائد پہنچانیکی دلی خواہش تھی۔[۱] اسنے کورٹ آف ڈائرکٹرس کی توجہ اس جانب بھی مبذول کرائی کہ ہندوستان کا گورنر ہونا کوئی آسان کام نہیں کیوں کہ ہندوستان کی اپنی علیحدہ تہذیب و تمدن اور رسم و رواج ہے۔ یہانتک کہ تجارتی اور مالگذاری کے شعبوں کی نوعیت بھی مغرب سے قطعی مختلف ہے۔ اس نے اس بات کا بھی ذکر کیا کہ کمپنی کے سول ملازمین کو بہت دنوں تک کمپنی جیسے تجارتی ادارہ سے متعلق نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیون کہ وہ ایک طاقت ور حکومت میں وزیروں اور افسروں کے فرائض انجام دے رہے ہیں اس لئے انھیں اب تاجرانہ نقطۂ نظر کے بجائے انکی صلاحیت اور اہلیت کے مطابق ان عہدوں کی روشنی میں ہی دیکھا جانا چاہیئے۔ سول ملازمین کی کم عمری انکی ادھوری تعلیم، انکی نا اہلی کے پس منظر میں ایک با صلاحیت عملے پر زور دیتے ہوئے اس نے کالج کے قیام کو ناگزیر بتایا۔

---

[۱] Wellesley's Minute بحوالہ. College of Fort William in Bengal P. 35, 36.

اسکے بعد اپنے ایک دوسرے مراسلے میں ویلزلی نے بڑی سادگی اور خاکساری سے کالج کے متعلق کورٹ آف ڈائرکٹرس کو لکھا تھا :۔

"کورٹ آف ڈائرکٹرس کی ابتدائی تائید اس نو قائم شدہ ادارے میں جان ڈالدے گی"۔ [۱]

ویلزلی نے اپنے نوٹس اور منٹ میں یہ بھی لکھا تھا کہ مغلیہ سلطنت کے خاتمے اور برٹش حکومت کے قیام سے ما قبل پھیلنے والے انتشار اور بدنظمی کے دور میں بہت سی عوامی تعلیم و تربیت گاہیں بے توجہی کا شکار ہوکر آخر کار ویران ہوگئیں۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے "ہندو کالج" اور "کلکتہ مدرسہ" جیسی تعلیم گاہیں نہ صرف دوبارہ زندہ ہوجائیں گی بلکہ قانون اور تعلیم کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں میں رائج غلط طور طریقوں کی اصلاح بھی ہوسکے گی۔ [۲]

ان تمام دلائل کے باوجود کورٹ کے ممبران کو جیسے ہی کالج کے قیام کی اطلاع ملی وہ چراغ پا ہوگئے۔ اسوقت نوجوان سول ملازمین کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اساتذہ تندہی سے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھے[۳] کورٹ آف

---

[۱] Marlin : Wellesley's Despatches Vol. II P. 366
بحوالہ India under Wellesley P. 153.

[۲] Wellesley's Minute بحوالہ College of Fort William in Bengal P. 38.

[۳] The Men Who Ruled India, The founders, Vol. I P. 280

ڈائرکٹرس نے ۲۷ر جنوری ۱۸۰۲ء کے مراسلہ میں فوراً فورٹ ولیم کالج توڑنے اور "اورینٹل سیمنری" کی تجدید کا حکم جاری کر دیا۔[1] کورٹ آف ڈائرکٹرس کی اس برافروختگی کی کئی وجوہات تھیں۔ وہ کالج کے قیام میں شامل ویلزلی کے خلوص اور حکومت کیلئے اس کی نیک نیتی کو نہیں سمجھ سکا۔ ویلزلی کے اجازت نہ لینے سے وہ یہ سمجھا کہ ویلزلی اسکی اہمیت اور اختیارات کو نظر انداز کر کے ہندوستان پر اپنا ذاتی اقتدار قائم کرلینا چاہتا ہے۔[2] اگر ویلزلی نے اپنا منصوبہ پہلے کورٹ آف ڈائرکٹرس کے سامنے رکھا ہوتا اور اس قدر جلدبازی سے کام نہ لیا ہوتا تو ممکن کہ اسے کورٹ آف ڈائرکٹرس کا اعتماد اور تعاون حاصل ہو ہی جاتا۔ ہم سارا الزام کورٹ آف ڈائرکٹرس ہی پر نہیں رکھ سکتے کیونکہ وہ یہ جانتا تھا کہ کالج کی ذمہ داری بالآخر اس پر آپڑیگی اور اسی بنیاد پر وہ کالج کو منظور کرنیسے انکار کر رہا تھا حالانکہ اسکے لئے ویلزلی نے یقین دلایا تھا کہ کالج کیوجہ سے کمپنی زیر بار نہیں ہوگی۔ ادارے کے اخراجات پورا کرنیکے لئے ہندوستان کے سول ملازمین سے ایک قلیل رقم بطور چندہ لی جائے گی جسے انکی تنخواہ سے کاٹ لیا جائے گا۔ امید ہے کہ یہ مد ادارے کے اخراجات کیلئے کافی ہو جائے گی۔ اسکے ساتھ ساتھ منشی الاؤنس کا فنڈ اور جدید انتظام کے تحت گورنمنٹ پرنٹنگ پریس سے ہونیوالی آمدنی اسپر مستزاد ہے۔ اسکے علاوہ بنگال اور میسور کی مال گذاری سے کچھ رقم حاصل

---

[1] گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۱۴۱۔

[2] India under Wellesley, P. 154.

کیجا سکتی ہے۔ سلہ بندشدہ ٹیکسوں کے احیاء سے بھی آمدنی کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے
مزید برآں مارٹن (CLAND MARTIN) کی وقف جائیداد بھی اسکے لئے
قانوناً کام میں لائی جاسکتی ہے۔ سلہ

کورٹ آف ڈائرکٹرس اس ضرورت کا منکر نہیں تھا جسکے تحت ویلزلی نے کالج
قائم کیا تھا۔ اسے تو ویلزلی کے منصوبے میں جو چیز ناپسند تھی وہ اسکی وسعت کار تھی
اسکے نزدیک اتنا وسیع وعریض تعلیمی منصوبہ جسمیں ذہنی، دماغی اور اخلاقی اصلاح بھی شامل
ہو یہ اسکا فرض نہیں تھا۔ سلہ چنانچہ اسے فضول خرچی سے تعبیر کرتے ہوئے اس نے
کالج کے خاتمہ کا حکم جاری کر دیا۔

ویلزلی کو کورٹ آف ڈائرکٹرس کے اس حکم سے بہت صدمہ پہنچا۔ اُسے
کورٹ کے اس فیصلے پر بے حد افسوس ہوا کہ ہر صوبے کیلئے الگ الگ مدرسے قائم
کر دیئے جائیں تاہم ویلزلی نے ہمت نہیں ہاری اور کورٹ آف ڈائرکٹرس کے اس
حکم اور فیصلے کے جواب میں اسنے بڑی سختی سے لکھا کہ :۔

"اس کالج نے (جسے کورٹ نے بند کرنا پسند فرمایا ہے)
بہت سی ان خرابیوں کو دور کر دیا ہے جسے میں نے ہندوستان،

لہ A Selection from the Despatches, Treatiese & other Papers P. 714, 746.

سلہ The Educational Policy of East India Company P. 16.

سلہ India under Wellesley P. 154.

پہنچنے پر آپ کی سول سروس کے جدید شعبوں میں موجود پایا تھا اور اسنے آپ کے ان متعدد جونیر ملازمین کو قابل داد اور محنت طلب کاموں میں لگا دیا ہے جوکہ اس کے پہلے مزاج کے برعکس نصاب پڑھنے پر مجبور تھے۔ اور اسنے عوامی تحسین کے معیار کو اونچا کر دیا ہے، جوکہ ذہانت، ڈسپلن، خوش اخلاقی، تعلیم اور مذہب کا ماحصل بن چکی ہے"۔[1]

اپنے اسی مراسلے میں آگے چل کر ویلزلی نے یہ بھی بتا دیا کہ:-

"ایک جگہ پر ہندوستان کی سول سروس کے تمام عملہ کی ایک ہی ماخذ سے نکلی یکساں، سیاسی، اخلاقی اور مذہبی تعلیم و تربیت ہندوستان میں اعلیٰ افسران کے زیر انتظام برطانوی عملداری کو فروغ دے گی"۔[2]

لیکن الگ الگ صوبوں کے لئے الگ الگ مدرسے قائم ہو جانیسے برطانوی مفاد کے اس پہلو کو زبردست نقصان پہونچے گا۔ اس خیال کے تحت ویلزلی نے اپنی مرضی سے کورٹ آف ڈائرکٹرس کے حکم پر عمل درآمد کو چند مہینوں کے لئے ملتوی کر دیا۔[3] ویلزلی نے ۲۴ جون ۱۸۰۲ء کو کورٹ آف ڈائرکٹرس کے احکام کی تعمیل میں کالج کو توڑنے کیلئے ہدایات جاری کر دیں۔ لیکن اس حکم کے عمل درآمد کی مدت کا

---

[1][2] India under Wellesley, P. 154-155.

[3] India under Wellesley P. 155.

فیصلہ اپنے حق میں محفوظ رکھا۔ اسنے کہا کہ کالج کا خاتمہ بتدریج عمل میں لایا جائے۔ اور کسی حالت میں بھی دسمبر ۱۸۰۳ء سے قبل یہ کام نہیں ہونا چاہیئے۔ کیوں کہ کالج کے اراکین اور طلبہ سے کیئے جانیوالے بعض وعدوں کا ایفا ہونا باقی تھا۔ اس کے علاوہ اسنے یہ بھی کہا کہ یہ بڑی شرم کی بات ہے کہ جن ادیبوں کو ہم نے ملک کے مختلف حصوں سے یہاں آنیکی دعوت دی انھیں اس بنا پر واپس کر دیا جائے کہ برٹش حکومت انکا بار اٹھانے سے معذور ہے۔ یہ چیز ہم پر سے انکے اعتماد کو ختم کر دے گی [1] لیکن اسکے باوجود کورٹ آف ڈائرکٹرس کالج کے خاتمے پر مصر رہا اور ویلزلی درخواست کرتا رہا کہ وہ اپنے فیصلے پر ایک بار پھر غور کرے [2]۔

یہ تنازعہ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ اس نے مزید طول اسوقت کھینچا جب یہ معاملہ بورڈ آف کنٹرول تک پہونچا۔ بورڈ آف کنٹرول کا صدر CASTLEREAGH ویلزلی کا دوست تھا۔ اس نے ویلزلی کی حمایت میں کورٹ آف ڈائرکٹرس کو دوبارہ اپنے فیصلے پر غور کرنے کی ترغیب دی [3] کورٹ آف ڈائرکٹرس کو بورڈ آف کنٹرول

---

[1] Gilchrist and the Language of Hindoostan. P. 21.

[2] The Educational Policy of East India Company P. 16.

[3] The Men who Ruled India the founders Vol. I P. 280. 281.

کی یہ بات سخت ناپسند ہوئی۔ ان دونوں کے درمیان بڑے تلخ بحث و مباحثہ کا آغ
ہو گیا۔ اور دونوں نے اپنے اپنے اختیارات کا حوالہ دے کر اپنے کو حق بجانب ثابت کر
کی کوشش کی۔ اس درمیان میں قانونی کارروائی بھی کیجاتی رہی۔ آخر کار فتح کورٹ آف
ڈائرکٹرس ہی کی ہوئی۔ بعد ازاں اسنے بھی نرم رویہ اختیار کیا۔[1] اور STLEREAGH
کے ساتھ اتفاق رائے سے یہ اعلان کیا کہ تا حکم ثانی کالج کو جاری رہنے دیا جائے
اس نے کالج کو قائم رہنے کا حکم تو جاری کر دیا لیکن ساتھ ہی اسکی حد بندی بھی کر د
مثلاً یہ کہ کالج محض ایک مدرسہ کی حیثیت سے جاری رہے گا۔ اسمیں صرف بنگا
کے سول ملازمین کو مشرقی زبانوں کی تعلیم و تربیت دیجائے گی۔ بمبئی اور مدراس
سول ملازمین کیلئے انکی اپنی پریسیڈنسی میں اسطرح کے مدرسے قائم کئے جائیں
کورٹ آف ڈائرکٹرس تو پہلے ہی سے تین صوبوں کے لئے ایک تعلیم گاہ کا مخالف تھ
اسکا خیال تھا کہ ان تین صوبوں کیلئے الگ الگ تعلیم گاہیں ہونی چاہئیں اس کے نزدیک
ایک ہی کالج میں تین صوبوں کے سول ملازمین کا تعلیم پانا خلاف مصلحت تھ
کیونکہ ایسے ماحول میں باغیانہ خیالات کو ابھرنے اور نشو و نما پانے کے واضح امکا
تھے جس سے برٹش حکومت کے استحکام کے لئے خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔[3] چنانچ

---

[1] ...dia under Wellesley, P. 155, 156, 157, 158.
...9, 160,

[2] ...he Educational Policy of East India Company P. 16.

[3] ...lchrist and the Language of Hindoostan, P. 20.

لج کی حدبندی کرکے اسنے اس خدشہ کا ازالہ کر لیا۔ بورڈ آف کنٹرول کے صدر
(CASTTEREAGH کورٹ کے مذکورہ منصوبہ کے صرف اس پہلو سے متفق
ے کہ بمبئی اور مدراس کیلئے الگ الگ مدرسے قائم کئے جائیں۔ ۱۸۰۵ء میں
ب وہ بورڈ سے الگ ہوگئے تو کورٹ آف ڈائرکٹرس نے کالج کو مدرسہ کی شکل
یدی جسمیں رائٹرس کو صرف مقامی زبانوں کی تعلیم دیجاتی تھی۔[۱] اس تبدیلی نے کالج کی
ں کی راہیں مسدود کر دیں۔

ان حالات میں کورٹ آف ڈائرکٹرس اور گورنر جنرل کے درمیان تعلقات نے
ی ناخوشگوار شکل اختیار کرلی۔ کورٹ آف ڈائرکٹرس نے ویلزلی پر الزام تراشیوں
سلسلہ شروع کیا جس سے عاجز آکر ویلزلی نے استعفاء دیدیا اور ۱۵ راگست ۱۸۰۵ء کو
لینڈ چلا گیا۔[۲]

اسکے بعد فورٹ ولیم کالج کا وہ کردار ختم ہوگیا جس کا خاکہ ویلزلی کے ذہن میں
ا۔ جسقدر خلوص سے اسنے وسیع و عریض پیمانے پر سول ملازمین کو تعلیم دینے کا پروگرام
یا تھا وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ البتہ کاغذات پر ۱۸۱۴ء تک اس کی وہی شکل برقرار
ی۔[۳]

The Educational Policy of East India Company
P. 17.

Gilchrist and the Language of Hindoostan
P. 22.

۱۲ ارمئی ۱۸۰۶ء کو کورٹ آف ڈائرکٹرس نے کم و بیش فورٹ ولیم کالج کے طرز پر ھیلی بری (HAILEBURY) میں ایسٹ انڈیا کالج کے نام سے ایک تعلیم گاہ قائم کی [1] اسکا بھی مقصد یہ تھا کہ ہندوستان جانیوالے کمپنی کے ملازمین کو ابتدائی تربیت بہم پہونچائی جائے۔[2] انھیں اعلیٰ معیار کی تعلیم دیجائے تاکہ وہ ہندوستان میں مختلف عہدوں پر اپنی کارگذاریاں دکھا سکیں ۔ یہ کالج ایک پرنسپل اور چھ پروفیسروں کے ساتھ شروع ہوا: یہاں کلاسیکی اور جنرل ادب، ہندی ادب، ایشیا کی تاریخ، عربی، فارسی اور ہندوستانی ادب کی تعلیم دیجاتی تھی۔[3]

فورٹ ولیم کالج کے آئین و قوانین کے مرتب ہو جانیکے فوراً بعد ہی یہاں درس و تدریس کا کام شروع نہیں ہوا۔ کالج نے ۲۴ نومبر ۱۸۰۰ء سے باقاعدہ تعلیم دینا شروع کیا اور اسی تاریخ سے عربی فارسی اور ہندوستانی شعبوں میں لکچر کا آغاز ہوا۔[4]
۱۰ جولائی سے ۲۴ نومبر کے درمیان کالج اپنی انتظامیہ اور تعلیمی شعبوں میں درس و تدریس، منشیوں، مترجموں اور صدر مدرسوں کا بندوبست، تقرر اور دیگر معاملات حل کرتا رہا۔ ہر شعبے کیلئے مناسب اور باصلاحیت مدرس اور ہیڈ مدرس کا

---

[1] [3] The Development of Hindi Prose Literature,
P. 35, 34.

[2] The Educational Policy of East India Company
P. 17

انتخاب کرنا تھا۔ اس سلسلے میں ویلزلی نے ۱۸/اگست ۱۸۰۰ء کو اپنے دوست اور بورڈ آف کنٹرول کے چیئرمین ہنری ڈنڈاس کو خط لکھا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنے اثر ورسوخ سے کام لے کر مختلف شعبوں کیلئے اسکے منتخب افراد کو بنگال بھیجدیں تاکہ وہ ان شعبوں کے پروفیسر کا عہدہ سنبھال لیں۔[1] اردو زبان (ہندوستانی) تو یوں بھی ان دنوں اپنی شکل وصورت اور ادبی سرمایہ کے لحاظ سے یتیم تھی۔ ہندوستانی شعبہ میں تعلیم دینے کیلئے ایسی کتابیں نہیں تھیں جن سے سول ملازمین استفادہ کرسکتے۔ چنانچہ تصنیف وتالیف کا کام اور مترجمین و مؤلفین کا انتظام دونوں وقت طلب تھا۔ ورنہ اس سے قبل دہی چند ایک از کار رفتہ کتابیں تھیں جن سے گلکرسٹ نے "اورینٹل سیمنری" میں پڑھانے کا کام لیا تھا۔

فی الحقیقت ویلزلی اپنے ذہن میں فورٹ ولیم کالج کی شکل میں ایک مشرقی یونیورسٹی کا تصور رکھتا تھا اور ۱۸۰۱ء سے ۱۸۰۵ء کے درمیان مشرق میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے کا خواب رفتہ رفتہ تکمیل کے مراحل سے گذرتا رہا۔ یہ کالج ہندوستان میں

---

[1] Two Views of British India edited by Edward Ingram, Secret and Confidential letter No. 13, P. 282, 283.

مثلاً انگلش لا، اخلاقیات، سول جو اس پروڈنس۔ قوانین اقوام کی تعلیم کیلئے ویلزلی نے MACKINTOSH شعبۂ جغرافیہ کیلئے RANNEL ۔ شعبۂ تاریخ اور ہندوستان ودکن کی قدیم تاریخ کیلئے MAURICE اور شعبۂ معاشیات کیلئے CHARLES GRANT کے نام تجویز کئے تھے۔

انگریزوں کا قائم کردہ اعلیٰ تعلیم کا واحد ادارہ تھا۔ اس نے ہندوستانیوں کو مختلف شعبوں میں کام کرنے کی دعوت دی تاکہ مشرقی اور مغربی تہذیب کے مابین تبادلہ کو تقویت پہونچے فورٹ ولیم کالج اپنی بعض خصوصیات میں کیمبرج اور آکسفورڈ کا ہم پلہ تھا چنانچہ اُسے ویلزلی کا آکسفورڈ آف دی ایسٹ (OXFORD OF THE EAST) بھی کہا گیا ہے۔

مختلف شعبوں میں ۲۴ر نومبر ۱۸۰۰ء سے جہاں لکچر کا آغاز ہوا وہیں اسوقت تک اساتذہ کے عہدوں کا بھی تعین عمل میں آچکا تھا۔

شعبۂ ہندوستانی کا اولین پروفیسر ڈاکٹر جان بورتھوک گل کرسٹ تھا۔ ان کا تقرر ۱۸ر اگست ۱۸۰۰ء کو عمل میں آیا۔ شعبۂ ہندوستانی میں بحیثیت ماتحت پروفیسر (EDWARD SCOTT WARING) ایڈورڈ اسکاٹ ویرنگ نے جون ۱۸۰۱ء سے جنوری ۱۸۰۲ء تک کام کیا۔ انسائن ولیم میک ڈوگل (ENSIGN WILLIAM MACDOUGALL) کا تقرر ماتحت پروفیسر کے عہدہ پر نومبر ۱۸۰۲ء میں ہوا تھا[1] ستمبر ۱۸۰۵ء میں انکی ناسازیٔ طبع کی بنا پر ولیم ہنٹر نے ان کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ میک ڈوگل ۱۳ر دسمبر ۱۸۰۵ء کو واپس آگئے۔ چنانچہ ولیم ہنٹر کی خدمات منقطع کر دی گئیں[2] (COPT. MOUNT) ہندوستانی

---

[1] *Annals of the College of fort William by Thomas Roebuck P. 54, 55, Appendix IV*

[2] فورٹ ولیم کالج، (ہندی) ص ۴۷، ۴۸

زبان کے پہلے ماتحت پروفیسر تھے۔ انکا تقرر ۱۸۰۳ء کو عمل میں آیا تھا۔ گل کرسٹ کے مستعفی ہوجانیکے بعد (فروری ۱۸۰۴ء) انھوں نے ہندوستانی پروفیسر کی ذمہ داریاں ار جنوری ۱۸۰۶ء تک سنبھالیں۔ اسی تاریخ سے انکو باقاعدہ پروفیسر بھی مقرر کردیا گیا۔ ۲۰ر جنوری ۱۸۰۸ء میں وہ اپنے عہدہ سے مستعفی ہوگئے۔[1] (MOUNT) کے بعد ولیم ٹیلر کو ۲۲ر فروری ۱۸۰۸ء میں پروفیسر کا عہدہ ملا۔[2] وہ جون ۱۸۰۹ء میں خرابیٔ صحت کی بنا پر آرام کرنیکی غرض سے سمندری سفر پر روانہ ہوگئے۔ ان کی جگہ پر لیفٹیننٹ لاکٹ نے ۱۵ر اگست ۱۸۰۹ء میں قائم مقام پروفیسر کا عہدہ سنبھالا۔[3] بعد میں ولیم ٹیلر لوٹ آئے۔ ۲۳ر مئی ۱۸۲۳ء میں لیفٹیننٹ کرنل ہوجانیسے انکی ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ چنانچہ گورنر جنرل باجلاس کونسل نے ولیم پرائس (WILLIAM PRICE) کو بحیثیت پروفیسر مقرر کردیا۔ ۲۰ر نومبر ۱۸۲۳ء میں انھوں نے اپنا عہدہ سنبھالا اور ۱۸۳۱ء تک وہ اس عہدہ پر فائز رہے۔[4] ۱۹ر نومبر ۱۸۱۳ء میں (CAPT. RUSSEL MARTIN) کیپٹن رسل مارٹن ماتحت پروفیسر ہوئے۔ ۲۳ر دسمبر ۱۸۱۶ء تک وہ اس عہدہ پر فائز رہے۔ اسکے بعد ناسازیٔ طبع کی بنا پر مستعفی

---

[1] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۷۷، ۸۰

[2] Annals of the College of Fort William P. 59 Appendix IV

[3] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۸۴

[4] Fort William, 26 Oct., 1831, 19 Aug., 1833, Home Misc. Vol. 19, P. 59, 61. بحوالہ فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۱۴۵

ہو کر یورپ لوٹ گئے۔[1] دسمبر ۱۸۱۶ء میں کیپٹن تھامس روبک (Capt. - Thomas Roebuck) ماتحت پروفیسر ہوئے۔[2]

شعبۂ ہندوستانی میں تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کے فرائض انجام دینے والوں کو منشی کہا جاتا تھا۔[3] ان منشیوں کی کئی قسمیں ہوتی تھیں (تفصیلات باب دوم میں ملاحظہ فرمائیے) شعبہ میں ہندوستانی کے ساتھ ساتھ بھاکھا کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ چنانچہ بھاکھا کے مشہور منشی سدل مشرا اور للو جی لال کوی کے ساتھ جن دیگر ہندی پنڈتوں یا ہندی منشیوں کا تقرر عمل میں آیا انمیں ایک سندر پنڈت ہیں۔ یہ ناگری خوش نویس تھے ـــــ ۱۸۱۱ء میں لوچن رام پنڈت کا تقرر ہوا۔[4] اندر لشور پنڈت کا تقرر ستمبر ۱۸۰۱ء میں ہوا تھا۔[5] یہ ارجون ۱۸۱۸ء میں بھی موجود تھے۔ نرسنگھ ۱۸۱۸ء سے ۱۸۲۱ء تک ملازم رہے۔ گنگا پرشاد شکلا ۱۸۲۳ء سے

---

[1] [2] Annals of the College of F. W. Appendix IV P.55

[3] صرف شعبۂ ہندوستانی کے دیسی اساتذہ کو ہی منشی نہیں کیا جاتا تھا بلکہ کالج میں دیگر مشرقی زبانوں کے شعبوں میں برسرکار دیسی اساتذہ بھی منشی ہی کہے جاتے تھے۔

[4] The Development of Hindi Prose Literature, P.42

[5] Annals of the College of F. W. Appendix III P. 50

شاردا دیوی نے اندر لشور کی وابستگی کا سن ۱۸۱۵ء سے سن ۱۸۱۹ء لکھا ہے۔

(ڈیولپمنٹ آف ہندی پروز لٹریچر ص ۴۲)

۱۸۲۶ء تک اور خیالی رام ۱۸۲۶ء سے ۱۸۲۹ء تک شعبہ سے وابستہ رہے۔ ان تمام پنڈتوں نے وقتاً فوقتاً شعبہ سے وابستہ پروفیسروں کی ماتحتی میں طلبہ کی مشق کے لئے ہندی میں کتابیں ترتیب دیں یا تالیف کیں۔ اسکے علاوہ وہ طلبہ کو امتحانات کی تیاری میں بھی مدد دیتے تھے۔[۱]

ولیم پرائس کے بعد ۱۸۳۱ء ہی سے شعبۂ ہندوستانی میں پروفیسر کا عہدہ ختم ہوگیا۔ لیکن طلبہ شعبہ سے وابستہ چند منشیوں اور پنڈتوں سے پہلے کیطرح تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس مدت میں تصنیف و تالیف کا کوئی کام سامنے نہیں آیا۔[۲]

مغلوں کے دور حکومت میں فارسی سرکاری اور عوامی دونوں سطح پر مقبول تھی۔ اسکا پڑھنا اور سمجھنا معاشرے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مغلوں کے زوال کے بعد بھی فارسی کے اثرات چشم زدن میں ختم نہیں ہوگئے۔ فورٹ ولیم کالج میں فارسی زبان وادب کا شعبہ بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اس شعبہ کے پروفیسر این۔ بی۔ ایڈمانسٹن (N. B. Edmonstone) تھے۔ ان کا تقرر اپریل ۱۸۰۱ء میں ہوا تھا۔[۳] گلیڈون اور ہارنگٹن ماتحت پروفیسر تھے۔

عربی اس دور کی دوسری اہم زبان تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ مذہبی نقطۂ نظر سے اہم تھی بلکہ اسلئے کہ مغلوں کے عہد حکومت میں قوانین کی بیشتر کتابیں عربی میں بھی تھیں اسکے علاوہ اسلامی فقہ سے مکمل واقفیت کیلئے عربی زبان یوں

۱، ۲ The Development of Hindi Prose Literature by Sharda Devi Vedalankar. P. 42, 37

۳ Annals of the College of F.W. Appendix IV P. 54

بھی ناگزیر تھی۔ فورٹ ولیم کالج میں شعبۂ عربی میں زبان اور اسلامی فقہ کی تعلیم دینے کیلئے ویلزلی نے پروفیسر کے عہدہ پر لیفٹننٹ جان بیلی (JOHN BALLIE) کا اپریل ۱۸۰۱ء میں تقرر کیا تھا۔[۱] یوں تو ان کی تنخواہ صرف ۱۶ سو روپے ہی تھی لیکن ان کے پاس عربی ترجمے کا سرکاری کام بھی تھا۔ جسکا معاوضہ تنخواہ کے علاوہ ایک ہزار دیا جاتا تھا۔[۲] ان کی ماتحتی میں کرک پیٹرک تھے۔[۳]

سنسکرت ہندوؤں کے اسلاف کی زبان تھی۔ یوں تو یہ عام بول چال سے بہت دور تھی لیکن چونکہ یہ قدیم ہندوستان کی زبان تھی۔ اور ہندوستانی تہذیب کے مطالعہ کیلئے اسکا علم ضروری تھا اسلئے کالج میں سنسکرت زبان کا شعبہ بھی قائم کیا گیا۔ سنسکرت زبان اور ہندو قانون کے پروفیسر کے عہدہ پر ہنری تھامس کوبروک کا تقرر مئی ۱۸۰۱ء میں عمل میں آیا۔

ویلزلی نے بنگالی زبان کا شعبہ بھی قائم کیا تھا۔ اس شعبہ کے پروفیسر بیپٹسٹ مشنری (Baptist-Missionary) کے سرگرم کارکن ولیم کیری (William Carey) تھے۔ انکا تقرر یکم جنوری ۱۸۰۱ء میں ہوا تھا۔[۴]

---

[۱] Annals of the College of F. W. Appendix IV P. 54

[۲] [۳] گلکرسٹ اور اسکا عہد۔ ص ۱۲۶، ۱۲۹

[۴] Annals of the College of F. W. Appendix IV P. 53, 54

انھیں بنگالی زبان پر خاصا عبور حاصل تھا. انھوں نے بنگالی زبان کی لغت، نیو ٹسٹامنٹ اور سنسکرت قواعد بنگالی میں شائع کی تھیں. کیری کی انھیں خدمات کے پیش نظر بعض لوگوں نے انھیں بجا طور پر فادر آف ماڈرن بنگالی پروز کہا ہے۔

ہندوستانی، عربی، فارسی، سنسکرت اور بنگالی کے شعبوں نے تصنیف و تالیف کے میدان میں بڑی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ ان شعبوں میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں. اسکے علاوہ قدیم کلاسکس پر مشتمل کتابوں کے تراجم کی ایک کثیر تعداد بھی سامنے آئی. ان کتابوں میں کالی داس، حافظ، فردوسی کے علاوہ بہت سے ایسے قدیم ادبا شعرا بھی تھے جن کو کالج نے پہلی بار مغرب سے روشناس کرایا۔

ہندوستان میں برطانوی مقبوضات کے لئے گورنر جنرل یا جلاس کونسل کے نافذ کردہ قوانین کی تعلیم دینے کیلئے پروفیسر جارج بارلو (G. Barlow) کا تقرر اپریل ۱۸۰۱ء میں عمل میں آیا تھا مئی ۱۸۰۱ء میں ہربرٹ بارنگٹن نے پروفیسر کا عہدہ سنبھالا۔[1]

یونانی اور لاطینی کلاسیکی ادب کے پروفیسر پادری بکھ نن (Buchanan) تھے مسٹر Poezold تامل زبان کے استاد تھے ان کا تقرر مارچ ۱۸۰۱ء میں ہوا تھا۔ James Dinwiddie اپریل ۱۸۰۱ء میں ریاضی کے استاد مقرر ہوئے. اپریل ۱۸۰۱ء میں ہی (Monsieur

---

[1] Annals of the College of F.W. Appendix IV P.53,54

ڈیوپلیسی (Duplessy) کا جدید زبانوں کے استاد کی حیثیت سے تقرر ہوا۔[1]

فورٹ ولیم کالج میں کسی بھی دیسی زبان کے پروفیسر کا عہدہ کسی مولوی یا پنڈت کو نہیں دیا گیا۔ اسے گویا انگریزوں نے اپنے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ دیسی زبان اور دیگر شعبوں کے پروفیسر حتیٰ کہ ماتحتین بھی انگریز ہی تھے لیکن ایسا نہیں کہ یہ انگریز مشرقی زبانوں سے ناواقف رہے ہوں یا معمولی استعداد رکھتے ہوں۔ تقرری کیلئے اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ جس شعبے کی سربراہی کے لئے وہ مقرر کئے جارہے ہیں اس سے وہ اچھی طرح واقف ہوں۔ ان پروفیسروں میں ایڈ مانسٹن، ہارنگٹن اور فرانسس[2] گلیڈون فارسی پر عبور رکھتے تھے۔ فرانسس گلیڈون نے فارسی ہندوستانی ڈکشنری بھی مرتب کی تھی۔ سنسکرت شعبہ کے پروفیسر کولبروک کو ذاتی طور سے بھی سنسکرت سے دلچسپی تھی۔ جان بیلی عربی کی اچھی واقفیت رکھتے ہی تھے۔ کیری نے بنگالی زبان کی ڈکشنری مرتب کی تھی۔ گل کرسٹ کی ہندوستانی زبان سے واقفیت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ شعبوں کے پروفیسروں کی تنخواہیں اس زمانے کے لحاظ سے بہت زیادہ ہوا کرتی تھیں۔ عبداللہ یوسف علی نے لکھا ہے:۔

"یوربین مضامین کی تعلیم کے لئے استادوں کی تنخواہ اچھی خاصی تھی"۔[3]

لیکن صرف یوربین ہی نہیں مشرقی علوم کے شعبوں سے متعلق انگریز پروفیسروں کی تنخواہیں

---

[1] Annals of the College of F.W. Appendix IV P. 54.

[2] فرانسس گلیڈون کا تعلق بھی شعبۂ فارسی سے تھا۔ [3] انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ص ۱۰۸۔

بھی اچھی خاصی ہی ہوا کرتی تھیں۔ عبداللہ صاحب کی بات کی وضاحت شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے کی ہے کہ انکو استاد نہیں بلکہ انگریز لکھنا چاہیئے تھا اسلئے کہ انگریز استادوں کی تنخواہیں ہی اچھی خاصی ہوا کرتی تھیں۔ ورنہ مولویوں اور پنڈتوں کا مشاہرہ تو انکے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔[1] ہیڈ منشی کو دو سو، سکنڈ منشی کو سو اور دیگر ماتحت منشیوں کو ۸۰ یا ۴۰ روپے ماہانہ مشاہرہ ملتا تھا۔ حالانکہ یہ منشی اور پنڈت، درس وتدریس کے علاوہ تصنیف وتالیف کا سارا کام انجام دیتے تھے۔

ذیل میں ان افراد کی فہرست پیش کی جاتی ہے جو سنہ ۱۸۰۰ء سے سنہ ۱۸۱۸ء تک مختلف اوقات میں کالج کونسل سے وابستہ رہے۔

(۱)	ریورنڈ ڈیوڈ براؤن (پرووسٹ[2])	اپریل سنہ ۱۸۰۱ء میں تقرر ہوا۔
(۲)	کلاڈیس بکھانن (وائس پرووسٹ)	اپریل سنہ ۱۸۰۱ء 〃 〃 〃
(۳)	عزت مآب ہنری ویلزلی	اپریل سنہ ۱۸۰۱ء 〃 〃 〃
(۴)	جارج ہلرو بارلو بارٹ	اپریل سنہ ۱۸۰۱ء 〃 〃 〃
(۵)	نیل بنجامن ایڈمانسٹن	اپریل سنہ ۱۸۰۱ء 〃 〃 〃
(۶)	جان لمسڈن	جنوری سنہ ۱۸۰۲ء 〃 〃 〃
(۷)	جان ہربرٹ ہارنگٹن	مارچ سنہ ۱۸۰۲ء 〃 〃 〃
(۸)	ہنری تھامس کولبروک	مارچ سنہ ۱۸۰۲ء 〃 〃 〃

---

[1] بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات، از شانتی رنجن بھٹاچاریہ ص ،،

[2] پرنسپل

(۹)	جان ٹومبل	جنوری ۱۸۰۷ء میں تقرر ہوا
(۱۰)	جیمس اسٹوارٹ	اگست ۱۸۱۰ء " " "
(۱۱)	رابرٹ کر	مارچ ۱۸۱۷ء " " "
(۱۲)	جان فینڈل	نومبر ۱۸۱۷ء " " "
(۱۳)	ولیم ایڈورڈ ریس	مئی ۱۸۱۸ء " " " [۱]

ان کے علاوہ لاکٹ ۱۸۰۹ء سے ۱۸۲۴ء تک مختلف اوقات میں کالج کونسل کے سکریٹری اور اکزامنر کی حیثیت سے کام کرتے رہے روبک ۱۸۱۵ء میں کالج کونسل کے سکریٹری اور نومبر ۱۸۱۱ء سے دسمبر ۱۸۱۹ء تک مختلف اوقات میں اسسٹنٹ سکریٹری اور سکنڈ اکزامنر کے فرائض انجام دیتے رہے [۲]

فورٹ ولیم کالج کا ڈسپلن اور نظم ونسق بہترین تھا۔ ماحول مکمل طور سے اکتسابی تھا جہاں طلبہ کو اپنی صلاحیتیں نکھارنے اور سنوارنے کے زیادہ امکانات اور مواقع تھے کالج کے منتظمین بذات خود طلبہ کی کارکردگی پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ کالج کے قانون کی خلاف ورزی کرنیوالے طلبہ پر جرمانے عائد کئے جاتے تھے۔ اس صورت حال نے ڈسپلن کی بے نظیر مثال پیش کی تھی۔

کالج کے قیام کے ابتدائی چار سالوں کی رپورٹ میں نہ صرف کالج کی ترقی اور کامیابی کی تعریف تھی بلکہ کالج کے بہترین نظم ونسق اور ڈسپلن کا بھی اعتراف کیا گیا تھا۔ کالج انھیں خوبیوں کے پیش نظر مغرب کے کسی بھی تعلیمی ادارے سے کم نہیں تھا۔[۳]

---

۱ و ۲ Annals of the College of F.W. Appendix IV P.52, Appendix III P. 46

۳ Gilchrist and the Language of Hindoostan P. 24

کالج میں تعلیم کی نوعیت یہ تھی کہ ہر طالب علم کو تین سال کالج میں رہنا پڑتا تھا۔ نصاب میں شامل زبانوں اور دیگر علوم کی تعلیم اور طلبار کی ترقی و صلاحیت کا جائزہ لینے کیلئے امتحانات منعقد کئے جاتے تھے۔ سال میں چار مرتبہ امتحان ہوتے تھے یعنی ایک سال چار حصوں میں منقسم ہوا کرتا تھا۔[1] پرچہ حل کرنے کیلئے دو گھنٹے کا وقت دیا جاتا تھا۔ اردو (ہندوستانی) کے پرچوں میں قواعد، ترجمہ، محاورات، ضرب الامثال کے علاوہ اشعار کا مطلب بیان کرنا شامل ہوتا تھا۔[2] کالج کونسل نے علوم کے مختلف شعبوں میں امتحانات کے اختیارات کیلئے ایک کمیٹی آف اکزامزس مقرر کر دی تھی۔ اسکے علاوہ سال میں دو مرتبہ پبلک اکزامنیشن کا انعقاد ہوتا تھا۔ طلبار کو اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کا مظاہرہ تحریری اور زبانی طور پر کرنا ہوتا تھا[3] اور اسی سے انکی لیاقت کا تعین ہوتا تھا۔ طلبار کو انعامات سے بھی نوازا جاتا تھا۔

مقامی زبانوں میں PUBLIC DISPUTATION اور DECLAMATION بھی ہوتے تھے۔ کالج کونسل اسکے منعقد ہونے کے اوقات مقرر کرتی تھی یوں بھی یہ عموماً سالانہ ہوا کرتا تھا۔ ویلزلی نے کالج کے آئین و قوانین میں درج کیا تھا کہ:۔

"سول سروس میں ترقی اس لیاقت کی لازمی بنیاد پر ہو گی جس کو کالج کے اداروں اور ضابطوں کے مطابق کھلے طور پر منظوری دی گئی ہو"۔[4]

---

[1] Wellesley's Minute اور Coll. College of F.W. in Bengal P.29

[2] بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات ص ۲۹۱

[3] The Development of Hindi Prose Literature P.38

کالج کے آئین و قوانین میں لائبریری کا قیام بھی شامل تھا۔ کالج کے ابتدائی ایام میں یہ رضا کارانہ طور پر عطا کی گئی کتابوں پر مشتمل تھی۔ یہ کتابیں طلبہ کے درس و تدریس میں معاون ثابت ہوتی تھیں۔ لائبریری پرووسٹ کے زیر نگرانی تھی۔ ۱۸۰۵ء میں کالج کونسل کے سکریٹری ولیم ہنٹر (WILLIAM HUNTER) نے اسکا انتظام سنبھال لیا تھا۔ دیسی لائبریرین میں منشی غلام حیدر کا تقرر ستمبر ۱۸۰۱ء میں موہن پرشاد ٹھاکر کا اکتوبر ۱۸۰۷ء میں اور مولوی اکرام علی کا ۱۸۱۶ء میں ہوا تھا۔[۱] بعد ازاں اس لائبریری میں ٹیپو سلطان کی لائبریری سے حاصل کردہ کتابیں بھی شامل کر دی گئی تھیں۔

کالج سیکولر ادارہ نہیں تھا بلکہ واضح طور سے اس بات کا اظہار کیا گیا تھا کہ یہ کالج عیسائی مذہب کے اصولوں اور تعلیمات پر قائم ہے۔ کالج سے وابستہ اعلیٰ افسروں اور پروفیسروں سے یہ تاکید کی جاتی تھی کہ وہ روئے زمین کے اس حصے میں عیسائی مذہب کی ترویج و ترقی کیلئے کوشاں رہیں۔ اگر غور کیا جائے تو انگریز اپنی کاوشوں میں حق بجانب تھے۔ وہ سول ملازمین کو صرف مختلف علوم کا درس ہی نہیں دیتے تھے بلکہ ان کے مذہبی عقائد بھی راسخ کرتے تھے۔ اسکے علاوہ مذہبی تبلیغ کا جذبہ بھی پیدا کرتے تھے۔ یوں صرف سیاسی نقطۂ نظر سے ہی نہیں بلکہ مذہبی نقطۂ نظر سے بھی انکی جڑیں ہندوستان میں گہرائی تک پیوست ہو جاتیں۔ کالج میں مسیحی عبادت (DIVINE SERVICE) روز

---

[۱] ANNALS OF THE COLLEGE OF FORT WILLIAM P. 51

APPENDIX III

ہوا کرتی تھی۔ کالج کے انفرادی کردار مذہبی اور اخلاقی کارکردگی کی نگرانی پر ووسٹ خود کرتا تھا۔[1]

کالج کے مقاصد میں سول ملازمین کی اخلاقی اصلاح بھی شامل تھی۔ انھیں اخلاقی اعتبار سے بلند اور نظم و ضبط کا پابند بنانا تھا۔ لیکن ڈسپلن اور کالج کے قواعد و ضوابط کی پابندی طلبہ نے چند ہی سال تک کی۔ کالج کی جملہ خصوصیات محض چند سال تک ہی قائم رہیں۔ گورنر جنرل ولیم بنٹک (WILLIAM BENTICK) کے عہد میں کالج کونسل نے چند طلبہ کو کاہلی کی بنا پر کالج سے نکال کر انہیں بنگال اور اڑیسہ کے دور دراز علاقوں میں تعینات کر دیا تھا۔ غالباً اسی صورت حال سے اچانک مستشرقین کے خلاف باغیانہ خیالات کو تحریک ملی اور طلبہ ایک دم مشتعل ہوگئے۔ کالج کے ہی ہندی اور فارسی کے عالم و فاضل طالب علم چارلس ٹریولین (CHARLES TREVELYAN) نے مستشرقین کے خلاف باقاعدہ جارحانہ رویہ اختیار کیا اور اسوقت جبکہ کلکتہ کا دانشور طبقہ بھی مشرقی زبانوں کی اہمیت کو قبول کر رہا تھا۔ انگریزی سول ملازمین نے (جن کیلئے یہ ادارہ قائم کیا گیا تھا) مشرقی زبانوں کی اہمیت سے انکار کیا۔ کچھ انگریز افسران نے ہیٹنگز اور ولیزلی کی پالیسیوں اور پروفیسروں کو تنقید اور چیلنج کا نشانہ بنا کر انکی ہجو لکھی۔[2]

۱۸۲۵ء میں جب ہالٹ میکنزی (HALT MACKENZIE) کالج کونسل کا

---

[1] EDUCATIONAL POLICY OF EAST INDIACOMPANY P. 14, 15.

[2] BRITISH ORIENTALISM AND THE BENGAL RENAISSANCE P. 222

صدر ہوا تو اس نے ممبران کے درمیان اس سوال کو اٹھایا کہ کالج جن فوائد اور مقاصد کے تحت قائم کیا گیا تھا وہ کالج سے اب بھی حاصل ہو رہا ہے یا نہیں۔ وہ واحد ممبر تھا جس نے کالج کے خاتمے پر زور دیا۔ اس نے ویلزلی کے منصوبے پر تنقید کی اور کہا کہ ہندوستان میں سول ملازمین کی تعلیم و تربیت کے لئے اسکے تجویز کردہ حل سے نہ صرف اسکے آمرانہ ذہنیت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی شدید انفرادیت پسندی بھی نمایاں ہوتی ہے۔ اسنے ہیلی بری کالج میں زبان دانی اور لسانیاتی پروگرام کی توسیع اور ترقی کی پُرزور حمایت کی۔[1]

میکنزی کے یہ خیالات جب کالج کے مربیان ہارنگٹن اور بیلی تک پہونچے تو انہوں نے اس کی مخالفت میں بیانات دیئے اور دلیلیں بھی پیش کیں۔

یکم اگست ۱۸۲۸ء میں جب ولیم بنٹنگ کلکتہ آیا تو اسوقت کالج کی خوبیوں اور خامیوں قیام اور خاتمہ پر بحث و مباحثہ چل رہا تھا۔ یہ بحث بڑی حد تک میکنزی کے عہد سے ملتی جلتی تھی۔ بنٹنگ بھی میکنزی کی طرح کالج کے خاتمے پر مصر تھا۔ مستشرقین کا خیال تھا کہ جن مقاصد کے تحت کالج قائم کیا گیا تھا اسمیں یہ سونیصدی کامیاب رہا ہے اور اس نے سول ملازمین کی تعلیم و تربیت میں بڑا مؤثر کردار ادا کیا ہے۔ اس عہد کے مستشرقین میں ہنری شیکسپیر (HENRY SHAKESPEAR) اینڈریو اسٹرلنگ (ANDREW STIRLING) اور ولیم ایچ میکناٹن (WILLIAM H. MACNAUGHTEN) نے پرزور الفاظ میں کالج کے قائم رکھنے کی حمایت کی۔[2]

ا۔۲۔ British Orientalism and the Bengal Renaissance
P. 226, 227 _ 229,

مستشرقین فروری ۱۸۳۰ء تک تو کالج کو بنٹک کے عتاب سے بچاتے رہے۔

لیکن مارچ ۱۸۳۰ء میں کالج کے سکریٹری مسٹر روڈل (RUDDELL) کو علم ہوا کہ بنٹک نے کالج کے مکمل طور سے خاتمے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے۔

ہندی کے پروفیسر کیپٹن پرائس نے ۲۲ر مارچ ۱۸۳۰ء میں بنٹک کے اس فیصلہ کے خلاف اور کالج کی حمایت میں آخری بار لکھا کہ کالج کے شعبوں کو نہ توڑا جائے اور نہ لکچرس کا سلسلہ ختم کیا جائے۔ انھوں نے پیشین گوئی کی کہ نیا تعلیمی نظام طلبہ کی لیاقت میں اضافہ کرنے کی بجائے اس میں کمی پیدا کریگا۔[۱]

بنٹک نے جو نیا تعلیمی منصوبہ بنایا تھا اسکو ۴ر مئی ۱۸۳۰ء کو سرکاری طور سے منظوری مل گئی۔ اس کی تجویز یہ تھی کہ یورپین پروفیسروں، مقامی پنڈتوں اور منشیوں کو انکی خدمات سے علیحدہ کر دیا جائے گا۔ طلبہ کو لکچرس دینے کا سلسلہ منقطع کر دیا جائے گا۔ ہر شعبے سے متعلق اساتذہ کو پنشن دیدی جائے گی۔ نیا تعلیمی نظام ایک بورڈ آف اکزامنرس پر مشتمل ہوگا۔ اسکے علاوہ ملکی معلموں کا ایک بہت رواں عملہ ہوگا جنھیں طلبہ اپنی ذاتی سہولت کے مطابق ہدایت کے لئے اجرت پر رکھ لیں گے۔[۲]

یکم مارچ ۱۸۳۱ء کو بنٹک نے ایک جانب تو کالج کونسل کو برخاست کیا دوسری طرف کالج کی لائبریری کا شیرازہ بکھیر کر رکھدیا اور ساری کتابیں ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کو منتقل کر دیں۔ یہاں تک کہ ۱۸۳۲ء میں جب نیا تعلیمی سلسلہ شروع ہوا تو بورڈ آف

[۱،۲] British Orientalism and the Bengal Renaissance

P. 232, 233.

اکزامزس کو نصابی کتابوں کی سخت ضرورت کے تحت دوبارہ کتابیں خریدنی پڑیں۔ بنٹنک نے ۱۸۳۵ء میں کالج کے تابوت میں آخری کیل یوں ٹھونکی کہ رائٹرس بلڈنگ کے دروازے طلبہ پر بند کر دیئے گئے۔ اور انکو یہ اجازت دیدی گئی کہ وہ جہاں دل چاہے وہاں رہیں۔ ورنہ اس سے قبل سول ملازمین کے لئے یہ ضروری تھا کہ جب تک وہ امتحان پاس نہ کرلیں رائٹرس بلڈنگ میں قیام کریں۔

۱۸۴۱ء میں فورٹ ولیم کالج کے قدیم طالب علم میجر جارج، ٹی، مارشل بنٹنک کے نو قائم شدہ کالج کے سکریٹری مقرر ہوئے تو انہوں نے کالج کی بازیافت کیلئے کوششیں شروع کیں۔ ۱۸۴۳ء میں صورت حال کافی امید افزا ہو چلی تھی لیکن سرمایہ کی کمی اور سرکاری طور سے کالج کی تجدید کی اجازت کے بغیر مارشل موجودہ صورت حال میں کوئی انقلاب نہ لا سکا۔

جب لارڈ ڈلہوزی (DALHOUSIE) گورنر جنرل ہوا تو اکتوبر ۱۸۵۳ء میں اسنے کالج کی موجودہ ہیئت پر تفتیش کر کے اپنی رپورٹ مرتب کی جسمیں لکھا تھا کہ اسنے نہ تو کوئی کالج پایا، نہ اس کی عمارت، نہ کمرے، نہ پروفیسرس اور نہ لکچررس، اس نے چند منشیوں کو پایا جنکو گورنمنٹ تنخواہ تو دیتی ہے لیکن انکو ملازم نہیں کہا جا سکتا۔[۱]

اس کے تین مہینے بعد یعنی ۲۴ رجنوری ۱۸۵۴ء کو گورنر جنرل نے اسوقت تک کالج کی جو بھی شکل رہ گئی تھی اسکے خاتمے کیلئے سرکاری طور سے حکم جاری کر دیا اور یوں اس کالج کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا۔[۲]

---

[۱] [۲] GPG—G-I-C, XIII (Oct. 11, 1853), 101, (Jan. 24, 1854) P. 113
بحوالہ British Orientalism P. 235

باب دوم

فورٹ ولیم کالج کے مُصنّفِین

۱۰ر جولائی ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد گورنر جنرل لارڈ ویلزلی نے اشتہارات کے ذریعے ہندوستانی ادیبوں کو کالج میں ملازمت کی دعوت دی۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کے ریزیڈنٹ کرنل اسکاٹ کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ صاحبان علم و ہنر کو ملازم مقرر کر کے کلکتہ روانہ کریں۔ کرنل اسکاٹ خود بھی اس کام میں دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی کوششوں سے کتنے ہی لوگوں کو کالج میں ملازمت دے کر کلکتے بھیجا۔ کاظم علی جوان "سکنتلا ناٹک" کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

"کرنل اسکاٹ صاحب جو لکھنؤ کے بڑے صاحب ہیں انہوں نے حسب الطلب گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ کے سن اٹھارہ سو عیسوی میں کتنے شاعروں کو سرکار عالی کے ملازموں میں سرفراز فرما کر اشرف البلاد کلکتے کو روانہ کیا۔"[1]

لیکن فورٹ ولیم کالج کی نثر اور نثر نگاروں کے سیاق و سباق میں یہ بات بڑی اہم ہے کہ جن لوگوں نے کالج میں ملازمت اختیار کی ان میں سے بیشتر اس عہد کے ادب اور شاعری میں گمنام تھے اور اس وقت تک انکی کوئی ادبی حیثیت نہیں تھی۔ اردو نثر تو یوں بھی قابل اعتنا تھی۔ فارسی کا دور دورہ تھا۔ اس کے علاوہ عوام و خواص کے نزدیک انگریزوں کی ملازمت

---

[1] دیباچہ سکنتلا ناٹک (ق ن) کاظم علی جواں ورق ۲

کو گری ہوئی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ جن ادیبوں نے کالج میں ملازمت اختیار کی وہ غم دوراں کے مارے اور تباہ حال لوگ تھے۔ انمیں سے بیشتر شاعر بھی تھے لیکن شاعری میں انکے مقام کا اندازہ اسی سے ہو جاتا ہے کہ اس عہد کے اکثر تذکرے انکے ذکر سے خالی ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کے کچھ مصنفین "صاحبان عالی شان" کے خیر خواہوں کی تحریک پر کالج میں ملازم ہوئے اور کچھ نے اپنی معاشی مجبوریوں اور تنگ دستیوں سے عاجز آکر کالج کی ملازمت اختیار کی۔ ان مصنفین کو کالج کی زبان میں منشی کہا جاتا تھا۔

ان منشیوں کی کئی قسمیں تھیں۔ اول میر منشی اسکے بعد سکنڈ منشی اور بقیہ ماتحت منشی ہوتے تھے۔ ماتحت منشیوں کو مقابلے کا امتحان دینا ہوتا تھا۔ کامیاب ہونے کے بعد انکو ضرورت کے مطابق ملازم رکھ لیا جاتا تھا۔ میر منشی کا مشاہرہ عموماً دو سو روپیہ سیکنڈ منشی کا مشاہرہ سو روپیہ اور ماتحت منشی عموماً چالیس روپے ماہوار پاتے تھے۔ بعض ماتحت منشیوں کو کام کی نوعیت کے اعتبار سے اسّی روپے ماہوار بھی ملتے تھے۔

یہ منشی تصنیف و تالیف اور ترجمہ و تصحیح کے علاوہ درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ ۴ رمئی ۱۸۰۱ء کی کالج کونسل کی کارروائی سے ان منشیوں کے فرائض کا علم ہوتا ہے:۔

> "طے پایا کہ فارسی و ہندوستانی زبانوں کے چیف (میر) اور سیکنڈ منشی بنگالی و سنسکرت زبانوں کے چیف و سیکنڈ پنڈت اور عربی کے چیف و سیکنڈ مولوی اتوار کے علاوہ باقی اور تمام دنوں میں خواہ تعطیل کا زمانہ ہو یا تعلیم کا۔ پبلک لکچر روم میں روزانہ تین گھنٹے کے لئے یعنی دس بجے سے ایک بجے تک حاضر رہا کریں گے تاکہ ان

اوقات میں طالب علموں کو اپنی پڑھائی کے سلسلے میں انسے استفادہ
کرنے کے مواقع حاصل رہیں۔ کام کے مقررہ اوقات میں عدم حاضری
کی اجازت دینے کا اختیار صرف پرووسٹ کو ہوگا۔" لہ

ان کے علاوہ منشیوں کا ایک اور حلقہ بھی تھا جنھیں سندی یا سرٹی فیکیٹ منشی
کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ ماتحت منشی سے کم تر درجے کے ہوتے تھے انکو بھی تقرری سے قبل
امتحان دینا ہوتا تھا۔ کامیاب ہو نیکے بعد سند دیجاتی تھی۔ اور تیس روپے ماہانہ مشاہرہ
پر انکو ملازم رکھ لیا جاتا تھا۔ جو سندی منشی کالج کے باضابطہ ملازم نہیں ہوتے تھے۔
وہ طالب علموں کو کالج سے باہر تعلیم دیا کرتے تھے اور ضرورت کے مطابق ان کو معاوضہ
دیکر کام لیا جاتا تھا۔ شعبۂ ہندوستانی کے باضابطہ ملازم پروفیسروں اور منشیوں کیلئے
کالج کے باہر کے طلبہ کو تعلیم دینا منع تھا۔

زیرِ نظر باب میں شعبۂ ہندوستانی کے صرف انہیں منشیوں کے سوانحی حالات
تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں جو فورٹ ولیم کالج کے باضابطہ ملازم تھے اور ان مصنفین
کے سوانحی حالات بیان کرنے میں اجمال سے کام لیا گیا ہے جو باضابطہ ملازم نہیں تھے
لیکن شعبۂ ہندوستانی کیلئے انہوں نے کتابیں تصنیف و تالیف کی تھیں۔ شیخ حفیظ الدین
شعبۂ فارسی سے وابستہ تھے انھوں نے گل کرسٹ کی فرمائش پر "عیار دانش" کا ترجمہ
"خرد افروز" کے نام سے کیا تھا۔ اس لئے انکے حالات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ولیم ہنٹر، ولیم ٹیلر
ولیم پرائس اور تھامس روبک نہ صرف شعبۂ ہندوستانی سے منسلک تھے بلکہ چند کتابوں
کے مرتب بھی تھے۔ اسلئے مختصراً انکا ذکر بھی شامل کیا گیا ہے۔

لہ Proceedings of the College of Fort William Vol. 559, P. 6

۱

ڈاکٹر جان بورتھوک گل کرسٹ

ڈاکٹر جان بورتھوک گل کرسٹ (JOHN BORTHWICK GILCHRIST)
کی پیدائش ۱۷۵۹ء میں اسکاٹ لینڈ کے شہر اڈنبرا میں ہوئی تھی۔[1] انکی ابتدائی تعلیم اڈنبرا
ہی میں ہوئی جس کے بعد انہوں نے مقامی جارج ہیرٹس اسپتال (G. HERRIOT.S
HOSPITAL) سے طب کی تعلیم حاصل کی۔[2]

گل کرسٹ فطری طور پر مہم جو اور رومانی طبیعت کے حامل تھے۔ طب کی تعلیم کے
حصول کے بعد انہوں نے طبی خدمات کی انجام دہی کی بجائے ویسٹ انڈیز میں نیل کی

---

[1] تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ (حصہ نثر) ص ۵، ارباب نثر اردو۔ سید محمد، ص ۱۹، فورٹ ولیم کالج
اور اکرام علی۔ نادم سیتاپوری ص ۲۲۵، گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۶۳، قواعد زبان اردو مشہور بہ رسالہ
گل کرسٹ۔ مرتبہ و مقدمہ خلیل الرحمن داؤدی ص ۱۲
Gilchrist and the Language of Hindoostan P. 34
The Development of Hindi Prose Literature P. 29 (F.N.)

[2] Gilchrist and the Language of Hindoostan, P. 34
The Development of Hindi Prose Literature P. 29 (F. N.)
ارباب نثر اردو ص ۱۹، فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۲۲۵، گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۶۳، مقدمہ
قواعد زبان اردو مشہور بہ رسالہ گل کرسٹ ص ۱۲

کاشتکاری شروع کردی لیکن انکی افتادِ طبع نے یہاں بھی انہیں چین نہیں لینے دیا۔ اور چند ہی سالوں بعد انہوں نے نیل کی کاشتکاری ترک کردی اور وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہوکر ہندوستان چلے آئے۔

گل کرسٹ ۱۷۸۲ء میں بمبئی کے ساحل پر اترے۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہوکر ہندوستان آئے تھے۔ اسکا اشارہ انکی مندرجہ ذیل تحریر میں ملتا ہے۔ وہ لغت و قواعد کے ضمیمہ کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"۱۷۸۲ء میں بمبئی میں وارد ہوتے ہی میں نے محسوس کرلیا تھا کہ یہاں پر میرا قیام خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو، وہ میرے لئے ناخوشگوار اور میرے مالک (ملازمت دینے والا) کے لئے غیر سودمند ثابت ہوگا جب تک کہ مجھے اس ملک کی موجودہ زبان سے پوری طرح واقفیت نہ ہو، جہاں مجھے کچھ دنوں کیلئے قیام کرنا ہے"۔ [1]

مندرجہ بالا بیان میں لفظ EMPLOYER (ملازمت دینے والا) ظاہر کرتا ہے کہ گل کرسٹ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں داخل ہوکر ہندوستان آئے تھے۔ لیکن "یہاں پر میرا قیام خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو" سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسوقت تک انہیں خود بھی اپنے فرائض کا علم نہیں تھا۔ ان کے عہدے کا تعین بعد میں کیا گیا۔ عتیق صدیقی نے بحیثیت اسسٹنٹ سرجن (بمبئی ڈیپارٹمنٹ میں) گل کرسٹ کا تقرر وسط اکتوبر اور نومبر ۱۷۸۲ء کے درمیان ثابت کیا ہے۔ [2]

---

[1] Appendix Gilchrist P. VI

[2] گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۶۵

ہندوستان آنے کے فوراً بعد ہی گل کرسٹ نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ یہاں کی مقامی زبان (MOORS) سے واقفیت ناگزیر ہے۔ ورنہ وہ نہ تو یہاں کی زندگی سے لطف اندوز ہو سکیں گے، نہ یہاں کی طرزِ معاشرت سے واقف ہو سکیں گے، اور نہ ہی مقامی باشندوں کے قریب آ سکیں گے۔ اس کے علاوہ برٹش حکومت کے استحکام میں بھی وہ اپنی ذات سے معاون نہیں ہو سکتے۔ اس خیال کے ساتھ ہی انہوں نے ہندوستانی[1] سیکھنے کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ اس راہ میں انہیں سودا کے کلیات سے بہت مدد ملی۔ اسی دور میں انہوں نے ہندوستانی زبان کی لغت اور قواعد مرتب کرنے کا بھی ارادہ کیا۔[2] اسلئے کہ ہندوستانی زبان کی تحصیل کے زمانے میں انہیں قواعد سے متعلق کوئی معاون کتاب دستیاب نہ ہو سکی تھی۔ چنانچہ انہیں ہندوستانی زبان کے تمام قوانین خود ہی دریافت کرنے پڑے۔

اس دوران گل کرسٹ کی ڈی ٹیچ منٹ کا تبادلہ سورت سے فتح گڑھ ہو گیا۔ یکم نومبر ۱۷۸۳ء کو انکی پلٹن نے کوچ کیا۔[3] اس سفر کے دوران انہیں ہندوستانی زبان کی افادیت اور وسعت کا مزید اندازہ ہوا۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ کمپنی کے سیاسی اور مالی فائدے کا انحصار ہندوستانی زبان سے واقفیت ہی میں مضمر ہے۔[4] گل کرسٹ نے

---

[1] ہندوستانی سے مراد اردو یا عام بول چال کی زبان ہے۔

[2] Appendix Gilchrist P. VI, VII

[3] Gilchrist and the Language of Hindoostan P. 38

[4] Appendix Gilchrist P. VII

فتح گڑھ کے قیام کے دوران ہندوستانی زبان سے اچھی خاصی واقفیت حاصل کر لی تھی۔ اسکے
علاوہ قواعد و لغت مرتب کرنیکے لئے بھی انہوں نے ضروری معلومات حاصل کر لی تھیں۔
اس سلسلے میں ترتیب و تدوین کے لئے انہوں نے ۱۲ رجنوری ۱۷۸۵ء کو گورنر جنرل
وارن ہیسٹنگز کو فتح گڑھ سے درخواست دی کہ وہ انہیں بارہ مہینوں کی رخصت دے۔ بس
اور اس مدت میں انکو تنخواہ اور بھتہ ملتا رہے تاکہ وہ سہولت اور فراغت سے اس مفید
کام کو انجام دے سکیں۔[1] گل کرسٹ کے ہم پیشہ دوست ڈاکٹر فرانسس بالفور کے
خط سے علم ہوتا ہے کہ انکی یہ درخواست منظور کر لی گئی تھی۔[2]

قواعد و لغت کی ترتیب کے سلسلے میں گل کرسٹ نے اپریل ۱۷۸۵ء میں فتح گڑھ
کا قیام ترک کیا اور فیض آباد آئے۔[3] یہاں آکر انہوں نے مشرقی طور و طریقوں کو اپنایا۔
فیض آباد کے قیام کے دوران انہیں معلوم ہوا کہ کرک پٹرک[4] (KIRK PATRICK) نام کے

---

[1] گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۶۹، ۷۰۔

[3] Appendix Gilchrist P. VII

ستمبر ۱۷۸۵ء میں تحریر شدہ فرانسس بالفور کے خط سے علم ہوتا ہے کہ قواعد اور لغت کیلئے مواد یکجا کرنے کے سلسلے
میں گل کرسٹ نے فیض آباد کے علاوہ لکھنؤ، الہ آباد، جون پور اور دیگر علمی مرکزوں کا سفر کیا تھا لیکن گل کرسٹ
نے صرف فیض آباد کا ذکر کیا ہے۔

(O.C. Home Public. Sept. 23, 1785, No. 15 A

بحوالہ گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۷۱)

[4] کرک پٹرک ان دنوں کمانڈر انچیف کے پرائیوٹ سکریٹری اور فارسی کے ترجمان تھے۔

شخص بھی ہندوستانی زبان کی لغت و قواعد مرتب کر رہے ہیں۔ اور انکا یہ کام کچھ طبع ہو چکا ہے کچھ طباعت کے مراحل سے دو چار ہے۔ اس خبر نے گل کرسٹ کے اوسان خطا کر دیئے اور انہیں شدید صدمہ پہونچا۔ یہاں تک کہ انہیں یہ خوف لاحق ہوا کہ یہاں وہ غیروں کے درمیان مرجائیں گے۔ چنانچہ وہ شدید بیماری کے عالم میں فیض آباد سے بنارس کی جانب روانہ ہوئے۔ جہاں انکے دوست ڈاکٹر جان پیٹر وئیڈ (JOHN PETER WADE) موجود تھے۔ بنارس پہونچ کر انکی حالت سنبھل گئی اور وہ پھر اپنے کام میں منہمک ہو گئے۔[۱]

۱۷۸۵ء کے اواخر میں گل کرسٹ نے کرک پیٹ رک کے کام کی نوعیت سے واقفیت حاصل کرنے اور اپنی لغت کی طباعت کیلئے بنارس سے کلکتہ کا سفر کیا۔[۲] یہاں گل کرسٹ نے انگریزی ہندوستانی لغت کی ترتیب کا کام مکمل کیا۔ اس سلسلے کی پہلی جلد ۱۷۸۶ء میں کلکتہ سے پہلی بار شائع ہوئی اسکا دوسرا حصہ ۱۷۹۰ء میں شائع ہوا۔[۳] گل کرسٹ نے ۴؍جون ۱۷۸۷ء کو گورنر جنرل کے نام ایک خط میں لکھا کہ انہیں بنارس زمینداری یا صوبہ اودھ میں سکونت اختیار کرنیکی اجازت دیجائے تاکہ وہ اپنے علمی و لسانی کام کو بخوبی انجام دے سکیں۔ اسکے علاوہ کتابت وطباعت کے مصارف کیلئے گل کرسٹ نے نیل کی کاشتکاری کی اجازت چاہی تھی۔[۴] انکی اس درخواست پر

---

[۱] [۲] Appendix Gilchrist P. VIII

[۳] سرورق انگریزی ہندوستانی لغت مشمولہ گل کرسٹ اور اسکا عہد۔

[۴] بحوالہ گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۷۷، ۷۸ O.C. Home Public, June 4, 1787, No. 10.

گورنر جنرل با جلاس کونسل نے ۱۴ رجون ۱۷۸۶ء کو ہی بنارس زمینداری میں قیام اور نیل کی کاشتکاری کی اجازت دیدی تھی۔ لیکن گل کرسٹ نے غازی پور کو قیام و کاشت کیلئے منتخب کیا۔

گل کرسٹ ۱۷۸۶ء سے ۱۷۹۴ء تک غازی پور میں رہے۔ یہاں انہوں نے مسٹر چارٹر کی شراکت میں نیل کی کاشت شروع کی[1] اسکے ساتھ ہی قواعد کی ترتیب کا کام بھی کرتے رہے۔ لیکن غازی پور کا کاروبار انہیں اور انکے شریک کار کو راس نہ آیا۔ صحت کی ناسازی نے ان دونوں کو غازی پور کا قیام ترک کر کے کلکتہ جانے پر مجبور کر دیا۔ ۱۷۹۵ء کے آغاز میں یہ لوگ کلکتہ روانہ ہو گئے۔[2] کلکتہ سے ہی ۱۷۹۶ء میں "ہندوستانی زبان کی قواعد" شائع ہوئی۔

راقم السطور کی نظر سے ہندوستانی قواعد کا جو نسخہ کلکتہ کی نیشنل لائبریری میں گزرا اسمیں یہ اورینٹل لنگوسٹ (ORIENTAL LINGUIST) کے ساتھ شامل ہے۔ اورنیٹل لنگوسٹ پر سنہ اشاعت ۱۷۹۸ء اور قواعد پر ۱۷۹۶ء درج ہے۔ ہندوستانی قواعد دس ابواب پر مشتمل ہے۔ چھ ابواب تک ہر باب کے مختلف حصے کئے گئے ہیں۔ گل کرسٹ نے اس کتاب میں قواعد کی تمام اقسام، رموز و نکات اور مبادیات پر روشنی ڈالی ہے۔ مثالوں TABLES اور تبصروں سے اپنی بات کو اچھی طرح واضح کرنیکی کوشش کی ہے۔ گل کرسٹ نے مثالیں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں دی ہیں اور تلفظ کے لئے رومن رسم الخط کا بھی استعمال کیا ہے اسکے علاوہ عبداللہ مسکین کے "مرثیہ مسلم" کو بھی انھوں نے بطور مثال فارسی رسم الخط میں نقل کیا ہے اور نو آموز انکے لئے انکے اچھ

---

[1] انکے پاس شکر اور افیون کا ٹھیکہ بھی تھا۔ [2] گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۸۷، ۸۸۔

مفید قرار دیا ہے۔ ہندوستانی قواعد میں عربی مہینوں کے نام بھی شامل ہیں۔ مذکورہ نسخہ میں (قواعد کے) درمیان سے ۲۰ اوراق غائب ہیں۔

۱۷۹۸ء میں گل کرسٹ کے دو کارنامے سامنے آئے۔ اول لغت اور قواعد کا ضمیمہ (APPENDIX) اور دوم مشرقی زبان دان (ORIENTAL LINGUIST) ضمیمہ میں گل کرسٹ نے اپنے قیام ہندوستان کی روداد بیان کی ہے۔ یہ روداد گل کرسٹ کے سوانحی حالات کے جویاؤں کے لئے بیحد مفید اور معلومات افزا ہے۔ اسی ضمیمہ میں ہندوستانی اور انگریزی لغت کا پہلا حصہ شامل ہے۔

اورنیٹل لنگوسٹ میں انگریزی اور ہندوستانی ؛ ہندوستانی اور انگریزی فرہنگ (VOCABULARY) کے علاوہ "ہندوستانی ٹیلز" (HINDOOSTANI TALES) کے عنوان سے رومن اور انگریزی میں ہندوستانی کہانیاں درج ہیں۔ "HINDOOSTANI ODES" کے ذیل میں میر درد اور سودا کی غزلیں ہیں۔ انکا انگریزی میں ترجمہ بھی ہے۔ اسکے علاوہ گل کرسٹ نے غزلوں کو گانیکے لئے موسیقی کا اسکیل بھی پیش کیا ہے۔

۱۷۹۸ء میں جب گورنر جنرل ویلزلی کلکتہ آیا تو اسنے گل کرسٹ کے کارناموں پر پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اسوقت بنگال کے سول ملازمین کو تیس روپے زائد ملتے تھے جس سے وہ ایک منشی سے مقامی زبانوں خاص طور سے فارسی کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ذریعۂ تعلیم مقامی زبان یا فارسی ہی ہوا کرتی تھی۔ منشی عام طور سے انگریزی زبان سے ناواقف ہوتے تھے۔ اسطرح تعلیم حاصل کرنیکے لئے سول ملازمین کا مقامی یا فارسی زبان سے واقف ہونا یا منشیوں کا انگریزی سے واقف ہو نا ضروری ہوجاتا تھا۔ ان دونوں صورتوں کے فقدان سے درس و تدریس کا کام صحیح طور سے نہ ہو پاتا تھا۔ ویلزلی نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اسوقت

گل کرسٹ نے ویلزلی کے سامنے سول ملازمین کے لئے منشیوں سے تعلیم حاصل کرنے سے قبل ہندوستانی زبان سکھانے کے ساتھ ساتھ فارسی کی ابتدائی قواعد سکھانے کی تجویز پیش کی۔ ویلزلی کو یہ تجویز پسند آئی۔ چنانچہ یکم جنوری ۱۷۹۹ء میں "اورینٹل سیمنری" کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن استاد کی حیثیت سے گل کرسٹ کا تقرر ۲۵ دسمبر ۱۷۹۸ء میں ہی ہو چکا تھا۔ درس و تدریس کا باقاعدہ آغاز فروری ۱۷۹۹ء میں ہوا[1] اور نومبر ۱۸۰۰ء سے یہ تدریسی سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔[2]

"اورینٹل سیمنری" کے بعد گل کرسٹ کی خدمات فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی سے وابستہ ہو گئیں۔ شعبۂ ہندوستانی میں بحیثیت پروفیسر اور ہیڈ (صدر) گل کرسٹ کے تقرر کی تاریخ شاردا دیوی ویدالنکار نے یکم نومبر ۱۸۰۰ء بتائی ہے۔[3] تھامس رُبک نے اپریل ۱۸۰۱ء درج کیا ہے[4] کلکتہ گزٹ ۲۹ ستمبر ۱۸۰۱ء کے شمارے سے علم ہوتا ہے کہ اس وقت تک گل کرسٹ کا تقرر عمل میں آچکا تھا۔[5] ۱۸ اگست ۱۸۰۰ء کے ایک سرکاری اعلان سے علم ہوتا ہے کہ گل کرسٹ کا تقرر اسی تاریخ کو عمل میں آیا تھا۔[6] انکا

---

[1] فورٹ ولیم کالج (ہندی) لکشمی ساگر وارشنے ص ۶، ۸۰

[2] The Development of Hindi Prose Literature P. 32

[3] " " P. 41

[4] Annals of the College of F.W. Appendix IV P. 53

[5] گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۱۲۹

[6] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۱۸

ماہانہ مشاہرہ پندرہ سو روپے تھا۔

گل کرسٹ کے عہدے کے متعلق ایک عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ ڈ کالج کے پرنسپل یا اعلیٰ افسر تھے۔ رام بابو سکسینہ نے لکھا ہے :۔

"ڈاکٹر موصوف اسوقت فورٹ ولیم کالج کے اعلیٰ افسر تھے۔"[1]

ڈاکٹر سید اعجاز حسین کا کہنا ہے کہ :۔

"اس کالج کے منتظم اعلیٰ ڈاکٹر جان گل کرائسٹ تھے۔"[2]

نادم سیتاپوری لکھتے ہیں :۔

"ظاہر ہے اس کالج کے لئے جان گل کرائسٹ سے زیادہ موزوں و مناسب کوئی دوسرا آدمی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ انہیں کا تقرر بحیثیت پرنسپل کیا گیا۔"[3]

امیر اللہ شاہین کا کہنا ہے کہ :۔

"ڈاکٹر جان گل کرسٹ جو ابتدا ر سے ہی اردو کے حامی اور حمایتی تھے۔ انکی کوششوں کا صلہ انہیں اسطرح ملا کہ کالج کے قیام پر انہیں کو کالج کا پہلا پرنسپل مقرر کیا گیا۔"[4]

---

[1] تاریخ ادب اردو ص ۳۱

[2] مختصر تاریخ اردو ص ۲۶۸، ۲۶۹

[3] فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۲۳۷

[4] اردو اسالیب نثر۔ تاریخ و تجزیہ (گیارہویں صدی سے بیسویں صدی تک) ص ۸۷

تاریخ ادب اردو کی ان چھوٹی بڑی کتابوں سے قطع نظر اس غلط فہمی سے انسائیکلو پیڈیا برٹینکا کیسلس انسائیکلو پیڈیا آف لٹریچر جیسی مستند کتابیں بھی بری نہیں ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینکا میں درج ہے کہ:۔

"۱۹ ویں صدی کے آغاز میں ڈاکٹر جان گل کرسٹ "فورٹ ولیم کالج" کے صدر (ہیڈ) تھے"۔ [۱]

انسائیکلو پیڈیا آف لٹریچر میں جہاں فورٹ ولیم کالج کا ذکر ہے وہاں لکھا ہے:۔

"اولین پرنسپل جان گل کرسٹ کو اردو نثر کا بانی کہا گیا"۔ [۲]

ڈاکٹر ہردیو بہری لکھتے ہیں کہ:۔

"The Fort William College was founded in 1800 by Lord Wellesley under the principalship of John Gilchrist." [۳]

باب اول میں یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ پرنسپل کے عہدہ کے لئے لازمی شرط یہ تھی کہ پرنسپل وہی شخص ہوگا جو انگلستان کے کلیسا کا کلرجی مین ہو۔ اسلئے ظاہر ہے کہ گل کرسٹ پرنسپل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

گل کرسٹ نے ۱۸۰۰ء میں جو تخلیقی کارنامہ انجام دیا اسکا نام "ہندوستانی زبان پر

۱۔ Encyclopaedia Britannica Vol. XI P. 575

۲۔ Cassel's Encyclopaedia of Literature Vol. I P. 295

۳۔ The Persian Influence on Hindee P. 14,

مختصر مقدمہ" (THE ANTI JARGONIST) ہے۔ اس کے علاوہ وہ

"Hindee Exercises" 1801, "A New Theory and Prospectus of Persian Verbs" 1801, "The Stranger's East India Guide to the Hindoostanee Or Grand Popular Language of India" 1802, "The Hindee Manual" 1802, "Practical Outlines Or a Sketch of Hindoostanee Orthoepy in the Roman Character" 1802, "The Hindee Story Teller" 1802, "Tables and Principles"[1] 1802, "The Hindee Moral Preceptor" 1803, "Oriental Fabulist" 1803, "The Hindee Roman Orthoepigraphical Ultimatum" 1804,

اور

"Hindee Arabic Mirror" 1804

کے مصنف و مؤلف تھے۔

---

[1] Tables and Principles کو گل کرسٹ نے ۱۶ جون ۱۸۰۲ء کو کالج کونسل کے پاس اشاعت کی اجازت حاصل کرنے کیلئے بھیجا تھا لیکن ۱۴ جون کی کاروائی میں اسے واپس کردیا گیا اور گل کرسٹ کو شائع کرنیکے حق سے محروم رکھا (فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۵۲، ۵۳)

گل کرسٹ کل چار سال شعبۂ ہندوستانی سے وابستہ رہے۔ ہندوستانی زبان کی ترویج و اشاعت کا جو خاکہ انکے ذہن میں تھا اسکے لئے کالج کونسل نے انکی قطعی ہمت افزائی نہیں کی۔ کالج کونسل کی سرد مہری اور حوصلہ شکنی سے عاجز آکر انہوں نے ۱۸۰۴ء میں قطعی طور سے یورپ لوٹ جانیکا فیصلہ کرلیا۔ انکی صحت بھی سالوں سے خراب تھی۔ چنانچہ اسی کو بنیاد بنا کر ۲۳ فروری ۱۸۰۴ء کو انہوں نے کالج کونسل کو خط لکھ کر یورپ کیلئے اپنی روانگی سے مطلع کیا۔ اور استعفیٰ قبول کرنیکی درخواست کی۔ ۲۶ فروری ۱۸۰۴ء کی کالج کونسل کی کاروائی میں انکا استعفیٰ منظور کرلیا گیا[1] گل کرسٹ کے بعد CAPT: MOUNT نے ہندوستانی پروفیسر کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔[2]

گل کرسٹ کی صدارت میں ہی ہندوستانی شعبے نے تصنیف اور تالیف کے میدان میں ایسے کارنامے انجام دیئے جو ہمارے لئے باعث افتخار ہیں۔ انہوں نے فاضل منشیوں اور پنڈتوں کو ملازم رکھ کر ان سے نہ صرف درس و تدریس کا کام لیا۔ بلکہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی بروئے کار لائے۔ چنانچہ آج جب ہم سادہ و سلیس نثری ادب پر گفتگو کرتے ہیں تو ان تصانیف و تالیفات کو بنیاد بناتے ہیں جو گل کرسٹ کی

---

[1] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۶۲، ۶۳

[2] ڈیوڈ کوف نے لکھا ہے کہ جب گل کرسٹ ہندوستان سے رخصت ہوئے تو انکی جگہ ولیم ہنٹر نے لی۔ ہنٹر کی ماتحتی میں جان لیڈن (JOHN LEYDEN) نے کام کیا۔

(British Orientalism P. 84, 85)

حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے۔

سعیٔ بے پایاں کی مرہون منت ہیں۔

انگلستان لوٹ آنیکے بعد گل کرسٹ نے وہاں بھی ہندوستانی زبان پر تحریر و تقریر اور ترتیب و تدوین کا کام جاری رکھا۔ کچھ دن انہوں نے اڈنبرا میں گزارے۔ جہاں اڈنبرا یونیورسٹی نے ۱۳؍ اکتوبر ۱۸۰۴ء میں انہیں ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ اس کے بعد وہ پھر لندن آئے اور ۶؍ جنوری ۱۸۰۹ء میں کمپنی کی ملازمت سے ریٹائر ہوگئے[۱] اور دیگر علمی و سیاسی مشاغل میں وقت گزارتے رہے۔ انکی ایک کتاب THE BRITISH INDIAN MONITOR اڈنبرا سے شائع ہوئی۔ اسمیں ORIENTAL اور ANTI-JARGONIST LINGUIST کے علاوہ اور بہت سی دوسری کتابوں کے اجزاء شامل تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی زبان کے بارے میں معلومات درج تھیں۔ اس کی پہلی جلد ۱۸۰۶ء[۲] میں اور دوسری ۱۸۰۸ء میں شائع ہوئی۔[۳]

گریرسن نے گل کرسٹ کی ایک کتاب "ہندوستانی زبان کی قواعد" کا ذکر کیا ہے۔ یہ کلکتہ سے ۱۸۰۹ء میں چھپی[۴] ممکن ہے کہ یہ ۱۷۹۶ء والی قواعد کا کوئی ایڈیشن ہو۔

راقم الحروف کی نظر سے قواعد اردو کا ایک مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ)

---

۱ Gilchrist and the Language of Hindoostan P. 57

۲ Linguistic Survey of India Vol. IX, Part I, P. 18

۳ Introduction, Poems of Dr. John Gilchrist by Dr. Ebadat Barelvi P. 6

۴ Linguistic Survey of India Vol. IX, Part I, P. 18

میں گزرا ہے۔ یہ مخطوطہ ۸۲ اوراق پر مشتمل ہے۔ آغاز میں کوئی سرورق نہیں ہے۔ اور نہ کہیں کالج کی مہر ہے۔ ہاں ایشیاٹک سوسائٹی کی حالیہ مہر ضرور لگی ہوئی ہے۔ لائبریری کے کیٹلاگ میں اس مخطوطہ کا نام صرف "قواعد اردو" درج ہے۔ مصنف کا نام یہاں بھی درج نہیں ہے۔ حالانکہ جاوید نہال نے اس نسخے کو گل کرسٹ سے منسوب کیا ہے۔ اسکے صفحات کی تعداد ۸۸ لکھی ہے۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس نسخے کے اختتام پر کالج کی مہر پڑی ہوئی ہے۔[1]

گل کرسٹ کی "HINDOOSTANI PHILOLOGY" کے دو ایڈیشنوں کا ذکر ملتا ہے۔ اول ۱۸۱۰ء کا اور دوسرا ۱۸۲۵ء کا۔[2]

انہوں نے اسوقت کی ملکی سیاست میں بھی دلچسپی لی تھی۔ چنانچہ انکے ادبی کارناموں میں ایک سیاسی کارنامہ "PARLIAMENTARY REFORM ON CONSTITUTIONAL PRINCIPLES" ہے۔ یہ ۱۸۱۵ء میں گلاسکو سے شائع ہوا۔ ORIENTAL GREEN BAG ۱۸۲۰ء میں شائع ہوئی۔ اسمیں ولیم جونس (WILLIAM JONES) کے سماجی، سیاسی اور مذہبی نظریات کے علاوہ انکی مخالفت کی تمام معرکہ آرائیاں بھی درج ہیں۔[3] "EAST INDIA GUIDE AND VADE MECUM" ۱۸۲۵ء میں لندن سے شائع ہوئی۔[4] اسکا ایک نسخہ نیشنل لائبریری (کلکتہ) میں راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے۔ یہ کتاب گل کرسٹ نے بمبئی اور بنگال کے قیام کے دوران اپنے ۲۲ سالہ تجربے کی بنیاد پر لکھی ہے۔ گل کرسٹ کا خیال ہے کہ ہر اس

---

[1] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب۔ ص ۴۲، ۴۷

[2] Introduction, Poems of Dr. John Gilchrist P. 7,

[3] Coverpage, East India Guide and Vade Mecum

شخص کو جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم ہے خواہ وہ ملٹری میں ہو، بحری فوج میں۔ یا کسی بھی شعبے میں اسے ہندوستان کے بارے میں علم ہونا ضروری ہے۔ اس کتاب کے ذریعے نو وارد ان کو ہندوستانی عوام کے بارے میں مکمل علم ہو جائے گا اور وہ خود کو ہندوستان جا کر اجنبی نہیں سمجھیں گے۔

گل کرسٹ ۱۸۱۶ء میں لندن میں ذاتی طور سے کمپنی کے ملازمین کو ہندوستانی زبان کا درس دیتے رہے۔ لیکن دو سال بعد کمپنی نے لیسٹر اسکوائر (LEICESTER SQUARE) پر واقع اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر کے عہدہ پر انکی خدمات حاصل کیں۔ یہاں صرف طبی عہدہ دار ہی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ انکی ذاتی درسگاہ بھی اس میں ضم ہو گئی۔ ۱۸۲۵ء میں جب کمپنی نے اپنی اعانت سے کھینچ لیا تو گل کرسٹ نے ایک کتاب "THE ORIENTAL OCCIDENTAL TUTIONARY PIONEER" لکھی جس میں انہوں نے اپنے مالکوں اور انکے رفتار سے اپنی ناگواری کا اظہار کیا تھا۔ گل کرسٹ ۱۸۲۶ء تک اس تعلیم گاہ میں تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۸۲۸ء میں انہوں نے دوبارہ پرائیوٹ طور سے تعلیم دینی شروع کی۔[1] لیکن کچھ دنوں بعد وہ پیرانہ سالی کی بنا پر تحریر و تقریر کی دنیا سے کنارہ کش ہو کر اپنے وطن لوٹ گئے۔

۹ر جنوری ۱۸۴۱ء میں بمقام پیرس انکا انتقال ہو گیا۔[2] اور یوں علم و ادب کا یہ محسن ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

---

[1] *Gilchrist and the Language of Hindoostan by S.R. Kidwai. P. 58*

[2] گارسن دی تاسی نے بھی گل کرسٹ کے انتقال کا سن ۱۸۴۱ء درج کیا ہے۔ (خطبات گارساں دی تاسی ص ۲۶۸)

گل کرسٹ ہندوستان آنے سے قبل شاعری کے میدان میں بھی اپنی جولانیٔ طبع کے مظاہرے کر چکے تھے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر نظمیں کہی ہیں۔ ان نظموں میں قدرت کا حسن بھی ہے اور حیات و کائنات کے رموز و نکات بھی۔ ان میں حب الوطنی کا جذبہ بھی نمایاں ہے۔ گل کرسٹ کی نظمیں انکے کردار اور افکار کی بہترین نمائندگی کرتی ہیں۔ گل کرسٹ کی نظموں پر رائے زنی کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی رقم طراز ہیں :—

"His poems reflect his nobility of Character and his human approach to life and endear his personality to the reader. His poetical compositions show that he was inspired as a youth by the national lyric movement of the eighteenth century in Scotland. He has given expression to his patriotism and his love for his homeland in his pastorals and in his poems describing sea voyages. He borrows his poetic expressions and his images from the love and the.

landscape of the Highlands and sings about "the harvest that waves in the breeze and the music that fleets on the gale." [۱۵]

ڈاکٹر گل کرسٹ کی نظمیں غیر مطبوعہ تھیں اور مخطوطے کی شکل میں لندن یونیورسٹی میں محفوظ تھیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اس مخطوط کو ایک مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ گل کرسٹ کی یہ نظمیں ہندوستان آنے سے قبل کی ہیں۔ بسنہ ۱۷۸۲ء میں ہندوستان آنیکے بعد غالباً وہ شاعری کی جانب توجہ نہ دے سکے۔ یہاں البتہ انہوں نے "ہندی مورل پری سپٹر" میں سعدی کی نظموں کا ترجمہ کیا تھا۔ گل کرسٹ کا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔ مندرجہ ذیل نظم میں انکی حب الوطنی کا جذبہ نمایاں ہے :—

Adieu ye Nymphs farewell my Scoltia's plains,
For You I sigh, alas, for ever mourn
My absent friends and Eden's free born swains
Perhaps poor Jockie never Will return.
Forbid it Goods, forbid it Heavens above,
Oh may Propitious fortune yet prove true

---

۱۵ *Introduction, Poems of Dr. John Gilchrist, P. 10.*

I'd fly with open arms to meet my love,
To meet my former friends, Such friends as you.[1]

گل کرسٹ اور ہندوستانی پریس

فورٹ ولیم کالج میں سول ملازمین کے درس و تدریس کے لئے کتابوں کا فقدان تھا۔ اسی مقصد سے مختلف شعبوں میں منشیوں، مولویوں اور پنڈتوں سے تصنیف و تالیف کا کام لیا گیا۔ یہ فورٹ ولیم کالج ہی کا کارنامہ تھا کہ اس نے مقامی زبانوں میں صرف تصنیف و تالیف ہی نہیں بلکہ اعلیٰ پیمانے پر انکی اشاعت کا مرحلہ بھی سر کیا۔ اس ضمن میں ہندوستانی پریس کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔

ہندوستانی پریس کب قائم ہوا اور یہ کس کی ملکیت تھا۔ اس سلسلے میں اختلاف رائے ہے۔ ۱۲ر جنوری ۱۸۰۲ء کی کالج کونسل کی کارروائیوں میں گل کرسٹ کا ایک خط ملتا ہے جو اسنے سکریٹری کو تحریر کیا تھا۔ اسمیں اس نے لکھا ہے :-

"ایسی ہندوستانی کتابوں کے عام فقدان نے جن پر کچھ بھی بھروسہ کیا جاسکے مجھے فوری طور پر حسب ذیل کتابیں چھاپنے پر مجبور کر دیا ہے .... اور کلکتہ کے تمام چھاپے خانوں کو میں نے اس کام پر لگا دیا ہے کیوں کہ کم سے کم وقت میں اس کام کو انجام دینے کا یہی طریقہ میری سمجھ میں آیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کالج کونسل اس اقدام کو قطعاً ناگزیر

---

[1] Poems of Dr. John Gilchrist, P. 79, 80

سمجھ کر میری ہمت افزائی کرے گی۔ [1]

اس خط کے ساتھ گل کرسٹ نے ان کتابوں کی فہرست منسلک کی تھی جو یا تو چھپ رہی تھیں یا چھپ چکی تھیں، یا چھپنے والی تھیں۔ اس فہرست میں ان کی طباعت کا تخمینہ بھی شامل تھا۔ کتابوں کے چھاپنے کا کام کلکتہ کے جن پریسوں کے حوالے کیا گیا تھا۔ ان میں ہرکارہ پریس کلکتہ گزٹ پریس، ٹیلی گراف پریس، مرر پریس، مارننگ پوسٹ پریس شامل تھے۔ [2] اس سے پتہ چلتا ہے کہ کم از کم ۱۲ر جنوری ۱۸۰۲ء تک تو ہندوستانی پریس کا وجود نہیں تھا۔ لیکن ۱۸۰۲ء کے ہی اوائل، وسط یا اواخر میں گل کرسٹ اور ڈاکٹر ہنٹر نے مل کر اسے قائم کیا۔ اس پریس میں طباعت کا وہی سامان استعمال کیا گیا تھا جو فرانسس گلیڈون نے اپنے مطبع استعمال کیا تھا۔ [3] یہ سامان فرانسس گلیڈون نے کالج کو دے دیا تھا۔ گل کرسٹ نے کالج کونسل سے اجازت لیکر ان سامانوں کی مدد سے ہندوستانی پریس قائم کیا۔ [4] یہ سامان انہے مستعار لیا تھا۔ نہ تو اس نے خریدا تھا اور نہ ہی اپنا سرمایہ اس پریس کے قیام میں لگایا تھا۔ اسلئے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ یا تو منتظم تھا یا محض حصّے دار۔

ہندوستانی پریس ۱۸۰۲ء میں قائم ہوا تھا۔ اس امر کی تصدیق "اناس آف دی کالج آف فورٹ ولیم" (تھامس روبک) میں درج فورٹ ولیم کالج میں تصنیف شدہ کتابوں کی تفصیلات

---

[1] [2] Proceedings of the College of Fort William. Vol. 559, P. 45, 46.

[3] British Orientalism and the Bengal Renaissance, P. 115.

[4] Proceedings of the College of Fort William, DL IX, Jan 30-1802 P. 57 اور British Orientalism P. 115.

سے بھی ہوتی ہے۔ تھامس روبک کے مطابق گل کرسٹ کی تصنیف "دی اسٹرینجرس ایسٹ انڈیا گائیڈ ٹو دی ہندوستانی" یا گرینڈ پاپولر لینگویج آف انڈیا" ۱۸۰۲ء میں ہندوستانی پریس میں ہی چھپی تھی۔[۱]

عتیق صدیقی نے گل کرسٹ کی مندرجہ ذیل تحریر سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہندوستانی پریس کا مالک گل کرسٹ تھا۔ اور کرنل رین کنگ (RANKING) کے اس خیال کو غلط قرار دیا ہے کہ ہنٹر ہندوستانی پریس میں حصے دار تھا:-

> "کالج کے چھاپے، ٹائپ، اپنی تمام کتابیں اور ہندوستانی پریس تی الحال ڈاکٹر ہنٹر، مسٹر میک ڈاگل اور میکن ٹوش فل ٹن اینڈ کمپنی کی مشترکہ نگرانی میں چھوڑ رہا ہوں"۔[۲]

لیکن اس خط سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ گل کرسٹ پریس کا مالک تھا۔ یہ خط اس نے شعبۂ ہندوستانی سے مستعفی ہوتے وقت کالج کونسل کو لکھا تھا۔ ظاہر ہے اسنے ان تمام چیزوں کی فہرست یا اثاثہ کالج کونسل کے حوالے کیا ہوگا جو اسکے ذمہ رہی ہوں گی۔ چونکہ پریس سے بھی اسکا تعلق تھا اس نے کالج کونسل کو اس امر سے مطلع کیا کہ وہ پریس کو متذکرہ بالا اشخاص کی نگرانی میں چھوڑ کر جا رہا ہے یا انکے حوالے کر رہا ہے۔ یوں بھی طباعت کا سامان گل کرسٹ کا ذاتی تو تھا نہیں اس نے کالج کونسل سے مستعار لیکر اسے استعمال کیا تھا۔ اس لئے اسے کالج کونسل کو تو مطلع کرنا ہی تھا کہ اب وہ سارا سامان کن افراد کے ہاتھ میں ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ گل کرسٹ

---

[۱] Annals of the College of Fort William Appendix II, P. 21

[۲] بحوالہ گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۱۵۲ P.C.F.W. Vol. 559, P. 168.

ہندوستانی پریس کا مالک تھا۔

لیکن پیری چند مترا نے رام کنول سین کا ذکر کرتے ہوئے "ڈاکٹر ہنٹر کا ہندوستانی پریس" لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"رام کنول سین اپنی تقدیر کا آپ معمار تھا اور اس نے اپنی زندگی ڈاکٹر ہنٹر کے ہندوستانی پریس میں آٹھ روپے ماہوار پر کمپوزیٹر کی حیثیت سے شروع کی تھی۔"[1]

اسی تصنیف سے ہمیں یہ بھی علم ہوتا ہے کہ رام کنول سین نے ہندوستانی پریس کی ملازمت ۱۸۰۴ء میں اختیار کی تھی[2] یعنی ۱۸۰۴ء میں ہندوستانی پریس ڈاکٹر ہنٹر کا تھا۔ پھر بھی یہ بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی کہ ڈاکٹر ہنٹر مکمل طور پر پریس کا مالک تھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اعلیٰ منتظم ہونیکی حیثیت سے پیری چند نے ہندوستانی پریس کو ڈاکٹر ہنٹر سے منسوب کر دیا ہو۔ لیکن اسی کتاب میں ڈاکٹر ولسن کا ۱۸۴۴ء کا لکھا ہوا ایک خط بھی شامل ہے جس سے یہ علم ہوتا ہے کہ ۱۸۱۱ء تک ہندوستانی پریس ایک سے زاید لوگوں کی ملکیت تھا اور ڈاکٹر ہنٹر سب سے بڑا حصہ دار تھا۔ ولسن (WILSON) اپنے مذکورہ خط میں لکھتا ہے:۔

"(رام کنول سین) دوسرے فرائض کے علاوہ ہندوستانی پریس کے منتظم کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ جس (پریس) کا ڈاکٹر ہنٹر سب سے بڑا شریک تھا۔"[3]

---

[1] Life of Dewan Ram Comul Sen by Peary chand Mitra P. 40.

[2] Life of Dewan Ram Comul Sen, P. 7.

[3] ,, ,, ,, ,, ,, P. 43, 44

۲

ولیم ہنٹر

ولیم ہنٹر اسکاٹ لینڈ کے باشندہ تھے ۱۷۸۱ء میں ۲۶ سال کی عمر میں ہندوستان آئے اور بحیثیت سرجن کام کرنے لگے۔ گل کرسٹ کی مراجعت کے بعد ۱۸۰۴ء میں ہنٹر کو انکی جگہ[1] پر ایشیاٹک سوسائٹی کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ اور ۱۸۰۵ء میں انھیں کالج کونسل کے سکریٹری کا بھی عہدہ ملا۔ ۱۸۰۵ء ہی میں انہوں نے فورٹ ولیم کالج کی لائبریری کا بحیثیت لائبریرین چارج لیا اور لائبریری کو استحکام بخشنے کیلئے بھرپور جدوجہد شروع کر دی[2]۔ شعبۂ ہندوستانی کے اسسٹنٹ پروفیسر میک ڈوگل کی بیماری کے باعث ۲۶ ستمبر ۱۸۰۵ء کو ولیم ہنٹر شعبۂ ہندوستانی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کئے گئے جسکے لئے انکا مشاہرہ آٹھ سو روپے ماہوار تھا۔ لیکن ۲۱ دسمبر ۱۸۰۵ء کو میک ڈوگل کی واپسی پر انہیں اس عہدے سے الگ کر دیا گیا[3]۔

۱۸۰۲ء سے ۱۸۱۱ء تک ہنٹر کا تعلق ہندوستانی پریس سے بھی تھا۔

- ہنٹر نے ہندوستانی انگلش ڈکشنری مرتب کی تھی اسکے علاوہ نیو ٹسٹامنٹ پر بھی نظرثانی کی۔ ہنٹر خود بھی ایک ہندوستانی انگریزی ڈکشنری تارنی چرن متر اور للوجی لال کی مدد سے ترتیب دے رہے تھے، ۱۸۱۱ء میں انکو جاوا کا سفر کرنا پڑا چنانچہ انہوں نے تھامس روبک کو اس کام کا نگراں بنایا اور تارنی چرن متر اور للوجی لال کی خدمت کو برقرار رکھنے کی سفارش کی۔ لیکن یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔ البتہ ۲۷ نومبر ۱۸۲۰ء کے ایک خطوط میں ولیم ٹیلر نے ہنٹر کا لغت مکمل کرنیکا ارادہ ظاہر کیا تھا[4]۔

---

[1] ۲۰ اپریل ۱۸۰۰ء میں گل کرسٹ ایشیاٹک سوسائٹی کے سکریٹری مقرر ہوئے تھے (British Orientalism P69

[2] British Orientalism P 84, 118

[3] [4] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۷۸، ۸۵، ۱۰۱، ۱۰۳، ۱۰۹

یکم نومبر ۱۸۱۱ء کو ہنٹر نے کالج کونسل کے سکریٹری کے عہدے سے استعفیٰ دیدیا۔[لف] اور ۱۸۱۱ء ہی میں وہ جاوا چلے گئے جہاں انکا انتقال ہو گیا۔[۲]

۴

جان ولیم ٹیلر

۲۰، فروری ۱۸۰۸ء میں CAPT. MOUNT کے مستعفی ہو جانیکے بعد ۲۲، فروری ۱۸۰۸ء کو گورنر جنرل با جلاس کونسل نے کیپٹن جان ولیم ٹیلر (CAPT. JOHN WILLIAM TYLOR) کو ہندوستانی شعبہ کا پروفیسر منتخب کیا۔[۳]

ولیم ٹیلر نے ۲۷، نومبر ۱۸۲۰ء کے ایک خط میں ولیم ہنٹر کی ہندوستانی انگریزی لغت (نامکمل) کو مکمل کرنیکا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

لہ فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۶۸، ۸۵، ۱۰۱، ۱۰۳، ۱۰۹۔

۲ۃ Life of Dewan Ram Comul Sen_ P. 44

جاوید نہال (انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۸۲) نے ۱۸۰۸ء میں ڈاکٹر ہنٹر کے تبادلے اور جاوا چلے جانیکی بات لکھی ہے جو صریحاً غلط ہے۔ ۳ۃ جاوید نہال (انیسوں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۸۱) نے جیمس مویٹ (CAPT. J. MOUNT) کے بعد جوزف ٹیلر کو کالج کا پروفیسر لکھا ہے۔ حالانکہ جوزف ٹیلر کا فورٹ ولیم کالج سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جوزف ٹیلر نے ذاتی استعمال کیلئے ایک لغت مرتب کیا تھا جسے تصحیح اور نظر ثانی کے بعد ولیم ہنٹر نے شائع کیا تھا۔ CAPT. MOUNT کے بعد کیپٹن جان ولیم ٹیلر شعبۂ ہندوستانی کے پروفیسر ہوئے تھے۔ نہال صاحب کو ولیم ٹیلر پر جوزف ٹیلر کا مغالطہ ہوا ہے۔

ٹیلر ۱۸۰۹ء میں خرابیٔ صحت کی بناپر سمندری سفر پر چلے گئے تھے۔ انکی غیر حاضری میں لیفٹننٹ لاکٹ کو غیر مستقل طور پر ہندوستانی شعبہ کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ ولیم ٹیلر ۲۱ دسمبر ۱۸۰۹ء تک دوبارہ فورٹ ولیم کالج میں واپس آگئے۔

۱۴ فروری ۱۸۱۰ء کو سرکار کے سامنے یہ بات رکھی گئی کہ ٹیلر صحت کی ناسازی کی بنا پر یہ درخواست کرتے ہیں کہ ہندوستانی کے ابتدائی درجات کی تعلیم لاکٹ دیا کریں۔ یہ درخواست اسی دن منظور کرلی گئی[1]۔

۳۰ اگست ۱۸۱۱ء کو ٹیلر نے کالج کونسل کے عوضی سکریٹری کیپٹن گیلو وے کو اپنی بیماری کی اطلاع دی۔ ۶ ستمبر ۱۸۱۱ء کو انہیں سرکاری منظوری مل گئی اور وہ ایک ماہ کیلئے سینڈہیڈس چلے گئے۔

۳۰ اکتوبر ۱۸۱۲ء کو ٹیلر نے شعبۂ ہندوستانی کے لئے ایک اسسٹنٹ پروفیسر مانگا ۱۹ نومبر ۱۸۱۲ء کو کیپٹن رسل مارٹن کو اس عہدہ پر سرفراز کیا گیا۔

ولیم ٹیلر ۲۲ مئی ۱۸۲۳ء میں لیفٹننٹ کرنل ہو گئے۔ چنانچہ ذمہ داریاں اور مصروفیات بڑھ جانیکی وجہ سے انہیں ہندوستانی پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنیکا موقع کم مل پاتا تھا۔ اسلئے گورنر جنرل باجلاس کونسل نے کیپٹن ولیم پرائس کو انکی جگہ پر ہندوستانی پروفیسر کے عہدہ پر فائز کیا[2]۔

---

[1] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۸۴۔

[2] " " (") ص ۸۴، ۸۵، ۱۱۲۰۔

۴
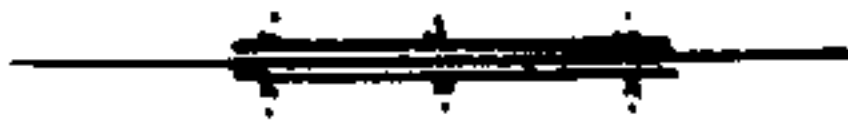
کیپٹن تھامس رُوبک

تھامس روبک (THOMAS ROEBUCK) لن لتھ گرو شائر (LINLITH GROW SHIRE) میں ۱۷۸۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۸۰۱ء میں انگلستان سے ہندوستان میں وارد ہوئے۔ یہیں پر انہوں نے اردو زبان سیکھی۔ تھامس روبک نے وِلور (نزد مدراس) میں کچھ دنوں بحیثیت قائم مقام میجر ٹاؤن کام کیا تھا۔ وہ ۱۸۰۵ء میں خرابیٔ صحت کی بنا پر اپنے وطن لوٹ گئے تھے۔[1]

ڈاکٹر محمد افضل الدّین اقبال نے تھامس روبک کے بارے میں لکھا ہے:-

"جب ۱۸۰۴ء میں ڈاکٹر گل کرائسٹ کالج کی صدارت اور اردو کی پروفیسری سے سبکدوش ہو گئے تو یہی انکی جگہ پر مامور ہوئے۔"[2]

یہ بیان درست نہیں ہے۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کالج کا نہیں بلکہ شعبۂ ہندوستانی کا صدر اور پروفیسر تھا۔ اسکا تعلق کالج کی انتظامیہ سے کبھی نہیں رہا۔ اس کی وطن مراجعت کے بعد دسمبر ۱۸۰۵ء تک شعبۂ ہندوستانی میں کوئی پروفیسر مقرر ہی نہیں ہوا بلکہ CAPT. MOUNT 9.

---

۱ بنگال میں اردو زبان وادب ۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ ص ۲۴

۲ فورٹ سینٹ جارج کالج ۔ ص ۱۳۱

پہلے اسسٹنٹ پروفیسر تھے وہی شعبہ کی ذمہ داریاں سنبھالتے رہے۔ یکم جنوری ۱۸۰۶ء کو انہیں کالج کونسل کی جانب سے پروفیسر کا عہدہ دے دیا گیا۔ تھامس روبک کبھی بھی شعبۂ ہندوستانی کے پروفیسر نہیں ہوئے۔ ہاں البتہ دسمبر ۱۸۱۶ء میں وہ ماتحت پروفیسر مقرر ہوئے تھے۔

تھامس روبک کے ۱۴ر جنوری ۱۸۱۲ء کے خط سے علم ہوتا ہے کہ ۱۸۰۶ء سے ۱۸۱۰ء کے دوران انہوں نے ایڈنبرا میں گل کرسٹ کے ساتھ کام کیا تھا[۱] ۱۸۱۰ء میں وہ دوبارہ ہندوستان لوٹ آئے۔ اور ۱۸۱۱ء میں فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہوگئے۔ یہاں وہ اسسٹنٹ سکریٹری اور سیکنڈ اگزامز تھے۔[۲] تھامس روبک ۱۸۱۱ء سے ۱۸۱۵ء کے درمیان کالج کونسل کے سکریٹری ہوگئے تھے۔ وہ ۱۸۱۶ء میں شعبۂ ہندوستانی میں بحیثیت عوضی ماتحت پروفیسر مقرر ہوئے۔[۳] اپنی موت تک وہ کالج سے ہی وابستہ رہے۔

۸ر دسمبر ۱۸۱۹ء میں کلکتہ ہی میں انکا انتقال ہوا۔[۴]

تھامس روبک نے کالج سے وابستہ ہونے کے قبل اور بعد میں کئی کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ وہ مندرجہ ذیل کتابوں کے مصنف و مؤلف تھے:۔

۱۔ برٹش انڈین مونیٹر (BRITISH INDIAN MONITOR) دو جلد ۱۸۰۹ء ایڈنبرا۔

---

[۱] FORTWILLIAM, 24 SEPT. 1811 – 12 JAN. 1814, HOME MISC. VOL. 4, P. 115. 119

بحوالہ فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۱۰۳

[۲] ANNALS OF THE COLLEGE OF FORTWILLIAM, APPENDIX NO. III, P. 46

[۳] 〃 NO. IV P. 55

[۴] بنگال میں اردو زبان و ادب۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ ص ۴۲

۲۔ ہندوستانی اینڈ انگلش ڈائیلاگز (HINDOOSTANEE AND ENGLISH DIALOGUES) سنہ ۱۸۰۹ء۔ ایڈنبرا۔

۳۔ AN ENGLISH AND HINDOOSTANI DICTIONARY WITH A GRAMMAR PREFIXED ایڈنبرا سنہ ۱۸۰۹ء

۴۔ AN ENGLISH AND HINDOOSTANI DICTIONARY WITH A GRAMMAR PREFIXED — 1809 ایڈنبرا۔ دوسری جلد

بقول ولیم ٹیلر یہ کالج میں پڑھائی جانے والی بہترین قواعد ہے۔

۵۔ تیسری جلد BRITISH INDIAN MONITOR

۶۔ ENGLISH AND HINDOOSTANI NAVAL DICTIONARY OF TECHNICAL WORDS AND PHARASES — 1811

۷۔ 1812، دو جلد ENGLISH AND HINDOOSTANI EXERCISE

۸۔ باغ و بہار کی ترتیب سنہ ۱۸۱۳ء، ۹۔ خرد افروز کی ترتیب سنہ ۱۸۱۵ء، ۱۰۔ گل بکاؤلی کی ترتیب سنہ ۱۸۱۵ء۔

۱۱۔ برہان قاطع کی تصحیح سنہ ۱۸۱۸ء، ۱۲۔ انالس آف دی کالج آف فورٹ ولیم سنہ ۱۸۱۹ء

۱۳۔ A COMPLETE COLLECTION OF ORIENTAL PROVERBS، ۱۴۔ A PERSIAN، HINDOOSTAEE AND ENGLISH DICTIONARY، ۱۵۔ DICTIONARY

اس کے علاوہ روبک کی نگرانی میں بھی کچھ تخلیقی کام ہوئے۔ مثلاً:۔

۱۔ دیوان جہاں (بینی نرائن جہاں) ۲۔ کثیر الفوائد یا ہندوستانی، فارسی اور پنجابی ضرب الامثال، ۳۔ کاشی راج کی تخلیق گلستاں بہ زبان پنجابی۔ ۴۔ بدیا درپن۔ ۵۔ اے پنجابی ڈکشنری۔ یہ گرومکھی رسم الخط میں ہے۔ ہر ایک لفظ کا تلفظ ناگری میں دیا گیا ہے۔ کاشی راج نے اسے سنہ ۱۸۱۳ء

میں کالج کی لائبریری میں بطور تحفہ پیش کیا تھا۔

۵

کیپٹن ولیم پرائس

اکتوبر ۱۸۱۳ء کو ولیم پرائس (WILLIAM PRICE) سنسکرت، بنگلہ اور ہندوستانی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ انکا مشاہرہ چار سو روپیہ تھا۔ فوجی بھتہ اس کے علاوہ انہیں ملتا تھا۔[۱] لیکن ۳۱ر اکتوبر ۱۸۱۳ء کو ہندوستانی شعبہ کے پروفیسر ولیم ٹیلر نے اپنے شعبہ کیلئے الگ اسسٹنٹ پروفیسر کے تقرر کی درخواست کی۔ کالج کونسل نے اسے منظور کرلیا اور ۱۹ر نومبر ۱۸۱۳ء کو رسل مارٹن (CAPT. RUSSEL MARTIN) اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کئے گئے۔ اسطرح مذکورہ تاریخ کے بعد ولیم پرائس صرف بنگلہ اور سنسکرت کے اسسٹنٹ پروفیسر باقی رہے ولیم ٹیلر ۲۲ر مئی ۱۸۲۳ء میں جب لیفٹننٹ کرنل ہوئے تو انکی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئیں اور وہ شعبہ کا بار سنبھالنے سے معذور ہوگئے۔ جس کی بنا پر ولیم پرائس کو ۲۰ر نومبر ۱۸۲۳ء میں شعبۂ ہندوستانی کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔[۲]

ولیم پرائس نے اپنے عہد میں ہندوستانی اور ہندی کو الگ الگ زبانوں میں تقسیم کرنے کی

---

[۱] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۸۱

[۲] FORTWILLIAM, 17 JUNE 1822 - 15 DEC. 1824, HOME MISC, VOL. 9, P. 335.

بحوالہ فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۱۱۳

انتہائی کوششیں کیں۔ اور بڑی حد تک کامیاب بھی ہوتے۔ وہ خود کو ہندی پروفیسر لکھتے تھے۔ حالانکہ کالج کونسل کے ذمہ داران انہیں ہندوستانی پروفیسر ہی کہتے رہے۔ پرائس کو سنسکرت اور برج بھاشا سے خصوصی دلچسپی تھی۔ وہ سنہ ۱۸۳۱ء تک شعبہ سے وابستہ رہے۔[1] ان ایام میں انکی مندرجہ ذیل کتابوں کا علم ہوتا ہے :-

۱۔ کھڑی بولی اور انگلش کی لغت کی ترتیب۔

۲۔ پریم ساگر کی لغت کی ترتیب۔

۳۔ محمد صالح کی قواعد کا انگریزی ترجمہ۔ سنہ ۱۸۲۳ء۔

۴۔ HINDEE AND HINDOOSTANEE SELECTIONS WHICH ARE PREFIXED, THE RUDIMENTS OF HINDOOSTANEE AND BRUJ BHAKHA GRAMMAR. کی ترتیب۔ سنہ ۱۸۲۷ء۔

۵۔ سبھا بلاس کی ترتیب۔ سنہ ۱۸۲۸ء۔

۶۔ چھتر سال کی ترتیب۔ سنہ ۱۸۲۹ء۔

---

[1] FORT WILLIAM, 26 OCT. 1831, — 19 AUG. 1833 HOME MISC, VOL. 14, P. 59 – 61 بحوالہ فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۱۴۵ ....

۶

میر بہادر علی (حسینی)

میر بہادر علی کے سوانح نگاروں نے انکا پورا نام میر بہادر علی حسینی لکھا ہے۔ لیکن کالج کونسل کی کارروائیوں میں صرف میر بہادر علی درج ہے۔

بہادر علی کے حالات زندگی پردۂ خفا میں ہیں۔ انکے سوانح نگاروں نے جو معلومات فراہم کی ہیں انکے علاوہ خود بہادر علی کا کوئی بیان راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزرا۔ کریم الدین نے نہ جانے کس بنیاد پر ان کو "ذی قدر شاعر" قرار دیا ہے[1] حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کریم الدین کے تذکرہ کے علاوہ انکا ذکر دیگر تذکروں میں نظر نہیں آتا۔ کالج میں مرتب شدہ دو تذکروں "گلشن ہند" (لطف) اور "دیوان جہاں" (بینی نرائن جہاں) تک میں انکا ذکر نہیں ملتا۔ اگر حسینی ذی قدر شاعر ہوتے تو تذکرے ان کے ذکر سے خالی نہ ہوتے۔ انکی تصانیف میں جو اشعار نظر سے گزرتے ہیں وہ نہ تو اعلیٰ درجہ کی شاعری کے نمونے ہیں اور نہ شاعر کی شعری صلاحیتوں کے ضامن، بلکہ یہ سیدھی سادی زبان میں حسب موقع موزوں کردیئے گئے ہیں۔

کریم الدین کے حوالے سے صاحب ارباب نثر اردو نے بہادر علی کے والد کا نام سید عبداللہ کاظم درج کیا ہے۔ اور سید عبداللہ کاظم کو وہی شخص قرار دیا ہے جنھوں نے شاہ عبدالقادر کا ترجمۂ قرآن شریف

---

[1] طبقات شعرائے ہند۔ طبقۂ سوم، کریم الدین و فیلن مرتبہ عطا کاکوی ص ۲۵

دہلی سے شائع کیا تھا۔ اور اسی بنیاد پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بہادر علی دہلی کے باشندہ تھے[1] لیکن ڈاکٹر وحید قریشی نے عبداللہ اور عبداللہ کاظم کو دو مختلف شخص بنایا ہے[2]

میر بہادر علی کو دہلی کا باشندہ قرار دیا جاتا رہا ہے لیکن نیر اقبال نے یہ انکشاف کیا ہے کہ وہ بدایوں کے باشندہ تھے[3] انکے سن پیدائش کا کہیں سے سراغ نہیں ملتا۔ فورٹ ولیم کالج کی ملازمت سے قبل کے حالات بھی دستیاب نہیں۔

۴ رمئی ۱۸۰۱ء میں انکا تقرر شعبۂ ہندوستانی میں میر منشی کے عہدے پر ہوا تھا۔ یہ کالج کے پہلے میر منشی تھے۔ انکا مشاہرہ دو سو روپیہ تھا[4]

۱۷ اکتوبر ۱۸۰۲ء کی کالج کونسل کی کارروائی سے یہ علم ہوتا ہے کہ بہادر علی کو مترجم مقرر کر دیا گیا اور یوں انکا مشاہرہ اسّی روپے ہوگیا۔ انکی جگہ پر شیر علی افسوس میر منشی ہوئے[5]

بہادر علی کی ۱۸۰۵ء تک کالج میں موجودگی کا علم ہوتا ہے۔ اس کی تصدیق "تاریخ آشام" کے دیباچہ سے بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن اسکے بعد کے حالات کا سراغ نہیں ملتا۔

---

[1] ارباب نثر اردو۔ ص ۱۲۶

[2] کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ۔ ص ۱۸۹

گارسن دی تاسی بھی ترجمۂ قرآن شریف کے ناشر کو بہادر علی کا والد کہتے ہیں۔

[3] کچھ رسالہ گل کرسٹ کے بارے میں" ہفتہ وار ہماری زبان ص ۴، شمارہ ۱۷۔ ۱۵ ر جولائی ۱۹۷۳ء۔

[4] PROCEEDINGS OF THE COLLEGE OF FORT WILLIAM, VOL. 5, 59, P. 5.

[5] FORT WILLIAM, 29 APRIL 1801 — 4 SEPT 1805, HOME MISC. VOL. I, P. 320

بحوالہ فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۴۵

بہادر علی "اخلاق ہندی" (سنہ ۱۸۰۲ء)، "نثر بے نظیر" (سنہ ۱۸۰۲ء) اور "تاریخ آشام" (سنہ ۱۸۰۵ء) کے مصنف تھے۔ ان سے گل کرسٹ کی ہندوستانی زبان کی قواعد (سنہ ۱۷۹۶ء) کی تلخیص بنام رسالہ گل کرسٹ بھی منسوب کی جاتی ہے۔ ان تصانیف کے علاوہ بہادر علی "نقلیات لقمانی" کے مترجمین اور ترجمۂ قرآن شریف کے معاونین میں بھی شامل تھے۔

(۷)

میر شیر علی افسوس

افسوس کا نام کالج کونسل کی کارروائیوں میں میر شیر علی افسوس درج ہے۔ اور خود بھی یہی لکھتے ہیں[۱] لیکن "گلشن اخلاق" میں افسوس کے بیٹے سید علی نے ان کا نام شیر علی جعفری لکھا ہے[۲] افسوس کے آبا و اجداد کا وطن "خاف" تھا لیکن ترک وطن کر کے ہندوستان چلے آئے اور آگرہ کے نزدیک قصبہ نارنول میں سکونت اختیار کر لی تھی[۳]

افسوس کے والد کا نام سید علی مظفر خاں تھا۔ یہ میر غلام مصطفیٰ کے بیٹے تھے۔ افسوس کے والد اور دادا محمد شاہ بادشاہ (۱۷۱۹ء - ۱۷۴۸ء) کے عہد میں نارنول سے دہلی چلے آئے۔ مقصد تلاش معاش تھا۔ یہاں آ کر یہ دونوں حضرات نواب عمدۃ الملک امیر خاں انجام سے وابستہ ہو گئے۔ یہ واقعہ نادر شاہ کے حملے سے قبل کا ہے۔ ان لوگوں کو انجام کی خوب خوب قربتیں اور عنایتیں حاصل ہوتیں۔ چنانچہ انھوں نے دہلی ہی میں سکونت اختیار کر لی[۴]

---

[۱] دیباچہ آرائش محفل (ق۔ن) ورق ۲، دیباچہ باغ اردو (مطبوعہ) ص ۲۱

[۲] دیباچہ گلشن اخلاق (ق۔ن) ورق ۲

[۳] دیباچہ باغ اردو ص ۲۱، ENCLOPAEDIA OF ISLAM, VOL. I. P. 241.

[۴] دیباچہ باغ اردو ص ۲۱

۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء میں انجامؔ کو الہ آباد کی صوبہ داری تفویض ہوئی تھی۔ وہ حملۂ نادر شاہ (۱۷۳۹ء) کے بعد وہاں گئے۔ افسوسؔ کے متعلقین بھی انکے ہمراہ تھے۔ ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء میں انجامؔ جب محمد شاہ کی طلبی پر دہلی آئے تو انکے وابستگان بھی ساتھ تھے۔ انجامؔ کو دیوان خاص میں ایک نوکر نے ۲۶ دسمبر ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء میں قتل کر دیا۔ ان ایام میں ملک و سلطنت کی حالت اچھی نہیں تھی۔ محمد شاہ کا آخری دورِ حکومت اور احمد شاہ کا ابتدائی دور انتشار اور ابتری سے پر تھا۔ ملک و سلطنت کی بدتر حالت اور انجام کے قتل سے دل برداشتہ ہوکر افسوسؔ کے والد خانہ نشیں ہو رہے۔ اور انہوں نے بارہ ۱۲ سال کا عرصہ گوشہ نشینی ہی میں گزار دیا۔[1]

افسوسؔ ۱۷۴۶ء کے اواخر یا ۱۷۴۷ء کے اوائل میں دہلی میں پیدا ہوئے[2] ابتدائی تعلیم انہوں نے دہلی میں ہی حاصل کی۔ گیارہ برس کی عمر میں وہ گلستاں پڑھا کرتے تھے اور دیوان ولی بھی انکے مطالعہ میں رہا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ شعر و سخن کا بھی ذوق پیدا ہو چلا تھا۔

---

[1] گلشن ہند۔ مرزا علی لطفؔ ص ۵۶

[2] افسوسؔ کے سن پیدائش کے تعین میں انکے مندرجہ ذیل بیان سے مدد ملتی ہے وہ باغ اردو کے دیباچہ میں (ص ۲۱) لکھتے ہیں:-

"اس عاصی کا مولد بینا شہر ہے۔ بعد برہم ہونے سلطنت کے اور وفات نواب صاحب غفور کے ایک مدت مدید والد مرحوم خانہ نشیں رہے آخر دلی کو چھوڑا اور روزگار بنگالے کے صوبہ دار ڈھاکا کیا۔ ان دنوں میں فقیر کا سن گیارہ برس کا تھا۔"

وفات نواب صاحب سے امیر خاں انجامؔ کی وفات کی جانب اشارہ ہے ان کا سن وفات ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء ہے۔ مدت مدید کا تعین افسوسؔ کے ہم عصر لطفؔ نے ۱۲ سال کیا ہے۔ افسوسؔ کے والد نے جب دلی چھوڑا اور بنگال کے صوبہ دار کا روزگار اختیار کیا۔ افسوسؔ ۱۱ سال کے تھے یعنی تقریباً ۱۷۵۸ء میں اسی بنیاد پر سن پیدائش ۱۷۴۶ء یا ۱۷۴۷ء قرار پاتا ہے۔

وہ متقدمین کے رنگ میں اشعار بھی کہنے لگے تھے ۔[1]

۱۷۵۸ء میں جب سید علی مظفر خاں دہلی سے عظیم آباد گئے تو افسوس بھی ان کے ہمراہ تھے ۔ افسوس تو ۱۷۶۳ء میں لکھنؤ چلے آئے ۔ لیکن ان کے والد میر جعفر کے انتقال ۱۷۶۵ء تک وہیں رہے ۔ اس کے بعد لکھنؤ آئے اور یہاں سے وہ حیدر آباد آ گئے ۔ وہیں انکا انتقال ہو گیا ۔[2]

بعد میں افسوس لکھنؤ سے فیض آباد چلے آئے ۔ اور انہوں نے یہاں ۱۷۷۵ء ۱۱۸۹ھ میں نواب سالار جنگ کا توسل اختیار کیا ۔ دس برس (۱۷۷۵ء ۱۱۸۹ھ - ۱۷۸۳ء ۱۱۹۸ھ) تک وہ نواب سالار جنگ کے بڑے بیٹے مرزا نوازش علی خاں کے مصاحب رہے ۔ اس کی تصدیق "مثنویات میر حسنؒ" کے دیباچہ میں افسوس کے بیان سے ہوتی ہے ۔[3] اسوقت افسوس شاعری کے میدان میں پختہ مشق ہو چکے تھے اور ان کا دیوان بھی مرتب ہو چکا تھا ۔ شاعری کے علاوہ ان ایام میں وہ عربی زبان کی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے ۔[4]

آصف الدولہ نے ۱۷۷۵ء ۱۱۹۰ھ میں جب لکھنؤ کو پایۂ تخت بنایا تو افسوس بھی سالار جنگ کے ہمراہ لکھنؤ چلے آئے ۔ مئی ۱۷۸۴ء میں شہزادہ جواں بخت جہاں دار شاہ لکھنؤ آیا ۔ اس وقت تک افسوس سالار جنگ سے ہی وابستہ تھے ۔ شہزادہ کو افسوس کا کلام بہت پسند آیا اور اس نے ان کو اپنی سرکار سے منسلک کر کے "بہ عہدۂ شاعری سرفراز فرمایا" ۔[5] ۱۷۸۴ء ۱۱۹۹ھ میں افسوس

---

[1] [2] دیباچہ باغ اردو ص ۲۱

[3] دیباچہ مثنویات میر حسن ۔ افسوس ص ۱۸ ، ۱۹

[4] دیباچہ باغ اردو ص ۲۲

[5] دیباچہ باغ اردو ص ۲۰۲

جواں بخت کے ملازم ہوگئے[1] اس نوازش و قدر دانی کے بعد افسوس کا زیادہ وقت شعر و سخن میں گزرنے لگا۔ ۱۷۸۶ء میں جواں بخت بنارس چلے آئے۔ افسوس بھی ان کے ہمراہ تھے[2]

افسوس جواں بخت کی رحلت (۱۲۰۲ھ ۱۷۸۸ء) تک بنارس ہی میں رہے۔ جواں بخت کے انتقال کے بعد افسوس کا بنارس میں قیام ہی بے معنی ہوکر رہ گیا۔ انہوں نے دل برداشتہ ہوکر شعر و شاعری کا شغل ترک کر دیا۔ شعری محفلوں سے کنارہ کشی اختیار کی۔ اور بنارس سے لوٹ آئے۔ یہاں آکر انہوں نے نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں[3] کا توسل اختیار کیا۔ اور فکر معاش سے آزاد ہوکر درس و تدریس میں وقت گزارنے لگے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا کام انکے ذمہ نہیں تھا۔ ان کے روزمرہ کے اخراجات کی کفالت حسن رضا خاں کے ذریعہ ہو جاتی تھی[4]

حسن رضا خاں کے انتقال (۱۲۱۶ھ ۱۸۰۱ء) کے بعد فخر الدین احمد خاں عرف مرزا جعفر ابن محسن الرّضا خاں مرحوم کے ذریعہ افسوس کی "سرکار دولت مدار" تک رسائی ہوئی۔[5]

---

[1] [2] دیباچہ مثنویات میرحسن ص ۲۰

[3] حسن رضا خاں آصف الدولہ کے عہد حکومت (۱۷۷۵ء-۱۷۹۹ء) میں منیب مقرر ہوئے۔ ان حکومت سے آٹھ لاکھ روپے سالانہ ملا کرتا تھا۔ (سوانحات سلاطین اودھ جلد اول ص ۱۰۲) یکم شوال ۱۲۰۶ھ ۱۷۹۲ء میں آصف الدولہ نے حسن رضا خاں اور راجہ ٹکیت رائے کو انگریزی سرکار سے بات چیت کرنیکے لئے کلکتہ بھیجا۔ گورنر جنرل جان شور سے ملکر یہ دونوں، ۲ جمادی الاول ۱۲۰۹ھ کو روانہ ہوئے اور ۸ جمادی الآخر کو لکھنؤ پہنچ گئے۔ اس زمانے میں راجہ ٹکیت رائے اور حسن رضا خاں کے درمیان نااتفاقی ہوگئی ۱۲۱۰ھ ۱۷۹۶ء میں آصف الدولہ بھی ان دونوں سے برگشتہ ہوگیا چنانچہ ۱۲۱۱ھ ۱۷۹۶ء میں حسن رضا خاں اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوگئے۔ (کلاسیکل ادب کا تحقیقی مطالعہ ص ۱۲۷)

[4] دیباچہ باغ اردو ص ۲۲

[5] دیباچہ آرائش محفل (ق، ن) ورق ۵، ۶

۱۰ اکتوبر ۱۸۰۰ء/۱۲۱۵ھ[1] میں لکھنؤ کے ریذیڈنٹ کرنل اسکاٹ نے افسوس کو بلوایا۔ ان کا کلام سنا اور یہ مژدہ سنایا کہ وہ مذکورہ تاریخ سے ہی کمپنی کے ملازم ہیں۔ زبان اردو کا محاورہ اور صحت دریافت کرنے کیلئے صاحبان عالی شان نے انکو کلکتہ بلایا ہے۔ افسوس ۱۸۰۰ء/۱۲۱۵ھ میں ہی کلکتہ پہنچ گئے اس کی تصدیق مرزا علی لطف کے ایک بیان سے ہوتی ہے۔[2]

افسوس شعبۂ ہندوستانی میں مترجم کے عہدہ پر فائز تھے۔ انکا مشاہرہ دو سو روپیہ تھا۔[3]

اپنی ملازمت کے دوران افسوس نے گلستاں کا ترجمہ "باغ اردو" (۱۸۰۲ء) کے نام سے کیا۔ اس کے بعد گل کرسٹ نے انکو تصحیح کا کام سپرد کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے نثر بے نظیر، قصہ گل بکاؤلی (مذہب عشق) مادھونل، توتا کہانی، قصہ حاتم طائی (آرائش محفل) اور چار درویش (باغ و بہار) کو درست کیا۔[4] لیکن افسوس نے "آرائش محفل" (خلاصۃ التواریخ) کے مطبوعہ نسخے میں بغیر نام بتائے محض چار کتابوں کی مکمل تصحیح اور "ایک آدھ کے جتنے ہی مربوط" کرنیکا ذکر کیا ہے۔[5] کلب علی خاں

---

[1] افسوس نے باغ اردو کے دیباچہ میں ۱۰ اکتوبر ۱۸۰۰ء/۱۲۱۵ھ درج کیا ہے۔ لیکن یہاں ان سے سہو ہوا ہے۔ تقویم کے مطابق ۱۲۱۵ھ ۲۵ مئی ۱۸۰۰ء سے شروع ہو کر ۱۳ مئی ۱۸۰۱ء کو ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے افسوس کے تقرر کی تاریخ ۱۰ اکتوبر ۱۸۰۱ء نہیں، بلکہ ۱۰ اکتوبر ۱۸۰۰ء قرار پاتی ہے۔ عتیق صدیقی نے کالج کونسل کی کارروائی کے حوالے سے افسوس کے تقرر کی تاریخ ۱۵ اکتوبر ۱۸۰۰ء درج کی ہے (گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۹۴) یہاں ۱۵ اکتوبر کی بجائے ۱۰ اکتوبر ہونا چاہیئے۔

[2] گلشن ہند۔ ص ۵۸۔ [3] فورٹ ولیم کالج ص ۵۲۔

[4] دیباچہ آرائش محفل (قلمی نسخہ) ورق ۳

[5] " " " (مطبوعہ) ص ۳

فائق نے بغیر کسی حوالے کے مذکورہ چار کتابوں کے نام یوں درج کئے ہیں :-

۱- بہار دانش (سنہ ۱۸۰۱ء)

۲- مذہب عشق (سنہ ۱۸۰۳ء)

۳- نثر بے نظیر (سنہ ۱۸۰۳ء)

۴- نقلیات لقمانی (سنہ ۱۸۰۲ء)[1]

حالانکہ افسوس کی تصحیح شدہ کتابوں میں بہار دانش اور نقلیات لقمانی کے نام شامل نہیں ہیں۔ افسوس نے آرائش محفل کے مطبوعہ نسخوں میں سے تصحیح شدہ کتابوں کے نام خارج کر دیئے تھے۔ لیکن قلمی نسخے میں اب بھی ان کتابوں کے نام موجود ہیں۔ اس کے بعد منشیوں سے تعلقات کی نزاکت اور مصلحت کے تحت افسوس نے تصحیح کا کام ہی ترک کر دیا۔[2] فرصت کے ایام میں وہ کلیات سودا کی تصحیح کرتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے "آرائش محفل" کی تالیف (سنہ ۱۸۰۵ء) کی۔ وہ "نقلیات لقمانی" کے مترجمین میں بھی شامل تھے۔ انہوں نے "مثنویات میر حسن" کا دیباچہ بھی لکھا تھا۔

سنہ ۱۸۰۴ء میں کالج کونسل نے میر بہادر علی حسینی کی جگہ پر افسوس کو میر منشی کے عہدہ پر فائز کیا اور بہادر علی مترجم مقرر ہوئے۔[3]

۱۹ر دسمبر سنہ ۱۸۰۹ء میں کلکتہ میں ہی انکا انتقال ہوگیا۔[4]

---

[1] مقدمہ آرائش محفل (مطبوعہ) ص ۳۵

[2] دیباچہ " (ق، ن) ورق ۴

[3] فورٹ ولیم کالج (ہندی) لکشمی ساگر وارشنے ص ۶۵

[4] " " " ص ۸۴

افسوس اپنے عہد کے معروف شعراء میں سے تھے۔ ان کا ذکر ہمعصر تذکرہ نگاروں نے اپنے تذکروں میں کیا ہے۔[1]

افسوس نے میر حیدر علی حیران کی شاگردی کا اقرار کیا ہے۔ اور میر حسن کی شاگردی سے انکار[2] حالانکہ میر حسن کے بیانات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ افسوس کے شاعرانہ کمالات میں میر حسن کے مشوروں کو بھی دخل تھا۔ اس کے علاوہ میر حسن ہی کے بیان سے میر سوز کی شاگردی کا بھی پتہ چلتا ہے۔[3]

افسوس اپنے عہد کے کامیاب نغزگو شاعر تھے۔ انہوں نے تقریباً تمام رائج اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ وہ شاعری کے میدان میں کسی نئے مکتب خیال اور نئے طرز کو پیش نہیں کرتے بلکہ وہ قدیم انداز کے ہی پیرو ہیں۔ ان کے یہاں شگفتگی اور فصاحت تو ملتی ہے لیکن سوز و گداز کی شدت نہیں ملتی۔ انہوں نے عاشقانہ شاعری کی ہے۔ وہ رجائیت اور رعنائیت کے

---

[1] تذکرہ مسرت افزا (ابوالحسن) ص ۴۲، طبقات شعرائے ہند (کریم الدین وفیلن) طبقہ سوم ص ۱۱، تذکرہ طبقات الشعراء (شوق بحوالہ تین تذکرے) ص ۷۹، تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن) ص ۲۱، گلشن سخن (مبتلا لکھنوی) ص ۲۳، دیوان جہاں (بینی نرائن جہاں) ص ۴۲، گلشن ہند (لطف) ص ۵۷، تذکرہ نادر (دیوان فوبیب کلب حسین خاں نادر) ص ۱۵، تذکرہ خوش معرکہ زیبا (سعادت خاں ناصر) ص ۸۰، عمدہ منتخبہ (تذکرۂ سرور محمد خاں سرور) ص ۹۱، تذکرہ شورش (شورش) ص ۲۲، سخن شعراء (نساخ) ص ۳۹، تذکرۂ ریاض الوفاق (بحوالہ معاصر، ذوالفقار مست) ص ۵، تذکرۂ ہزار داستاں (خمخانۂ جاوید، سری رام) جلد اول ص ۳۵۲۔

[2] مثنویات میر حسن۔ دیباچہ افسوس ص ۱۹

[3] تذکرۂ شعرائے اردو۔ ص ۲۱

امین ہیں ؎

دیکھے جو تجھے اے مہ تابان کے ٹکڑے
یوسف بھی کرے اپنے گریبان کے ٹکڑے
جہاں میں اور ہو کوئی تجھ سا خوب رو معلوم
عدم کے پردے میں یوسف ہے روبرو معلوم

انکے اشعار خواہ وہ عاشقانہ ہوں یا کسی حد تک مایوسانہ دونوں روایتی ہیں لیکن ہم افسوس کے روایتی پن پر گرفت اس لئے نہیں کر سکتے کہ وہ جس عہد میں سانسیں لے رہے تھے اور انہوں نے جن لوگوں کی صحبتیں اٹھائی تھیں وہ باصلاحیت شاعر ضرور تھے لیکن وہ بھی انہیں خیالات اور تصورات میں اسیر تھے۔ جن کے افسوس شکار تھے۔ عہد و ماحول کے کرب اور انتشار کی تصویر، انسان کی تنہائی اور داخلی و خارجی شکست و ریخت کی داستان نہ اس دور کے شعرا کے مزاج سے مطابقت رکھتی تھی اور نہ اس دور کا تقاضا تھی۔ درباروں، نوابوں اور شہزادوں سے وابستہ شعرا اگر انکی مدح سرائی نہ کرتے، عاشقانہ اشعار لکھ کر ان کے لئے تفریح و تلطف کا سامان نہ بہم پہونچاتے تو پھر اور کیا کرتے۔ وصل و فراق کی جو داستان اور جو انداز ہم اس عہد کے دیگر شعرا کے یہاں پاتے ہیں کم و بیش ویسی ہی تصویر ہمیں افسوس کے یہاں بھی نظر آجاتی ہے۔

افسوس کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔ اسمیں دیگر قصائد کے علاوہ کالج اور ارباب کالج کی شان میں بھی قصائد درج ہیں۔ افسوس نے آصف الدولہ کے جشن ہولی پر ایک طویل مثنوی کہی تھی۔ اس مثنوی پر میر حسن کی "سحر البیان" کا رنگ غالب ہے۔

افسوس کے معاصرین نے بھی تذکروں میں انکا نمونۂ کلام پیش کیا ہے جس سے انکے کلام کا اچھا خاصہ ذخیرہ سامنے آتا ہے اور ان کے شاعرانہ مقام کو متعین کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

۸

تارنی چرن متر

تارنی چرن متر شمالی کلکتہ[1] میں ۱۷۷۱ء یا ۱۷۷۲ء کے قریب پیدا ہوئے[2]۔ انکی تعلیم و تربیت بنگال ہی میں ہوئی۔ تارنی چرن متر عالم اور ماہر زباندان تھے۔ انہیں انگریزی، فارسی، عربی سنسکرت اور اردو پر بے پناہ عبور حاصل تھا۔

شعبۂ ہندوستانی میں تارنی چرن کا تقرر ابتدائی دور کے منشیوں کے ساتھ ہی منظور ہوا تھا۔

---

[1] BRITISH ORIETALISM AND THE BENGAL RENAISSANCE P.110

[2] سن پیدائش دریافت کرنے کے دو ماخذ ہیں۔ اول یہ کہ دسمبر ۱۸۱۶ء میں سکریٹری لاکٹ نے کالج کی جو تفصیلات بھیجی تھیں۔ اس سے علم ہوتا ہے کہ ۱۸۱۶ء میں تارنی چرن متر کی عمر ۴۵ سال تھی۔ (FORT WILLIAM 27 GUNE. 1816 - 22 APRIL 1818 HOME MISC. VOL. 6, P. 290, 293.

بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۹۲

اس روشنی میں ان کا سن پیدائش ۱۷۷۱ء نکلتا ہے۔ دوم یہ کہ مئی ۱۸۳۰ء میں رڈیل نے پنشن پانے والے ہندوستانی اساتذہ کے حلیئے کی تفصیلات پروفیسروں سے طلب کرکے اکاؤنٹنٹ جنرل سی۔ مارے اور نائب خزانچی جی۔ ایچ بارویل کے پاس بھیجی تھیں۔ ولیم پرائس نے اپنی رپورٹ میں تارنی چرن کی عمر ۵۸ سال لکھی تھی۔ (FORT WILLIAM, 18 FED. 1830 - 29 OCT. 1831, HOME MISC. VOL. 13, 47. 52.

بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۱۳۷
اس حساب سے انکا سن پیدائش ۱۷۷۲ء قرار پاتا ہے۔

وہ ۴ رمئی ۱۸۰۱ء میں سیکنڈ منشی کے عہدہ پر کالج کونسل کی جانب سے فائز ہوتے ہیں[1] لیکن ۱۹ دسمبر ۱۸۱۶ء میں سکریٹری لاکٹ نے ایچ. ووڈ کے پاس کالج کی جو تفصیلات بھیجیں ان سے علم ہوتا ہے کہ تارنی چرن نے ستمبر ۱۸۰۱ء سے اپنے عہدہ پر کام کرنا شروع کیا تھا[2]۔ ان کا مشاہرہ سو روپے ماہوار تھا۔

۱۹ دسمبر ۱۸۰۹ء میں میر منشی شیر علی افسوس کا انتقال ہو جانے کے بعد ۲۱ دسمبر ۱۸۰۹ء

---

[1] PROCEEDINGS OF THE COLLEGE OF FORT WILLIAM, VOL 559, P.4.

عتیق صدیقی نے گل کرسٹ اور اس کا عہد میں حوالہ توضیح دیا ہے لیکن کالج کونسل کی کاروائی کی تاریخ ۴ رمئی ۱۸۰۱ء کی بجائے ۲۹ راپریل ۱۸۰۱ء درج کی ہے (ص ۱۴۲) یہ درست نہیں ہے۔ ۲۹ راپریل ۱۸۰۱ء کی کالج کونسل کی کاروائی میں مختلف زبانوں کے شعبوں کے لئے منشیوں کی تعداد اور ان کی تنخواہوں کا تعین کیا گیا تھا۔

[2] FORT WILLIAM, 20 APRIL 1816-22 APRIL 1818, HOME MISC. VOL 6, P.290-293.

بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۹۲۔

نے تارنی چرن میر منشی مقرر ہوئے۔[1] انکا مشاہرہ دو سو روپے ہو گیا۔ کاظم علی جوان کو تارنی چرن کا سابق عہدہ ملا۔

تارنی چرن متر "نقلیات لقمانی" کے مترجمین میں شامل تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے "نقلیات ہندی" کی تصحیح کی تھی۔ وہ "کلیات میر" کے مرتبین میں شامل تھے۔ انہوں نے پرش پریکھا کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ یہ روشن علی انصاری جونپوری کے فارسی ترجمہ خلاصۃ الحساب کی تصحیح و نظر ثانی میں جان علی اور غلام اکبر کے ساتھ شامل تھے[2] جس کے لئے انھیں ۱۲۲۵ روپے دیئے گئے۔[3]

گل کرسٹ کا پروگرام تھا کہ ایک مشرقی زبان کا ادب دوسری مشرقی زبان میں منتقل کیا جائے اور انکا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو۔ اس منصوبے میں تارنی چرن بھی شریک تھے۔ اس پروگرام کے تحت سب سے پہلے گل کرسٹ کی (A SKETCH OF HINDOOSTANI یا PRACTICAL OUTLINES ORTHEOPY IN THE ROMAN CHARACTER (1802)" ترتیب دی گئی۔ گل کرسٹ کو

---

[1] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۸۴

ڈیوڈ کوف نے برٹش اور نیلزم (ص ۱۱۰) PCFW, DL XI, Jan 1810 P. 186 کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"He was hired by the College of Fort William on May 4th 1801, as second Pundit of Hindoostani Department at a Salary of 100 Rupees a month. Later that year, When the Chief Pundit Miri Ali died William Hunter then Urdu Professor elevated Mitra to this Post and increased his Salary to 200 Rupees Per month"

[2] کلکتہ کے قدیم اردو مطابع ص ۸۴ [3] فورٹ ولیم کالج ص ۱۰۲

اس کاوش میں تارنی چرن کا تعاون حاصل رہا۔ نقلیات ہندی بھی ان کے تعاون کی مثال میں پیش کیا سکتی ہے۔

تارنی چرن متر فورٹ ولیم کالج کے ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ دوسرے تعلیمی اداروں سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ وہ کلکتہ اسکول بک سوسائٹی کے دیسی سکریٹری تھے۔ سوسائٹی کی سنہ ۱۸۲۰ء۔ سنہ ۱۸۲۱ء کی ایک رپورٹ سے علم ہوتا ہے کہ کیپٹن روبک کی کتاب "کھڑی بولی کی کہانیاں" جو روبک کے انتقال کے بعد ادھوری رہ گئی تھی اسے تارنی چرن نے اپنے طور پر مکمل کیا تھا۔[۱] ڈاکٹر گیان چند جین نے ایک کتاب "حکایات نصیحت آموز" تارنی چرن سے منسوب کی ہے۔[۲]

تارنی چرن نے اپنا بیشتر وقت درس وتدریس میں گذارا۔ اپنی بے پناہ لسانی صلاحیتوں کے باعث وہ گل کرسٹ کے دست راست رہے۔ اوران کے لسانی پروگرام میں ہاتھ بٹاتے رہے۔ تارنی چرن کے تعاون کا اعتراف کرتے ہوئے گل کرسٹ نے "ORIENTAL FABULIST" کے دیباچہ میں لکھا ہے:۔

"It behooves me now more particularly to specify that to Tarnee Charan Mitra's patient labour and considerable proficiency in the English tongue, am I greatly indebted for the accuracy and despatch with which the collection has been at last completed."[۳]

۱؎ بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات ص ۱۴۱ ۲؎ اردو کی نثری داستانیں ص ۲۰۰

۳؎ Oriental fabulist P. xxiv بحوالہ British Orientalism P. 110.

انہوں نے ڈیم پرائس کی تالیف "Hindee and Hindoostani Selections which are Prefixed, The Rudiments of Hindoostani and Bruj Bhakha Grammar" کی ترتیب کا کام انجام دیا تھا۔[1]

کلکتہ اسکول بک سوسائٹی کی ایک رپورٹ ۱۸۳۰ء۔۱۸۳۱ء سے علم ہوتا ہے کہ تارنی چرن نے انگریزی ہندوستانی لغت کا ایک مسودہ کمیٹی کو پیش کیا تھا جسے شکریہ کیساتھ قبول کر لیا گیا تھا۔[2]

تارنی چرن ۱۸۳۰ء تک فورٹ ولیم کالج سے وابستہ رہے۔ یکم جون ۱۸۳۰ء میں سرکاری سکریٹری پرنسپ کے ایک حکم نامہ کی رو سے تارنی چرن کو مذکورہ تاریخ میں پنشن کے قابل قرار دے کر شعبہ سے الگ کر دیا گیا۔ پنشن کی رقم سو روپے تھی۔[3]

مئی ۱۸۳۰ء میں ہی روڈیل نے پنشن یافتہ ہندوستانی اساتذہ کے حلیئے کی تفصیلات پروفیسروں سے مانگیں۔ پرائس نے اپنے شعبہ کے اساتذہ کی جو تفصیلات بھیجیں۔ اس میں تارنی چرن کے بارے میں انہوں نے لکھا تھا کہ:۔

"تارنی چرن متر، سو روپے پنشن، اٹھاون سال کی عمر، چھوٹا قد

---

[1] Hindee and Hindoostani Selections which are Prefixed, The Rudiments of Hindoostanee and Bruj Bhakha Grammar, Introduction. P. 11.

[2] بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات ص ۱۴۸

[3] Fort William, 18 Feb 1830 - 29 Oct. 1831, Home Misc. Vol. 13, P. 47-52. بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۱۳۶

دور کی چیزیں نہیں دیکھ سکتے، تھوڑا جھک کر چلتے ہیں، اوپر کے ہونٹ پر ایک تل ہے" [۱]

کلکتہ سے تارنی چرن کو کسی ضروری کام کے تحت بنارس جانا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بنارس میں ہی پنشن پانیکی درخواست کی۔ ۲۰ اپریل ۱۸۳۲ء میں انکی درخواست منظور کرلی گئی اور تارنی چرن متر سے متعلق ساری اطلاعات اور ہدایات بنارس کے کلکٹر کو بھیج دی گئیں۔ تارنی چرن متر جب بنارس آئے اسوقت انکی عمر ساٹھ سال تھی۔ [۲] شانتی رنجن بھٹاچاریہ لکھتے ہیں کہ :۔

"کلکتے سے مہاراجہ کاشی کے دربار میں چلے گئے۔ راجا رادھا کانت دیپ کی کوششوں سے انہیں وہاں ملازمت ملی" [۳]

بعد کے حالات کا علم نہ ہوسکا۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ ہی کے قیاس کے مطابق ان کا انتقال ۱۸۳۷ء میں کاشی میں ہوا۔ [۴]

---

[۱] Fort William, 18 Feb. 1830-29 Oct. 1831 Home Misc Vol. 13, P. 47, 52. بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۱۳۶

[۲] Fort William, 26 Oct. 1831 - 19 Aug. 1833, Home Misc Vol. 14, P. 102, 170 بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۱۴۱

[۳] [۴] بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات ص ۱۴۴، ۱۵۰

۹

میر بخشش علی

میر بخشش علی شعبۂ ہندوستانی کے باقاعدہ ملازم تھے۔ انکا نام کالج کونسل کی کارروائیوں میں اور "انالس آف دی کالج آف فورٹ ولیم" میں بخشش علی درج ہے۔ لیکن "اقبال نامہ" کے دیباچہ میں انہوں نے اپنا پورا نام سید بخشش علی فیض آبادی لکھا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ فیض آباد کے رہنے والے تھے۔

مئی ۱۸۳۰ء میں سکریٹری رڈیل نے پنشن پانے والے ہندوستانی منشیوں کے حلیئے کی تفصیلات طلب کی تھیں۔ چنانچہ ہندوستانی کے پروفیسر ولیم پرائس نے بخشش علی کے بارے میں لکھا ہے۔

> "میر بخشش علی پچاس روپیہ پنشن، ۴۸ سال کی عمر، درمیانہ قد رنگ کچھ گورا، داہنیں گال پر ایک چیچک کا سا داغ ہے۔"[۱]

اس لحاظ سے انکا سن پیدائش ۱۷۸۲ء نکلتا ہے۔ بخشش علی بھی غالباً صاحبان عالی شان کی نوازشوں اور عنایتوں کا شہرہ سن کر کلکتہ آئے اور فورٹ ولیم کالج میں ملازمت اختیار کرلی۔ جاوید نہال نے لکھا ہے کہ انکو کالج کی ملازمت نہ مل سکی تھی۔[۲] حالانکہ انکا تقرر نومبر ۱۸۰۳ء میں منشی کے عہدہ پر ہوا تھا۔

---

[۱] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۱۳۷

[۲] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب۔ ص ۳۶۸

انکا شاہرہ اسّی روپے ماہوار تھا۔[1]

کالج کونسل کی ۲۷ فروری ۱۸۱۶ء اور ۲۲ اپریل ۱۸۱۸ء کی درمیانی کارروائی سے علم ہوتا ہے کہ مارٹن اور ٹیلر نے بخشش علی اور دیگر منشیوں کا فارسی اور ہندوستانی کا امتحان لیا تھا۔ اس امتحان میں کامیابی کے بعد بخشش علی سیکنڈ منشی مقرر ہوئے۔[2] اور مستقبل میں میر منشی کے عہدہ کے قابل بھی ہو گئے۔ لیکن وہ ۱۸۳۰ء تک سیکنڈ منشی ہی رہے۔ انکا شاہرہ سو روپے ہو گیا تھا۔ یکم جون ۱۸۳۰ء میں انکو سیکنڈ منشی کے عہدہ سے ہی ریٹائر کر دیا گیا۔ انکی پنشن پچاس روپے ماہوار منظور کی گئی۔[3]

بخشش علی نے "سیر المتاخرین" کے ایک مخصوص حصے کا ترجمہ "اقبال نامہ" کے نام سے کیا تھا۔

---

[1] گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۲۰۰

[2] Fort William, 27 Feb. 1816 - 21 April 1818, Home Misc., Vol. 6 P. 262. 265.

بحوالہ فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۹۲

[3] Fort William 18 Feb. 1830 - 29 Oct. 1831, Home, Misc. Vol. 13, P. 47 - 52.

بحوالہ فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۱۳۷

۱۰

میر امن دلی والے

میر امن کے سوانح نگاروں نے انکا اصلی نام میر امان بتایا ہے[۱] لیکن انکے خود نوشت حالات میں اس نام کا کہیں سے سراغ نہیں ملتا۔ وہ واضح طور سے خود کو میر امن دلی والا لکھتے ہیں:-

"پہلے احوال یہ عاصی گنہگار میر امن دلی والا بیان کرتا ہے"......[۲]

"گنج خوبی" کے دیباچہ میں بھی انہوں نے میر امن دلی والے ہی لکھا ہے[۳] اس کے علاوہ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا،[۴] لنگوسٹک سروے آف انڈیا،[۵] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام،[۶] اناس آف دی کالج

---

[۱] داستان تاریخ اردو (حامد حسن قادری) ص ۸۴، سیر المصنفین (محمد یحییٰ تنہا) ص ۷۱، ارباب نثر اردو (سید محمد) ص ۲۰۴، طبقات شعرائے ہند (کریم الدین وفیلن) طبقہ سوم مرتبہ عطا کاکوی ص ۱۲۔

[۲] باغ و بہار میر امن مرتبہ سید ابو الخیر کشفی ص ۷۵

[۳] گنج خوبی۔ میر امن مطبوعہ ۱۸۴۶ ص ۵

[۴] Encyclopaedia Britannica, Vol. XI, P. 575

[۵] Linguistic Survey of India, vol. IX, Part I P. 30.

[۶] Encyclopaedia of Islam, vol I P. 430.

آف فورٹ ولیم[1] اور گل کرسٹ کی تحریروں میں میر امن ہی ملتا ہے۔ کالج کونسل کی کارروائیوں میں بھی میر امن (MEERUMMAN) ہی درج ہے۔

میر امن کا تخلص لطف تھا اس کا واضح ثبوت گل کرسٹ کی ایک تصنیف سے ملتا ہے انہوں نے Stranger's East Indian Guide to the East Indian Guide Hindoostani میں جہاں میر امن کی غزل ردمن میں درج کی ہے۔ وہاں میر امن لطف لکھا ہے[2] میر امن نے بھی باغ و بہار کے خاتمہ پر درج شدہ اشعار میں اپنا تخلص لطف ہی استعمال کیا ہے[3] لیکن محمد یحییٰ تنہا لکھتے ہیں کہ:۔

"آپ کا اصلی نام میر امان ہے اور امن تخلص ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں اشعار میں اپنا تخلص لطف بھی ظاہر کیا ہے"[4]

میر امن کے سوانحی حالات کے بارے میں جہاں کہیں جو کچھ بھی درج ہے اس کا ماخذ باغ و بہار کا دیباچہ ہے جس میں میر امن نے اپنے سوانحی حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ باغ و بہار کے دیباچے سے علم

---

[1] Annals of the College of Fort William, Appendix No.II P. 32.

[2] Stranger's East Indian Guide to the East Indian Guide Hindoostani, P. 127.

[3] باغ و بہار۔ مرتبہ ابوالخیر کشفی ص ۲۰۸

[4] سیر المصنفین۔ محمد یحییٰ تنہا مرتبہ امیر اللہ شاہین ص ۱۱

ہوتا ہے کہ میرامن کے آبا و اجداد[1] ہمایوں بادشاہ[2] کے عہد سے دیگر تمام بادشاہوں کے دربار سے وابستہ رہے۔ (غالباً عالمگیر ثانی تک) انھیں ان تمام بادشاہوں کی سرپرستی اور عنایات حاصل تھیں۔ بادشاہوں نے انھیں عہدوں اور جاگیر و وظائف سے بھی سرفراز کیا تھا۔ اور "خانہ زاد موروثی" "منصب دار قدیمی" جیسے الفاظ سے نوازا تھا۔ لیکن ان کا حاصل کردہ عروج و اقبال جاودانی نہ ہو سکا سورج مل جاٹ نے جاگیر ضبط کر لی اور احمد شاہ درانی کے حملے نے گھر بار تاراج کر ڈالا۔ اسی تباہی سے تنگ آکر میرامن نے ترک وطن کیا[3]۔

سورج مل جاٹ احمد شاہ کے عہد میں ۱۱۶۶ھ ۱۷۵۳ء میں دہلی پر حملہ آور ہوا۔ اور اس نے بہت لوٹ مار مچائی۔ سید واڑہ اور بے جل مسجد وغیرہ محلوں کو تباہ و برباد کر دیا[4]۔ میرامن کی جاگیر

---

[1] KAHTARINE SMITH DIEHL نے باغ و بہار کے ترجمے (L. F. SMITH) کے مقدمہ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ میرامن کے آبا و اجداد ایران سے آئے تھے (ص ۱)

[2] ہمایوں بادشاہ دو مرتبہ تخت نشین ہوا تھا۔ اول اول وہ بابر کے بعد ۹۳۷ھ ۱۵۳۰ء میں آگرہ کے تخت پر بیٹھا۔ اس نے کل ۱۱ سال ۵ ماہ اور محض چند روز حکومت کی تھی کہ شیر شاہ کیساتھ جنگ میں شکست کھا کر ایران چلا گیا۔ یوں ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ شیر شاہ کے بعد تھوڑی تھوڑی مدت کے لئے درمیان میں پانچ بادشاہ ہوئے۔ پانچویں بادشاہ احمد خاں سکندر شاہ (رجب ۹۶۲ھ ۱۵۵۴ء تا شعبان ۹۶۲ھ ۱۵۵۴ء کل دو ماہ) کے عہد حکومت میں ہمایوں حملہ آور ہوا اور احمد خاں شکست کھا کر بنگال کی سمت فرار ہو گیا اس طرح ہمایوں رمضان ۹۶۲ھ ۱۵۵۴ء میں دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ اس نے کل ۶ ماہ اور چند ہی دن حکومت کی تھی کہ شیر منڈل کے قلعہ کہنہ سے اترتے وقت گر کر زخمی ہوا اور یازدہم ربیع الاول ۹۶۲ھ کو چل بسا۔ (آثار الصنادید ص ۵۵، ۵۶)

[3] دیباچہ باغ و بہار۔ مرتبہ ابوالخیر کشفی ص ۷۔

[4] Fall of Mughal Empire by Jadunath Sarkar Vol I, P. 271.

ضبط کرنے کا واقعہ بھی اسی سنہ کا ہے۔ اس لئے کہ سورج مل نے ۱۷۵۳ء کے علاوہ ۱۷۶۰ء اور ۱۷۶۴ء میں دو حملے اور کئے تھے لیکن ۱۷۶۰ء میں مرہٹے اس کے ساتھ تھے اور انہوں نے صرف قلعۂ دہلی میں لوٹ مچائی تھی۔ ۱۷۶۴ء کے حملے میں خود سورج مل مارا گیا تھا۔

باغ و بہار کے دیباچہ میں میرامن آگے چل کر لکھتے ہیں :-

"جب احمد شاہ ابدالی کابل سے آیا اور شہر کو لٹوایا۔ شاہ عالم پورب کی طرف تھے۔ کوئی وارث اور مالک ملک کا نہ رہا۔ شہر بے سر ہو گیا"[1]

سورج مل کے حملے کے بعد احمد شاہ ابدالی (درانی) نے ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۶ء، ۱۱۷۰ھ/۱۷۶۰ء اور ۱۱۷۵ھ/۱۷۶۲ء میں تین حملے اور کیے[2] بقیہ حملے وہ سورج مل جاٹ کے مذکورہ حملے سے قبل کر چکا تھا۔ ۱۷۵۷ء کے حملے کے وقت عالمگیر ثانی تخت نشین تھا لیکن ۱۷۵۹ء میں اسے قتل کر دیا گیا۔ اس وقت شاہ عالم ثانی اطراف بنگال میں موجود تھا۔ اس نے وہیں سے اپنی فرماں روائی کا اعلان کر دیا۔[3] اس وقت دہلی کا عملی طور سے کوئی بادشاہ نہ تھا۔ شاہ جہاں ثانی کو تخت پر بٹھایا گیا لیکن کسی نے اسے بادشاہ تسلیم نہ کیا اور تخت اس وقت تک کس مپرسی کے عالم میں پڑا رہا جب تک کہ ۱۷۶۰ء میں جواں بخت جہاں دار شاہ خلف شاہ عالم ثانی تخت پر نہ بیٹھا۔

میرامن کا یہ بیان کہ "کوئی وارث اور مالک ملک کا نہ رہا" غالباً انہیں واقعات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس سے یہ علم ہوتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی کے جس حملے کا ذکر میرامن نے کیا ہے وہ ۱۷۶۰ء

---

[1] دیباچہ باغ و بہار۔ مرتبہ ابوالخیر ص ۸

[2] خزانۂ عامرہ۔ مولوی غلام علی آزاد بلگرامی ص ۹۷

[3] " " ص ۹۱

کا حملہ ہے۔ اس طرح میر امن نے ۱۷۵۲ء سے ۱۷۶۰ء تک تقریباً آٹھ سال کی تباہی و بربادی کا ذکر کیا ہے۔ جس سے تنگ آکر انہوں نے ترک وطن کیا۔

مندرجہ بالا بیانات سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ میر امن دہلی میں ہی پیدا ہوئے۔ سن پیدائش کا تعین دشوار ہے۔ ان کے خود نوشت حالات سے یا دیگر کسی مستند ذریعے سے اسکا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ ممتاز منگلوری نے مختلف قرائن و شواہد سے یہ ثابت کیا ہے کہ میر امن محمد شاہ بادشاہ (۱۷۱۹ء۔ ۱۷۴۸ء) کے عہد میں پیدا ہوئے۔[1]

۱۷۶۰ء میں دہلی کا قیام ترک کرکے میر امن مع اہل و عیال عظیم آباد (پٹنہ) میں وارد ہوئے۔ یہاں انہوں نے کئی سال گزارے لیکن ان کو سکون نصیب نہ ہوا۔ آخر کار اپنے اہل و عیال کو عظیم آباد میں چھوڑ کر وہ ۱۷۹۸-۹۹ء[2] میں تنہا کلکتہ آئے۔ کچھ دن تو وہ بیکار رہے۔ بعد میں انہیں نواب دلاور جنگ کے چھوٹے بھائی محمد کاظم خاں کی معلمی مل گئی۔ جہاں وہ تقریباً دو سال تک ملازم رہے لیکن یہاں بھی وہ خود کو مطمئن نہ محسوس کر سکے۔ چنانچہ انہوں نے سلسلہ ترک کر دیا اور میر منشی بہادر علی حسینی کے توسط سے ڈاکٹر گل کرسٹ تک پہونچے۔ گل کرسٹ کی نگاہوں سے میر امن کا جوہر پوشیدہ نہ رہ سکا اور انہوں نے میر امن کو شعبۂ ہندوستانی سے منسلک کرلیا۔

۴ رمئی ۱۸۰۱ء کو میر امن کا تقرر بحیثیت ماتحت منشی عمل میں آیا۔ ان کا مشاہرہ چالیس

---

[1] مقدمہ باغ و بہار۔ مرتبہ ممتاز منگلوری ص ۳۸

[2] یہ سنہ نواب دلاور جنگ کے یہاں کی ملازمت اور کالج میں تقرر کی تاریخ کو پیش نظر رکھ کر متعین کیا گیا ہے۔

روپے ماہوار تھا۔[1]

میرامن کالج سے کل پانچ سال وابستہ رہے۔ ان ایام میں ان پر ضعف اور ناتوانی کا غلبہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے کالج کونسل کو اپنی علیحدگی کے لئے درخواست دی اور ۴ر جون ۱۸۰۶ء میں کالج کونسل نے انکو حسب خواہش چار ماہ کی تنخواہ دے کر شعبہ سے الگ کر دیا۔[2] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی عمر کے آخری حصہ میں انہوں نے کالج کی ملازمت اختیار کی تھی۔

کالج سے علیحدگی کے بعد میرامن کلکتہ ہی میں مقیم رہے اور یہیں انہوں نے وفات

---

[1] Proceedings of the College of fort William, Vol. 559, P. 5

ممتاز منگوری نے گل کرسٹ اور اس کا عہد (ص ۱۵۳) کے حوالے سے میرامن کے تقرر کی تاریخ ۱۹ر اپریل ۱۸۰۱ء درج کی ہے۔ جو غلط ہے۔ اس کے بعد وہ مذکورہ کتاب کے ص ۱۵۵ اور ۱۹۸ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ کالج کونسل کی پہلی جلد کے ابتدائی اوراق میں جہاں منشیوں کے فرائض پر روشنی ڈالی گئی ہے وہاں ۴ر مئی ۱۸۰۱ء کی روداد میں میرامن کے تقرر (بحیثیت ماتحت منشی بہ مشاہرہ ۴۰ روپے ماہوار) کا بھی ذکر ہے۔ ممتاز صاحب کا یہ بیان درست نہیں۔ "گل کرسٹ اور اس کا عہد" کے ص ۱۵۵ پر جہاں منشیوں کے فرائض کا ذکر ہے (بہ حوالہ ۴ر مئی ۱۸۰۱ء کی کالج کونسل کی کارروائی) وہاں میرامن کا نام نظر نہیں آتا ہے۔ ہاں ص ۱۹۸ پر البتہ ان کے تقرر کی تاریخ ۴ر مئی ۱۸۰۱ء اور مشاہرہ ۴۰ روپے درج ہے۔ یہی درست بھی ہے۔ میرامن کے تقرر کی مذکورہ دو تاریخوں سے قطع نظر گل کرسٹ اور اسکا عہد کے ص ۴۴ پر ایک تیسری تاریخ ۲۹ر اپریل ۱۸۰۱ء بھی نظر آتی ہے۔ دراصل میرامن کے تقرر کی تاریخوں میں تضاد کا سبب یہی ہے کہ عتیق صدیقی نے اپنی مذکورہ کتاب کے مختلف صفحوں پر مختلف تاریخ درج کی ہے۔

[2] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۶۹

پائی۔ سن وفات کا تعین مشکل ہے۔[۱] میرامن کثیر العیال تھے۔ ان سے دس نفر وابستہ تھے۔[۲]

میرامن نے کالج کی ملازمت کے دوران باغ و بہار (۱۸۰۲ء) اور گنج خوبی (۱۸۰۲ء)

تالیف کیں۔

میرامن باقاعدہ شاعر نہیں تھے۔ انہوں نے جو کچھ فکر سخن کی وہ محض تفریحاً اور شغلاً

اس میدان میں وہ کسی کے شاگرد ہونے کے بھی گنہگار نہیں۔ کریم الدین کا خیال ہے کہ میرامن صاحب

دیوان تھے[۳] لیکن اس کی تصدیق کسی اور ذریعہ سے نہ ہو سکی۔ باغ و بہار اور گنج خوبی میں درج

اشعار ان کی شاعری کا بہت معیاری نمونہ پیش نہیں کرتے۔ ان کی غزل گل کرسٹ نے

STRANGERS EAST INDIAN GUIDE میں رومن رسم الخط میں شامل کی ہے۔

---

[۱] ممتاز منگلوری نے نصر اللہ خورجی اور مجتبیٰ خاں کے حوالے سے میرامن کا سنہ وفات ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۲ء قرار دیا ہے (مقدمہ باغ و بہار ص ۳۸، ۳۹) لیکن یہ درست نہیں ۱۸۰۳ء میں وہ تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف تھے۔ اس کے علاوہ ۱۸۰۶ء تک کالج میں ان کی موجودگی کا علم واضح طور سے ہوتا ہے۔

ابوالخیر کشفی نے مختلف تاریخی بنیادوں پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ میرامن نے ستر سال کی عمر پائی (مقدمہ باغ و بہار ص ۲۱)

عبدالمنان نے حامد اللہ افسر (اردو کی کلاسیکی کتابیں) اور عتیق صدیقی کے ذاتی مراسلے کے حوالے سے میرامن کا سنہ وفات ۱۸۰۶ء یا ۱۸۰۹ء متعین کیا ہے۔ (میرامن دہلوی اور انکی نثری خدمات غیر مطبوعہ مقالہ ص ۲۹۹)

[۲] دیباچہ گنج خوبی مطبوعہ ۱۸۴۶ ص ۶

[۳] طبقات شعرائے ہند (طبقہ سوم) ص ۱۳

(۱۱)

حیدر بخش حیدری

حیدری کے متعلق ذوالفقار علی مست نے لکھا ہے :-

"میر حیدر بخش متخلص بہ حیدری، اگرچہ کسب سرمایۂ علوم رسمی چندانش دست ندادہ منزہ بہ بخشش خاں سالار انعام حیدری خوان جوان الوان موزونیت و لطافت و ظرافت طبع ورخش او افتادہ از غایت حسن خلق عندلیب العیش بر شاخسار دلہائے آشنا و بیگانہ، آشیانہ می سازد در مدرسۂ ہندی سرکار کمپنی انگریز بہادر مدتے بزمرۂ منشیان دستاران گزرانید، از ناموافقت ہوائے کلکتہ از ہوا و ہوس نوکری درگذشتہ باندک ۔ داری کہ از سرکار مقرر شدہ مکتفی گشتہ در بنارس او وزرا جانب است" ۔[1]

بینی نرائن جہاں لکھتے ہیں :-

حیدری تخلص، نام میر حیدر بخش، دلی کے رہنے والے ۔ بالفعل مسند حیات پر موجود ہیں اور اس خاکسار کو نہایت انکی خدمت میں بندگی اور ما شعار اس طرح کے کہتے ہیں .... ۔"[2]

---

[1] ملخص تذکرہ ریاض الوفاق مرتبہ سید حسن (معاصر حصہ ۲۱) ص ۵ [2] دیوان جہاں (مطبوعہ) ص ۹۹

نساخ کا کہنا ہے :-

"حیدری تخلص، حیدر بخش دہلوی، ۱۲۱۶ھ میں کلکتہ میں موجود تھے۔ انکی آرائش محفل یعنی "ہفت سیر حاتم" نظر سے گزری ہے"[۱]

تذکرہ نگاروں کے ان بیانات سے قطع نظر حیدری نے "گلدستہ حیدری" اور "تذکرۂ گلشن ہند" میں خود بھی اپنی زندگی کے حالات درج کئے ہیں۔ جس سے علم ہوتا ہے کہ حیدری کے والد نجف اشرف کے رہنے والے تھے۔ بعد میں دہلی میں سکونت اختیار کی۔ ہو سکتا ہے کہ ایران کے انتشار و خلفشار کے سبب انہوں نے ترک وطن کیا ہو۔ اور دیگر مہاجرین اور تارکین وطن کی طرح محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ہندوستان چلے آئے ہوں۔

حیدری کے والد کا نام سید ابوالحسن تھا۔ حیدری کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ سن پیدائش کا تعین دشوار مسئلہ ہے۔ حیدری کے ذکر سے عبارت تذکرے بھی اس باب میں خاموش ہیں۔ جاوید نہال نے بغیر کسی حوالے کے یہ لکھا ہے کہ حیدری جب کلکتہ آئے اسوقت ان کی عمر چالیس سال تھی۔ اور اس حساب سے انکا سن پیدائش ۱۷۶۸ء قرار دیا ہے[۲] مختار الدین آرزو نے بارہویں صدی کے نویں عشرے میں انکی پیدائش متعین کی ہے[۳] بلوم ہارٹ کا بیان ہے کہ جس وقت سید ابوالحسن دہلی سے بنارس پہنچے اسوقت حیدری نوجوان تھے[۴] ان تمام قیاسات سے قطع نظر

---

[۱] سخن شعراء۔ ص ۱۴۳ [۲] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۱۱۹

[۳] مقدمہ گلشن ہند۔ مختار الدین آرزو ص ۱۲

[۴] بلوم ہارٹ۔ فہرست مخطوطات اردو ص ۴، نیز گارساں دی تاسی کی تاریخ ادب ہندی و ہندوستانی ص ۵۴۰۔ ۵۵۰ بحوالہ مقدمہ گل مغفرت (تحشیہ) ص ۸

سن پیدائش دریافت کرنے کی سب سے مضبوط بنیاد حیدری کا بیان ہے ۔ وہ گلدستۂ حیدری کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ جس وقت سید ابوالحسن نے دلی چھوڑی اور لالہ سکھدیو رائے کے ہمراہ بنارس آئے اس وقت حیدری نہایت خورد سال تھے۔ سید ابوالحسن نے کئی سال لالہ سکھدیو رائے کی رفاقت میں گذارے۔ یہاں تک کہ حیدری سن بلوغ کو پہونچے۔ انہیں ایام میں نواب علی ابراہیم خاں بنارس کے حاکم ہوئے تو حیدری کے والد نے انکی ملازمت اختیار کی۔[1]

نواب علی ابراہیم خاں (مؤلف تذکرۂ گلزار ابراہیم) ستمبر ۱۷۸۱ء میں بنارس کے مجسٹریٹ مقرر ہوئے تھے۔ حیدری کو سن بلوغ تک پہونچنے کو اگر ہم ۱۴ سال تعبیر کرلیں تو سن پیدائش ۱۷۶۷ء قرار پاتا ہے۔ انہیں بنیادوں پر ڈاکٹر وحید قریشی نے حیدری کا سن پیدائش ۱۱۸۲ھ/۱۷۶۸ء یا ۱۱۸۳ھ/۱۷۶۹ء درج کیا ہے۔[2]

جن ایام میں حیدری کی پیدائش ہوئی دہلی کے حالات بے حد پرآشوب تھے۔ ۱۷۵۹ء میں عالمگیر ثانی کے قتل کے بعد دہلی کی سیاسی فضا بہت آلودہ ہوگئی تھی۔ تخت دہلی پر شاہ جہاں ثانی کو بٹھایا گیا لیکن کسی نے اسے بادشاہ تسلیم نہیں کیا۔ ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ درانی نے چوتھا حملہ کیا۔[3] اور مرہٹوں کو شکست دے کر ۱۷۶۰ء میں دہلی میں داخل ہوا۔ مرہٹوں نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے دوبارہ کثیر لشکر کے ساتھ دہلی پر حملہ کیا۔ قلعۂ دہلی میں لوٹ مچائی۔ اور ۱۷۶۰ء میں جواں بخت جہاں دار شاہ خلف شاہ عالم ثانی کو تخت پر بٹھایا۔

---

[1] دیباچہ گلدستۂ حیدری بحوالہ دیوان حیدری ص ۱۲

[2] کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ۔ ص ۱۸۱

[3] Ahmad Shah Durrani by Gande Singh, P. 153.

سنہ ۱۷۶۴ء میں سورج مل سرکشی پر آمادہ ہوا۔ نجیب الدولہ نے دہلی سے باہر نکل کر مقابلہ کیا۔ اور سورج مل مارا گیا۔ اس کا بدلہ لینے کیلئے سورج مل کا بیٹا جواہر مل مرہٹوں کی مدد سے دہلی پر حملہ آور ہوا مگر اسے دو تین بار شکست ہوئی۔ سنہ ۱۷۷۱ء میں مرہٹے پھر دہلی کی جانب متوجہ ہوئے۔ اور انہوں نے ۲۵ دسمبر سنہ ۱۷۷۱ء میں شاہ عالم ثانی کو تخت دہلی پر متمکن کیا۔ اس کے بعد مرہٹوں کا عمل دخل بڑھتا گیا۔ انہوں نے طوائف الملوکی اور جنگ و جدل کا طویل سلسلہ شروع کیا۔ ملک کا اقتصادی نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ شاہی خزانے پر بدحالی کے مہیب سائے پھیل گئے تھے۔ اس کشاکش اور نامساعد حالات نے اہل شہر کو ترک وطن پر مجبور کر دیا تھا۔

ماحول کے انتشار اور معاشی ضرورتوں کے تحت حیدری کے والد مع حیدری دہلی سے نکلے اور لالہ سکھدیو رائے کے ہمراہ بنارس آئے۔ اور انکی رفاقت میں دن گزارتے رہے۔ جب نواب علی ابراہیم خاں بنارس کے مجسٹریٹ ہوئے تو حیدری کے والد نے انکی ملازمت اختیار کر لی اور تعلیم و تربیت کے واسطے حیدری کو نواب صاحب کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ حیدری نے قاضی عبدالرشید خاں، مولوی غلام حسین غازی پوری اور سید جمعیت علی رضوی سے اکتساب علم و فیض کیا۔[1]

صاحبان عالی شان خصوصاً گل کرسٹ کی ادب نوازی اور علم دوستی کی خبریں حیدری کے کانوں تک پہونچیں۔ چنانچہ انہوں نے سنہ ۱۲۱۴ھ ۱۸۰۰-۱۷۹۹ء میں قصہ مہر و ماہ کا اردو میں ترجمہ کیا اور بطور نمونہ ساتھ لے کر رجب سنہ ۱۲۱۴ھ میں بنارس سے روانہ ہوئے۔[2] اور تری کی راہ سے غازی پور ہوتے ہوئے مرشد آباد کی سمت چلے۔ جب غازی پور پہونچے تو وہاں سے مرزا محمد فاضل کے بیٹے مرزا

---

[1] دیباچہ گلدستۂ حیدری بحوالہ دیوان حیدری ص ۱۲، ۱۳

[2] دیباچہ مہر و ماہ بحوالہ دیوان حیدری ص ۱۴، ۱۵

محمد علی (دہلی کے رہنے والے) بھی مرشد آباد کی جانب روانہ ہوئے۔ اس سفر میں انہوں نے حیدری کو ایک نسخہ بطور تذکرہ "ترتیب دینے کی ترغیب دی۔ چنانچہ حیدری نے تذکرہ گلشن ہندی مرتب کیا۔[۱]

حیدری نے کلکتہ پہونچکر گل کرسٹ کی خدمت میں "قصہ مہر و ماہ" کا نسخہ پیش کیا۔ گل کرسٹ کو یہ قصہ بہت پسند آیا۔ اور یہی قصہ فورٹ ولیم کالج میں ملازمت کا سبب بنا۔ چنانچہ ۴ رمئی سنہ ۱۸۰۰ء میں حیدری کا تقرر منشی کے عہدہ پر عمل میں آیا۔ انکا مشاہرہ چالیس[۳] روپے ماہوار تھا۔[۲]

گل کرسٹ کی فرمائش پر حیدری نے مثنوی لیلیٰ مجنوں (۱۲۱۵ھ سنہ ۱۸۰۱ء) کو اردو میں منتقل کیا۔ اس کے بعد توتا کہانی (سنہ ۱۸۰۱ء) آرائش محفل (سنہ ۱۸۰۱ء) گلدستہ حیدری (سنہ ۱۸۰۱ء) جامع القوانین (سنہ ۱۸۰۳ء) گلزار دانش (سنہ ۱۸۰۴ء) ہفت پیکر (سنہ ۱۸۰۹ء) تاریخ نادری (سنہ ۱۸۰۹ء) اور گل مغفرت (سنہ ۱۸۱۲ء) جیسی نادر کتابیں تصنیف کیں۔

کریم الدین نے حیدری کی تصانیف میں ایک "شاہ نامہ" ان سے منسوب کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ :-

"مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ اسی حیدر بخش نے ایک مختصر شاہنامہ

---

[۱] دیباچہ تذکرہ گلشن ہند۔ ص ۱۰۰۹

[۲] Proceedings of the College of Fort William, vol. 559, P. 5

[۳] ڈاکٹر عبادت بریلوی نے دیوان حیدری کے مقدمہ میں گل کرسٹ اور اس کا عہد (ص ۱۴۳) کے حوالے سے حیدری کا مشاہرہ دو سو روپے ماہوار درج کیا ہے (ص ۲۳) جو غلط ہے۔ "گل کرسٹ اور اس کا عہد" کے مذکورہ صفحے پر چالیس روپیہ ہی لکھا ہوا ہے۔

اردو میں لکھا ہے۔"[1]

لیکن کسی اور ذریعہ سے اس کی تصدیق نہ ہو سکی

حیدری ۱۸۱۲ء تک کلکتہ میں موجود تھے[2] واضح طور سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ انہوں نے کب کلکتہ کی ملازمت اور قیام ترک کیا۔ ذوالفقار علی مست نے ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں "تذکرہ ریاض الوفاق" ترتیب دیا تھا۔ اس وقت حیدری بنارس میں موجود تھے۔ ذوالفقار علی مست نے حیدری کے کلکتہ چھوڑنے کا سبب آب و ہوا کی ناموافقت قرار دیا ہے[3]

حیدری کے تمام سوانح نگاروں نے ان کا سن وفات ۱۸۲۳ء/۱۲۳۹ھ قرار دیا ہے۔ اس کا ماخذ اسپرنگر کے حوالے سے غلام حیدر[4] کا بیان ہے۔ حیدری نے بنارس میں وفات پائی۔

حیدری کو جو بھی مقبولیت حاصل ہوئی اس کی بنیاد ان کے نثری کارناموں پر ہے لیکن وہ اعلیٰ درجہ کے شاعر بھی تھے۔ حالانکہ تذکروں میں جہاں انکی زندگی کے بارے میں چند اطلاعات ملتی ہیں وہاں شاعری پر کوئی تبصرہ نہیں ملتا۔

حیدری نے قیام بنارس کے دوران ہی شاعری کی ابتدا کی تھی۔ ان میں بہترین شاعرانہ صلاحیتیں تھیں۔ انہوں نے مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ گلدستۂ حیدری میں انکا

---

[1] طبقات شعرائے ہند، طبقہ سوم ص ۳۳

[2] دیوان جہاں ۔ بینی نرائن جہاں ص ۲۴۰

[3] ملخص تذکرہ ریاض الوفاق ۔ ص ۹

[4] غلام حیدر گل دہرمز کے مترجم اور حیدری کے دوست تھے۔

دیوان بھی شامل ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ درج ہیں۔ ؎

شیخ گم گشتۂ ازل خود ہے،
ہم ہو اس سے راہ مت پوچھو،

تاج شاہی سے یوں اٹھائیں ہاتھ
آج اپنا جو وہ غلام کرے

آب حیات میں محمد حسین آزاد نے حیدری کے مندرجہ ذیل شعر کو سودا سے منسوب کیا ہے۔[1]
لیکن یہ شعر "دیوان حیدری" کی پہلی غزل کا مطلع ہے۔ ؎

برابری کا تری گل نے جب خیال کیا
صبا نے مار طمانچے موہنہ اس کا لال کیا۔[2]

---

[1] آب حیات۔ ص ۲۱۴
[2] دیوان حیدری۔ ص ۶۷

۱۲

مظہر علی خاں ولاؔ

مختلف تذکروں میں ولاؔ کا نام مظہر علی خاں اور تخلص ولاؔ درج ہے[۱] کریم الدین، بینی نرائن جہاںؔ، رام بابو سکسینہ، حامد حسن قادری، سید محمد احمد نادم سیتاپوری مرزا لطف علی نام اور عرفیت مظہر علی خاں بتاتے ہیں[۲] تذکرہ عمدۂ منتخبہ میں مظہر علی خاں نام اور عرفیت مرزا لطف علی درج ہے۔ ولاؔ نے بھی "دیوان ولا" کے دیباچے میں اپنا نام مظہر علی خاں، عرفیت مرزا علی اور تخلص ولاؔ درج کیا ہے[۳]۔

ولاؔ نے "جہانگیر شاہی" کے دیباچے[۴] میں اپنے سوانحی حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ ان سے علم ہوتا ہے کہ ولاؔ کے جد و پدر اصفہان کے باشندہ تھے۔ ولاؔ کے دادا آقا محمد حسین اصفہانی کا خطاب

---

[۱] عمدۂ منتخبہ (اعظم الدولہ سرور) ص ۸۰۹، تلخیص مجمع الانتخاب (تین تذکرے) شاہ کمال ص ۱۳۹، ملخص تذکرہ ریاض الوفاق ذوالفقار علی مست ص ۴۶، تذکرہ صبح گلشن۔ سید علی حسن خاں ص ۶۳، سیر المصنفین۔ محمد یحییٰ تنہا ص ۱۳۹، گلشن ہند ص ۲۸
[۲] طبقات شعرائے ہند، طبقہ سوم ص ۸۱، دیوان جہاں ص ۲۵۸، تاریخ ادب اردو ص ۱۲، داستان تاریخ اردو ص ۱۱۰، ارباب نثر اردو ص ۱۹۵، فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۲۶۱
[۳] دیوان ولا (ق۔ن) ورق ۷،
[۴] دیباچہ جہانگیر شاہی (ق۔ن) ورق ۴، ۵، ۸، ۹، ۱۰

علی قلی خاں تھا۔ یہ آقا صادق ترک کے بیٹے تھے۔ ولاؔ کے والد کا نام سلیمان علی خاں عرفیت مرزا محمد زماں اور تخلص وداد تھا۔ یہ اپنے والد کے بڑے بیٹے تھے اور ولاؔ انکے چھوٹے بیٹے۔

ولاؔ کے دادا اور والد ترک وطن کر کے دہلی آئے اور محمد شاہ بادشاہ (۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء) کے ابتدائی عہد حکومت میں محمد آقا حسین نے نواب سعید الدین خاں میر آتش کے ذریعہ دربار شاہی میں ملازمت حاصل کی۔ محمد آقا حسین بہت ہی فعال تھے۔ انکی صلاحیت اور اہلیت کے پیش نظر بادشاہ نے انکو بائیس ۲۲ عہدوں اور علی قلی خاں کے خطاب سے نوازا تھا۔

محمد آقا حسین کے انتقال کے بعد سلیمان علی خاں نے نواب نجم الدولہ محمد اسحاق خاں بہادر کی وساطت سے دربار شاہی میں توسل حاصل کیا۔ بادشاہ نے محمد آقا حسین کی خدمات کے پیش نظر سلیمان علی خاں کو منگل باشی کا عہدہ عطا کیا۔ جب شاہ عالم ثانی تخت نشین ہوا[1] تو سلیمان علی خاں نے اوائل حکومت میں نواب عزت اللہ صولت جنگ موسیٰ خاں کی رفاقت اختیار کی۔

اگرچہ ولاؔ نے اپنے مولد کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن واقعات کی ترتیب سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے کہ انکی پیدائش دہلی میں ہی ہوئی۔ سن پیدائش کا تعین دشوار ہے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔ دہلی کے علمی وادبی ماحول میں ان کے شعر وسخن کے شغل کو جلا ملی۔ اپنے والد کے انتقال (۱۵ رجمادی الاول ۱۱۸۱ھ ۱۷۶۷ء) کے بعد ولاؔ نے سلسلۂ معاش میں نواب سیف الدولہ بخشی الملک نجف قلی خاں بہادر مظفر جنگ کی رفاقت اختیار کی۔ اور کافی دنوں تک

---

[1] ولاؔ نے آگے چل کر چونکہ شہزادہ جواں بخت کا ذکر کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ عالم کی تخت نشینی سے مراد ۱۷۵۹ء میں اس کے فرماں روائی کے اعلان سے ہے۔ لیکن کسی نے اسے بادشاہ تسلیم نہیں کیا۔ ۱۷۷۱ء میں مرہٹوں نے اسے باقاعدہ دہلی کے تخت پر بٹھایا تھا۔

ان سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد ولاؔ کچھ دنوں تک شہزادہ جواں بخت جہاندار شاہ (سنہ جلوس ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء) کی سرکار سے منسلک رہے۔

جہاندار شاہ سے وابستگی کے ایام میں انکو فارغ البالی اور سکون نصیب تھا۔ جہاندار شاہ کی مہربانیوں اور نوازشوں سے یہ بہرہ اندوز ہوا کرتے تھے۔ ولاؔ شہزادے کو اشعار سنایا کرتے تھے اور اس کا صلہ بھی پاتے تھے۔ ۱۴ر اپریل ۱۷۸۴ء میں جہاندار شاہ دہلی سے فرار ہوکر ۶ر مئی ۱۷۸۴ء میں لکھنؤ آئے۔[1] ولاؔ بھی انکے ہمراہ لکھنؤ آئے۔ ۱۷۸۶ء میں جب جہاندار شاہ بنارس گئے تو ولاؔ انکے ساتھ نہیں گئے بلکہ معتمد الدولہ مشیر الملک مہاراج ادھیراج راجہ ٹیکیت رائے بہادر صلابت جنگ نے نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵ء۔ ۱۷۹۹ء) کی سرکار میں ملازمت اختیار کرواکر اپنی مصاحبت میں لے لیا۔ ولاؔ سات سال تک مہاراجہ ٹیکیت رائے سے وابستہ رہے۔ جب انکی دیوانی برہم ہوئی تو ولاؔ بے یار و مددگار ہوگئے۔ بہت دنوں تک بے کار و بے روزگار اور سرگرداں و پریشان رہے۔

۱۸۰۰ء میں مارکوئس ویلزلی کی دعوت پر کرنل اسکاٹ کے ذریعہ انہوں نے فورٹ ولیم کالج میں ملازمت حاصل کی۔ کرنل اسکاٹ تک ولاؔ کی رسائی فخر الدین احمد خاں عرف مرزا جعفر ابن محسن زماں خاں کے توسط سے ہوئی تھی۔ ولاؔ نے اپنی ملازمت کی تاریخ "انیس ۱۹ مارچ کی دسویں تاریخ" درج کی ہے۔[2] یہ غالباً کتابت کی غلطی ہے۔ اس لئے کہ ولاؔ نے "دیوان ولا" کے دیباچہ میں

---

[1] Fall of Mughal Empire by Jadunath Sarkar Vol III (1771–1788), P. 184.

[2] دیباچہ جہانگیر شاہی (ق۔ن) درق ۹، ۱۰

(جس میں جہانگیر شاہی کا دیباچہ فارسی میں درج ہے) یوں لکھا ہے:۔

"نوکر شدہ بہ تاریخ دہم ماہ مارچ سنہ مذکور (۱۸۰۰ء)

وارد کلکتہ شدہ۔"[1]

تقرری کے بارے میں ولا کے مذکورہ بیان کے بعد کرنل اسکاٹ کا خط بھی قابل غور ہے۔ یہ خط انہوں نے چیف سکریٹری کے نام لکھا تھا۔ اس سے علم ہوتا ہے کہ ۱۰ر نومبر ۱۸۰۰ء میں کالج کیلئے انکا تقرر عمل میں آیا اور کرنل اسکاٹ نے بحساب اسّی روپے ماہانہ ۱۰ر نومبر سے جنوری ۱۸۰۱ء تک ۲۱۳ روپے پیشگی مشاہرہ بھی ادا کردیا تھا۔[2]

لکشمی ساگر وارشنے نے ایشیاٹک اینول رجسٹر ۱۸۰۱ء لندن (۱۸۰۲ء) کے حوالے سے ولا کے تقرری تاریخ ۱۰ر نومبر ۱۸۰۰ء درج کی ہے۔[3]

کالج کونسل کی ۴ر مئی ۱۸۰۱ء کی کاروائی میں جن منشیوں کی تقرری منظور ہوئی ان میں ولا کا نام نظر نہیں آتا۔ ہاں البتہ ۱ر جون ۱۸۰۱ء کی کاروائی میں انکا نام شامل ہے۔[4]

ولا کے تقرر کے سلسلے میں ایک بات اور قابل غور ہے۔ انہوں نے گل کرسٹ کے حکم سے ۱۸۰۱ء میں مادھونل بیتال پچیسی اور ہفت گلشن کا ترجمہ کیا تھا۔ ان تین کتابوں کا ترجمہ ایک

---

[1] دیباچہ دیوان ولا (ق۔ن) ورق ۲

[2] O.C. Home Public, Jan. 23, 1801, No. 26.

ڈاکٹر گل کرسٹ اور ان کا عہد ص ۱۹۰

[3] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۱۹

[4] ،، ص ۵۲

سال میں تو ممکن ہے لیکن (۲۷ر نومبر ۱۸۰۱ء کی روشنی میں) ایک ماہ میں قرین قیاس نہیں۔ اسلئے ولاؔ کے تقرر کی تاریخ ۱۰ر نومبر ۱۸۰۱ء ہی درست سمجھی جاسکتی ہے۔

ولاؔ ۱۸۰۱ء میں کلکتہ آئے اور چیف سکریٹری سے ملاقات کی۔ اور انکے حکم پر گل کرسٹ سے مل کر شعبۂ ہندوستانی سے وابستہ ہوگئے۔[1] ۷ر جون ۱۸۰۲ء کی کالج کونسل کی کاروائی سے علم ہوتا ہے کہ وہ مترجم کے عہدہ پر فائز تھے۔

۳۰ر ستمبر ۱۸۰۲ء میں ولاؔ کی ضرورت نہ سمجھ کر انکو شعبہ سے الگ کردیا گیا۔ تنخواہ کے علاوہ لکھنؤ تک جانیکا خرچ بھی دیا گیا[2] لیکن ولانے اس فیصلے کے خلاف عرضی پیش کی۔ ۴ر اکتوبر ۱۸۰۲ء کی کالج کونسل کی کارروائی میں اس پر غور کرنے کے بعد ان کو دوبارہ ملازمت میں لے لیا گیا[3]

ولاؔ مادھونل اور کام کندلا (۱۸۰۱ء)، بیتال پچیسی (۱۸۰۱ء)، ہفت گلشن (۱۸۰۱ء)، پندنامہ منظوم (۱۸۰۲ء)، لطائف وظرائف، تاریخ شیر شاہی (۱۸۰۵ء)، جہانگیر شاہی (۱۸۰۹ء) کے مصنف اور مترجم تھے۔ انہوں نے "دہ مجلس" (محمد بخش) کی اصلاح بھی کی تھی۔

۱۸۱۰ء میں انہوں نے اپنا دیوان کالج کو بطور تحفہ دیا تھا جسے کالج نے شکریہ کے ساتھ قبول کرلیا تھا۔[4]

---

[1] دیباچہ جہانگیر شاہی (ق۔پ)، ورق ۱۰

[2] فورٹ ولیم کالج (ہندی)، ص ۵۳

[3] Proceedings of the College of Fort William Vol. 559, P. 123.

(بحوالہ گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۱۶۱۔ ۱۶۲)

[4] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۱۰۳

۱۲ اگست ۱۸۱۶ء کو شعبۂ ہندوستانی کے پروفیسر ولیم ٹیلر نے ولا کے انتقال کی خبر دی۔[1]

ولا کا شاعرانہ خمیر اپنے عہد کے باکمال شعراء کی صحبتوں سے اٹھا تھا۔ وہ نظام الدین ممنونؔ مصحفیؔ اور طپش کے دائرۂ تلامذہ میں شامل تھے۔ ولا نے شاعرانہ ذوق و شوق میں اپنے والد سلیمان علی خاں ودادؔ سے بھی تحریک حاصل کی۔

ولا نے غزل کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ تذکروں میں انکی شاعرانہ خوبیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

انہوں نے اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ لیکن طباعت کی نوبت نہ آسکی۔ اسے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مرتب کر کے پاکستان سے شائع کر دیا ہے۔

ولا کے بیشتر اشعار عاشقانہ ہیں۔ چند مثالیں درج ہیں :-

تاثیر کی تھی جذبۂ دل نے مرے مگر
اس گل کے آتے ہی لب اظہار بندھ گیا

اک ذرہ تری خاک کفِ پا کو نہ پہنچے
چمکے فلک حسن پہ گر اختر طاؤس

---

[1] فورٹ ولیم کالج (ہندی)، ص ۱۰۳

(۱۳)

کاظم علی جوآں

تاریخ ادب اردو کی کتابوں اور مختلف تذکروں میں جوآں کا نام کاظم علی درج ہے[1] خود جوآں بھی اپنا نام یہی بتاتے ہیں[2] لیکن ولآ نے انکا نام حسن علی خاں اور عرفیت کاظم علی لکھی ہے[3] کاظم علی کا تخلص جوآں تھا۔

جوآں نے اپنے سوانحی حالات کہیں درج نہیں کئے ہیں۔ ان کے ہمعصر تذکرہ نگاروں نے بھی اختصار کی روایت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ چنانچہ انکے آبا و اجداد کا کیا ذکر خود جوآں کا ہی مفصل حال نہیں ملتا۔ مختلف مآخذ سے جو معلومات دستیاب ہوتی ہیں ان سے علم ہوتا ہے کہ

---

[1] ریاض الفصحا (تذکرہ ہندی گویاں) مصحفی ص ۱۷، گلشن سخن۔ مبتلا لکھنوی ص ۹۶، گلزار ابراہیم (گلشن ہند) ص ۹۳، تذکرہ ریاض الوفاق۔ ذوالفقار علی مست ص ۲۱، تذکرہ خوش معرکہ۔ زیبا رسعادت خاں ناصر ص ۱۹۲ دیوان جہاں۔ بینی نرائن ص ۹۲، طبقات شعرائے ہند، طبقہ سوم۔ کریم الدین وفیلن ص ۷۵، تاریخ ادب اردو۔ رام بابو سکسینہ ص ۱۱۱، ارباب نثر اردو ص ۲۲۳، فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی۔ نادم سیتاپوری ص ۲۶۴، مقالہ تنویر احمد علوی ہفتہ وار "ہماری زبان" ص ۱۶، داستان تاریخ اردو۔ حامد حسن قادری ص ۱۴

[2] دیباچہ ترجمۂ قرآن شریف (ق۔ن) ورق ۲۷۰، دیباچہ سکنتلا ناٹک (ق۔ن) ورق ۲

[3] دیباچہ جہانگیر شاہی (ق۔ن) ورق ۲۹۳

جوآں دہلی کے باشندہ تھے۔[۱] ان کے سن پیدائش کا سراغ نہیں ملتا۔ قیاس ہے کہ جوآں کی تعلیم وتربیت دہلی میں ہی ہوئی ہوگی۔ عہد احمد شاہی (۱۷۴۸ء۔ ۱۷۵۴ء) کے انتشار وخلفشار اور معاشی بدحالی نے ان کو دہلی چھوڑنے پر مجبور کیا ہوگا۔ چنانچہ وہ دہلی سے نکل کر فیض آباد میں وارد ہوئے۔[۲] شجاع الدولہ کا عہد (۱۷۵۴ء۔ ۱۷۷۵ء) تھا۔ ان دنوں تاخت وتاراجی کے شکار لوگوں کے لئے اودھ اور دکن ہی ملجا وماویٰ تھا۔ چنانچہ فیض آباد آکر انہوں نے شجاع الدولہ کے بیٹے نواب سیف الدولہ کی رفاقت اختیار کی۔[۳] تذکرہ خوش معرکہ زیبا میں بھی نواب سیف الدولہ کی رفاقت کا ذکر ہے۔[۴]

مرزا کاظم علی مبتلا لکھنوی نے ۱۷۸۰ء میں "تذکرہ گلشن سخن" مرتب کیا تھا۔ اس وقت جوآں لکھنؤ میں موجود تھے۔[۵] اس بنیاد پر یہ اندازہ قائم کیا جاسکتا ہے کہ شجاع الدولہ کی وفات کے بعد

---

[۱] دہلی کی سکونت کے ثبوت میں کرنل اسکاٹ کا ایک خط ملتا ہے۔ یہ انہوں نے چیف سکریٹری کو جوآں کے تقرر کے سلسلے میں لکھا تھا۔ جسمیں انکو دہلی کا باشندہ درج کیا ہے۔ (O.C Home Public Jan. 29, 1801, No 27)

بحوالہ گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۱۶۰

ریاض الفصحا۔ ص ۱۷۱، Encyclopaedia Britannica. Vol. XI, P. 575.

[۲] جوآں کے بیشتر سوانح نگاروں (نادم سیتاپوری، سید محمد، رام بابو سکسینہ، جاوید نہال اور حامد حسن قادری وغیرہ) نے جوآں کا دہلی سے لکھنؤ آنے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن وہ قطعی طور سے دہلی سے فیض آباد ہی آئے تھے۔

[۳] ریاض الفصحا۔ ص ۱۷۱

[۴] تذکرہ خوش معرکہ زیبا۔ مرتبہ عطا کاکوی ص ۱۹۲

[۵] گلشن سخن۔ ص ۹۶

جب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو اپنا پایۂ تخت بنایا تو جواںؔ بھی یہاں چلے آئے ہوں گے۔ لکھنؤ آکر انہوں نے علمی و ادبی حلقوں میں بڑا نام پیدا کیا۔ یہانتک کہ ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء میں ابراہیم خاں نے اپنا تذکرہ "گلزار ابراہیم" مرتب کیا تو انہوں نے لکھنؤ سے جواںؔ کے اشعار بنارس طلب کئے تھے۔[1]

گورنر جنرل ویلزلی کے حکم اور دعوت پر کرنل اسکاٹ نے جن ادیبوں اور شاعروں کو کلکتہ روانہ کیا ان میں جواںؔ بھی ہیں۔ کرنل اسکاٹ نے ۱۸۰۰ء میں جواںؔ کو "سرکار عالی" کے ملازم کی حیثیت سے کلکتہ روانہ کیا۔[2] انہوں نے چیف سکریٹری کے نام جواںؔ کے تقرر کے متعلق ایک خط تحریر کیا تھا جس سے یہ علم ہوتا ہے کہ ان کا تقرر انہوں نے ۱۰ر نومبر ۱۸۰۰ء کو کیا تھا اور بہ حساب اسّی روپے ماہوار فروری ۱۸۰۱ء تک کی تنخواہ (۲۹۳ روپے) بھی پیشگی ادا کردی تھی۔[3]

کلکتہ پہنچ کر جواںؔ نے گل کرسٹ کی خدمت میں حاضری دی۔ وہ شعبہ میں مترجم کے عہدہ پر فائز ہوئے اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہوگئے۔

۱۹ر دسمبر ۱۸۰۹ء میں میر منشی شیر علی افسوسؔ کا انتقال ہوگیا۔[4] جواںؔ نے ۲۱ر دسمبر ۱۸۰۹ء

---

[1] گلشن ہند (گلزار ابراہیم) ص ۹۳

[2] دیباچہ سکنتلا ناٹک (ق۔ن) ورق ۲۔

جاوید نہال نے جواںؔ کے لکھنؤ سے عظیم آباد آنے کی بات کہی ہے (انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۸)

لیکن اس بات کی تردید کے جواںؔ کا مذکورہ دیباچہ کافی ہے۔

[3] O.C. Home Public, Jan. 29, 1801, No. 27.

بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۹۰

[4] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۸۴

میں ولیم ٹیلر کی سفارش کے ساتھ میر منشی کے عہدہ کے لئے درخواست دی۔ لیکن کالج کونسل نے انکی درخواست نامنظور کر دی۔ چونکہ جواںؔ مترجم تھے۔ اس لئے میر منشی کے عہدہ پر تقرری کیلئے انسے اونچے عہدہ یعنی سیکنڈ منشی کی ترقی کے امکانات زیادہ تھے۔ چنانچہ ۱۲ر دسمبر ۱۸۰۹ء میں ہی تارنی چرن متر سیکنڈ منشی سے میر منشی کے عہدہ پر فائز ہوئے اور انکی جگہ پر جواںؔ کو سیکنڈ منشی کا عہدہ ملا[1] اور انکا مشاہرہ سو روپے ہو گیا (سیکنڈ منشی کا یہی مشاہرہ ہوتا تھا)

۱۴ر جولائی ۱۸۱۶ء کو جواںؔ کا انتقال ہو گیا۔ ولیم ٹیلر نے انکی بیوہ اور بچوں کیلئے پنشن کی سفارش کی تھی مگر یہ منظور نہ ہوئی۔[2] انتقال کے کچھ دنوں پہلے وہ سیکنڈ منشی نہیں تھے بلکہ میر بخشش علی کو یہ عہدہ مل گیا تھا۔ جواںؔ سیکنڈ منشی کے امتحان میں ناکامیاب ہو گئے تھے۔[3] جواںؔ کے سوانح نگاروں نے ان کے دو بیٹوں مرزا قاسم علی ممتازؔ اور مرزا ہاشم علی عیاںؔ کا ذکر کیا ہے۔ دونوں شاعر تھے۔

جواںؔ سکنتلا ناٹک (۱۸۰۱ء) اور سنگھاسن بتیسی (۱۸۰۱ء) کے مترجم تھے۔ وہ ترجمۂ قرآن شریف کے معاونین میں شامل تھے۔ "بارہ ماسہ" (۱۸۰۲ء) جواںؔ کی منظوم تصنیف ہے۔ انہوں نے "تاریخ فرشتہ" (۱۸۰۱ء) کا ترجمہ کیا تھا۔ وہ انتخاب سودا اور کلیات میر کے مرتبین میں شامل تھے۔

یہ واقعہ ہے کہ جواںؔ شعبۂ ہندوستانی کے منشی اور نثر نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور

---

[1] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۸۴

[2][3] " " ص ۹۳، ۹۲

ہیں. لیکن وہ اچھے شاعر بھی تھے. کرنل اسکاٹ نے انکی تقرری کے پروانہ پر انہیں "منشی" کے علاوہ "شاعر" بھی لکھا تھا. وہ اپنے عہد کے شعرا میں اچھا خاصا مقام رکھتے تھے. ہمعصر تذکرہ نگاروں نے انکی زبان دانی اور شاعرانہ صلاحیت پر روشنی ڈالی ہے۔

ذوالفقار علی مست نے لکھا ہے :۔

"از زمرۂ ریختہ گویان مدرسہ ہندی سرکار کمپنی انگریز بہادر بہ رتبۂ ارجمندی طنطنۂ نواسنجی بلند آوازہ دارد و تیغ لسانش بہ جوہر افشانی ہندی دمساز است و احیاناً بمعرکۂ فارسی سر بمعانی انداز قصائد و غزلیات آں فصیح زمن مدون است۔"[1]

مبتلا لکھنوی نے چند الفاظ میں انکی شاعری کی یوں ستائش کی ہے :۔

"کلامش جوشے و خروشے دارد۔"[2]

جواں کا نمونۂ کلام درج ہے :۔

سرگشتہ ہے جواں تری فرقت میں واں جہاں
منزل ہے نے مقام، نہ قصر و رباط ہے

---

[1] ملخص تذکرہ ریاض الوفاق ص ۲۲۔ ڈاکٹر عبدالرسول خیامپور نے مذکورہ تذکرہ کی تلخیص تصحیح و تحشیہ کے ساتھ تبریز سے شائع کی ہے. مرتب نے اردو شعرا کا کلام یکسر خارج کر دیا ہے. اس کے علاوہ فارسی شعرا کے ذکر میں بھی انتخاب سے کام لیا ہے. عطا کاکوی نے ریاض الوفاق کی جو تلخیص شائع کی ہے اسمیں چند جملے ڈاکٹر رسول کے مرتب تذکرہ سے زیادہ ہیں اور چند کم. راقم الحروف نے مندرجہ بالا اقتباس دونوں نسخوں کے حذف شدہ جملوں کو شامل کر کے نقل کیا ہے۔

[2] گلشن سخن، ص ۹۶

عتاب اس تند خو نے خط جس دلگیر پر لکھا میں
تو حرف قتل پہلے مجھ سے بے تقصیر کو لکھا

کریم الدین[1] اور سید محمد[2] نے مشتبہ انداز میں انکے دیوان کا ذکر کیا ہے۔
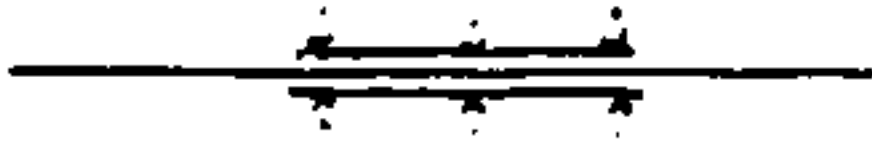
---

[1] طبقات شعرا ہند، طبقہ سوم ص ۶۶

[2] ارباب نثر اردو ص ۲۳۵

۱۴

للّوجی لال کوی

للوجی لال کوی[۱] فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی میں بھاکھا منشی تھے۔ ان کے آبا و اجداد گجرات کے رہنے والے برہمن تھے[۲] جو بعد میں آگرہ میں آبسے تھے۔ للوجی کے والد کا نام چین سکھ تھا۔[۳] للوجی کی پیدائش آگرہ میں ہوئی۔ اسی لئے وہ اپنے آپ کو "آگرہ والے" لکھتے ہیں[۴]۔ ان کا سنہ پیدائش دریافت کرنے کی سب سے مضبوط بنیاد یہ ہے کہ ۱۹ر دسمبر ۱۸۱۶ء کو سکریٹری لاکٹ نے ایچ۔ دوڈ کے پاس کالج کی تفصیلات بھیجی تھیں۔ جس سے یہ علم ہوتا ہے کہ اس وقت للوجی کی عمر ۵۵ سال کی تھی۔[۵] اس حساب سے ان کا سن پیدائش ۱۷۶۲ء۔ ۱۷۶۳ء کے قریب متعین ہوتا ہے لیکن لکشمی ساگر وارشنے نے مذکورہ تفصیل کی بنیاد پر للوجی کا سن پیدائش ۱۷۶۳ء درج کیا ہے[۶]۔

---

[۱] "راج نیتی" کے دیباچہ میں للوجی لال کوی درج ہے (ص ۲) جو "آں سکنتلا ناٹک" کے دیباچہ میں بھی یہی لکھتے ہیں (ق۔ ن ورق ۲)

[۲] پریم ساگر۔ للوجی لال کوی ص ۲

[۳] ہندی ساہتیہ کا پرورتی گت اتہاس، حصہ نثر، جلد دوم، ڈاکٹر پرتاب نرائن ٹنڈن ص ۵۰۵ [۴] پریم ساگر ص ۲

[۵] fort William, 27 oct. 1816 - 22 April, 1818, Home Misc Vol. 6, P. 290 - 293. (بحوالہ فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۹۲)

[۶] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۹۳

وارشنے صاحب سے سہو ہوا ہے۔ انہوں نے غالباً یہ سمجھا ہے کہ کالج میں ملازمت حاصل کرنے کے وقت انکی عمر ۵۵ سال تھی۔ جبکہ دراصل ۱۹ار دسمبر ۱۸۱۶ء میں وہ ۵۵ سال کے تھے۔ آچاریہ رام چندر شکل نے للوجی کی پیدائش سمبت ۱۸۲۰ (مطابق ۱۷۶۳ء) میں بتائی ہے [1] ڈاکٹر پرتاب نرائن نے لکھا ہے کہ انکی پیدائش ۱۷۶۳ء میں ہوئی۔ [2] غالباً یہ طباعت کی غلطی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا مقصد ۱۷۶۲ء لکھنا رہا ہوگا۔

للوجی کی تعلیم و تربیت آگرہ میں ہی ہوئی۔ ان کے نام کے ساتھ کوی (کب) کا اضافہ اس جانب توجہ مبذول کراتا ہے کہ وہ شاعر بھی تھے۔

غالباً تلاش معاش نے للوجی کو آگرہ چھوڑنے پر مجبور کیا ہوگا۔ وہ آگرہ سے کب نکلے اس کا علم نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر پرتاب نرائن ٹنڈن نے ان کے مرشد آباد آنے کا ذکر کیا ہے جہاں للوجی کے تعلقات کرپا سکھی کے شاگرد گوپال داس سے تھے۔ انہیں کے توسط سے للوجی کی شناسائی مبارک الدولہ سے بھی ہوگئی تھی [3] لیکن یہاں وہ مطمئن نہ رہ سکے۔ اور فورٹ ولیم کالج کی شہرت انہیں کلکتہ کھینچ لائی۔ یہاں انہیں کامیابی بھی حاصل ہوئی اور وہ شعبۂ ہندوستانی میں ملازم ہوگئے للوجی کا بیان ہے کہ :-

> "سمبت ۱۸۵۷ (م ۱۸۰۰ء) میں روزگار کمپنی کے کالج میں مقرر ہوا۔" [4]

---

[1] ہندی ساہتیہ کا اتہاس۔ ص ۴۰۶

[2] ہندی ساہتیہ کا پرورتی گت اتہاس، حصہ نثر، جلد دوم ص ۵۰۵

[3] " " " " " " " " " " " [4] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۴۹

گل کرسٹ کو جب شعبۂ ہندوستانی میں بھاکھا منشی کی ضرورت کا احساس ہوا تو انہوں نے کالج کونسل کو ۴ رجنوری ۱۸۰۲ء میں ایک خط تحریر کیا تھا۔ اس میں انہوں نے پچاس روپے مشاہرہ پر ایک بھاکھا منشی کے تقرر کی درخواست کی تھی[1]۔ ۱۹ رفروری ۱۸۰۲ء کو کالج کونسل نے اس درخواست کو بخوشی منظور کر لیا اور فروری ۱۸۰۲ء میں بحیثیت بھاکھا منشی (بہ مشاہرہ پچاس روپے) للوجی کا تقرر عمل میں آیا[2]۔ کالج کونسل نے انکا یکم اگست ۱۸۰۱ء سے ۳۱ رجنوری ۱۸۰۲ء تک کا بقیہ مشاہرہ ادا کر دینے کا بھی حکم دیا۔ لکشمی ساگر نے اس سے یہ اندازہ قائم کیا ہے کہ للوجی اس وقت تک سرٹیفکیٹ منشی کی حیثیت سے کام کر رہے تھے[3]۔

گل کرسٹ کی مراجعت (فروری ۱۸۰۴ء) کے بعد اول ماتحت اور قائم مقام پروفیسر CAPT. MOUNT نے ۹ رمئی ۱۸۰۴ء کو کالج کونسل کے سکریٹری چارلس روتھمین کے نام ایک خط لکھا۔ اس خط میں انہوں نے شعبۂ ہندوستانی میں بھاکھا منشی کی موجودگی غیر ضروری قرار دی۔ CAPT. MOUNT کا یہ خط کالج کونسل کی ۱۱ رجون ۱۸۰۴ء کی کاروائی میں پیش ہوا۔ چنانچہ للوجی کی تنخواہ یکم جولائی ۱۸۰۴ء سے ملتوی بند ہو گئی۔ یعنی وہ شعبہ سے الگ کر دیئے گئے۔ بعد میں CAPT. MOUNT کو بھاکھا منشی کی ضرورت کا احساس ہوا۔ چنانچہ ۱۷ را کتوبر ۱۸۰۴ء کی کالج کونسل

---

[1] Fort William, Home Misc, Vol. I, P. 62.

بحوالہ فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۵۰

[2] Annals of the College of Fort William, Appendix III, P. 50.

عتیق صدیقی نے للوجی کے تقرر کی تاریخ ، رجون ۱۸۰۲ء درج کی ہے۔ (گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۹۹) یہ درست نہیں۔

[3] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۵۰، ۵۱

کی کارروائی سے علم ہوتا ہے کہ ان کو دوبارہ کالج میں شامل کر لیا گیا۔ اور جولائی سے ہی ان کو برسرکار تصور کر کے انکا پچھلا مشاہرہ بھی ادا کر دیا گیا۔[1]

للوجی بڑے فعال اور باصلاحیت تھے۔ انہوں نے گل کرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۱ء میں چار کتابوں دسنگھاسن بتیسی، بیتال پچیسی، سکنتلا ناٹک اور مادھونل کو برج بھاشا سے ہندوستانی (اردو) میں منتقل کروایا۔ ان کے ساتھ مظہر علی خاں ولا اور کاظم علی جوان شریک تھے۔ للوجی نقلیات لقمانی کے مترجمین میں بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے راج نیتی، پریم ساگر، لطائف ہندی، برج بھاشا کی قواعد اور لال چندریکا بھی تالیف کی۔ سبھا بلاس، مادھو ولاس اور چھتر پرکاش انکے منظوم کارنامے ہیں۔ شاردا دیوی نے للوجی لال کوی کی ۱۸۱۳ء کی ایک تالیف "بدیا درپن" کا ذکر کیا ہے[2] لیکن اس کتاب کی تفصیلات کا علم نہ ہو سکا۔ البتہ مرزا علی بیگ نے "بدیا درپن" کے نام سے "اودھ بلاس" کا ترجمہ ضرور کیا تھا۔ اودھ بلاس پوربی زبان میں للوجی لال کی تصنیف ہے۔

للوجی لال کوی نے "سنسکرت پریس" کے نام سے اپنا ذاتی پریس کلکتہ میں قائم کیا تھا۔[3]
للوجی ۱۸۲۳ء تک قطعی طور سے کالج سے وابستہ تھے۔ کالج کونسل کی ۱ر مئی ۱۸۲۳ء کی

---

[1] فورٹ ولیم کالج ص ۶۵

[2] The Development of Hindi Prose Literature, P. 73

[3] ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۲۸۸

کارروائی میں آخری بار انکا ذکر ملتا ہے[1]۔ لکشمی ساگر وارشنے کا بیان ہے کہ غالباً یکم مئی ۱۸۲۴ء سے قبل ہی انکا انتقال ہو گیا۔[2]

آچاریہ رام چندر شکل کا کہنا ہے کہ للوجی نے سمبت ۱۸۸۱ (مطابق ۱۸۲۴ء) میں نوکری سے پنشن لے لی تھی۔ اور آگرہ چلے آئے تھے۔ انھوں نے اپنا پریس بھی کلکتہ سے لاکر آگرہ میں قائم کر لیا تھا۔ پریس کا انتظام مکمل کر کے وہ ایک بار پھر کلکتہ گئے جہاں ان کا سمبت ۱۸۸۲ (م ۱۸۲۵ء) میں انتقال ہو گیا۔[3] مذکورہ تفصیلات کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ۱۸۲۴ء سے ۱۸۲۵ء کے درمیان للوجی نے وفات پائی۔

---
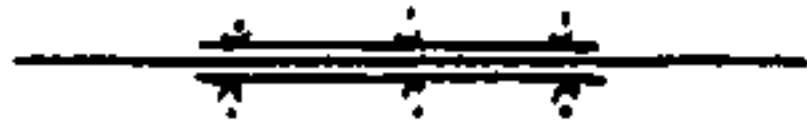
[1] Fort William 17, gane, 1822 – 15 Dec. 1824, Home Misc. Vol. 9, P. 214 – 218.

(بحوالہ فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۹۷)

[2] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۹۷

[3] ہندی ساہتیہ کا اتہاس۔ ص ۲۸۶، ۲۸۸

۱۵

سیّد منصور علی

سید منصور علی کے والد کا نام سید امام بخش حسینی موسوی سبزواری تھا. آبا و اجداد کا وطن سبزوار تھا. ان کے بزرگ اپنی خاندانی جاہ و حشمت، دردمندی و دل سوزی، بردباری و حلیمی اور علم و کمال میں مشہور تھے[1]. غالباً ایران کے انتشار اور خلفشار کے باعث منصور علی کے بزرگوں نے ترک وطن کیا اور ہندوستان میں وارد ہوئے. اس کے بعد کے حالات کا کوئی سراغ نہیں ملتا. منصور علی نے بھی اپنے سوانحی حالات کہیں درج نہیں کئے ہیں. جاوید نہال نے بغیر کسی حوالہ کے یہ معلومات فراہم کی ہیں کہ:-

"ہو سکتا ہے کہ جب دلی لٹ رہی تھی اور سلطنت مغلیہ زرداں کی سیاہ پرچھائیوں میں سمٹتی جارہی تھی تو اس نازک وقت میں سید امام بخش مراد آباد اور دلی سے عظیم آگئے ہوں اور رہیں کے ہو کر رہ گئے ہوں"[2]

موصوف آگے لکھتے ہیں:-

"مولوی منصور علی کی پرورش و پرداخت بھی بہار میں ہوئی تھی.

---

[1] دیباچہ بحر عشق. سید منصور علی (ق. ن) ورق ۲

[2] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۰۶،

یہی وجہ ہے کہ انکی زبان پر بہار کا اثر غالب ہے[1]

لیکن کسی دوسرے مستند ذریعے سے منصور علی کی جائے پیدائش اور دیگر حالات سے متعلق کوئی معلومات دستیاب نہ ہو سکی۔

سید منصور علی غالباً ۱۸۰۱ء کے آس پاس ہی کلکتہ میں وارد ہوئے۔ اس لئے کہ شعبۂ ہندوستانی میں انکا تقرر فروری ۱۸۰۲ء میں منشی کے عہدہ پر ہوا تھا۔ ان کا مشاہرہ چالیس روپے تھا۔[2] یہاں وہ نوآموزان کو درس دیا کرتے تھے۔[3]

ملازمت کے دوران انہوں نے ایک قصہ "بحر عشق" کے نام سے ترجمہ کیا۔ یہی ان کا واحد کارنامہ ہے۔

منصور علی ستمبر ۱۸۰۵ء تک تو قطعی طور سے کالج سے وابستہ تھے۔[4] اس کے بعد انہوں نے کب ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کی اور کس جگہ وفات پائی اس کا پتہ نہیں چلتا۔

---
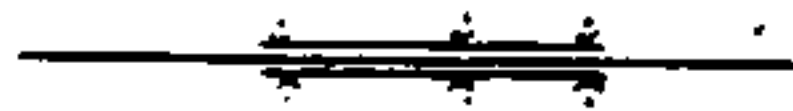
[1] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۳۷۷،

[2] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۹۹

[3] دیباچہ بحر عشق (ق۔ن) ورق ۲

[4] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۶۹

۱۶

سدل مشر

سدل مشر ضلع آرہ (شاہ آباد) کے گاؤں دھروڈیہا کے باشندہ تھے۔ یہ ۱۷۶۷ء، ۱۷۶۹ء کے قریب پیدا ہوئے۔ انکے والد کا نام نندمنی مشر تھا۔[1]

سدل مشر "صاحبان عالی شان کی دریادلی کا شہرہ سن کر کلکتہ آئے"[2] اور فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوگئے۔ یہ شعبۂ ہندوستانی میں بھاکھا منشی تھے۔ انکا تقرر ۱۵ر نومبر ۱۸۰۲ء کو عمل میں آیا تھا۔ مشاہرہ تیس روپے ماہوار تھا۔[3]

CAPT. MOUNT نے کالج کونسل کے سکریٹری چارلس رتھ مین کے نام اپنے ۹ر مئی ۱۸۰۴ء کے خط میں للوجی کے ساتھ سدل مشر کی موجودگی بھی شعبہ میں غیر ضروری قرار دی تھی چنانچہ ۱۱ر جون ۱۸۰۴ء کی کالج کونسل کی کارروائی میں ان کو بھی یکم جولائی ۱۸۰۴ء سے ملازمت سے برطرف کردیا گیا۔ لیکن شعبہ میں بھاکھا منشی کی موجودگی ناگزیر تھی اس لئے ۱۰ر اکتوبر ۱۸۰۴ء کی کالج کونسل کی کارروائی میں للوجی کے ساتھ انکو بھی دوبارہ شعبہ میں شامل کرلیا گیا اور جولائی سے ہی

---

[1] ہندی ساہتیہ کا پرورتی گت اتہاس۔ معتمد نثر۔ جلد دوم ص ۵۰۶

[2] دیباچہ چندراوتی۔ سدل مشر ص ۱

[3] گلکرسٹ اور اسکا عہد۔ ص ۱۹۹

برسرکار متصور کرکے پچھلا مشاہرہ بھی ادا کر دیا گیا۔[۱]

سدل مشر کا انتقال ۴۷-۱۸۴۸ء کے قریب ہوا۔[۲]

سدل مشر نے "ناسکے تو پاکھیان" کا ترجمہ "چندراوتی" کے نام سے اور "ادھیاتم راماین" کا ترجمہ "رام چرت" کے نام سے کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ۱۸۰۹ء میں "HINDI PERSIAN VOCABULARY" بھی مرتب کی تھی۔

---
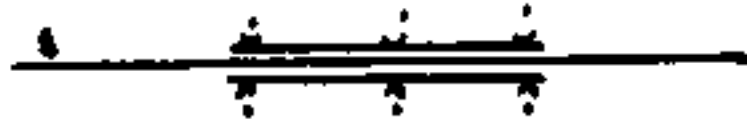
[۱] Fort William, 29. April, 1801 - a Sept. 1805, Home Misc. Vol. I, P. 382.
بحوالہ فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۶۵

[۲] ہندی ساہتیہ کا پرورتی گت اتہاس، جلد دوم، حصۂ نثر ص ۵۰۶

۱۷

خلیل علی خاں اشک

اشک نے "انتخاب سلطانیہ" کے دیباچہ میں اپنے سوانحی حالات بڑی تفصیل سے درج کئے ہیں۔ اس سے علم ہوتا ہے کہ انکا پورا نام محمد خلیل علی خاں فیض آبادی[1] اور اشک تخلص تھا۔ جائے پیدائش شاہ جہاں آباد (دہلی) تھی۔[2] لیکن پرورش اور پرداخت فیض آباد میں ہوئی یہیں سن تمیز کو بھی پہنچے۔ فیض آباد آنے کا سبب احمد شاہی دور کا انتشار (خلفشار)، افراتفری اور احمد شاہ درانی کے حملوں کو قرار دے سکتے ہیں۔ اجڑی ہوئی دہلی کے بعد اودھ ہی تباہ حالوں کا ملجاو ماویٰ تھا۔ فیض آباد میں ہی اشک نے تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اشک نے شہزادوں کی صحبتیں بھی اٹھائی تھیں۔ انہوں نے خصوصیت سے شہزادہ جواں بخت جہاندار شاہ کی خدمت

---

[1] نادم سیتاپوری نے انکا نام خلیل الدین لکھا ہے (فورٹ ولیم کالج، اکرام علی ص ۲۵۷)

[2] اشک کے بیان سے نادم سیتاپوری کا یہ کہنا باطل ہو جاتا ہے کہ اشک خیرآباد ضلع سیتاپور میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ نادم سیتاپوری نے تراب علی نامی سے رشتہ داری اور ہندوستانی پریس سے تعلق بھی ظاہر کیا ہے (فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۵۸-۲۵۷) اشک کے بیانات سے علامہ تراب علی نامی سے کسی تعلق کا سراغ نہیں ملتا۔ اسکے علاوہ ہندوستانی پریس کی تاریخ میں اول تو اکرام علی کا نام ہی شامل نہیں کیا جا سکتا دوسرے مہتمم اور منتظم کی حیثیت سے اشک کا ذکر تو اور بھی بعید از فہم ہے۔

میں حاضر رہنے کا ذکر کیا ہے۔ غالباً یہ صحبت اشک کو اسوقت حاصل ہوئی ہوگی جب شہزادہ جواں بخت ۱۷۸۴ء میں لکھنؤ آئے تھے[1] جواں بخت نے انکی بڑی قدر کی اور انعام و اکرام سے نوازا۔ جواں بخت کچھ عرصہ بعد لکھنؤ سے بنارس چلے گئے۔ انکے بنارس جانیکے بعد تقریباً دس سال کا عرصہ اشک نے کیسے گزارا اسکی نشاندہی نہیں ہوتی۔ خیال ہے کہ دیگر امراء و روٴسا کا توسل اختیار کیا ہوگا۔ لیکن انہیں اطمینان نصیب نہ ہوا۔ اور تنگ آکر ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء میں یہ لکھنؤ سے بنگال چلے آئے۔ یہاں چند سال (۱۷۹۴ء۔۱۸۰۹ء) انہوں نے ناظمان بنگالہ کی صحبت میں گزارے۔ اسوقت ناظمان بنگالہ مرشد آباد میں رہتے تھے۔ اس لئے اشک کا قیام بھی مرشد آباد میں رہا ہوگا۔ یہاں بھی وہ مطمئن نہ رہ سکے اور ۱۸۰۱ء میں کلکتہ چلے آئے۔[2]

ان دنوں کلکتہ کے حالات عام ہندوستانیوں کی نظر میں اچھے نہیں تھے۔ انگریزی اقتدار نے یہاں کی تہذیب و معاشرت کو تباہ کرکے رکھدیا تھا۔ مغربی تہذیب کے نمونے عام ہو رہے تھے۔

---

[1] ڈاکٹر عبادت بریلوی نے رسالہ کائنات کے مقدمہ میں لکھا ہے:۔

"............ وہ (اشک) ۱۲۰۹ھ تک فیض آباد میں رہے اور یہاں مختلف شہزادوں کی صحبتوں میں عزت کی زندگی بسر کی لیکن زیادہ وقت مرزا جواں بخت جہاندار کے ساتھ گزارا۔ جب فیض آباد کی یہ محفلیں برہم ہوئیں تو خلیل علی خاں اشک نے اس سرزمین کو خیرباد کیا۔" (ص ۹)

تاریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ جہاندار شاہ فیض آباد نہیں بلکہ لکھنؤ آئے تھے۔ آصف الدولہ کے یہاں تھے جس نے ۱۷۷۵ء میں اپنا پایۂ تخت لکھنؤ منتقل کر لیا تھا۔ اور اشک نے لکھنؤ ہی سے بنگال کا عزم کیا۔

[2] دیباچہ انتخاب سلطانیہ۔ اشک (ق۔ن) ص ۵، ۶

اسکے علاوہ بدنظمی اور بدحالی ہندوستانی عوام پر مسلط ہوتی جارہی تھی۔ چنانچہ کلکتہ آنے کے بعد یہاں کے حالات دیکھ کر اشکؔ کو اسقدر مایوسی اور تکلیف ہوئی کہ وہ خانہ نشین ہورہے۔ ایک دن مولوی سعید الدین کی زبانی اشکؔ کو یہ معلوم ہوا کہ صاحبان عالی شان نے لکھنؤ سے شاعر بلوائے ہیں۔ ان میں کاظم علی جواںؔ آگئے ہیں۔ جواںؔ کی آمد سے اشکؔ بے حد مسرور ہوئے اور فوراً ان سے ملاقات کی۔ یہ لوگ باہم قدیم آشنا تھے۔ جواںؔ کے توسط سے ہی اشکؔ کی رسائی (اوائل سنہ۱۸۰۱ء) گل کرسٹ تک ہوئی[1]۔ وہ اشکؔ سے بے حد متاثر ہوئے۔ انہوں نے ان سے ملازمت کا وعدہ کرکے قصہ امیر حمزہ کو ریختہ (اردو) میں منتقل کرنیکی فرمائش کی۔

اشکؔ نے قصہ امیر حمزہ کی چند داستانیں لکھیں لیکن انکی خاطر خواہ ہمت افزائی نہ ہوئی۔ اشکؔ نے دل برداشتہ ہوکر ترجمہ کرنا چھوڑ دیا اور گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ ظاہر ہے جس شخص نے شہزادوں کی صحبت اٹھائی ہو وہ انگریزوں کی بے توجہی سے ضرور متاثر ہوگا۔ جب مولوی سعید الدین کو ان کوائف کا علم ہوا تو انہوں نے اشکؔ کی ہمت افزائی کرکے ہربرٹ ہارنگٹن سے انکی ملاقات کروائی۔ ہارنگٹن کی توجہ اور عنایت کے بعد گل کرسٹ کو بھی اشکؔ کا خیال آیا۔ اور انہوں نے صاحبان عالی شان کے ہندی درس کے سلسلے میں انکو مانگ لیا۔ چنانچہ اشکؔ صاحبان عالی شان کو درس دیتے رہے۔ لیکن کالج کی ملازمت سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ صاحبان عالی شان اپنے طور پر تنخواہ دیتے رہے ہوں گے۔ یہ سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد گل کرسٹ نے انہیں ہندوستانی شعبہ کے ماتحت منشیوں میں شامل کرلیا۔ لیکن کالج کونسل سے انکی ملازمت کی توثیق نہیں ہوئی تھی۔ زمرۂ منشیان میں شامل ہونے کے بعد اشکؔ کی مصروفیات میں اضافہ ہوگیا۔ کالج

---

[1] نادم سیتاپوری کا یہ بیان درست نہیں کہ اشکؔ کی رسائی تراب علی کے ذریعہ ہوئی (فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۲۵۹)

کے کاموں کے علاوہ اشکؔ کسی انگریز کو درس بھی دیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے راتوں کو محنت کرکے امیر حمزہ کی دو جلدیں مکمل کیں[1]۔ اور انہیں ایام میں ایک مختصر رسالہ کائنات جو" تصنیف کیا۔

۹؍اگست ۱۸۰۳ء کو اشکؔ کی ملازمت کی توثیق کالج کونسل سے ہوگئی۔ اور انکا مشاہرہ ۳۰ روپے مقرر ہوا۔[2] ۱۸۰۵ء میں CAPT. MOUNT نے ہندوستانی شعبہ کے منشیوں کی فہرست مرتب کی تھی۔ یہ فہرست ۳۰ ستمبر ۱۸۰۵ء کی کالج کونسل کی کارروائی میں پیش ہوئی۔ اس میں دیگر منشیوں کے ساتھ خلیل علی خاں کا نام بھی شامل ہے اور انکا مشاہرہ چالیس روپے درج ہے۔[3]

---

[1] دیباچہ انتخاب سلطانیہ۔ ص ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶

[2] گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۱۶۹۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی گلزار چین کے مقدمے (ص ۱۵) میں لکھتے ہیں کہ :-

"خلیل علی خاں اشک ۹، اگست ۱۸۰۱ء کو بحیثیت منشی کے فورٹ ولیم کالج میں باقاعدہ ملازم ہو گئے۔ تیس روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج میں باقاعدہ ملازم ہونیکے بعد انہیں ڈاکٹر جان گل کرسٹ کے ساتھ کام کرنیکا موقع ملا۔ اس زمانے میں انہوں نے امیر حمزہ کی داستان مکمل کی۔ ایک مختصر رسالہ "کائنات جو" کے نام سے لکھا۔"

اشکؔ کو گل کرسٹ کی رفاقت تو باقاعدہ ملازمت سے قبل ہی حاصل ہو چکی تھی۔ مذکورہ دونوں تصانیف بھی انکی باقاعدہ ملازمت سے بہت قبل کی ہیں۔

[3] fort William, 16 Sept. 1805 — 27 Jan. 1809. Home Misc, Vol. 2 P. 53-60.

(بحوالہ فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۶۱)

اشکؔ امیر حمزہ اور کائنات جوؔ کے علاوہ قصہ رضوان شاہ ، انتخاب سلطانیہ، کتاب واقعات اکبر اور منتخب الفوائد کے مصنف تھے ۔

یہ پتہ نہیں چلتا کہ اشکؔ کب تک کالج سے وابستہ رہے ۔ انہوں نے سنہ ۱۸۱۰ء میں منتخب الفوائد کو تصنیف کیا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ سنہ ۱۸۱۰ء کے بعد شعبہ سے الگ ہوگئے ہوں ۔ نادم سیتاپوری کے بیان سے یہ علم ہوتا ہے کہ اشکؔ کی وفات سنہ ۱۸۲۱ء/۱۲۳۶ھ کے آس پاس ہوئی۔[1]

اشکؔ نے "انتخاب سلطانیہ" کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے کاظم علی جوانؔ کے کلام سے شعر و سخن کا فن اور سلیقہ سیکھا ۔ اُس عہد میں شاعری کے میدان میں طبع آزمائی ایک عام بات تھی ۔ اسی رواج کی مثال اشکؔ بھی ہیں ۔ کسی تذکرے میں ان کا ذکر نظر نہیں آتا ۔ اس سے کم از کم یہ اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے مجہول شاعر تھے ۔ ان کی کتابوں میں شاعری کے جو نمونے خال خال نظر آتے ہیں وہ شاعری کا کوئی عمدہ اور معیاری نمونہ پیش نہیں کرتے ۔

---

[1] فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۲۶۰

۱۸
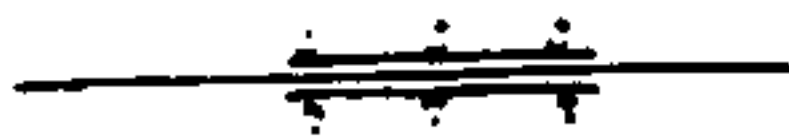
میر معین الدین فیض

"چشمۂ فیض" کے دیباچہ سے علم ہوتا ہے کہ انکا نام میر معین الدین[1] اور فیض تخلص تھا۔ والد کا نام سید فخر الدین اور دادا سید زین العابدین تھے۔ یہ لوگ "سادات حسنی الحسینی" تھے۔

"میر معین الدین کے آبا و اجداد کا وطن سمرقند تھا لیکن یہ لوگ سمرقند سے ہجرت کر کے "مع قبائل" پرانی دہلی میں وارد ہوئے۔ یہاں انہوں نے سکونت اختیار کی اور بڑے تزک و احتشام سے زندگی گزاری، عمارتیں بنوائیں، اپنے وابستگان اور متوسلین کو جائے پناہ مہیا کی۔ ان کے بزرگوں کو اسقدر عروج حاصل ہوا کہ انہوں نے ایک ریاست قائم کر لی۔ یہ لوگ جس محلہ کے ساکن تھے۔ اسکا نام ان لوگوں نے بے حبل مسجد (سید واڑہ) رکھا۔ یہاں انہوں نے بارہ پشتیں گزاریں۔ میر معین الدین کے اجداد اعلیٰ عہدوں پر فائز اور عمدہ ملازمتوں سے سرفراز تھے۔ اس کے علاوہ انہیں بادشاہ کی خصوصی عنایت اور قرب حاصل تھا۔

میر معین الدین کی پیدائش غالباً دہلی میں ہی ہوئی۔ انہوں نے تعلیم و تربیت بھی یہیں حاصل کی۔ جب دہلی پر پے در پے حملے ہونے لگے تو شرفاء نے دوسری جگہوں کو ملجا و ماویٰ بنایا۔ اسی

---

[1] صاحب ارباب نثر اردو نے ا شپرنگر کی فہرست شاہان اودھ کے حوالے سے انکا نام میر محی الدین اور فیض تخلص بتایا ہے (ص ۱۵۳) یہ اطلاع درست نہیں ہے۔

تاخت وتاراجی کا شکار ہوکر میر الدین نے بھی مع متعلقین ترک وطن کیا اور غازیپور ضلع بنارس میں پناہ لی اور خانہ نشینی میں دن گزارنے لگے۔[1]

جب گل کرسٹ اپنے لسانی پروگرام کے تحت اور نیل کی کاشت کرنے کے سلسلے میں غازیپور آئے۔ ان دنوں بھی میر معین الدین خانہ نشین تھے۔ گل کرسٹ نے ہی انکو بلوا کر "واسطے سند پہنچانے محاورات شاعران ہند" کے ملازم رکھا۔ جب تک گل کرسٹ غازیپور میں رہے۔ میر معین الدین نے ان سے کافی فیض حاصل کیا اور "صاحبان عالیشان" کی صحبت کے قابل ہو گئے۔[2]

غازیپور سے گل کرسٹ کی واپسی کے بعد میر معین الدین کو وہاں اپنا کوئی قدردان نظر نہ آیا۔ حالانکہ انکی زندگی کے دن کسی نہ کسی طرح "کٹنے" ہی جا رہے تھے۔ بلکہ انہیں کے الفاظ میں وہاں صرف "خوش باش" تھے لیکن مطمئن نہ رہ سکے۔ چنانچہ گل کرسٹ کے اخلاق، نوازش اور فن پروری پر بھروسہ کرکے وہ کلکتہ چلے آئے۔ یہاں میر منشی بہادر علی حسینی نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ہر طرح سے ان کے آرام اور ضروریات کا خیال رکھا۔[3]

میر معین الدین ۹ اگست ۱۸۰۲ء میں ۳۰ روپے مشاہرہ پر منشی کے عہدہ پر فائز ہوئے۔[4] وہ شعبہ میں معلمی کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔

اپنی ملازمت کے دوران انہوں نے گل کرسٹ کی فرمائش پر شیخ فریدالدین عطار کے پند نامہ کا منظوم ترجمہ "چشمۂ فیض" کے نام سے کیا تھا۔

---

[1] [2] دیباچہ چشمۂ فیض (ق۔ن) ورق ۳۔

[3] " " (ق۔ن) ورق ۳، ۴۔

[4] گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۲۰۰۔

میر معین کالج سے کب تک وابستہ رہے اور کب انہوں نے علیحدگی اختیار کی اسکا علم نہ ہو سکا۔

فیض کے شاعرانہ مرتبے کا تعین دشوار ہے۔ اس عہد کے تذکروں میں انکا ذکر نہیں ملتا۔ صرف کریم الدین نے ان کا ذکر کیا ہے[1]۔ وہ بھی مختصر۔ کریم الدین نے ان کا تخلص فائز درج کیا ہے۔ جو قطعی طور سے غلط ہے۔

"چشمۂ فیض" ان کا منظوم کارنامہ ہے اسمیں ان کی شاعری کا جو انداز سامنے آتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیض کہنہ مشق اور بہت عمدہ شاعر نہیں تھے تاہم انہوں نے سیدھے سادے انداز میں پند و نصائح کو نظم کر دیا ہے۔

---

[1] طبقات شعرائے ہند طبقہ دوم مع تعلیقات (کریم الدین دفیلن) مرتبہ عطا کاکوی ص ۲۵

۱۹

سیّد حمیدُالدّین بہاریؒ

سیّد حمید الدّین بہاری کے سوانحی حالات دستیاب نہیں۔ "خوانِ نعمت" کے دیباچے میں بھی انھوں نے اپنے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ نام کے ساتھ "بہاری" کا اضافہ اس جانب رہنمائی کرتا ہے کہ وہ بہار کے باشندہ رہے ہوں گے۔

شعبۂ ہندوستانی میں حمید الدّین کا تقرر ۱۸۰۳ء میں منشی کے عہدہ پر ہوا تھا۔ انکا مشاہرہ تیس روپے ماہوار تھا۔[۱]

حمید الدّین نے "خوان الوان" کا ترجمہ "خوانِ نعمت" کے نام سے کیا تھا۔

۱۸۰۲ء کے بعد حمید الدّین کی زندگی کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔

---

[۱] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۲۰۰

۲۰

شیخ امانتُ اللہ شیدؔا

شیخ امانت اللہ شیدؔا کے حالات زندگی پردۂ خفا میں ہیں۔ ان کے سوانح نگاروں نے یہ اندازہ قائم کیا ہے کہ وہ شمالی ہند کے باشندہ تھے[1]۔ جائے پیدائش معلوم نہ ہو سکی۔ جاوید نہال نے بغیر کسی حوالہ کے یہ معلومات فراہم کی ہیں کہ شیدؔا کا خاندان دلی سے ہجرت کر کے کلکتہ میں آبسا تھا۔ شیدؔا نے مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تعلیم پائی تھی اور یہیں تعلیم مکمل کی۔ ان کے علم کا چرچا اور ادبی شہرت ہی فورٹ ولیم کالج میں ملازمت کا سبب بنی۔[2] شیخ امانت اللہ کے ہم عصر بینی نرائن نے اپنے تذکرے میں انکا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"شیدؔا تخلص، نام مولوی امانت اللہ، کلکتے میں تشریف رکھتے ہیں۔"[3]

امانت اللہ شعبۂ ہندوستانی میں مترجم کے عہدہ پر فائز تھے[4]۔ ان کا تقرر کب ہوا، اس کا

---

[1] ارباب نثر اردو (سید محمد) ص ۱۷۳، فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی (نادم سیتاپوری) ص ۲۶۹

[2] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۳۱۳

[3] دیوان جہاں۔ ص ۱۵۵

[4] دیباچہ جامع الاخلاق۔ امانت اللہ (ق۔ن) ورق ۵، ۶

پتہ نہیں چلتا۔ غالباً ۱۸۰۲ء میں ان کا شعبہ سے تعلق قائم ہوا ہوگا۔ اس لئے کہ ۱۹ اگست ۱۸۰۲ء کی گل کرسٹ کی مرتبہ ایک فہرست میں انکا نام پہلی بار نظر آتا ہے (یہ فہرست شعبۂ ہندوستانی کے ادبی کارناموں پر مشتمل تھی۔ جن پر گل کرسٹ نے کالج کونسل سے انعام کی سفارش کی تھی) اس فہرست میں وہ "نقلیات لقمانی" اور "قرآن شریف" کے مترجمین میں شامل ہیں۔ گل کرسٹ نے مذکورہ ترجموں کیلئے کالج کونسل سے شیدا کو خصوصی انعام اور اسّی روپے مشاہرہ دینے کی سفارش کی تھی[1]۔ ۹ ستمبر ۱۸۰۲ء کی فہرست میں بھی گل کرسٹ نے ترجمۂ قرآن شریف[2] کے تحت اسّی روپے مشاہرہ [illegible] تجویز کا اعادہ کیا ہے[3]۔ ان تفصیلات سے یہ علم ہوتا ہے کہ شیدا کا مشاہرہ اسّی روپے [illegible] رہا ہوگا۔

امانت اللہ شیدا "نقلیات لقمانی" اور ترجمۂ قرآن شریف کے علاوہ [illegible] "جامع الاخلاق" اور "قواعد صرف اردو" کے مصنف و مترجم تھے۔

امانت اللہ کے تراجم سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انکو عربی اور فارسی [illegible] ان کا ذکر کرتے ہوئے حامد حسن قادری لکھتے ہیں :-

"فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے [illegible]

[illegible] فارسی کے اچھے عالم تھے۔ کالج میں کام [illegible]"

---

[1] Fort William, vol. 579, P 275 [illegible]

فقہ اسلام کے متعلق ایک ضخیم کتاب عربی زبان میں 'ہدایت الاسلام' کے نام سے لکھی تھی۔ اس کے فائدے کو عام اور وسیع کرنے کے خیال سے اسی کتاب کا ترجمہ اردو میں کیا اور وہی نام رکھا۔ پہلی جلد ترجمہ کرکے ڈاکٹر گل کرائسٹ کے سامنے پیش کیا۔ ڈاکٹر پر ان کے فضل و کمال کا بڑا اثر ہوا اور ان کو عربی و فارسی کے ترجمے کے لئے ملازم رکھ لیا۔[1]

امانت اللہ کب تک کالج سے وابستہ رہے اور کب انکا انتقال ہوا، اس کے متعلق کوئی معلومات دستیاب نہ ہوسکی۔ البتہ 'دیوان جہاں' ۱۸۱۲ء میں بینی نرائن نے جس انداز سے انکا ذکر کیا ہے اس بنیاد پر یہ اندازہ قائم کیا جاسکتا ہے کہ وہ ۱۸۱۲ء میں کالج سے وابستہ تھے۔

امانت اللہ کا تخلص شیدا تھا۔ تذکرے ابکے ذکر سے خالی ہیں۔ صرف طبقات شعرائے ہند میں انکا ذکر ملتا ہے وہ بھی تشنہ۔ ان کی شاعری پر کریم الدین نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہے۔ شیدا میں شاعرانہ صلاحیتیں موجود تھیں لیکن انھوں نے باقاعدہ شاعری اختیار نہیں کی۔ انکی شاعری کا محور حسن و عشق نہیں بلکہ تصوف و اخلاق ہے۔ اس میں کہیں کہیں انکی بہترین شاعرانہ صلاحیتیں نمایاں ہوگئی ہیں۔ فارسی سے ماخوذ ان کے شعری ترجمے درج ہیں سہ

نہ یہ قفس ہے سزاوار مجھ خوش الحان کے
علم کا طائر قدسی ہوں اس چمن میں جا

خوب وہ دن ہے کہ اس منزل ویراں سے چلوں
ساتھ جاناں کے چلوں، راحت جانی پاؤں

---

[1] داستان تاریخ اردو۔ ص ۱۱۷

۲۱

غلام حیدر عزت

غلام حیدر کے سوانحی حالات دستیاب نہیں۔ انہوں نے اپنی واحد تالیف حسن و عشق (گل و ہرمز) میں بھی اپنے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ جاوید نہال نے حسن و عشق (قلمی نسخہ) کے دیباچے سے اقتباس پیش کرتے ہوئے مندرجہ ذیل عبارت نقل کی ہے:۔

"یہ اصل اصل اول کے مضمون کا ترجمہ ہے نہ الفاظ و عبارت کا۔ عاصی نے جس کا تخلص عزت ہے اور جو ہندوستان سے ہجرت کر کے کلکتے آیا تھا ترجمہ نویسی میں اقدام کر بعضے مقام میں الفاظ کا ترجمہ موقوف اور بعضے فقرے مبالغے کے کہ ہندی محاورے .... جس جگہ محاورے میں غلطی ہو از راہ کرم اصلاح فرما دیں"[1]

اسی بنا پر جاوید نہال نے غلام حیدر کو شمالی ہند کا باشندہ قرار دیا ہے۔

ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں راقم الحروف کی نظر سے حسن و عشق کا قلمی نسخہ گزرا ہے اس میں مذکورہ عبارت یوں درج ہے:۔

"یہ اصل اصل اول کے مضمون کا ترجمہ ہے نہ الفاظ اور عبارت کا

---

[1] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۳۸۳

عاصی نے مطلب نویسی میں اقدام کر بعضے مقام میں الفاظ کا ترجمہ موقوف کیا اور
بعضے فقرے مبالغے کے کہ ہندی محاورے کے موافق نہ تھے موقوف کر اور طرح سے
لکھے۔ امید محاورہ دانوں سے یہ ہے کہ جس جگہ محاورے میں غلطی ہو از راہ کرم کے
اصلاح فرمادیں[1]

مندرجہ بالا اقتباس میں ہندوستان سے ہجرت کرکے کلکتے آنے کا ذکر کہیں نہیں ہے۔

تھامس روبک نے غلام حیدر کو دیسی لائبریرین (NATINE LIBRARIAN) لکھا ہے اور
ان کا سن تقرر ستمبر ۱۸۰۱ء درج کیا ہے[2]

غلام حیدر نے ۱۸۰۳ء میں گل کرسٹ کی فرمائش پر فارسی کی ایک داستان کا ترجمہ
حسن و عشق (گل و ہرمز) کے نام سے کیا[3] ۱۲ ستمبر ۱۸۰۳ء کی کالج کونسل کی کاروائی میں گل کرسٹ کا
۹ ستمبر ۱۸۰۳ء کا ایک مراسلہ پیش کیا گیا تھا جس کے ساتھ منسلکہ فہرست میں انعام کے لئے دیگر کتابوں کے
ساتھ غلام حیدر کی گل و ہرمز (حسن و عشق) بھی شامل ہے[4] یہ فہرست ان مؤلفین و مترجمین کے کارناموں
پر مشتمل تھی جو کالج کے باضابطہ ملازم نہیں تھے۔ مذکورہ تفصیلات کی روشنی میں یہ علم ہوتا ہے کہ کم از کم
۱۸۰۳ء تک غلام حیدر شعبۂ ہندوستانی کے باقاعدہ ملازم نہیں تھے۔

ولیم پرائس کے عہد میں جب شعبۂ ہندوستانی کے منشیوں کے لئے ہندی کی واقفیت پر زور

---

[1] دیباچہ حسن و عشق (قلمی نسخہ) ورق ۲

[2] Annals of the College of Fort William Appendix No. II P. 71

[3] دیباچہ [illegible]

[4] Proceedings of the College [illegible]

دیا گیا تو سکریٹری رڈیل نے ۱۸ رمئی (۱۸۲۵ء) کو پرائس کو اطلاع دی کہ ۲۴ رمئی (۱۸۲۵ء) کے بعد جس دن بھی انہیں آسانی ہو وہ منشیوں کا امتحان لے لیں۔ اس امتحان میں شامل ہونے والے منشیوں میں غلام حیدر کا نام بھی ملتا ہے[1]۔ اس سے علم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت (۱۸۲۵ء) باقاعدہ ملازم تھے۔ اور درس وتدریس کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔

یکم مئی (۱۸۴۴ء) میں غلام حیدر شعبۂ فارسی اور ہندوستانی میں سررشتہ دار کے عہدہ پر فائز ہوئے تھے اور ان کا مشاہرہ چالیس[40] روپے تھا۔ کالج کونسل نے ۶ رجون (۱۸۴۴ء) کو ان کے مذکورہ عہدے کی توثیق کر دی تھی[2]۔

مزید تفصیلات دستیاب نہ ہو سکیں۔

---

[1] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۱۲۳، ۱۴۸

[2] 〃 〃 〃 ص 〃 [illegible]

۲۲
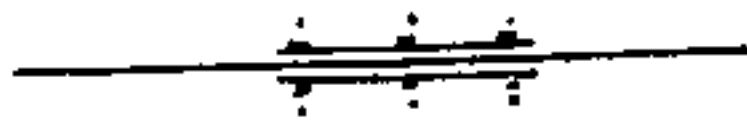
مرزا جان طپش

طپش کا نام مرزا محمد اسمٰعیل اور لقب مرزا جان تھا۔ طپش تخلص کرتے تھے۔ یہ اپنے لقب سے ہی مشہور ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد بخارا کے رہنے والے اور قوم کے مغل تھے۔[۱] سلسلۂ نسب مشہور صوفی سید جلال الدین بخاری تک پہنچتا ہے۔[۲] ان کے والد مرزا یوسف بیگ خاں نے بخارا سے ترک وطن کیا اور دہلی میں وارد ہوئے۔

---

۱ سخن شعرا۔ ص ۳۰۲، ملخص تذکرہ ریاض الوفاق (تلخیص ڈاکٹر عبدالرسول خیا مپور) ص ۴ ۵، مجموعۂ نغز جلد اول ص ۳۶۷، تذکرہ نادر ص ۱۰۳، تذکرۂ خوش معرکہ زیبا ص ۶۷، تذکرۂ عشقی ص ۵ ۵، تلخیص تذکرہ مجمع الانتخاب (تین تذکرے) ص ۹۲، تذکرۂ ہندی ص ۱۴۵، عمدہ منتخبہ ص ۴۰۶، بزم سخن ص ۲۷، دیوان جہاں ص ۱۶۳، طبقات شعرائے ہند طبقہ دوم ص ۴۸، ارباب نثر اردو ص ۲۰۹، فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۲۶۵، اردو نثر کا دہلوی دبستان ص ۲۰۹

۲ مجموعۂ نغز جلد اول ص ۳۶۷، ملخص تذکرہ ریاض الوفاق ص ۵۴، طبقات شعرائے ہند طبقہ دوم ص ۴۸، سخن شعرا ص ۳۰۲، عمدہ منتخبہ ص ۴۰۶، بزم سخن ص ۲۷، ارباب نثر اردو ص ۲۰۹، فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۲۶۵، تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند (ساتویں جلد) ص ۲۲۶۔ گلشن بے خار ص ۹۷

طپش کی پیدائش دہلی میں ہی ہوئی[1] سن پیدائش کے باب میں تمام تذکرے خاموش ہیں صرف طبقات شعرائے ہند میں ایک جملہ ملتا ہے جس کی بنیاد پر اکثر مؤرخین[2] نے انکا سن پیدائش ۱۱۸۲ھ / ۱۷۶۸ء متعین کیا ہے۔ کریم الدین کا جملہ یوں ہے :-

"۱۱۹۸ھ میں سولہ برس کی عمر اس کی تھی جب سے اس کو شوق شعر کہنے کا ہوا۔"

اس سے قبل کی عبارت بھی قابل غور ہے :-

"مرزا جہاندار شاہ بہادر کی سرکار میں افسر کھتا تھا جس کے ساتھ بنارس کو گیا۔ علی ابراہیم سے بھی اسکی ملاقات ہوئی تھی۔"[3]

مندرجہ بالا اطلاع کریم الدین کے غیر ذمہ دارانہ بیان کی ایک مثال ہے۔ جہاندار شاہ ۱۱۹۶ھ / ۱۷۸۲ء میں بنارس گئے تھے۔ طپش بھی ان کے ہمراہ تھے۔ صاحب تذکرہ گلزار ابراہیم نے ۱۱۹۸ھ / ۱۷۸۴ء میں طپش سے مکرر ملاقات کا حال اپنے تذکرہ میں درج کیا ہے[4]۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ طپش سفر بنارس

---

[1] مجموعۂ نغز (جلد اول) ص ۲۶۷، طبقات شعرائے ہند، طبقہ دوم ص ۴۸، عمدۂ منتخبہ ص ۴۰۶، بزم سخن ص ۷۲، داستان تاریخ اردو ص ۱۳۵، فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۲۶۵۔ گلشن بے خار ص ۷۰۔

وفا راشدی نے اپنی تصنیف "بنگال میں اردو" میں طپش کی جائے پیدائش کلکتہ اور ڈھاکہ مسکن بتایا ہے (ص ۲۲) یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں۔ طپش کا قیام ڈھاکہ میں نواب شمس الدولہ کے عہد میں تھا۔

[2] داستان تاریخ اردو ص ۱۳۵، ارباب نثر اردو ص ۲۱۰، فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۲۶۵، اردو نثر کا دہلوی داستان ص ۲۱۰، تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند (ساتویں جلد) ص ۲۲۶، میر امن دہلوی اور ان کی نثری خدمات (غیر مطبوعہ) ص ۲۷۶

[3] طبقات شعرائے ہند۔ طبقہ سوم ص ۴۹ [4] گلزار ابراہیم (گلشن ہند) مرزا علی لطف ص ۱۷۲

سے قبل ہی بحیثیت شاعر مشہور ہو چکے تھے۔ اگر وہ مجہول یا نومشق شاعر ہوتے تو گلزار ابراہیم میں ہرگز جگہ نہ پاتے۔ انہوں نے سولہ برس کی عمر میں شاعری شروع فرور کی مگر وہ ۱۱۹۸ھ نہیں بلکہ اس کے اور قبل کا سن ہے۔ یوں ۱۱۹۸ھ کی بنیاد پر ۱۱۸۲ھ طپش کا سن پیدائش بھی ثابت نہیں ہوتا۔

۱۱۹۸ھ میں وہ سولہ برس کے نہیں تھے اس کی تردید یوں بھی ہو جاتی ہے کہ طپش کے تذکرہ نویسوں نے انکو اول اول مرزا محمد یار بیگ سائل کا شاگرد بتایا ہے۔[1] درد کی شاگردی کے بارے میں بھی معاصرانہ اور متاخرانہ شہادت ملتی ہے۔[2] طپش درد کے مشہور شاگرد تھے انہوں نے کچھ عرصہ سائل کی شاگردی میں گزارا ہوگا۔ اس کے بعد درد کے دائرہ تلامذہ میں شامل ہوئے ہوں گے۔ اور درد تا حیات دہلی ہی میں رہے۔ انہوں نے برہمی سلطنت کے سارے تماشے دیکھے۔ ۱۱۹۹ھ میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہ قرین صحت نہیں ہے کہ طپش نے ۱۱۹۸ھ میں دہلی سے چلتے چلتے انکو اپنا کلام دکھانا شروع کیا ہو اور بطور شاگرد مشہور ہو گئے ہوں یا یہ بھی کہ وہ درد کے بالکل آخری دنوں میں انکے شاگردوں میں شامل ہوئے ہوں۔

طپش کے سن پیدائش کے تعین میں دو ماخذوں کو بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔ اَوّل

---

[1] تلخیص مجمع الانتخاب مؤلفہ شاہ کمال (بحوالہ تین تذکرے مرتبہ نثار احمد فاروقی) ص ۹۲، طبقات شعرائے ہند طبقہ دوم ص ۴۹، تذکرہ خوش معرکہ زیبا (مؤلفہ سعادت خاں ناصر مرتبہ عطا کاکوی) ص ۱۱، تلخیص تذکرہ ریاض الوفاق (معاصر مرتبہ عبدالمنان بیدل) ص ۲۸

[2] گلزار ابراہیم (گلشن ہند) ص ۱۲۰، تذکرہ عشقی (دو تذکرے) ص ۵۵، گلشن سخن (مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب) ص ۱۷۰، تذکرہ نادر (مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب) ص ۱۰۳، تذکرہ ریاض الوفاق ص ۵۵، سخن شعرا ص ۳۰۲، عمدہ منتخبہ (تذکرہ سرور) ص ۲۰۷، بزم سخن ص ۱۳۹، مجموعہ نغز (حصہ اول) ص ۴۹ تذکرہ ہندی ص ۱۴۵، گلشن بے خار ص ۹۶

صاحب تذکرۂ عشق کا مندرجہ ذیل بیان :-

"آخر با جل طبعی ازیں دار در رحلت فرمودہ"[1]

اور دوم[2] طپش کی بیاض۔ جس میں آخری یادداشت شعبان سنہ ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء کی درج ہے[4]۔ اس سے اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ وہ سنہ ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء کے بعد فوت ہوئے۔ اسے ہم سنہ ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء - سنہ ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۷ء تسلیم کریں[3]۔ اور اجل طبعی کے لئے زیادہ سے زیادہ تہتر[4] سال کی عمر موزوں ہے۔ اس روشنی میں انکا سن پیدائش سنہ ۱۱۴۳ھ/۱۷۴۴ء کے قریب قیاس کر سکتے ہیں۔

طپش کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہی ہوئی۔ عربی اور فارسی کے علاوہ انہوں نے سنسکرت زبان کا علم بھی[5] حاصل کیا تھا۔ خط شفیعا، نستعلیق اور صرانی میں انکو مہارت حاصل تھی[5]۔ ۱۶ سال کی عمر سے انہوں نے شعر کہنا شروع کیا[6]۔ شاگردی کے باب میں سا آئکا، اور درد کے علاوہ مجموعۂ نغز (جلد اول) سے ہدایت اللہ خاں کی بھی شاگردی کا علم ہوتا ہے۔ طپش سپاہی پیشہ تھے چنانچہ

---

[1] تذکرۂ عشق۔ وجیہہ الدین عشق (دو تذکرے مرتبہ کلیم الدین احمد) ص ۵۵۔

[2] بیاض مرزا جان طپش۔ نجم الاسلام (ماہ نامہ نقوش (لاہور) ستمبر سنہ ۱۹۶۷ء) ص ۶۹۔

[3] اسپرنگر نے طپش کا سنہ وفات سنہ ۱۸۱۶ء سے قبل بتایا ہے (ماہنامہ نقوش ص ۶۹)۔

[4] عمدۂ منتخبہ ص ۴۰۶، سخن شعرا ص ۳۰۲، طبقات شعرائے ہند، طبقہ دوم ص ۲۰۸، داستان تاریخ اردو ص ۱۲۶، اردو مرثیے (سفارش حسین رضوی) ص ۲۵۶۔

[5] تذکرۂ ہندی ص ۱۴۵، مجموعۂ نغز (جلد اول) ص ۳۶۷، ملخص تذکرۂ ریاض الوفاق (تلخیص عبدالرسول خیاپوری) ص ۵۵، عمدۂ منتخبہ ص ۴۰۶۔

[6] تذکرۂ ہندی ص ۱۴۵، ملخص تذکرہ ریاض الوفاق (تلخیص ڈاکٹر عبدالرسول خیاپوری) ص ۵۵۔

فنِ سپہ گری اور آلاتِ حرب سے بھی واقف تھے۔

طپش نے دربارِ شاہی سے وابستگی اختیار کر لی تھی. چنانچہ ۱۱۹۸ھ؁ میں جب مرزا جواں بخت جہاندار شاہ لکھنؤ آئے تو طپش بھی ان کے ہمراہ تھے۔ قیامِ لکھنؤ کے زمانہ میں جواں بخت کے حکم سے "گلزارِ مضامین" (۱۱۹۹ھ؁ ۸۵-۱۷۸۴ء) کو مرتب کیا۔[1] ناسخ نے "گلزارِ مضامین" کو طپش کا دیوان کہا ہے۔[2] لیکن گارسین دی تاسی نے اسے طپش کی چھوٹی چھوٹی نظموں کا مجموعہ بتایا ہے۔ مزید لکھتے ہیں کہ:-

"تاہم اس میں تذکرے کی بھی صورت ہے کیوں کہ دیباچے میں مصنف نے اردو شاعری اور شاعروں سے بحث کی ہے"[3]

۱۲۰۰ھ؁ ۱۷۸۶ء میں جب جواں بخت بنارس آئے تو طپش ان کے ہمراہ تھے۔[4] ۱۲۰۲ھ؁ ۱۷۸۸ء میں جواں بخت کا بنارس میں ہی انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد طپش بے یار و مددگار ہو گئے اور انہوں نے تلاشِ معاش کی نیت سے بنگال کا قصد کیا۔[5] قیاس ہے کہ ۱۲۰۲ھ؁ ۱۷۸۸ء تا ۱۲۰۳ھ؁ ۱۷۸۹ء کے درمیان طپش نے ڈھاکہ کا سفر اختیار کیا اور وہاں کے نواب امیر الملک شمس الدولہ سید احمد خاں ذوالفقار جنگ کے دربار سے وابستہ ہو کر ان کے مصاحبین میں شامل ہو گئے۔ ڈھاکہ کے قیام کے زمانہ میں انہوں نے ۱۲۰۶ھ؁ ۱۷۹۲ء میں اردو محاورات اور ضرب الامثال پر اولین کتاب "شمس البیان فی مصطلحات"

---

[1] [2] قطعۂ منتخبہ بحوالہ مقدمہ بہارِ دانش (خلیل الرحمٰن داؤدی) ص ۱۷۔ [3] خطباتِ گارساں دی تاسی ص ۱۰۱۔

[4] سخن شعراء ص ۳۰۲، ملخص تذکرہ ریاض الوفاق (عبد الرسول نیا مپور) ص ۵۵، تذکرۂ عشق (دو تذکرے) ص ۵۵، عمدۂ منتخبہ ص ۴۰۶، بزمِ سخن ص ۸۰، تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند (ساتویں جلد) ص ۲۲۷۔

[5] عبد الرحیم جاگیردار نے "اردو نثر کا دہلوی دبستان" میں مذکورہ بالا واقعات کو یوں بیان کیا ہے:-

"۱۱۹۸ھ؁ کے اواخر میں انھی (جواں بخت) معیت میں لکھنؤ آئے اور غالباً

(بقیہ حاشیہ آگے صفحہ پر)

ہندوستان" لکھی[1]۔ اس کا نام انہوں نے نواب سید احمد خاں کے خطاب (شمس الدولہ) پر رکھا تھا۔

ان کے انتقال ۱۲۱۱ھ / ۱۷۹۶ء تک وہیں رہے۔ مرزا جہاندار شاہ کے انتقال کے بعد وہ تمام صحبتیں درہم برہم ہوگئیں اور طپش نے بھی بنارس سے نکل کر تلاش معاش میں صوبہ بنگال کا سفر کیا۔" (ص ۲۱۵)

جاگیر دار صاحب نے ایک جملہ میں لکھنؤ میں آمد اور وہیں انتقال ہوجانیکا ذکر کیا ہے اور دوسرے جملے میں بنارس کے قیام کی بات کہی ہے۔ یوں سارے واقعات مبہم ہوگئے ہیں۔ نادم سیتاپوری نے نوجوان بخت کا دہلی ہی میں انتقال بتایا ہے اور انکے انتقال کے بعد طپش کی دہلی سے روانگی کا ذکر کیا ہے (فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۲۶۵) ظاہر ہے کہ یہ بیان درست نہیں۔ جاوید نہالی طپش کے بارے میں لکھا ہے :-

"طپش انیسویں صدی کے ان باکمال شاعروں میں سے ہیں جو دلی کی غیر یقینی سیاسی حالت اور آئے دن کی تاخت و تاراجی سے تنگ آکر اپنے وطن سے نکل کر ہندوستان کے دوسرے شہروں میں جا بسے تھے۔ طپش بھی بنارس، لکھنؤ، عظیم آباد، جہانگیر آباد اور مرشد آباد کی خاک چھاننے کے بعد ۱۸۰۰ء اور ۱۸۰۳ء کے درمیان کلکتہ آئے۔"

(انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۳۲۲) طپش کے عہد میں دہلی میں جو انتشار اور خلفشار برپا تھا اس سے کون متاثر نہیں تھا لیکن یہ قرین صحت نہیں ہے کہ اس انتشار سے متاثر ہوکر طپش نے دہلی سے نکلکر دوسرے شہروں کو آباد کیا۔ وہ جواں بخت کی سرکار میں ملازم تھے۔ انکے تو سال کا زمانہ طپش کیلئے اطمینان و سکون کا زمانہ تھا۔ اسکے علاوہ ۱۸۰۰ء یا ۱۸۰۳ء میں وہ معتدل حالات میں کلکتہ نہیں آئے تھے۔ حامد حسن قادری بھی طپش کے سفر بنارس کا ذکر نہیں کرتے بلکہ ڈھاکہ میں نواب شمس الدولہ کی ملازمت کا ذکر کرتے ہیں۔ (داستان تاریخ اردو ص ۱۳۶)

[1] مقدمہ بہار دانش۔ خلیل الرحمن داؤدی ص ۶۔

یہ ۱۸۴۹ء / ۱۲۶۵ھ میں مرشد آباد سے شائع ہوئی۔[1]

نواب شمس الدولہ سے توسل کے ضمن میں سب سے اہم واقعہ طپش کی اسیری کا ہے اس کے بارے میں ہلکا سا اشارہ تذکرۂ ریاض الوفاق اور تذکرۂ عشقی میں ملتا ہے۔[2] نجم الاسلام نے طپش کی بیاض سے متعلق اپنے مضمون میں بھی اس واقعہ کا اجمالی ذکر کیا ہے تاریخ سے تفصیلات یوں واضح ہوتی ہیں کہ ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء میں آصف الدولہ کے انتقال کے بعد اس کا متبنیٰ وزیر علی خاں مسند آرا ہوا۔ اس کے سطحی کردار اور اخلاق و عادات کی بنا پر گورنر جنرل جان شور نے اسے معزول کر کے بنارس بھیج دیا۔[3] یہاں وزیر علی خاں نے انگریزوں سے انتقام لینے کی غرض سے قرب و جوار کے راجاؤں سے مدد حاصل کرنے کے لئے خفیہ طور پر خط و کتابت کی۔ اس سازش میں نواب شمس الدولہ سے بھی اسکی خط و کتابت ہوئی تھی۔ گورنر جنرل کو جب وزیر علی خاں کے ان ارادوں کا علم ہوا تو اس نے بنارس کے ریذیڈنٹ جان چیری کو حکم دیا کہ وہ اسے کلکتہ بھیج دے۔ لیکن وزیر علی خاں جان چیری کو قتل کر کے فرار ہو گیا۔ انگریزی فوج نے اسے جے نگر میں گرفتار کر لیا۔ اس کے سامان کی تلاشی کے دوران نواب شمس الدولہ کا ایک خط نکلا۔ اسی جرم میں نواب شمس الدولہ کئی ماہ کلکتہ کے فورٹ ولیم میں قید رہے۔[4] بڑی مشکل سے رہائی ملی۔

نواب شمس الدولہ کے ساتھ طپش بھی قید میں تھے۔ طپش کی اسیری کی معاصرانہ شہادت وقائع عبد القادر خانی (علم و عمل جلد اول) میں بھی مل جاتی ہے۔ طپش نے ۱۸۰۶ء / ۱۲۲۱ھ میں رہائی

---

[1] داستان تاریخ اردو۔ ص ۱۲۷۔

[2] خطبات گارساں دی تاسی کے تحشیہ میں مرتب نے لکھا ہے کہ طپش کا قید ہونا کسی تذکرے میں نہیں پایا جاتا (ص ۱۴۹) یہ درست نہیں ہے۔ [3] سوانحات سلاطین اودھ، جلد اول۔ ص ۱۳۳، ۱۳۴۔

[4] " " " " جلد اول ص ۱۴۰، ۱۴۱

پائی۔[1] ایامِ اسیری میں طپش نے حضرت علی کی منقبت بہ طرزِ مثمن بارہ بند تصنیف کیا تھا۔[2] انہیں دنوں کی ایک مثنوی "یوسف زلیخا" ان سے منسوب کیجاتی ہے۔ گارسن دی تاسی نے لکھا ہے:۔

"میں یوسف زلیخا کے چھ مختلف نسخوں سے واقف ہوں۔ ایک امین کا جو ۱۸۶۰ء میں لکھا گیا۔ دوسرا طپش کا جو اس نے بزمانہ قید خانے قید میں لکھا۔"[3]

اپنی بات کی تصدیق میں گارسن دی تاسی نے تذکرۂ قاسم اور تاریخ ادبیات (جلد اول ص ۵۰۲) کا حوالہ دیا ہے۔ حکیم حبیب الرحمٰن ۱۸۰۲ء میں "یوسف و زلیخا" کی تصنیف کا ذکر کرتے ہیں۔[4] لیکن ایامِ اسیری میں اس کے قبل یا بعد میں بھی ایسی کسی تخلیق کا سراغ نہیں ملتا۔

طپش نے ایامِ اسیری میں ہی ۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۲ء میں بہارِ دانش (منظوم) کہی۔

---

[1] طپش کی بیاض میں مفتی صبغ الاسلام کا تصنیف کردہ ایک قطعہ درج ہے جس سے انکی رہائی کا سن معلوم ہوتا ہے ؎

میرزا جان طپش آنکہ بہ قدرت حق
گل جمعش ہمہ از آب نجابت بسرشت
بہرِ تاریخِ رہایش صبغ از خامہ
"طپش از قید الم یافت رہائی" بنوشت
سنہ ۱۲۲۱ھ

(بحوالہ بیاض مرزا جان طپش، ماہنامہ نقوش۔ (لاہور) ستمبر ۱۹۶۷ء ص ۶۹۔

[2] بیاض مرزا جان طپش۔ ماہنامہ نقوش لاہور ستمبر ۱۹۶۷ء ص ۶۹۔

[3] خطبات گارساں دی تاسی۔ ص ۱۴۹۔

[4] مضمون شمس البیان، مشمولہ ماہنامہ ادیب، الہ آباد نومبر ۱۹۱۰ء بحوالہ مقدمہ بہار دانش ص ۳۳۔

رہائی کے بعد طپش نے نواب شمس الدولہ سے علیحدگی اختیار کی اور ۱۸۰۸ء میں بہ عہد جان ولیم ٹیلر فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی سے وابستہ ہوگئے۔ شعبہ میں کتابوں پر نظر ثانی کا کام طپش کے سپرد تھا۔ انہوں نے بہار دانش کو بعض اضافوں کے ساتھ شعبہ میں دیدیا تھا۔ ۱۸۱۱ء میں کالج نے ایک کثیر رقم بطور انعام دے کر ان کا کلیات خریدا تھا۔[1] غالباً اسی کے بارے میں وارث نے لکھا ہے کہ انکی شعری تصنیف (نام درج نہیں بہار دانش کا ذکر وہ اس سے قبل کر چکے ہیں)۔ پر کالج نے انکو چار سو روپے کے انعام سے نوازا تھا۔[2] خلیل الرحمٰن داؤدی نے لکھا ہے کہ یہ کلیات ۱۸۱۲ء میں کالج کی طرف سے شائع ہوا تھا۔[3] طپش کلیات میر کی ترتیب میں بھی شامل تھے۔

طپش غالباً ۱۸۱۱ء تک ہی شعبہ سے وابستہ رہے۔ کالج سے نکل کر انہوں نے زرالب کشور کا توسل اختیار کیا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے راج کشن نے بھی طپش کو اپنا مصاحب بنایا۔[4] وہ ۱۸۱۱ء اور ۱۸۱۲ء کے درمیان کلکتہ میں رہے۔ ۱۸۱۲ء میں وہ قطعی طور پر کلکتہ سے چلے گئے۔ اسکی تصدیق "دیوان جہاں" (۱۸۱۲ء) سے ہوتی ہے۔[5] ان کا ۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء میں عظیم آباد اور ۱۲۲۸ھ/۱۸۱۲ء میں بنارس کا قیام ثابت ہوتا ہے[6] ۱۲۲۹ھ تک وہ قطعی طور سے حیات رہے۔ صاحب تذکرہ ریاض الوفاق نے

---

[1] تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند (مدیر وقار عظیم) ساتویں جلد، اردو ادب (دوم) ص ۲۲۸۔

[2] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۱۰۴۔

[3] مقدمہ بہار دانش۔ ص ۱۰۔

[4] ملخص تذکرہ ریاض الوفاق (تلخیص ڈاکٹر عبد الرسول نیا میور) ص ۴۰۔

[5] دیوان جہاں۔ بینی نرائن جہاں ص ۱۶۳۔

[6] بیاض مرزا جان طپش، ماہنامہ نقوش (لاہور) ص ۶۸۔

لکھا ہے کہ بنارس سے وہ لوٹ کر پھر کلکتہ آئے اور وہیں انتقال کیا۔[1] بہر حال ۱۲۳۱ھ ۱۸۱۶ء - ۱۲۳۲ھ ۱۸۱۷ء کے قریب انکا انتقال ہوگیا تھا۔

مرزا جان کی سیرت اور اخلاق کی تعریف بیشتر تذکرہ نگاروں نے کی ہے۔

طپش کی شاعری کے بارے میں معاصر اور متاخر تذکرہ نگاروں نے اجمالی تبصرے کئے ہیں اور مختلف پیرائے میں انکی شاعری کی تعریف کی ہے۔

تذکروں میں طپش کا تخلص کہیں طپش لکھا ہے اور کہیں تپش۔ انہوں نے اپنی بیاض میں طپش ہی لکھا ہے۔ چنانچہ یہی درست ہے۔ تپش اور طپش کے ذیل میں ایک دلچسپ بات تذکرہ "بزم سخن" میں نظر آتی ہے۔ صاحب تذکرہ نے تپش اور طپش کو دو الگ ہستیاں متصور کر کے الگ الگ عنوان قائم کئے ہیں۔[2] حالانکہ سوانحی حالات میں ذرہ برابر ہی کمی و بیشی واقع ہوئی ہے۔

طپش اپنے عہد کے اچھے اور باکمال شاعر تھے۔ انکی شاعری اس عہد کے مخصوص مضامین اور مخصوص انداز کی شاعری ہے۔ یہ ہجر و فراق کی حدیث، آرزوئے وصل اور لب و رخسار کی تفسیر سے عبارت ہے۔ انکے اشعار میں عریانی اور ابتذال نہیں ہے۔ جس درمیانی سطح سے وہ بولتے ہیں اسمیں نفاست اور پاکیزگی ہے۔ مثالیں دیکھئے ؎

کب دل سے بھولتی ہے چشم سیاہ اسکی نظروں میں پھر رہی ہے ترچھی نگاہ اسکی

ہے غضب پیکان میں اسکے یہ کیا تاثیر تھی خون بھی نخچیر کا نخچیر سا تڑپا کیا

طپش کے مرثیے جذبات نگاری، سوز و گداز اور سادگی کے بڑے پر اثر مرقعے ہیں۔

طپاں (متوفی ۱۲۳۶ھ) طپش کے مشہور شاگرد تھے۔

---

[1] ملخص تذکرہ ریاض الوفاق۔ ص ۲۹ [2] بزم سخن۔ سید حسن علی خاں سلیم ص ۲۱، ۸۰۔

۲۳

نورعلی

نورعلی موضع چھتلا ضلع ہگلی کے باشندہ تھے۔ ان کے والد کا نام سید نذر علی تھا۔ سید نذر علی ملازمت کرنا کسرِشان سمجھتے تھے اور پیری مریدی میں گزارہ کرتے تھے۔ یہی واحد ذریعہ معاش تھا۔

نورعلی تعلیم حاصل کرنے کے لئے کلکتہ آئے۔ اتفاقاً انکی ملاقات کاظم علی جواں سے ہوئی۔ چنانچہ انہیں کے فیض تعلیم سے یہ زبان اردو کے محاوروں اور دیگر رموز ونکات سے واقف ہوئے۔ جواں ہی کے توسط سے نورعلی کی رسائی فورٹ ولیم کالج تک ہوئی اور یہ شعبۂ ہندوستانی کے منشیوں میں شامل ہوگئے۔[1]

نورعلی نے فارسی مثنوی "نل دمن" کا ترجمہ وتلخیص "بہار عشق" کے نام سے کیا وہ "نقلیات لقمانی" کی تصحیح میں بھی شامل تھے۔

---

[1] دیباچہ بہار عشق۔ (ق۔ ن) نورعلی ورق ۳، ۴، ۵۔

۲۴

سیّد علی

سیّد علی، میر شیر علی افسوس کے بیٹے تھے[1] ان کے سوانحی حالات دستیاب نہیں۔

جاوید نہال نے سیّد علی کو کالج کا بے ضابطہ ملازم قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"سیّد علی جعفری نے اپنے والد محترم کے مشورے سے ہی گلشن اخلاق ترتیب دی تھی اور مدرس اول ولیم ٹیلر کو نذر کی تھی۔ جنھوں نے کالج کونسل سے اسکی خریداری کی سفارش کی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیّد علی کو کالج کی باضابطہ ملازمت مل نہ سکی تھی"[2]

یہ ضرور ہے کہ سیّد علی نے "گلشن اخلاق" کو ولیم ٹیلر کے سامنے پیش کیا تھا لیکن وہ باضابطہ ملازم تھے۔ شعبۂ ہندوستانی میں ۱۲/ دسمبر ۱۸۰۹ء کو ۴۰ روپے ماہوار مشاہرے پر ان کا تقرر عمل میں آیا تھا۔[3]

"گلشن اخلاق" انکی واحد تالیف ہے۔

---

[1] دیباچہ گلشن اخلاق (ق۔ن) سیّد علی۔ ورق ۲۔

[2] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب۔ ص ۲۱۰۔

[3] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۹۴۔

۱۸۱۶ء میں ٹیلر اور مارٹن نے بعض منشیوں کا فارسی اور ہندوستانی زبانوں کا امتحان لیا تھا۔ ان منشیوں میں سید علی بھی شامل تھے۔ اس وقت ان کا مشاہرہ ساٹھ روپے ماہوار تھا۔[1]

ولیم پرائس کے عہد میں سید علی نے فورٹ ولیم کالج میں ہندی زبان کا مطالعہ کیا۔ اور دیگر منشیوں کے ساتھ یہ بھی ہندی کا امتحان دینے کے امید وار ہوئے۔ سکریٹری رڈیل نے ۱۸ رمئی ۱۸۲۵ء کے ایک خط میں ولیم پرائس کو لکھا کہ ۲۴ رمئی ۱۸۲۵ء کے بعد جس دن بھی سہولت ہو وہ ہندی کا امتحان لے لیں۔

بعد میں سید علی شعبۂ فارسی سے وابستہ ہوگئے تھے۔ اس کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ جون ۱۸۳۰ء میں سکریٹری رڈیل نے جتنے منشیوں کی تفصیلات سرکار کے پاس بھیجیں۔ اس میں شعبۂ فارسی کے ذیل میں سید علی کا نام اور چالیس روپے مشاہرہ درج ہے۔[2]

---

[1] Fort William, 27, Feb. 1816 - 22 April, 1818, Home Misc, Vol - 6 P. 262 - 265.
(بحوالہ فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۹۲)

[2] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۱۲۳، ۱۳۹۔

۲۵

بینی نرائن جہاںؔ

یوں تو تاریخ ادب اردو کی بیشتر کتابوں اور تذکروں میں بینی نرائن کا ذکر ملتا ہے[1] لیکن انہوں نے اپنی مختلف کتابوں کے دیباچوں میں اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ کافی اہم ہے۔

چار گلشن، دیوان جہاں، نوبہار (قصۂ گل صنوبر) اور باغ عشق کے دیباچوں سے انکی پوری زندگی تو نہیں لیکن انکی زندگی کا کافی حصہ سامنے آجاتا ہے۔ جو تصنیف و تالیف سے متعلق ہے۔

بینی نرائن کے والد کا نام رائے شودشٹ نارائن تھا۔[2] اور بینی نرائن مہاراجہ لچھمی نارائن کے بنیرہ تھے۔[3] یہ لوگ قوم کے کھتری مہتہ تھے۔ بینی نرائن کے بیشتر سوانح نگاروں نے

---

[1] طبقات شعرائے ہند، طبقہ سوم ص ۶۲، سیر المصنفین ص ۱۴۲، داستان تاریخ اردو ص ۱۲۸، ارباب نثر اردو ص ۲۸۶، فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۲۴۶، تاریخ ادب اردو ص ۱۴، ہندوؤں میں اردو (حصہ اول دربارۂ نظم) ص ۱۹۲، انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۵۵، تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند، آٹھویں جلد ص ۸۳۔

[2] دیباچہ چار گلشن۔ از بینی نرائن (ق۔ن) ورق ۲، دیباچہ باغ عشق۔ از بینی نرائن بحوالہ اردو کی قدیم داستانیں ص ۹۹

[3] طبقات شعرائے ہند، طبقہ سوم (ص ۶۲)، داستان تاریخ اردو (ص ۱۲۸) ارباب نثر اردو (ص ۲۸۶) فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی (ص ۲۴۶) ہندوؤں میں اردو (ص ۱۹۲) اور تاریخ ادبیات مسلمانان پاک ہند (ص ۸۳) کے مؤلفین نے بینی نرائن کے والد کا نام لچھمی نرائن درج کیا ہے۔ جو غلط ہے۔

انکو لاہور کا باشندہ قرار دیا ہے۔ بینی نرائن نے بھی "چار گلشن" کے دیباچے میں خود کو لاہور کا رہنے والا بتایا ہے[1]۔ لیکن "باغ عشق" کے دیباچہ میں بینی نرائن خود کو واضح طور سے "دلی کا رہنے والا کہتے ہیں اور اپنا مولد شاہ جہاں آباد (دہلی) درج کرتے ہیں:۔

"یہ ذرۂ بے مقدار بینی نرائن ابن راجہ شودشٹ نرائن بنیرہ مہاراجہ لچھی نرائن کھتری مہتہ، دلی کا رہنے والا، احوال پر ملال اپنا بیان کرتا ہے۔ اگرچہ مولد اس خاکسار کا شاہ جہاں آباد ہے پر بزرگوار اس مور ضعیف کے عہد دولت میں جنت آرام گاہ محمد شاہ بادشاہ غازی مرحوم و مغفور کے دارالسلطنت لاہور سے ہندوستان[2] میں آئے"[3]

"دیوان جہاں" کے منظوم دیباچے سے بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بینی نرائن نے اپنے زندگی کے ابتدائی ایام دلی میں گزارے تھے[4]۔ ان کے آبا و اجداد لاہور کے باشندہ تھے۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد حکومت میں ترک وطن کر کے دلی (ہندوستان) آئے۔ بینی نرائن کے بزرگ شاہی عنایات اور نوازشات سے بلند مرتبے پر فائز ہوئے۔ بینی نرائن دلی (شاہ جہاں آباد) میں پیدا ہوئے اور یہیں سن شعور کو پہونچے[5]

---

[1] دیباچہ چار گلشن (ق.ن) ورق ۲۔

[2] ہندوستان سے مراد شمالی ہند کا علاقہ ہوا کرتا تھا۔

[3] دیباچہ باغ عشق بحوالہ اردو کی قدیم داستانیں ص ۸۹، ۹۰۔

[4] دیوان جہاں۔ بینی نرائن جہاں (ق.ن) ورق ۲۔

[5] دیباچہ باغ عشق بحوالہ اردو کی قدیم داستانیں ص ۸۹، ۹۰۔

کھیم نرائن رِند نواب سعادت علی خاں کے وکیل اور بینی نرائن کے بڑے بھائی تھے۔ یہ اپنے عہد کے مشہور عالم اور شاعر تھے۔ بینی نرائن نے انہیں کے یہاں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اتفاقاً کھیم نرائن لکھنؤ سے لارڈ مارکوئس ویلزلی کے ساتھ کلکتہ کے لئے روانہ ہوئے۔ بینی نرائن بھی ان کے ساتھ کلکتہ چلے آئے۔

بینی نرائن ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء میں کلکتہ آگئے تھے۔ تقریباً انہیں دنوں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تھا۔ لیکن نامعلوم وجوہ کی بنا پر انہیں کوئی ملازمت نہ مل سکی اور تقریباً گیارہ برس تک بیکار رہے۔[1]

۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں بینی نرائن نے منشی امام بخش کی تحریک پر "چار گلشن" تالیف کی۔

بینی نرائن کالج کے باضابطہ ملازم نہیں تھے۔ وقتاً فوقتاً کسی عہدہ دار کی فرمائش پر یا اپنی مرضی سے کتابیں تالیف کرکے صاحبان کونسل کے سامنے پیش کرتے اور انعام حاصل کرتے۔ "بابِ عشق" کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

"......... پچیس برس کے عرصے میں اس جزضعیف نے اپنے دل بہلانے کے واسطے کئی نسخے تصنیف و تالیف کر حضور میں صاحبان کونسل کے گزرانے۔ حق سبحانہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان کتابوں نے خوب رواج پایا اور مرغوب مزاج خاص و عام ہوئیں بلکہ نقلیات ان کی بہت شخص بطریق تحفہ ملک بہ ملک لے گئے"۔[2]

---

[1] اپنی بے روزگاری کی مدت بینی نرائن نے "چار گلشن" میں گیارہ سال اور "دیوان جہان" میں بارہ سال متعین کی ہے لیکن ۱۲۱۵ھ میں کلکتہ آنے اور ۱۲۲۵ھ میں "چار گلشن" تالیف کرنے کا درمیانی وقفہ زیادہ سے زیادہ گیارہ سال ہی قرار پاتا ہے۔

[2] دیباچہ "بابِ عشق" بحوالہ اردو کی قدیم داستانیں ص ۹۰۔

"نوبہار" کے دیباچے میں بینی نرائن لکھتے ہیں :۔

"بالفعل کہ اب سنہ ۱۲۴۰ھ اور سنہ ۱۸۲۴ء ہیں عہد دولت میں لارڈ امرس صاحب بہادر کے ایک دن منشی امام بخش کہ ۲۵ برس کے عرصے سے اس خاکسار کے ساتھ رابطہ محبت دلی رکھتے ہیں فرمانے لگے کہ سابق میں قصۂ گل صنوبر کو منشی باسط خاں نے تصنیف کیا تھا۔ ظاہرا نامربوطی اور بے محاورگیٔ الفاظ کے باعث صاحبان کالج کونسل کی نظر مبارک میں پسند نہ پڑا بلکہ انہیں کو واپس ہوا۔ حق تو یہ ہے کہ اس زمانے میں مدرسۂ کمپنی انگریز بہادر یعنی کالج دارالضرب عالموں اور فاضلوں کا ہے۔ جو کتاب کہ وہاں کے صاحبوں کو پسند نہ پڑے اور نامنظور ہو کر نکالی جائے پھر اسے کون پوچھتا ہے ؟ تم کو حق تعالیٰ نے طبع تند اور ذہن رسا عطا فرمایا ہے اور کئی ایک کتابیں تیری شہر میں مشہور ہوئی ہیں بلکہ بہت لوگ خوش ہو کر بطریق تحفہ ملک بہ ملک لے گئے۔ اب تجھ کو لازم ہے کہ اس قصۂ رنگین کو نثر و نظم سے آراستہ کر کے کانوں کو زیب و زینت بخشو.......................

اس بات کو بہ پاس خاطر منشی صاحب ممدوح کے قبول کیا اور دو ہفتے کے عرصے میں تمام قصۂ گل صنوبر کو کتاب فارسی سے ترجمہ کیا۔"[1]

مندرجہ بالا اقتباسات سے اس خیال کو تقویت پہونچتی ہے کہ بینی نرائن زمرۂ منشیان کالج میں شامل نہیں تھے۔ ورنہ باسط خاں کی "گل وصنوبر" کے بارے میں انکی معلومات کا ماخذ امام بخش نہ ہوتے۔ اور

---

[1] دیباچہ نوبہار (بحوالۂ مقالہ قاضی عبدالودود) ماہنامہ نیا دور، جولائی سنہ ۱۹۵۹ء ص ۴، ۵

نہ انکی تحریک پر بینی نرائن کتابیں ترجمہ یا تالیف کیا کرتے۔ بینی نرائن نے کالج کیلئے تھامس روبک کی فرمائش پر صرف ایک کتاب "دیوان جہاں" مرتب کی اور اس وقت بھی وہ کالج کے باضابطہ ملازم نہیں تھے بلکہ حیدر بخش حیدری نے بینی نرائن کو مشورہ دیا تھا کہ وہ تھامس روبک سے ملاقات کریں۔ تھامس روبک نے "دیوان جہاں" ترتیب دینے کی فرمائش کی تھی اور تکمیل کے بعد کالج کونسل سے اجرت بھی دلوائی تھی۔ "نو بہار" کے دیباچہ میں بینی نرائن نے لکھا ہے :-

"......... بموجب فرمائش کپتان تھامس روبک مرحوم کے اشعار شعرائے متقدمین و متاخرین کے جمع کئے اور "دیوان جہاں" نام رکھ کر دستگیری سے صاحب ممدوح کی حضور میں صاحبان کونسل کو گزرانا اور عنایت صلہ سے بھی سرفراز ہوا۔"[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے بھی یہ سراغ نہیں ملتا کہ بینی نرائن کو کالج میں ملازمت حاصل ہوئی تھی۔ "نو بہار" کے دیباچے میں اپنی تصنیف "بہار عشق" اور "گلزار حسن" کا ذکر کرتے ہوئے وہ یہی لکھتے ہیں کہ "شہر میں رواج دیا" کالج کے لئے لکھنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

بینی نرائن چار گلشن، بہار عشق، گلزار حسن، دیوان جہاں، تفریح بنبع، قصۂ گل صنوبر، (نو بہار)، باغ عشق اور تنبیہ الغافلین کے مرتب، مترجم اور مؤلف تھے۔

بینی نرائن کا تخلص جہاں تھا۔ شاعری کے میدان میں بینی نرائن کا مرتبہ بہت بلند نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے بھائی کھیم نرائن رند کی صحبت میں شعر و سخن کا ذوق پایا۔ انکی شاعری کے نمونے منظوم دیباچہ یا داستانوں کے درمیانی اور اختتامی اشعار ہیں۔ یہ اشعار سیدھے سادے انداز میں کہے گئے ہیں اور شاعری کا بہت معیاری اور اعلیٰ نمونہ پیش نہیں کرتے۔ کریم الدین کے علاوہ اور کسی تذکرہ نگار نے بحیثیت شاعر ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔

---

[1] دیباچہ نو بہار (بحوالہ مقالہ قاضی عبدالودود) ماہنامہ نیا دور، جولائی ۱۹۵۹ء ص ۲۰۔

۲۶

کندنؔ لالؔ

کندن لال کے سوانحی حالات دستیاب نہیں۔ کالج کونسل کی ۴ مئی ۱۸۰۱ء کی کاروائی میں کندن لال کا نام بحیثیت منشی اور تنخواہ چالیس روپے ماہوار درج ہے[1]۔ لیکن شاید بعد میں انہیں شعبہ ہندوستانی سے الگ کر دیا گیا تھا اس لئے کہ ۹ ستمبر ۱۸۰۳ء میں گل کرسٹ کی جانب سے تصانیف پر انعام کے لئے پیش کی گئی فہرست میں کندن لال کی واحد تالیف "کلا کام" بھی شامل ہے[2]۔ واضح ہو کہ یہ فہرست ان مصنفین کی تصانیف پر مشتمل ہے جو شعبہ کے باتنخواہ ملازم نہیں تھے۔

عتیق صدیقی گل کرسٹ اور اسکا عہد میں صفحہ ۱۰۸ (طبع ثانی) پر کندن لال کا نام کالج کے بے ضابطہ مصنفین کی فہرست میں درج کرتے ہیں۔ حالانکہ صفحہ ۱۲۱ پر عتیق صاحب نے کالج کونسل کی کاروائی کے حوالے سے انہیں باقاعدہ ملازم بتایا ہے۔ اور صفحہ ۱۶۷ پر انکے تقرر کی تاریخ ۴ مئی ۱۸۰۱ء مشاہرہ چالیس روپے اور مستعفی ہونے کی تاریخ ۲۸ مارچ ۱۸۰۲ء درج کی ہے۔ لیکن ۹ ستمبر ۱۸۰۳ء کی فہرست کے پیش نظر مستعفی ہونے کی یہ تاریخ درست نہیں معلوم ہوتی۔

۱۔ Proceedings of the College of fort William, Vol. 559, P. 5.

۲۔ " " " " " " " " " P. 278.

۲۷

توتارامؔ

توتارام شعبۂ ہندوستانی کے باضابطہ ملازم نہیں تھے۔ ان کے حالاتِ زندگی کہیں نہیں ملتے۔ انہوں نے اپنی واحد تصنیف "دل رُبا" میں بھی اپنے حالات قلم بند نہیں کئے۔ بلکہ اپنا نام تک لکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے[1]۔ گل کرسٹ کی ۹ ستمبر ۱۸۰۲ء کی فہرست میں چونکہ "دل رُبا" بھی شامل تھی اس لئے اس فہرست سے ہی دل رُبا کے مصنف توتارام کے نام کا علم ہوتا ہے۔

---
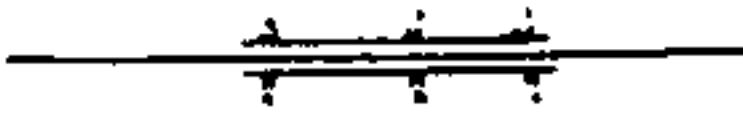
[1] دل رُبا کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) میں موجود ہے جس میں نہ تو کوئی دیباچہ ہے اور نہ مصنف کا نام۔

۲۸

شیخ حفیظ الدین احمد

شیخ حفیظ الدین کے والد کا نام شیخ ہلال الدین محمد تھا۔ یہ شیخ محمد ذاکر کے بیٹے تھے۔ شیخ حفیظ الدین احمد کے آباد اجداد عرب سے ترک وطن کر کے دکن آئے۔ یہاں انہوں نے دو، تین پشتیں گزاریں۔ انہیں میں سے ایک شخص حسن نامی بنگال میں وارد ہوئے۔ انکی پانچ پشتوں نے بنگال میں عابدانہ اور زاہدانہ زندگی بسر کی۔ انہیں کی اولاد میں سے مسمی شاہ شیخ سعدی عرف شاہ میران نے حضرت شاہ عبداللہ کرمانیؒ کی اولاد میں سے حضرت شاہ عنایت اللہؒ سے رشد و ہدایت حاصل کی اور عبادت و ریاضت میں اعلیٰ درجات کو پہونچے۔ البتہ شیخ حفیظ الدین احمد کے والد نے ملازمت کا پیشہ اختیار کیا۔[1]

شیخ حفیظ الدین احمد بنگال میں ہی پیدا ہوئے۔ اپنے سن پیدائش کا ذکر انہوں نے اپنے خود نوشت حالات میں نہیں کیا ہے۔

حفیظ الدین احمد نے بیس برس کی عمر تک "مدرسہ کمپنی" میں عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔[2] چونکہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے فوراً کالج میں ملازمت حاصل کر لی تھی۔

---

[1] دیباچہ خرد افروز (ق۔ن) شیخ حفیظ الدین احمد ص ۱۔

[2] دیباچہ خرد افروز (ق۔ن) ص ۱۔

اس لئے جب وہ کالج میں ملازم ہوئے اس وقت انکی عمر بیسؔ، اکیسؔ سال سے زیادہ نہ رہی ہوگی۔ اس بنیاد پر انکا سن پیدائش ۱۸۰۰ء کے آس پاس متعین کیا جاسکتا ہے

حفیظ الدین احمد تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۴ر مئی ۱۸۰۱ء میں فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ فارسی میں ماتحت منشی مقرر ہوئے۔ ان کا مشاہرہ چالیسؔ روپے ماہوار تھا۔[1]

انہوں نے گل کرسٹ کی فرمائش پر فارسی کی "عیار دانش" کا ترجمہ "خرد افروز" کے نام سے کیا۔

عتیق صدیقی نے حفیظ الدین احمد کی شعبۂ فارسی سے علیٰحدگی کا سن ۲ر نومبر ۱۸۰۱ء درج کیا ہے[2] لیکن ۲ ار مئی ۱۸۰۳ء کو گل کرسٹ نے "خرد افروز" پر انعام کے لئے ایک خط کالج کونسل کے سکریٹری کو لکھا تھا۔ اس وقت وہ شعبۂ فارسی میں موجود تھے[3]۔ کریم الدین نے لکھا ہے کہ وہ کچھ مدت کے بعد مدرسی ترک کرکے دہلی کے ریذیڈنٹ ٹکاف صاحب کے میر منشی ہوئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ۱۸۱۵ء میں حفیظ الدین احمد کا دہلی میں قیام ثابت کیا ہے[4]

حفیظ الدین احمد کب تک حیات رہے اسکا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

---

[1] Proceedings of the College of Fort William Vol. 559, P. 4.

[2] گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۱۹۸

[3] Proceedings of the College of Fort William. Vol. 559, P. 247, 248.

[4] طبقات شعرائے ہند، طبقہ سوم ص ۴ ۔

۲۹

اکرام علی

اردو ادب کی تاریخ اکرام علی کے سوانحی حالات سے یکسر خالی ہے۔ ان میں اکرام علی کے ذیل میں "اخوان الصفا" کا ذکر کر دیا گیا ہے۔[۱] ان کے حالات زندگی صرف نادم سیتاپوری کی فراہم کردہ اطلاعات کی روشنی میں مفصل طور سے سامنے آتے ہیں۔

نادم سیتاپوری کے مطابق اکرام علی کا تخلص اکرام تھا۔ ان کا سلسلہ حضرت عمر فاروق رضؓ سے ملتا ہے۔ اکرام علی کے مورث اعلیٰ میں سے ایک شخص شیخ کمال الدین سلیمان محمد غوری بادشاہ کے عہد حکومت (۱۲۰۵ء-۶۰۲ھ - ۱۱۹۱ء-۵۸۷ھ) میں کابل سے ہندوستان میں وارد ہوئے اور ملتان کے نزدیک قصبہ نارنول میں سکونت اختیار کی۔ اکرام علی کا سلسلہ بابا فرید شکر گنجؒ سے بھی ملتا ہے۔ بابا فرید کے متعلقین میں سے ایک شخص شیخ محمد رئیس تھے۔ انہوں نے سیتاپور میں توطن اختیار کیا۔ اکرام علی کا سلسلہ چھ نسلوں سے ان تک پہونچتا ہے۔ اکرام علی کے آبا و اجداد "ارباب تصوف" میں سے تھے۔ اس کے علاوہ وہ دربار شاہی سے جاگیروں اور

---

[۱] تذکرہ طبقات شعرائے ہند، طبقہ دوم ص ۴۳، تاریخ ادب اردو ص ۱۳، داستان تاریخ اردو ص ۱۴۲، سیر المصنفین ص ۱۲۴، ارباب نثر اردو ص ۲۶۹، تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند، ساتویں جلد ص ۸۲، ۸۳، اردو اسالیب نثر ص ۱۱۸۔

وظائف سے بھی سرفراز تھے۔

اکرام علی کا وطن سیتاپور تھا۔ انکے والد کا نام شیخ احسان علی تھا۔ اکرام علی ۱۷۸۲ء یا ۱۷۸۳ء میں پیدا ہوئے[1]۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے سیتاپور میں ہی حاصل کی۔ تقریباً نو سال کی عمر میں ان کے والد ذہنی امراض کی بنا پر مفقود الخبر ہوگئے۔ تب اکرام علی اپنے چچا شیخ مردان علی خاں کے ساتھ تحصیل علم کے لئے دہلی چلے آئے۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد وہ پھر سیتاپور آئے اور منقولات و معقولات کی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کے سلسلے میں وہ لکھنؤ بھی گئے اور کلکتہ کے مدرسہ عالیہ میں بھی تعلیم حاصل کی[2]۔ یہاں انکو اپنے رشتہ کے بھائی اور اس وقت کے مشہور عالم علامہ تراب علی ناآی خیرآبادی[3] کی سرپرستی حاصل رہی۔ وہ ابراہم لاکٹ کی ایما سے ناآی کے بلانے پر کلکتہ آئے تھے۔ اس کا ذکر انہوں نے "اخوان الصفا" کے دیباچے میں کیا ہے۔

حصول علم کے بعد وہ ابراہم لاکٹ کے توسط سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہوگئے۔

---

[1] سن پیدائش کا تعین نادم سیتاپوری کے اس بیان کی روشنی میں کیا گیا ہے کہ وہ اپنے رشتے کے بھائی علامہ تراب علی ناآی خیرآبادی سے چار یا پانچ سال چھوٹے تھے۔ ناآی کے ایک بیان کے مطابق وہ ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء [illegible] کے تھے۔ اس حساب سے ناآی کا سن پیدائش ۱۱۹۴ھ ہوا۔ یوں اکرام علی کا سن پیدائش [illegible] نادم سیتاپوری نے انکا سن ولادت ۱۱۹۰ھ / ۱۷۷۶ء یا ۱۱۹۸ھ درج کیا ہے (فورٹ ولیم کالج [illegible]) ان دونوں سنین کا سن عیسوی غلط ہے۔ ۱۱۹۰ھ کا سن عیسوی [illegible] اور ۱۱۹۸ھ [illegible] ہے۔

[2] فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۱۰۴، ۱۰۶، ۱۰۹، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳۔

[3] علامہ تراب علی ناآی اکرام علی کے عزیز دار تھے۔ اس عہد کے علماء و فضلاء میں خاصا مقام رکھتے تھے۔ تحصیل علم کے

(بقیہ حاشیہ آگے صفحہ پر)

ابراہیم لاکٹ نے اکرام علی کو اپنے پاس متعین کر لیا۔[1]

جاوید نہال اور عبدالمنان نے بغیر کسی حوالے کے اکرام علی کو شعبۂ عربی و فارسی کا مدرس قرار دیا ہے۔ لیکن کسی اور ذریعہ سے اس کی تصدیق نہ ہو سکی۔ اکرام علی کے ضمن میں دستیاب شدہ مواد کی روشنی میں یہ علم ہوتا ہے کہ وہ کالج کے شعبۂ ہندوستانی سے وابستہ نہیں تھے۔ نادم سیتاپوری انکو کالج کے شعبۂ تصنیف و تالیف سے وابستہ قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ مزید لکھتے ہیں کہ:۔

"کم عمری کہیئے یا کوئی اور وجہ ہو؟ یہ صحیح ہے کہ اکرام علی کا عروج ڈاکٹر گل کرائسٹ کے زمانے میں نہ ہو سکا بلکہ انہیں کالج کے شعبۂ تالیف و

بعد وہ کلکتہ چلے آئے تھے۔ یہاں وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز صاحبان کے استاد ہو گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب نامی کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ کمپنی کی ملازمت اختیار کرنے کے بعد انکا بیشتر وقت کلکتہ سے زیادہ مدراس میں گزرا۔ یہاں وہ فورٹ سینٹ جارج کالج کے شعبۂ عربی و فارسی کے صدر رہے۔ فورٹ سینٹ جارج کالج کے علاوہ انکا ربط ضبط فورٹ ولیم کالج سے بھی تھا۔ وہ فورٹ ولیم کالج کی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ نامی کی صرف ایک کتاب "وسیط النحو" کا ذکر ملتا ہے۔ یہ کتاب فورٹ سینٹ جارج کالج کی ملازمت کے انہوں نے ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں تصنیف کی تھی۔ نامی کا انتقال ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۵ء میں ہوا (فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۱۱۶، ۱۲۱، ۱۲۶، ۱۳۲)

[1] دیباچہ اخوان الصفار (مطبوعہ) ص ۳

لکشمی ساگر وارشنے نے علامہ تراب علی کو ابراہیم لاکٹ کا منشی درج کیا ہے (فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۱۰۱) یہ درست نہیں۔ ان کے منشی کی حیثیت اکرام علی کو ہی حاصل تھی۔

تصنیف میں کام کرنیکا موقع اس وقت ملا جب کالج کی عنان اقتدار صحیح معنوں
میں ان کے شاگرد رشید کپتان ابراہم لاکٹ کے ہاتھ میں پہونچی[۱]

اکرام علی کا تعلق براہِ راست ابراہم لاکٹ سے ہی تھا۔ اسی لئے جب وہ شعبۂ ہندوستانی کے قائم مقام پروفیسر (۱۸۰۹ء) مقرر ہوئے تب اس مدت میں انہوں نے اکرام علی کو "اخوان الصفا" کا ترجمہ کرنیکا حکم دیا۔ اس کام میں ولیم ٹیلر کی رضامندی بھی شامل تھی۔ یہ ترجمہ ۱۸۱۰ء میں مکمل ہوا[۲]۔ "اخوان الصفا" ہی اکرام علی کا واحد کارنامہ ہے۔

کریم الدین[۳]، رام بابو سکسینہ[۴]، سید محمد[۵] اور مرتب تاریخ ادبیات[۶] مسلمانان پاک و ہند نے لکھا ہے کہ اکرام علی ۱۸۱۴ء میں فورٹ ولیم کالج کے کتب خانہ کے محافظ مقرر ہوئے۔ جاوید نہال[۷] اور عبد المنان[۸] نے ۱۸۰۶ء درج کیا ہے۔ مذکورہ دونوں سنین غلط ہیں۔ واقعہ یہ ہیکہ ۵ اکتوبر ۱۸۱۶ء

---

[۱] فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۱۲۵، ۱۳۶۔

[۲] دیباچہ اخوان الصفا۔ ص ۳، ۵۔

[۳] طبقات شعرائے ہند، طبقہ دوم ص ۳۴۔

[۴] تاریخ ادب اردو ص ۱۴۔

[۵] ارباب نثر اردو ص ۳، ۲۔

[۶] تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند، ساتویں جلد ص ۸۳۔

[۷] انیسوں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۳۴۶۔

[۸] میر امن دہلوی اور انکی نثری خدمات (غیر مطبوعہ) ص ۲۶۵۔

میں لائبریرین مقرر ہوئے تھے[۱]۔ ۱۸۱۰ء سے ۱۸۱۶ء کی درمیانی مدت میں انہوں نے کیا کیا۔ اسکا علم نہ ہو سکا۔ نادم سیتاپوری توان کو ۱۸۱۶ء تک شعبۂ تصنیف و تالیف سے ہی وابستہ قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد لائبریری کی ملازمت کا ذکر کرتے ہیں[۲]۔

نادم سیتاپوری نے اردو کا پہلا اخبار بہ نام اردو اخبار اکرام علی سے منسوب کیا ہے اور اس کا سن اجرا ر ۱۸۱۰ء بتایا ہے۔ حامد حسن قادری نے بھی اس کی تائید کی ہے اور ہندوستان میں سب زبانوں کے اخبار پر اردو زبان کے اخبار کو اولیت دی ہے[۳]۔ یہ اطلاعات درست نہیں ہیں۔ ۱۷۸۰ء میں "ہکی گزٹ" نکل چکا تھا۔ اس کے علاوہ انگریزی و فارسی کا مشترکہ اخبار "کلکتہ گزٹ" ۱۷۸۴ء میں نکلا تھا۔ جہاں تک دیسی زبانوں کا سوال ہے تو ۱۸۱۸ء میں سب سے پہلے "سماچار درپن" جاری ہوا تھا۔ اس سے قبل کسی دیسی زبان کے اخبار کا سُراغ نہیں ملتا[۴]۔

اکرام علی تقریباً ۱۸۱۹ء یا ۱۸۲۰ء تک کالج سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد علامہ تراب علی نامی نے کوشش کر کے اکرام علی کو کلکتہ کے صدر الصدوری کا چارج دلا دیا۔ لیکن بعد میں وہ مذکورہ عہدہ سے استعفیٰ دے کر سیتاپور چلے آئے۔ کچھ دنوں بعد اجمیر کے مفتیٔ اعظم

---

[۱] Annals of the College of Fort William, Appendix No. III, P. 51.

[۲] فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی۔ ص ۱۴۸۔

[۳] داستان تاریخ اردو ص ۸۲ (تحشیہ)۔

[۴] بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ ص ۶۵۔

مقرر ہوکر اجمیر آئے اور یہیں ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۶ء میں انکا انتقال ہوگیا۔[1]

اکرام علی فن طب اور حکمت سے بھی واقف تھے۔ لیکن انہوں نے اس فن کو بطور کسب معاش نہیں اپنایا۔ ضرورت مندوں کی وہ بے لوث خدمت کیا کرتے تھے۔[2] نادم سیتاپوری نے اکرام علی کو فارسی کا خوش فکر شاعر قرار دیا ہے اور ناؔمی کا شاگرد بتایا ہے۔ کلام کے بارے میں لکھتے ہیں کہ تلف ہوچکا ہے۔ انہوں نے اکرام علی کا صرف ایک شعر درج کیا ہے ؎

اکرامؔ بہ ہجر تو چناں اشک فشاند
چوں آب کہ از ابر گہر بار بہ ریزد[3]

---

[1] فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۱۷۸، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۵۵۔
[2] " " " " " " " " " " "۔
[3] " " " " " " " " " " "۔

(۳۰)
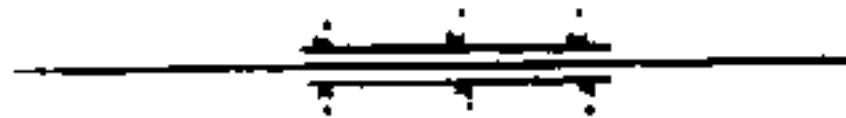
مرزا علی لُطف

مرزا علی[1] نام اور لطف تخلص تھا۔ والد کا نام کاظم بیگ خاں تھا۔ جو فارسی کے اچھے شاعر تھے اور ہجری تخلص کرتے تھے۔ انکا وطن اسطرآباد تھا[2]۔ لطف کی خودنوشت سوانح[3] اور تاریخ ادب اردو[4] کی کتابوں میں درج ہے کہ لطف کے والد کاظم بیگ خاں ۱۱۵۴ھ میں نادر شاہ کے ساتھ شاہجہاں آباد میں وارد ہوئے۔ تاریخ کی کتابوں سے علم ہوتا ہے کہ نادر شاہ نے ۱۱۵۱ھ ۱۷۳۹ء میں ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ اور اسے ۹ رذی الحجہ ۱۱۵۱ھ مطابق ۹ رمارچ ۱۷۳۹ء میں محمد شاہ کی فوجوں پر فتح حاصل ہوگئی تھی۔[5] وہ کل دو ماہ دہلی میں رہا اور صفر ۱۱۵۲ھ میں ایران لوٹ گیا۔ اس کے بعد ہندوستان پر اس کے

---

[1] جاوید نہال (انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۳۲۵) اور ایم۔ اے۔ نصر (لطفا ویکر تحشیہ ص ۷۵) نے لطف کا اصلی نام مرزا کاظم علی بتایا ہے۔ یہ درست نہیں۔ کاظم تو لطف کے والد کے نام کا جزو ہے۔

[2] [3] گلشن ہند۔ لطف بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۲۲۹۔

[4] طبقات شعرائے ہند، طبقہ سوم ص ۶۸، تاریخ ادب اردو ص ۱۴، تاریخ داستان اردو ص ۸۴، سیر المصنفین حصہ اول ص ۱۶۱، ارباب نثر اردو ص ۱۴۶، فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۲۴۸، مقدمہ گلشن ہند (عبدالحق) ص ۱۲، مقدمہ مثنوی لطف (ڈاکٹر ثمینہ شوکت) ص ۲۔

[5] Ahmad Shah Durrani by Ganda Singh P. 18, 19

دوبارہ جملے کی کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی۔ اس تاریخی پس منظر میں "لطف" اور "تاریخ ادب اردو" کے تمام مورخین کا تحریر کردہ سن ہجری غلط ثابت ہو جاتا ہے۔

نادرشاہ کے ہمراہ لطف کے والد کی آمد سے یہ علم ہوتا ہے کہ وہ محمد شاہ کے عہد میں دہلی آئے تھے۔ کاظم بیگ خاں کی صفدر جنگ[1] سے استرآباد کے زمانۂ قیام سے شناسائی تھی۔ چنانچہ دہلی آنے کے بعد انہیں کے توسط سے دربار شاہی میں رسائی حاصل ہوئی[2]۔

لطف کی جائے پیدائش کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ لیکن قیاس غالب یہی ہے کہ ان کی پیدائش دہلی ہی میں ہوئی۔ اس لئے کہ اس دوران کاظم بیگ کا دہلی سے کسی دوسری جگہ جانا ثابت نہیں ہوتا۔ اپنے سن پیدائش کا ذکر نہ تو لطف نے ہی کیا ہے اور نہ انکے سوانح نگاروں نے۔ لطف نے "گلشن ہند" میں آصف الدولہ کا ذکر کرتے ہوئے چند جملے اپنے بارے میں بھی سپرد قلم کئے ہیں:-

"راقم آثم صغر سن سے ملازموں میں اس آستانۂ دولت کے

---

[1] صفدر جنگ کا اصلی نام مرزا محمد مقیم تھا۔ صوبہ دار اودھ محمد امین سعادت خاں برہان الملک انکے ماموں تھے محمد شاہ کے عہد میں برہان الملک نے صفدر جنگ کو نیشاپور (ایران) سے بلوا کر اپنی بڑی بیٹی کا عقد ان سے کر دیا اور کچھ ہی دنوں بعد اپنے صوبہ کی نیابت پر مقرر کیا۔ جلال الدین حیدر (شجاع الدولہ) انکے بیٹے تھے۔ نادرشاہ نے محمد شاہ سے سفارش کر کے برہان الملک کی وفات (۱۷۳۹ء) کے بعد صفدر جنگ کو اودھ کا صوبہ دار مقرر کر دیا تھا۔ ۱۰ر صفر ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء میں انکو میر آتش کا خلعت عطا ہوا۔ ۲۷ر شعبان ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء میں کشمیر کی صوبہ داری ملی۔ ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء میں صوبۂ الہ آباد امیر خاں انجام سے نکالکر انکو دیا گیا۔ احمد شاہ ابدالی کے ۱۷۴۸ء کے حملہ میں یہ احمد شاہ کیساتھ شریک جنگ تھے۔ ۴ر رجب ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء میں انکو وزارت کا خلعت عطا ہوا۔ ۱۷ر ذی الحجہ ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء میں لکھنؤ کے قریب پاپڑ گھاٹ میں انتقال ہو گیا۔

[2] گلشن ہند۔ بحوالہ گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۲۲۹۔

مع رسالہ سرفراز تھا اور افراط عنایت اور الطاف سے اس کے ہم چشموں میں
اپنے مورد و امتیاز تھا۔"[1]

صغر سنی کو ہم دس سے تیرہ سال کے درمیان محدود کر سکتے ہیں۔ اس روشنی میں ابتدائے عہد آصف الدولہ (۱۱۸۸ھ/۱۷۷۵ء) میں لطف کی ملازمت تسلیم کرتے ہوئے انکا سن پیدائش تقریباً ۱۷۶۲ء سے ۱۷۶۴ء[2] کے مابین متعین کیا جا سکتا ہے۔ مذکورہ سن پیدائش کی بنیاد پر لطف شاہ عالم ثانی (۱۷۵۹ء سے ۱۸۰۶ء) کے عہد میں عالم وجود میں آئے۔ ابتدائی تعلیم دہلی میں ہی حاصل کی۔ کم عمری میں ہی شعر و سخن کی جانب متوجہ ہو گئے۔ لطف نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری شروع کی۔ فارسی میں اپنے والد سے ہی اصلاح لی۔ تاریخ اور تذکروں میں انکی شاگردی کا مسئلہ باعث اختلاف بنا ہوا ہے۔ لیکن اپنی اردو شاعری کے باب میں لطف نے کسی سے اصلاح لینے یا شاگردی کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ اپنی طبیعت کو ہی ذمہ دار قرار دے کر ساری بات صاف کر دی ہے۔[3]

---

[1] گلشن ہند۔ لطف ص ۱۱۔

[2] ڈاکٹر ثمینہ شوکت (مقدمہ مثنوی لطف ص ۲۴) نے مختلف دلائل کی بنیاد پر انکا سن ولادت ۱۱۶۸ھ کے لگ بھگ قرار دیا ہے۔ جاوید نہال (انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۳۲) نے لطف کا سن پیدائش ۱۷۶۰ء سے ۱۷۶۴ء کے مابین متعین کیا ہے اور اسکا ثبوت یہ فراہم کیا ہے کہ جب وہ کلکتہ آئے تھے اسوقت انکی عمر ۴۰ سال تھی۔ لیکن انہوں نے کوئی حوالہ پیش نہیں کیا ہے۔ ایم۔ اے۔ نصر (لفظ و پیکر ص ۷۵) نے بھی نہال صاحب کی تقلید کی ہے اور کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ قاضی عبدالودود کا قیاس ہے کہ لطف ۱۱۵۱ء اور ۱۱۶۵ء (یہ غالباً سہو کاتب ہے۔ یہ دونوں سن ہجری ہیں) کے درمیان پیدا ہوئے ہونگے۔ (قاضی عبدالودود "عبدالحق بحیثیت محقق معاصر سہ ماہی، پٹنہ ص ۱۳۱ بحوالہ مرزا علی لطف، حیات اور کارنامے ص ۱۳) [3] گلشن ہند بحوالہ گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۲۲۹۔

ان دنوں دہلی کے حالات پر آشوب تھے. عالم گیر ثانی کے قتل (۱۷۵۹ء) کے بعد سلطنت دہلی کے لئے کشمکش ، امرار کی سازشیں ، اندرونی و بیرونی خلفشار ، طوائف الملوکی اور فوج کشی نے اقتصادی بدحالی اور بھوک و افلاس کے بھیانک سائے ہر جانب پھیلا دیئے تھے۔ اہلِ کمال، اہلِ سخن اور شرفار ترک وطن کر رہے تھے. لطف نے بھی ترک وطن کیا اور آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ آکر انکی ملازمت اختیار کی. لطف کے قیام لکھنؤ کے دوران شہزادہ جواں بخت جہاں دار شاہ ۱۷۸۴ء میں لکھنؤ آئے. یہاں لطف نے آصف الدولہ کی ایماسے جوان بخت کو اپنا کلام بھی سنایا جسے شہزادے نے بہت پسند کیا اور انعام و اکرام سے نوازا[1]

آصف الدولہ کے انتقال ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء کے بعد لطف زیادہ عرصہ لکھنؤ میں مقیم نہیں رہے. غالباً انکو وہ قدردانی اور وقعت حاصل نہ ہوئی. چنانچہ ناسخ[2] اور اعظم الدولہ سرور[3] کے مطابق عظیم آباد آئے اور یہاں سے اخیر ۱۸۰۰ء میں وہ مرشد آباد چلے آئے[4]. شاید یہاں بھی وہ اقتصادی اور معاشی طور سے مطمئن نہیں رہے. مرشد آباد سے وہ حیدر آباد جانے کے لئے نکلے. ان دنوں حیدر آباد کے مسند اقتدار پر ارسطو جاہ (۱۲۰۰ھ تا ۱۲۲۰ھ) متمکن تھے[5]. انکی ادب نوازی، ارباب شعر و ادب کی بے پناہ سرپرستی اور فیاضی مشہور زمانہ تھی. لطف حیدر آباد جانے کیلئے

---

[1] گلشن ہند. ص ۸۹۔

[2] سخن شعرار. ص ۴۰۵۔

[3] عمدۂ منتخبہ. ص ۵۵۰۔

[4] گلشن ہند. ص ۵۸۔

[5] داستان ادب حیدر آباد. مقالہ رضی الدین حسن کیفی ص ۴۴۔

نکلے ضرور۔ لیکن افسوس کی دعوت پر وہ ان سے ملنے کے لئے کلکتہ میں اتر گئے۔[1] یہاں انہوں نے گل کرسٹ کی فرمائش پر چند ماہ کی ریاضتوں کے بعد ۱۸۰۱ء میں تذکرہ گلزار ابراہیم کو "گلشن ہند" کے نام سے تالیف کیا۔ اس کے بعد وہ حیدر آباد کے لئے روانہ ہو گئے۔[2]

حیدر آباد میں ارسطو جاہ نے لطف کی بہت قدر کی۔ اپنا مصاحب بنایا اور دربار شاہی سے ڈیڑھ سو روپیہ تنخواہ مقرر کر دی۔ بعد میں ارسطو جاہ کے ہی توسط سے لطف کی رسائی دربار شاہی تک ہوئی اور چار سو روپے تنخواہ اور ایک پالکی سے سرفراز ہوئے۔[3]

صاحب تذکرۂ عشقی نے لکھا ہے کہ لطف مرشد آباد اور کلکتہ کے قیام کے بعد وہاں سے فیض آباد یا لکھنؤ چلے گئے۔[4] لیکن مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں یہ بیان غلط ثابت ہو جاتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے "گلشن ہند" میں شامل ارسطو جاہ کے قصیدے کی بنیاد پر یہ رائے قائم کی ہے کہ ۱۸۰۱ء سے قبل بھی حیدر آباد جا چکے تھے۔[5] لیکن صرف "گلشن ہند" میں شامل قصائد کو بنیاد بنا کر ہم ۱۸۰۱ء سے قبل لطف کی حیدر آباد آمد تسلیم نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ اس بات کی

---

[1] شیر علی افسوس جب مرشد آباد آئے تھے تو انہوں نے لطف سے ملاقات کی تھی اور ان سے کلکتہ کی سیر کا وعدہ لیا تھا۔ (گلشن ہند۔ لطف ص ۵۸)۔

[2] گلشن ہند بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۲۲۷، ۲۲۸۔

[3] مرزا علی لطف حیات اور کارنامے۔ ڈاکٹر اکبر علی بیگ ص ۴۶۔

[4] تذکرۂ عشقی (دو تذکرے) ص ۱۷۹۔

[5] مقدمہ گلشن ہند۔ ص ۱۳۔

تردید میں "مجموعۂ فصاحت" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ "مجموعۂ فصاحت" ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء کا مرتبہ ہے۔ اس میں وہ سارا کلام شامل ہے جو ارسطو جاہ کے متوسل شعرا نے انکی مدح میں کہا ہے۔ لیکن اس میں لطف کا کلام شامل نہیں ہے۔[1]

ارسطو جاہ کے انتقال کے بعد لطف وزیر میر عالم (۱۸۰۴ء۔ ۱۸۰۸ء) سے وابستہ ہو گئے۔ اور انکی شان میں قصیدے کہے۔ لطف نے ارسطو جاہ اور میر عالم دونوں کے قصیدوں میں تنخواہ اور وظیفے میں اضافے کی درخواست کی ہے۔[2]

لطف نے بقیہ عمر حیدر آباد ہی میں گزاری۔ یہاں کے علمی اور ادبی حلقوں میں وہ خاصے مقبول تھے۔ یہیں ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔[3] لطف کے دو بھائی مرزا علی رضا اور حاجی مرزا خاں تھے۔ ان کا شمار حیدر آباد کے مشہور سوز خوانوں میں ہوتا تھا۔[4]

لطف۔ اردو شاعری کے سلسلے میں کسی کی شاگردی کا اعتراف نہیں کرتے لیکن "سخن شعرا"[5]، "مجموعۂ نغز"[6] اور تذکرۂ عشقی[7] میں ان کو سودا کا شاگرد قرار دیا گیا ہے۔ شیفتہ نے گلشن بے خار[8] میں اور سحر نے

---

[1] مقدمہ مثنوی لطف، ص ۵۰۔

[2] مقدمہ گلشن ہند۔ ص ۱۵۔

[3][4] داستان ادب حیدر آباد ص ۸۵۔

[5] سخن شعرا ص ۴۰۵۔

[6] مجموعۂ نغز۔ جلد دوم ص ۱۴۸۔

[7] تذکرۂ عشقی (دو تذکرے) ص ۱۰۷۔ [8] گلشن بے خار ص ۲۶۰۔

"بہار بے خزاں"[1] میں (۱۱)، کو میر کا شاگرد بتایا ہے۔ لیکن نساخ نے اس کی تردید کی ہے۔[2] ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے یہ قیاس ظاہر کیا ہے کہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر ہی انہوں نے خود کو میر یا سودا کا شاگرد ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا ہوگا۔[3]

لطف اپنے عہد کے اچھے اور پر گو شاعر تھے۔ انہوں نے تقریباً سبھی اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ لطف کی غزلوں میں شیرینی اور شستگی بھی ہے، سوز و گداز بھی اور گہرائی اور تاثیر بھی۔ مضامین کے انتخاب میں انہوں نے نفاست اور سلیقے کا ثبوت دیا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

یاران تیز رو ذرا ٹھہرو کہ جوں جرس
ہم پیچھے پیچھے آتے ہیں نالاں لگے ہوئے

کبھی تو خاکسار و نکا بھی غم خانہ کر درویشن
نہیں گو کچھ بھی، نقش بوریا تو ہوگا بستر کو

لطف کے زبان و بیان کی انکے ہم عصر تذکرہ نگاروں نے کافی تعریف کی ہے۔

---

[1] بہار بے خزاں۔ احمد حسین سحر ص ۸۳۔
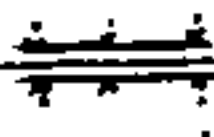
[2] سخن شعراء۔ ص ۴، ۵۔

[3] مرزا علی لطف۔ حیات اور کارنامے ص ۴۶۔

(۳۱)

نہالؔ چند لاہوری

نہال چند لاہوری[۱] دہلی میں پیدا ہوئے۔ تلاش معاش میں کلکتہ آئے۔ کلکتہ میں ڈیوڈ رابرٹ سن (DAVID ROBERTSON) سے انکی زمانہ قدیم کی شناسائی تھی۔ چنانچہ انہیں کے توسط سے نہال چند کی رسائی ڈاکٹر گلکرسٹ تک ہوئی۔ انکی نوازشوں اور عنایتوں سے نہال چند کی زندگی بسر ہونے لگی۔[۲]

نہال چند شعبۂ ہندوستانی کے باضابطہ ملازم نہیں تھے۔ انہوں نے گلکرسٹ کی فرمائش پر تاج الملوک اور بکاؤلی کے فارسی قصے کو "مذہب عشق" کے نام سے اردو میں منتقل کیا۔[۳]

"مذہب عشق" کے علاوہ انکی کسی دیگر تصنیف کا سراغ نہیں ملتا۔ "مذہب عشق" کو ہی اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ نہال چند کالج کے مشہور و معروف منشیوں کے مقابل جا کھڑے ہوئے۔

۱؎ نہال چند نے اپنے خود نوشت حالات میں "لاہوری" کی وضاحت نہیں کی ہے اور نہ لاہور کے قیام کی بابت درج کی ہے۔ انکے دیگر سوانح نگاروں نے دہلی سے نکل کر لاہور توطن اختیار کرنیکا ذکر کیا ہے اور اسی رعایت سے وہ لاہوری کا اضافہ ثابت کرتے ہیں۔ (طبقات شعرائے ہند، طبقہ سوم ص ۴۰، تاریخ ادب اردو ص ۳۰، داستان تاریخ اردو ص ۱۲۷، ہندوؤں میں اردو، دربارۂ نظم ص ۱۹۳)۔

۲؎ ۳؎ دیباچہ مذہب عشق (ق۔ن)، ورق ۴، ۵۔

۳۲

محمد بخش

محمد بخش فورٹ ولیم کالج کے باضابطہ ملازم نہیں تھے۔ ان کے سوانحی حالات دستیاب نہیں۔

جاوید نہال نے محمد بخش کو اردو اور فارسی شعبے کا ملازم لکھا ہے۔[1] یہ اطلاع درست نہیں۔ ۱۲ ستمبر ۱۸۰۲ء کی کالج کونسل کی کارروائی میں گل کرسٹ کا ۹ ستمبر ۱۸۰۲ء کا مراسلہ پیش کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک فہرست منسلک تھی جس میں ان مصنفین کی تصانیف پر انعام کی سفارش کی گئی تھی جو کالج کے باقاعدہ ملازم نہیں تھے، اس فہرست میں محمد بخش کا "قصۂ فیروز شاہ" بھی شامل ہے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ محمد بخش کالج کے باضابطہ ملازم نہیں تھے۔ مذکورہ فہرست میں "قصۂ فیروز شاہ" پر رائے کے کالم میں گل کرسٹ نے محمد بخش کو "ہندوستان" کا رہنے والا بتایا ہے۔[2] اس سے محمد بخش کے بارے میں اتنا علم ضرور ہو جاتا ہے کہ وہ شمالی ہند کے باشندہ تھے۔ شمالی ہند سے کب کلکتہ آئے۔ اس کا علم نہیں ہوتا۔

محمد بخش سے تین نثری کارنامے منسوب ہیں۔ وہ مجلس، قصۂ فیروز شاہ اور قصۂ فرعون۔

---

[1] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۳۶۳۔

[2] Proceedings of the College of Fort William, Vol. 559 P. 285.

(۴۲)

باسط خاں باسط

باسط خاں کے آبا و اجداد دہلی میں بادشاہوں کے دربار میں سپہ گر ہوا کرتے تھے۔ بادشاہوں نے انہیں نوازشات اور عنایات سے بھی سرفراز کیا تھا۔ محمد شاہ بادشاہ کے انتقال کے بعد سلطنت کی برہمی اور اندرونی و بیرونی خلفشار نے باسط خاں کے خاندانی عروج و اقبال کو گھن لگا دیا۔[1]

باسط خاں کی پیدائش شاہ عالم ثانی کے عہد (۱۱۵۹ء۔ ۱۹۰۶ء) میں ہوئی۔ ابھی پانچ سال کی ہی عمر تھی کہ ان کے والد مراد خاں نے دلی کی غیر یقینی صورت حال اور مسموم فضا سے عاجز آکر وہاں کا قیام ترک کر دیا اور عظیم آباد (پٹنہ) چلے آئے۔ باسط خاں بھی ہمراہ تھے۔ یہاں باسط خاں صوبہ دار عظیم آباد کلیان سنگھ کے لڑکوں کے ہم مکتب اور رفیق رہے۔ اس رفاقت کی بدولت ان کو ہندوستان کے علماء و فضلاء اور دیگر صاحبان دیدہ و بینا سے مستفیض ہونے کا موقع ملا۔ جب سن شعور کو پہونچے تو کچھ دنوں مبارک الدولہ بہادر مرحوم فیروز جنگ صوبہ بنگ اور کچھ دنوں نواب دلاور جنگ کی مصاحبت حاصل رہی۔ یہاں ایک مدت تک صاحب فضل و ہنر کی عنایتوں اور نوازشوں سے بہرہ مند ہوتے رہے۔[2] لیکن گردش زمانہ انکو نورت دلیم کا نج

---

[1] [2] دیباچہ تعزیہ گل صنوبر (گلشن ہند) (ق۔ ن) باسط خاں۔ ورق ۲۔

تک لے آئی۔

باسط خاں شعبۂ ہندوستانی کے باقاعدہ ملازم نہیں تھے۔ جاوید نہال انکو فورٹ ولیم کالج کا گمنام منشی قرار دیتے ہیں[1] گل کرسٹ کی ۹ رستمبر ۱۸۰۲ء کی فہرست میں باسط خاں کی "گل صنوبر" شامل ہے[2] واضح ہو کہ یہ فہرست بے ضابطہ ملازمین کی تصانیف پر مشتمل تھی۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ باسط خاں کا تعلق شعبۂ ہندوستانی کی ملازمت سے نہیں تھا۔

باسط خاں نے گل کرسٹ کی فرمائش پر ایک مجموعہ "گلشن ہند" مرتب کیا تھا۔ "گلشن ہند" میں "قصۂ گل صنوبر"، "قصۂ حسن ملوک" اور چند نقلیں شامل ہیں۔

---

[1] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۳۰۲۔

[2] Proceedings of the College of fort William, Vol. 559, P. 282.

۴۴

حاجی مرزا مغل نشاں

مرزا مغل کے آبا و اجداد عرب کے رہنے والے تھے۔ مرزا مغل لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ انکا تخلص نشاں تھا۔ یہ کاظم علی جواں کے شاگرد تھے۔ مرزا مغل نے کربلائے معلیٰ کی زیارت کی سعادت بھی حاصل کی تھی اور وہاں سے واپس لوٹ کر مرزا حسین علی خاں ابن امیر الدولہ نواب حیدر بیگ خاں کی رفاقت اختیار کی۔ ان دنوں مرزا مغل کے حالات بہت بہتر تھے۔ اتفاقاً وقت نے بساط الٹ دی۔ مرزا حسین علی خاں وراثت سے محروم ہو گئے۔ اور دھیرے دھیرے جو کچھ سرمایہ تھا صرف ہو گیا۔ اسی دوران مرزا مغل پر حج بھی واجب ہو گیا۔ کوئی چارہ نہ دیکھ کر انہوں نے مرزا حسین علی خاں کی رفاقت چھوڑی اور ترک وطن کر کے مرشد آباد چلے آئے۔ ذہن میں صرف ایک ہی دھن سمائی رہتی تھی کہ کسی طرح زاد راہ بہم پہونچا کر حج کا فریضہ ادا کریں ایسا نہ ہو کہ موت آجائے۔ لیکن مرشد آباد میں بھی کوئی تدبیر نہ بن پڑی۔ فورٹ ولیم کالج کی شہرت اور صاحبان کمال شان کی قدردانی کی خبر سن کر کلکتہ چلے آئے۔ یہاں آکر گل کرسٹ سے ملاقات کی۔ گل کرسٹ نے انہیں "بوستان سعدی" کو اردو میں ترجمہ کرنے کا مشورہ دیا۔ مرزا مغل نے دو مہینے کے عرصے میں رات دن محنت کر کے ترجمہ مکمل کیا اور باغ سخن نام رکھا۔[1]

---

[1] دیباچہ باغ سخن (ق۔ن) مرزا مغل ورق ۲، ۳۔

"باغ سخن" پر مرزا مغل کو چار سو روپے کا انعام ملا[1]۔ یوں ان کی مشکل کسی حد تک حل ہوگئی۔ بعد کے حالات کا علم نہیں۔

جاوید نہاں نے مرزا مغل کے سن پیدائش کے متعلق لکھا ہے کہ :۔

"جسوقت مرزا مغل کلکتے آئے تھے انکی عمر ۳۲ کے لگ بھگ تھی۔ لہٰذا انکی پیدائش ۱۷۶۶ء اور ۱۷۶۸ء کے درمیان ہوئی ہوگی۔"[2]

مرزا مغل مرشد آباد سے ۱۸۰۲ء میں کلکتہ آئے تھے۔ کلکتہ آکر گلکرسٹ سے ملاقات کے بعد انہوں نے صرف دو مہینے میں "بوستان سعدی" کا ترجمہ مکمل کر دیا تھا۔ یہ ترجمہ ۱۸۰۳ء میں ہی ہوا تھا۔[3] اگر اسوقت انکی عمر جاوید نہاں کے مطابق ۳۲ سال تھی انکی پیدائش کا سن ۱۷۷۱ء نکلتا ہے۔ ۱۷۶۶ء اور ۱۷۶۸ء کے درمیان کی بات بعید از فہم ہے۔

اب ذرا "باغ سخن" کے دیباچہ کے کچھ جملوں پر غور کریں :۔

۱:۔ "غرض جب انکی (مرزا حسین علی خاں) حالت ابتر ہوئی اور اس عرصہ میں بہر نوع نفقیر واجب الحج ہوگیا"[4]

۲:۔ "غرض معہ اہل ذعیال جب مرشد آباد میں پہونچا۔ موسم حج کا نرہا (نہ رہا) تھا۔ نہایت

---

[1] Proceedings of the College of Fort William, Vol. 559 P. 287.

[2] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۳۵۱۔

[3] دیباچہ باغ سخن (ق.ن) ورق ۲۰۲۔

[4] " " " ورق ۳۔

زیر باری اٹھائی اور شب و روز دغدغہ یہ تھا کہ مبادا یک اجل آپہونچے اور یہ فقیر مشغول الذمہ رہے"۔[1]

۳۲ سال کی عمر میں حج کا واجب ہو جانا اور شب و روز موت کے اندیشے میں گرفتار رہنا بعید از فہم ہے۔ جاوید نہال نے اپنے مذکورہ بیان کی دلیل میں کوئی حوالہ بھی پیش نہیں کیا ہے۔

حاجی مرزا مغل شعبۂ ہندوستانی کے باضابطہ ملازم نہیں تھے۔

---

[1] دیباچہ باغ سخن (ق۔ن) ورق ۳۔

۳۵
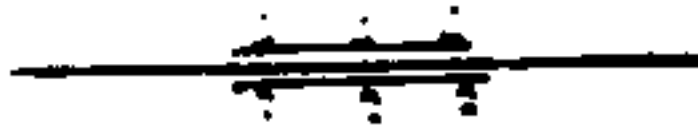
میر ابوالقاسمؔ

میر ابوالقاسم کے آبا و اجداد ایران کے باشندے تھے جو بعد میں ترک وطن کر کے ہندوستان میں آباد ہو گئے۔ میر ابوالقاسم کلکتہ کے رہنے والے تھے۔[1] جاوید نہال تو یہ لکھتے ہیں کہ ابوالقاسم سبزواری کا حال کہیں نہیں ملتا اور دوسری جانب بغیر کسی حوالے کے ان کے آبا و اجداد کو سبزوار کا باشندہ قرار دے کر ان کا ترک وطن کر کے ہندوستان آنا اور دہلی میں قیام کے بعد انتشار و خلفشار کے سبب کلکتہ میں آمد درج کرتے ہیں۔[2]

میر ابوالقاسم کالج کے باضابطہ ملازم نہیں تھے۔ شعبۂ ہندوستانی کی تصانیف میں ان کی تصنیف حسن اختلاط شامل ہے۔

---
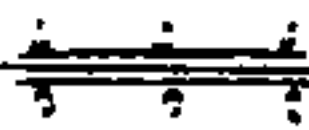
[1] سلسلۂ اشاعت خواتین دکن انسٹی ٹیوٹ، کتب خانہ آصفیہ جلد اول (نصیر الدین ہاشمی) ص ۲۳۵۔

[2] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۴۰۴۔

۳۶

محمد علیؒ

محمد علی کے والد کا نام سید نثار علی ترمذی نانوتوی تھا۔ محمد علی آصف الدولہ کے عہد میں نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کے چودہ سال تک مصاحب رہے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ اور محمد علی بے یار و مددگار ہوکر ادھر ادھر بھٹکتے رہے۔ صاحبان عالی شان کی فیاضی اور دریا دلی ان کو بھی کلکتہ کھینچ لائی۔ یہاں وہ کئی مہینے ایک انگریز الگزنڈر گاوی کے ملازم رہے۔ بعد میں الگزنڈر گاوی نے محمد علی کے لئے کپتان ولیم اسٹرک سے سفارش کی۔ ولیم اسٹرک لیفٹننٹ جنرل جارج ہویٹ کے میر منشی تھے۔ محمد علی ولیم اسٹرک کی خدمت میں حاضری دینے لگے۔ غالباً بعد میں وہ کلکتہ سے مدراس چلے گئے۔ محمد علی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ۱۵ر اگست سنہ ۱۸۱۰ء میں ولیم اسٹرک کا بہ مقام چینا پٹن مندراج (مدراس) انتقال ہوگیا۔ چنانچہ محمد علی جنرل ہویٹ کے ساتھ وہاں سے چلے آئے۔ یہ "ڈیانا" نامی جہاز سے سفر کر رہے تھے۔ اسکا کپتان مارسل تھا۔ یہ جہاز طوفان سے دوچار ہوا اور انہوں نے بڑی پریشانیاں اٹھائیں۔ غرضیکہ محمد علی کلکتہ پہونچ کر جیمس نھارن کے ملازم ہوگئے۔ جیمس نھارن ولیم اسٹرک کی جگہ پر جنرل ہویٹ کے میر منشی ہوگئے تھے۔ محمد علی انہیں سے وابستہ رہے۔[1]

---

[1] دیباچہ شہپارۂ ہندی، ق ۔ ن ؛ و، ق ۲ ۔

محمد علی نے فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی سے انعام حاصل کرنے کے لئے فردوسی کے شاہنامہ کی تلخیص "شمشیر خانی" کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا اور "شہنامۂ ہندی" نام رکھا تھا۔[1]

محمد علی شعبہ کے باقاعدہ ملازم نہیں تھے۔

[1] دیباچہ شہنامۂ ہندی (ق ن) ورق ۳۸۱۔

(۳۷)

نورُخاںُ

نورخاں کے والد کا نام محمد قائم خاں تھا۔ وہ احمد شاہ بادشاہ کے ملازم تھے اور سلیم گڑھی میں داروغہ کے عہدہ پر فائز تھے۔ جب محمد قائم خاں صفدر جنگ سے لڑائی میں مارے گئے تب نورخاں پر بادشاہ کی نظر عنایت ہوئی۔ احمد شاہ ابدالی کے حملہ سے دہلی میں جو انتشار اور تباہی و بربادی پھیلی تو نورخاں اپنے متعلقین کے ہمراہ لکھنؤ چلے آئے۔ ان دنوں نورخاں بہت کم سن تھے۔ لکھنؤ میں ہی انکی پرورش ہوئی۔ یہیں انہوں نے ہوش سنبھالا اور افسانہ و قصہ خوانی کا فن اختیار کیا۔ اس طرح اپنے دن بسر کرتے رہے۔ جن ایام میں بسنت خاں اٹاوہ میں مارا گیا۔ اس کے بعد نورخاں دہلی آئے اور شہزادہ جواں بخت جہاں دار شاہ سے وابستہ ہوگئے۔ وہ شہزادہ کے مصاحبین میں شامل تھے۔ ان کی خواب گاہ میں جاکر راتوں کو قصے سنایا کرتے تھے۔ اور انعام واکرام سے سرفراز ہوا کرتے جب جہاندار شاہ کا ارادہ لکھنؤ آنے کا ہوا تو انہوں نے نورخاں کو رقعہ دے کر لکھنؤ بھیجا۔ نواب آصف الدولہ نے نورخان کا سو روپیہ درماہا مقرر کرکے اپنے ملازموں میں شامل کرلیا۔ جب جہاندار شاہ لکھنؤ آئے تو انہوں نے نورخاں کو دوبارہ اپنی سرکار سے وابستہ کرلیا۔ جہاں دار شاہ کے انتقال تک وہ ان سے منسلک رہے۔ جہاندار شاہ کے انتقال کے بعد نانی بیگم کی عنایت سے دو دو برس تک شہزادہ کے ملازموں میں شامل رہے۔ اس کے بعد دیگر مقامات پر بھی ملازمت کی لیکن فورٹ ولیم کالج اور

صاحبان عالی شان کی دریا دلی کا شہرہ سن کر کلکتہ آئے اور چھ ہزار بیت کی ایک مثنوی انعام حاصل کرنے کے لئے کالج کونسل کے سامنے پیش کی۔ لیکن انعام حاصل نہ ہو سکا۔ چنانچہ انہوں نے یہ قصہ نثر میں "قصۂ بلند اختر" کے نام سے لکھا[1]

یہ شعبۂ ہندوستانی کے باقاعدہ ملازم نہیں تھے۔

---

(۲۸)

مرزا ئی بیگ

ان کے سوانحی حالات دستیاب نہ ہو سکے۔ یہ اودھ کے رہنے والے تھے۔ کلکتہ آکر انہوں نے "اُدھو ولاس" کا ترجمہ "بدیا درپن" کے نام سے تھامس روبک کی نگرانی میں انجام دیا تھا۔ یہ خرد افروز کی نظر ثانی میں بھی شریک تھے۔

مرزا ئی بیگ فورٹ ولیم کالج کے بے ضابطہ ملازم تھے۔

---

[1] دیباچہ مثنوی در احوال کلکتہ مع بلند اختر (ق۔ن) ورق ۱۷، ۱۹۰ -

ان کے علاوہ کالج کونسل کی کارروائیوں سے شعبۂ ہندوستانی سے متعلق کچھ اور مصنفین کا بھی علم ہوتا ہے۔ ان کے سوانحی حالات دستیاب نہ ہو سکے۔ البتہ کالج کونسل کی کارروائیوں سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ میر جعفر (سید جعفر) کا تقرر ۲ر نومبر ۱۸۰۱ء کو چالیسؓ روپے مشاہرہ پر منشی کے عہدے پر ہوا تھا[1]۔ انہوں نے "مرثیۂ مسکین" کو نثر میں منتقل کیا تھا۔ غلام اکبر ۴ر مئی ۱۸۰۱ء میں چالیسؓ روپے مشاہرہ پر منشی مقرر ہوئے[2]۔ یہ "تاریخ بنگالہ کے مؤلف تھے۔ لکشمی ساگر وارشنے نے ان سے "گل بکاؤلی" کا ترجمہ منسوب کیا ہے[3]۔ یہ کلیات میرؔ کی ترتیب میں بھی شامل تھے۔ غلام شاہ بھیک ۴ر مئی ۱۸۰۱ء کو بہ مشاہرہ چالیسؓ روپے شعبۂ فارسی میں منشی ہوئے تھے[4]۔ لیکن ۲ر نومبر ۱۸۰۱ء کو برطرف کر دیئے گئے۔ انہوں نے شعبۂ ہندوستانی کیلئے "تواریخ اسلاطین" اور "قصہ دل و حسن" تالیف کیا تھا۔ محمد عمر تیسؓ روپے مشاہرہ پر ۹ر اگست ۱۸۰۲ء کو ملازم ہوئے[5]۔ یہ "تواریخ عالم گیری" کے مؤلف تھے۔ غلام سبحان کا چالیسؓ روپے مشاہرہ پر ۹ر اگست ۱۸۰۲ء کو تقرر ہوا[6]۔ انہوں نے "ذرمجالس" تصنیف کی تھی۔ شاکر علی بے ضابطہ ملازم تھے۔ انہوں نے

---

[1] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۹۹۔

[2] Proceedings of the College of Fort William, Vol. 559, P. 5

[3] فورٹ ولیم کالج (ہندی) لکشمی ساگر وارشنے ص ۱۰۵۔

[4] Proceedings of the College of Fort William, Vol. 559, P. 5.

[5] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۹۸، ۲۰۰ [6] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۶۹۔

"الف لیلیٰ" تصنیف کی تھی۔ تصدق حسین نومبر ۱۸۰۲ء[1] میں چالیس روپے[2] مشاہرہ پر منشی مقرر ہوئے اور "تواریخ تیموری" تالیف کی۔ یہ شعبۂ ہندوستانی میں طلباء کو فارسی اور ہندی کا درس دیتے تھے اور لائبریری سے بھی منسلک تھے۔[3] انہوں نے ۱۲ دسمبر ۱۸۳۱ء کو استعفیٰ دے دیا تھا۔[4]

غلام اشرف ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو چالیس روپے مشاہرہ پر منشی مقرر ہوئے۔[5] اور "اخلاق النبی" تالیف کی۔ ایک بار انہیں شعبہ سے الگ کر دیا گیا تھا۔ لیکن گل کرسٹ نے کام کی زیادتی کی بناء پر جلد ہی دوبارہ ملازم رکھ لیا تھا۔[6] یہ "نقلیات لقمانی" کے مترجمین میں بھی شامل تھے۔ مولوی فضل اللہ "قرآن شریف" کے مترجمین میں شامل تھے۔ لیکن یہ ترجمہ کالج کونسل نے قابل اعتراض سمجھ کر ضبط کر لیا تھا۔

---

[1] Annals of the College of Fort William Appendix III P. 48.

[2][3][4] فورٹ ولیم کالج (ہندی)، لکشمی ساگر وارشنے ص ۱۳۱، ۱۲۹۔

[5] Proceedings of the College of Fort William, Vol. 559. P. 5.

[6] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۱۲۹۔

باب سوم

فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدماتؒ
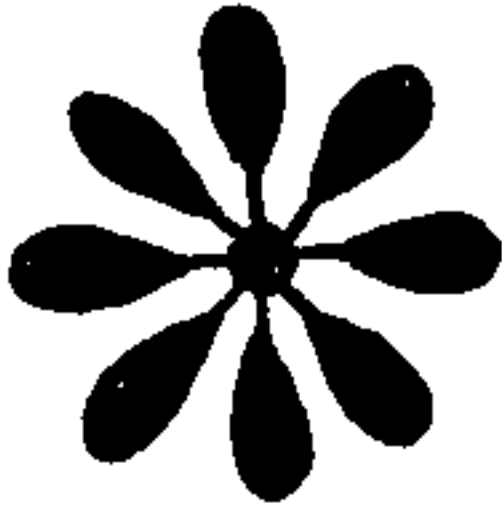
باب اوّل میں یہ بحث کی جاچکی ہے کہ فورٹ ولیم کالج صاحبان نو وارد کی تعلیم و تربیت اور انہیں مشرقی ادب و تہذیب سے واقف کرانے کیلئے قائم ہوا تھا۔ چنانچہ یہاں جو ادبی کارنامے انجام دیئے گئے انکا مقصد اردو زبان و ادب کی آبیاری نہیں تھا بلکہ ان ادبی خدمات کے پس پردہ سیاسی مفاد کے حصول کا جذبہ کارفرما تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان اقدامات کے مثبت نتائج برآمد ہوئے اور اس کالج سے اردو زبان و ادب کو بے پناہ فائدہ پہنچا۔ یہاں کی نثر نے آئندہ کی اردو نثر کیلئے راہیں متعین کیں۔

فورٹ ولیم کالج کی تصانیف میں طبع زاد کارناموں کی تعداد بہت مختصر ہے۔ ان میں سے بیشتر فارسی، عربی، سنسکرت اور برج بھاشا کا ترجمہ ہیں۔ وجہ ظاہر ہے یہاں تالیف و ترجمے کیلئے وہ کتابیں انتخاب کیجاتی تھیں جن سے ہندوستان کی معاشرت، اخلاق، تہذیب و تمدن اور تاریخ سے واقفیت حاصل ہوسکے۔ ہندوستانی زبان سکھانے کیلئے لغت اور قواعد کی کتابیں ترتیب دی گئیں۔ یوں کالج کے کارنامے اخلاق، تاریخ، داستان، لسانیات، لغت اور قواعد جیسے موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس باب میں کالج کی تصانیف کا تنقیدی اور تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور ان تصانیف کو موضوعات کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔

چونکہ کتابوں کی تعداد زیادہ تھی اسلئے چیدہ چیدہ باتوں کو دہرانے سے پرہیز کیا گیا ہے۔

البتہ جو غلط فہمیاں محققین کے یہاں برسوں سے پرورش پاتی رہی ہیں انکی نشاندہی کی گئی ہے، اور مفصل بحث کے ذریعے انکی تصحیح کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے لئے حتی الامکان بنیادی ماخذ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اگرچہ مطبوعہ کتب کا بھی حوالہ دیا گیا ہے لیکن مباحث کیلئے قلمی نسخوں کو فوقیت دی گئی ہے۔ کالج کی بہت سی تصانیف جو ہندوستان میں شائع نہیں ہوتی ہیں، لیکن پاکستان میں شائع ہو چکی ہیں انہیں بھی پاکستان سے حاصل کیا گیا ہے۔ کچھ تصانیف ایسی بھی تھیں جن کے نسخوں کا پتہ ہندوستان میں نہیں چل سکا لیکن لندن کے کتب خانے کے توسط سے پاکستان میں طبع ہو چکی ہیں، انکا مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔ متفرقات کے ذیل میں ان تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے جنکا علم کالج کونسل کی کاروائیوں سے یا کالج سے متعلق تصانیف سے تو ہوتا ہے لیکن تلاش وجستجو کے باوجود جن کے بارے میں مزید تفصیلات دستیاب نہ ہو سکیں۔ اسی ذیل میں وہ کتابیں بھی شامل کی گئی ہیں جنھیں شعبۂ ہندوستانی میں صرف ترتیب دیا گیا۔

اس باب میں فورٹ ولیم کالج کی ان تمام تصانیف کو شامل کیا گیا ہے جو شعبۂ اردو کے متعلقین کے ذریعے وجود میں آئیں۔ لیکن ان کتابوں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جو ان مصنفین کے کالج سے وابستہ ہونے سے قبل یا کالج چھوڑنے کے بعد کی ہیں۔ البتہ وہ کتابیں شامل کی گئی ہیں جو مصنفین نے کالج میں داخل کیں، چاہے وہ کالج کے باقاعدہ ملازم رہے ہوں یا محض انعام کے لئے کتابیں پیش کی ہوں۔ اس باب میں بعض ایسی تصانیف بھی شامل ہیں جو ناگری یا رومن رسم الخط میں شائع کی گئیں لیکن جن کی زبان اور اسلوب اردو یا ہندوستانی ہے۔ چند ایک مصنفین کی ہندی کتابوں کا ذکر بھی شامل کیا گیا ہے، کیونکہ وہ شعبۂ ہندوستانی سے وابستہ تھے اور انہوں نے وہ کتابیں شعبۂ ہندوستانی ہی کے لئے لکھی تھیں۔ جو کتابیں شعبۂ ہندوستانی سے متعلق نہیں تھیں انکا ذکر باب سوم میں مصنفین کے کارناموں کے ذیل میں کیا جا چکا ہے۔

اگرچہ فورٹ ولیم کالج کی تمام تصانیف کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ ایک مشکل اور وقت طلب کام تھا لیکن شدید محنت اور حوصلے کے ساتھ اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔
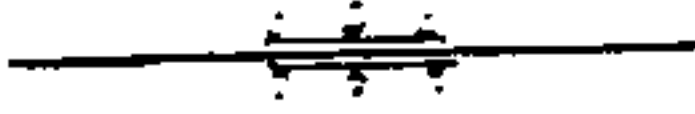
(الف)

داستان، کہانی، حکایات اور نقلیں

۱

مذہب عشق (قصہ گل بکاؤلی)

نہال چند لاہوری

"مذہب عشق" کی تمہید میں نہال چند لاہوری نے لکھا ہے کہ شیخ عزت اللہ بنگالی نے یہ قصہ اپنے معشوق نذر محمد کو کسی دن خلوت میں سنایا تھا اور اس کے اصرار پر اس قصے کو فارسی میں لکھنا شروع کیا لیکن اتفاقاً یکم ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ کو نذر محمد کی موت واقع ہو گئی اس واقعے سے دل برداشتہ ہو کر شیخ عزت اللہ نے مسودات کو چاک کر ڈالنا چاہا لیکن دوستوں کے سمجھانے پر مان گئے اور نصف قصے کو فارسی کیا اور نصف کو جوں کا توں رکھ دیا۔[۱]

اس جوں کا توں کی وضاحت تاریخ ادب اردو کے مورخوں نے نہیں کی ہے لیکن ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) کی فارسی مخطوطات کی فہرست میں گل بکاؤلی کے ضمن میں صفحہ ایک سو چوبیس پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

"Gul-e [illegible] – A love story of Tajul-Muluk and Bakawali, translated from Hindustani into Persian ca. 1134/1722 by Izzatullah Bengali.

باڈلین لائبریری (فہرست کتب ٹرکش، ہندوستانی، پشتو جلد دوم) میں "مذہب عشق" کے ضمن میں مندرجہ ذیل بیان ملتا ہے:۔

"Madhbi Ishq:-The Hindustani version of the story of Prince Tajul muluk, the fairy Bakawali and her rose, which was originally written in Hindi translated into Persian by Shaikh Izzatullah Bengali (who commenced it A.H. 1134 = A.D 1722 not A.H 1124 as Garcin de Tassy wrongly states)......"

مندرجہ بالا بیانات کی روشنی میں اس بات کا بخوبی علم ہو جاتا ہے کہ عزت اللہ بنگالی نے کسی ہندوستانی داستان سے (جو لکھی جا چکی تھی) فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات تسلیم کرنے میں تامل ہے کیوں کہ ان بیانات میں بہت سی ایسی خلیجیں ہیں جنھیں تحقیق نے ابھی پُر نہیں کیا ہے:۔

(الف) اگر عزت اللہ بنگالی نے ہندی یا ہندوستانی کی کسی کتاب سے ترجمہ کیا تھا تو وہ کتاب اب کہاں ہے۔

(ب) اگر عزت اللہ بنگالی نے آدھا حصہ فارسی میں منتقل کیا تھا اور آدھا حصہ "جوں کا توں" رکھا تو یہ "جوں کا توں" والا نصف ہندی یا ہندوستانی والا حصہ فارسی مخطوطے سے کہاں غائب ہو گیا۔

محققین ادب اردو نے فارسی "گل بکاؤلی" سے قبل اس قصہ پر مبنی صرف ایک دکنی مثنوی

کا پتہ دیا ہے جو ۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء میں لکھی گئی تھی۔ لیکن اس مثنوی کی تاریخ تصنیف بھی مشتبہ قرار دی جا چکی ہے۔[1]

عزت اللہ بنگالی کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قصہ عوام میں رائج رہا ہوگا اور زبانی سنا جاتا رہا ہوگا۔ عزت اللہ نے بھی نذر محمد کو یہ قصہ زبانی ہی سنایا اور پھر اس کی فرمائش پر اسے فارسی میں لکھا۔

عزت اللہ بنگالی کی گل بکاؤلی کے دیباچے کا جو ترجمہ نہال چند لاہوری نے کیا ہے، اس سے چند غلط فہمیاں ہوئی ہیں۔ نہال چند لکھتے ہیں:۔

"اس واقع جانکاہ سے اس مصیبت زدہ کے ہوش و حواس کا طائر اڑ گیا چاہا کہ اوراق مسودات اس افسانے کے بھی پرزے پرزے کر ڈالوں لیکن چند دوستوں نے کہ ایک گونہ (کذا) پاس خاطر انکی منظور تھی آکر سمجھایا۔ بیت .... بحکم ضرورت ادھے کو فارسی کیا اور ادھا جوں کا توں رکھا۔"[2]

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے آدھا قصہ فارسی میں منتقل کیا اور آدھا جس زبان میں بھی وہ تھا اسی میں چھوڑ دیا۔ لیکن فارسی دیباچہ کی عبارت سے یہ غلط فہمی رفع ہو جاتی ہے۔ عزت اللہ لکھتے ہیں:۔

"ازیں .... ایں مصیبت زدہ ہوش و حواس از

---

[1] اردو کی نثری داستانیں۔ گیان چند جین ص ۲۱۲۔

[2] دیباچہ مذہب عشق (ق ن)، ورق ۴۔

سر یافتہ اکثر زبان بایں رباعی میگشود رباعی ...

خواستم کہ اوراق مسودات ایں افسانہ چوں جامہ شکیبائی چاک نمایم، و

سطور صفحات (کذا) فراہم آوردہ را از آب دیدۂ تر پاک کنم لیکن چوں

نیمے یعنی احبہ عزیز القدر کہ پاس خاطر آنہا یکی از وجیبات اعتقادی بود

مانع دقت شدند ومیگفتند بیت .... بحکم ضرورت

نیمی قصہ مکتوبہ را برجا داشتم ونیمی دیگر را نیز بقالب عبارت فارسی

نگاشتم ....[1]

اس عبارت سے مفہوم صاف سمجھ میں آجاتا ہے کہ جو حصہ لکھا جا چکا تھا اور اسے عزت اللہ بنگالی چاک

کر دینا چاہتے تھے اسے تو برقرار رکھا اور بقیہ نصف کو بھی فارسی میں لکھ کر مکمل کر دیا۔

عزت اللہ بنگالی نے اس قصے کی تکمیل کب کی؟ اسکا علم نہیں ہوتا۔ صرف نذر محمد کا

سنہ وفات معلوم ہے جسکو قصے کی تکمیل کا سنہ قرار دیا جاتا رہا ہے۔ عزت اللہ کے فارسی قصے کے

دیباچے سے بھی سنہ تکمیل کا علم نہیں ہوتا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

" (نذر محمد کی وفات کے بعد) .... بحکم ضرورت

نیمی قصہ مکتوبہ را برجا داشتم ونیمی دیگر را نیز بقالب عبارت فارسی

نگاشتم "[2]

ممکن ہے کہ اس عمل میں عزت اللہ کو کچھ عرصہ صرف کرنا پڑا ہو لیکن اس عرصے کا علم کسی ذریعے سے

---

[1] [2] دیباچہ تاج الملوک وگل بکاولی (فارسی) ق۔ن۔ عزت اللہ بنگالی ورق ۵ ب

سے نہیں ہوتا۔ کریم الدین[۱]، رام بابو سکسینہ[۲] اور خلیل الرحمٰن داؤدی[۳] نے قصے کی تکمیل کا سنہ ۱۲۴۴ھ درج کیا ہے۔ جو نہال چند لاہوری کے مطابق نذر محمد کے انتقال کا سنہ ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی فہرست مخطوطات[۴] کے مرتب نے اور باڈلین لائبریری کے فہرست نگار ایتھے نے اس کی تاریخ تصنیف ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء درج کی ہے[۵]۔ ڈاکٹر گیان چند جین بھی انہیں حوالوں سے عزت اللہ کے قصے کی تاریخ تصنیف ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء لکھتے ہیں[۶]۔ یہ تاریخ بھی دراصل نذر محمد کے وفات کی تاریخ ہے۔

یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ نہال چند سے نذر محمد کا سنہ وفات (۱۱۲۴ھ) نقل کرنے میں سہو ہوا ہے۔ عزت اللہ بنگالی نے نذر محمد کا سنہ وفات ۱۱۳۴ھ درج کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"........ دریں اثنا بتاریخ غرۂ شہر ذی الحجہ ۱۱۳۴ھ ہزار یک صد وسی و چہار ہجری ان نوبادۂ ریاض دل و دیدہ نونہال سینہ محبت کشیدہ را سر سر مرگ دکنداد رہم شکست درخت حیات از بیخ و بن برکنده را نے سرای بیاد دادنے بربست"[۷]

---

[۱] طبقات شعرائے ہند، طبقہ سوم ص ۴۰۔ [۲] تاریخ ادب اردو ص ۱۲۔

[۳] مقدمہ مذہب عشق ص ۱۔

[۴] Society collection Persian Mss, Book No 3110 P. 134

[۵] باڈلین لائبریری، جلد دوم، ترکی، ہندوستانی اور پشتو، ۲۳۱۶، ۱۲۹۰، ۱۱۔

[۶] اردو کی نثری داستانیں ص ۲۱۲۔

[۷] دیباچہ قصہ تاج الملوک و گل بکاؤلی (فارسی) قلمی نسخہ ورق ۵۔

نہال چند لاہوری نے گل کرسٹ کی فرمائش پر قصہ تاج الملوک و گل بکاؤلی کو فارسی سے اردو میں منتقل کیا اور "مذہب عشق" نام رکھا۔ نہال چند دیباچے میں لکھتے ہیں:-

"......... پھر ایک روز خداوند نعمت نے ارشاد کیا کہ
قصہ تاج الملوک اور گل بکاؤلی کا فارسی سے ہندی ریختے کے محاورے میں
ترجمہ کر کہ باعث سرخروئی اور یادگاری تیری کا ہو اور موجب خوشنودی ہماری
کا۔ چنانچہ اس نحیف نے بموجب ارشاد فیض بنیاد کے اپنے حوصلے کے موافق
صاحب والا طوں .... گورنر جنرل مارکوس ولزلی بارنگٹن (کذا)
.... کے عہد میں ترجمہ کیا اور نام اسکا "مذہب عشق" رکھا۔"[1]

"مذہب عشق" ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء میں مکمل ہوئی۔ نہال چند نے خاتمہ پر قطعۂ تاریخ درج کیا ہے۔

تاریخ سال ہجری:- یہ قصہ ہوا جب بخوبی تمام :.: تو پھر فکر تاریخ تھی صبح و شام
اچانک سنی میں نے آواز غیب :.: کہ ہے مذہب عشق تاریخ و نام (۱۲۱۷ھ)

تاریخ سنہ عیسوی:- ہوئی پھر یہ خواہش کروں اب عیاں :.: یہاں عیسوی سال کو بھی بیاں
تو پھر ہاتف غیب نے دی صدا :.: کہ اس مذہب عشق (۱۲۱۷) میں کوئی آ
کرے مشرب جام گر اختیار (۵۸۶ + ۱۲۱۷ = ۱۸۰۳ء) :.: تو راز نہاں اس پہ ہو آشکار[2]

"مذہب عشق" کا ۱۰۳ اوراق کو محیط قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔ اور اسکی حالت کافی اچھی ہے۔ "مذہب عشق" ۱۸۰۴ء میں پہلی بار طبع ہوئی۔[3] دوسری اشاعت کے

---

[1] دیباچہ مذہب عشق، قلمی نسخہ، ورق ۵۔ [2] دیباچہ مذہب عشق، قلمی نسخہ، ورق ۱۰۳۔

[3] Annals of the College of F. W. Appendix, P. 24

وقت شیر علی افسوس نے اور تیسری اشاعت کے لئے ۱۸۱۵ء میں تھامس روبک نے نظر ثانی کی۔[1]

مذہب عشق اپنی ہیئت کے اعتبار سے داستان ہے۔ اس میں بہت سے ایسے مقامات ہیں جو دیگر داستانوں سے مماثلت رکھتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی اس داستان میں آغاز سے انجام تک جو فضا جاری و ساری ہے وہ ہندوستانی ہے۔ نمایاں ترین ہندوستانی عناصر میں شیر و برہمن کی ضمنی کہانی، دلبر بیسوا کا چوسر کھیلنا، راجہ اندر کی سبھا کا ذکر، بکاؤلی کا سراندیپ کے مندر میں قید ہونا، اس کے بعد دوبارہ کسان کے گھر میں پیدا ہونا وغیرہ واقعات ہیں۔ بکاؤلی کی دوبارہ پیدائش (آواگون) تناسخ کے عقیدہ کی آئینہ دار ہے۔ تبدیلِ جنس کی مثالیں عموماً ہندوستانی قصوں میں مل جاتی ہیں۔ قصہ میں بادشاہ زین الملوک کی بینائی کے لئے پھول کا استعمال، چڑے اور فقیر کی حکایت میں چڑے کا سلیمانؑ کے دربار میں انصاف طلب کرنا دو ایسے مقامات ہیں جنہیں اسلامی روایتوں کا عکس جھلکتا ہے۔

تاج الملوک اور بکاؤلی کی یہ داستان حسن و عشق کی رنگینیوں سے عبارت ہے۔ یہ داستان چھبیس ابواب پر مشتمل ہے۔ گیان چند جین نے اس داستان کے پلاٹ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔[2] داستان کا آغاز بادشاہ زین الملوک اور اس کے چار شہزادوں کے بیان سے ہوتا ہے پانچواں شہزادہ تاج الملوک ہے اور یہی قصے کا ہیرو بھی ہے۔ تاج الملوک کے دیدار سے بادشاہ اپنی بینائی کھو بیٹھتا ہے۔ اس واقعے سے تاج الملوک پر بادشاہ کا عتاب نازل ہوتا ہے اور اسے شہر بدر کر دیا جاتا ہے۔ بادشاہ کی دوبارہ بینائی گل بکاؤلی کے ذریعہ ہی ممکن ہوتی ہے۔ چنانچہ

---

[1] Linguistic Survey of India Vol. IX Part I P. 38

[2] اردو کی نثری داستانیں ص ۲۲۳۔

چاروں شہزادے گل بکاؤلی کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ تاج الملوک بھی ان کے پیچھے چل پڑتا ہے۔
بہت سے مراحل سے گزرنے کے بعد تاج الملوک گل بکاؤلی حاصل کرتا ہے۔ اپنے بھائیوں کو
دلبر بیسوا کے قید سے آزاد کراتا ہے اور بکاؤلی کے وصل سے شاد کام ہوتا ہے۔ ان واقعات
میں دیو اور پری جیسے فوق الفطرت عناصر بھی شامل ہیں۔ بظاہر قصے کو یہیں ختم ہو جانا چاہیے تھا
لیکن داستان گو نے قصہ کو طول دینے کیلئے داستان کا دوسرا حصہ امرنگر کے راجہ اندر کے
دربار میں بکاؤلی کے رقص سے شروع کیا ہے۔ یہاں وہ راجہ اندر کے عتاب کا شکار ہوتی ہے
اور سراندیپ کے مندر میں نصف جسم تک پتھر کی بنا کر قید کر دی جاتی ہے۔ بعد وہ مندر تہہ و بالا
کر دیا جاتا ہے پھر بکاؤلی ایک کسان کے گھر میں پیدا ہوتی ہے۔ اور کسی قدر نشیب و فراز سے
گزرنے کے بعد دوبارہ تاج الملوک تک پہنچتی ہے۔ داستان کے اختتام پر تیسرا حصہ روح افزا
اور بہرام کے واقعات و واردات سے عبارت ہے۔ ان تینوں حصوں کا آپس میں کوئی ربط
نہیں۔ ان میں سے ہر حصہ اپنی جگہ مکمل ہے۔ ان تینوں حصوں میں اگر کوئی رشتہ ہے تو صرف
کرداروں کا۔ [illegible]

قصہ گل بکاؤلی اپنے جلو میں تقریباً سارے داستانوی عناصر رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی
حد تک مہم جوئی بھی ہے اور عشق و عاشقی بھی۔ فوق الفطرت عناصر بھی ہیں اور طلسم کا بیان بھی ہے۔
قصہ میں مہم جوئی کا انداز وہاں ملتا ہے جب تاج الملوک گل بکاؤلی کے حصول کے لئے نکلتا ہے
اور ایک دیو کی مدد سے [illegible] بکاؤلی تک پہنچتا ہے۔ دوسری جگہ [illegible] بکاؤلی اپنی ہیئت بدل کر
خود تاج الملوک کا پتہ لگانے نکلتی ہے۔ داستان کے اہم اور نمایاں کردار مثلاً تاج الملوک،
بکاؤلی، دلبر بیسوا، روح افزا، بہرام [illegible] کے کردار [illegible] داستان
کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوئی ہیں۔ [illegible]

اس داستان میں طلسمات اور فوق الفطرت عناصر کا بیان بہت دلچسپ ہے۔
چودھویں داستان میں تاج الملوک ایک ایسے جزیرے میں جا پڑتا ہے جہاں کے پھل انسان کے کلّے سے مشابہ ہیں۔ انار گھڑے کی مانند ہیں اسے توڑنے پر چھوٹے چھوٹے خوش رنگ پرندے نکل کر پرواز کر جاتے ہیں۔ یہاں ایسا حوض ہے جس میں غوطہ لگا کر تاج الملوک کی ہیئت بدل جاتی ہے اور حوض کے کنارے ایستادہ درخت کا پھل کھا کر وہ دوبارہ اپنی وضع پر لوٹ آتا ہے۔ یہاں ایسا بھی حوض ہے جس میں غوطہ لگا کر نہ صرف جنس بدلتی ہے۔ بلکہ ساری دنیا ہی دوسری ہوتی ہے۔ پریوں کی شہزادی بکاؤلی ہیرے جواہرات سے مزین محل میں رہتی ہے۔ یہاں دیو اور ہوا میں رہنے والی پریوں کے علاوہ چوہے، سانپ اور بچھو محافظت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ روح افزا اپنے عاشق بہرام کو طلسم کی مدد سے قمری بنا کر پنجرے میں قید کئے رہتی ہے۔ تاج الملوک کو بہت سی ایسی کراماتی چیزیں بھی حاصل ہوتی ہیں جن سے نہ صرف وہ اپنی حفاظت کرتا ہے بلکہ روح افزا کو دیو کے پنجے سے آزاد کرانے کے بعد دیو سے لڑائی میں اسے زیر بھی کرتا ہے۔ یہ سارے بیانات داستان کی دلکشی میں اضافہ کرتے ہیں۔ قصے میں تین ضمنی کہانیاں ہیں۔ ایک شیر اور برہمن کی دوسری بادشاہ کی بیٹی کی اور تیسری چڑے اور فقیر کی۔ اوّل الذکر دو کہانیاں تو برمحل ہیں لیکن تیسری بے محل لگتی ہے۔

اس داستان میں ہندوستانی عناصر کی کثرت ہے۔ پوری داستان میں عام طور سے ہندوستانی تہذیب کی جھلک منعکس ہے۔ قصہ میں اندر سبھا کا ذکر بکاؤلی کا مندر میں قید ہونا، مندر کے انہدام کے بعد سرسوں کے تیل کے ذریعہ بکاؤلی کا ایک کسان کے گھر میں دوبارہ پیدا ہونا یہ سارے خیالات مکمل طور سے ہندوستانی اور دلچسپ

ہیں۔ اس کے علاوہ رسم و رواج، نشست و برخاست کے بیانات میں ہندوستانیت کا مکمل اثر غالب ہے۔ مقامات اور اسمار کے بیان میں قصہ گو نے ہند ایرانی روایات کی پاسداری کی ہے۔ مثلاً شہر فردوس، شرقستان، امرنگر، سراندیپ، رضوان شاہ، فیروز شاہ، راجہ چترسین چتراوت، راجہ اندر، نرملا اور چپلا وغیرہ۔

قصہ گل بکاؤلی میں بہترین کردار نگاری کے نمونے نہیں ملتے۔ یہاں صرف دو کردار نمایاں اور نمائندہ ہیں۔ اول قصہ کا ہیرو تاج الملوک دوم ہیروئن گل بکاؤلی۔ ان دونوں کے کرداروں میں کافی حد تک یکسانیت ہے۔ یہ دونوں عشق میں صادق، جرأت و ہمت، جفاکشی، حسن صورت، حسن سیرت اور فہم و ذکا کا پیکر ہیں۔ اگر تاج الملوک بکاؤلی کے عشق میں غم و مصیبت سے گزرتا ہے تو بکاؤلی بھی تاج الملوک کی خاطر ہر طرح کا ظلم و ستم برداشت کر لیتی ہے۔ اسے روز اندر کی سبھا میں جل کر خود کو پاک کرنا پڑتا ہے۔ وہ اسے بھی گوارا کر لیتی ہے۔ لیکن تاج الملوک کی رفاقت نہیں ترک کرتی۔ اس کے بعد اسے اندر کے عتاب سے سراندیپ کے مندر میں نصف جسم تک پتھر کی بنا کر قید کر دیا جاتا ہے۔ اسے جب اس بات کا شک ہوتا ہے کہ تاج الملوک نے دوسرا عقد کر لیا ہے تو وہ اپنے عشق کی بے حرمتی برداشت نہیں کر پاتی لیکن جب اسے پوری صورت حال کا علم ہوتا ہے تو وہ شرمندہ ہوتی ہے۔ بکاؤلی کی ذہانت وہاں ظاہر ہوتی ہے جب وہ تاج الملوک کی تلاش میں نکلتی ہے اور فرخ بنکر بادشاہ زین الملوک کے دربار میں رسائی حاصل کرتی ہے۔ وہ زین الملوک کے چاروں شہزادوں کو دیکھ کر یہ بھانپ جاتی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی گل بکاؤلی کا لانے والا نہیں۔ اس کے علاوہ بکاؤلی تاج الملوک کو اندر سبھا میں پکھاوجی بنا کر لے جاتی ہے اور راجہ اندر جب منھ مانگی مراد دینے کا وعدہ کرتا ہے تو بکاؤلی پکھاوجی کی شکل میں تاج الملوک کو مانگتی ہے۔

تاج الملوک بکاؤلی کے فراق میں دشت نوردی کرتا ہے لیکن ہمت نہیں ہارتا۔ اسکے کردار کا یہ پہلو بہت تابناک ہے کہ وہ چترادت کی مشاطہ کے دام میں کسی طرح نہیں آتا۔ اسکی زندگی میں ایک موڑ ایسا بھی آتا ہے جب اسے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ اور آزادی کی صورت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ راجہ چترسین کی لڑکی چترادت سے عقد کرلے۔ تاج الملوک بکاؤلی سے ملاقات کے لئے یہ زہر بھی پی لیتا ہے۔ اس کی ذہانت کا تو یہ عالم ہے کہ وہ دلبر بیسوا جیسی چالاک اور عیار عورت سے نہ صرف چوسر کی بازی جیت لیتا ہے بلکہ اپنے چاروں بھائیوں کو بھی آزاد کراتا ہے۔ تاج الملوک ناقابل تسخیر چیزوں کو بھی زیر کرلیتا ہے یہ اسی کا کام ہے کہ وہ بکاؤلی کا راز بڑی خوبصورتی سے خواب کے پیرائے میں بیان کرکے بکاؤلی سے اقرار کروالیتا ہے۔ انکے علاوہ دلبر بیسوا اور روح افزا کے کردار گوارہ ہیں۔ دیگر کرداروں میں نہ تو تازگی ہے اور نہ وہ عمل و کارنامے سے ہی نمایاں اور فعال ثابت ہوتے ہیں۔

نہال چند نے عزت اللہ بنگالی کے قصہ تاج الملوک و گل بکاؤلی کا محض لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے۔ بلکہ حسب موقعہ قطع و برید سے بھی کام لیا ہے۔ دیباچے میں وہ خود لکھتے ہیں:

"............ لیکن نظم کتاب کو کتنے موقع میں تو بالکل چھوڑ دیا اور بعضے مقام میں جو مناسب دیکھا تو بطور انتخاب کے ترجمہ کیا۔ کہیں تو نظم میں اور کہیں جا نثر میں سوائے اس کے عبارت کی ترتیب بھی بعضے مواقع میں بدل دی ہے بلکہ کہیں کہیں نظم بڑھا دی ہے۔"[1]

نہال چند نے دیباچے میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ گل بکاؤلی وہ قصہ ہے جو انہوں نے فارسی سے ہندی

---

[1] دیباچہ مذہب عشق، ق۔ن، ورق ۵۔

ریختہ میں ترجمہ کیا ہے۔ لیکن وہ فارسی کے سحر سے اپنا دامن نہیں بچا سکے۔ انہوں نے نہ صرف فارسی کے طرز پر داستانوں کے عنوانات قائم کئے ہیں بلکہ فارسی کے اسلوب سے بھی متأثر ہیں۔ انکی زبان سادہ، سلیس اور بامحاورہ نہیں۔ ہر داستان کے درمیان میں تھوڑی دیر کے لئے سادہ اور رواں زبان نظر آجاتی ہے لیکن بحیثیت مجموعی انہوں نے فارسی استعارات اور فارسی انداز بیان کی پیروی کی ہے۔ حسن صورت کا بیان ہو کہ عیش و عشرت کا۔ وہ سادگی کی بجائے مشکل پسندی ہی اپناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "مذہب عشق" کے بیانات میں تاثیر کا فقدان ہے۔ بکاؤلی کے حسن کا بیان ملاحظہ ہو:۔

"اس کے رنگ روپ کی جوت سے زمین و آسمان نورانی اور اسکی چشم مست سے نرگس کو ہمیشہ حیرانی۔ لب نازک کے رشک سے لالہ خون میں غلطاں ہے۔ ابرو کی پناہ سے ہلال زار و ناتواں ہے معلم بہار اس کے غنچۂ دہن سے کوئی حرف نہ سنے تو اطفال شگوفہ کو پھولنے کا سبق نہ دے سکے۔ اگر زنگی شب اسکی زلف مشکیں کے سائے میں نہ آئے تو آفتاب کی تیغ شعاع سے مارا جائے۔"[1]

"مذہب عشق" میں محاوروں اور روزمروں کا استعمال بہت کم ہے۔ تشبیہات و استعارات کی کثرت نفس مضمون کی روانی میں روڑے اٹکاتی ہے۔ فلسفیانہ بیان، تمثیلی انداز، پند و نصیحت۔ اسکے علاوہ قرآن و حدیث کے حوالوں سے قصے کی روانی مجروح ہوئی ہے اور ایسے بیانات ہر داستان کے ذیل میں مل جائیں گے۔ ممکن ہے کہ ان بیانات سے مصنف

---

[1] مذہب عشق (مطبوعہ مجلس ترقیٔ ادب لاہور) ص ۳۹۔

قارئین پر پاکیزہ اور صالح صفات کی اہمیت واضح کرنا چاہتا ہو۔ اسلوب بیان میں شگفتگی کا فقدان اور فارسی ترکیبوں کی کثرت ناگوار گزرتی ہے۔ اس سے وہ بیانات بھی متاثر ہوئے ہیں جو نسبتاً سادہ اور پر لطف ہیں۔ نہال چند جہاں سادہ نگاری کا مظاہرہ کرتے ہیں وہاں، انکا اسلوب اس سے آگے نہیں بڑھتا:۔

"چاروں طرف سے لڑکوں نے آکر گھیرا کہ بابا ہمارے واسطے کیا لایا ہے۔ شاہزادہ چپکا ایک ایک کا منھ تکنے لگا۔ اتنے میں اس چڑیل نے ایک کلھاڑی لا تاج الملوک کے ہاتھ میں دی کہ جا لکڑیاں کاٹ لا۔ شاہزادہ اس فرصت کو غنیمت سمجھا۔ جنگل میں گیا لیکن اس طلسمات عجیب کے حالات سے حیران تھا۔"[1]

قصے کی روانی میں قدم قدم پر مندرج ابیات بھی مانع ہوئی ہیں۔ نہال چند نے داستان کے اہم تأثرات کو ان ابیات کے حوالے کر دیا ہے۔ جذبات نگاری ہو کہ پیکر نگاری وہ ابیات ہی کا سہارا لیتے ہیں۔ اکثر و بیشتر جزئیات بھی ابیات ہی میں بیان کرنا چاہتے ہیں۔ وہ نثر میں جو نقشے پیش کرتے ہیں اسے انہوں نے مرکب ترکیبوں اور تشبیہوں سے اتنا بوجھل کر دیا ہے کہ اسکی واضح اور خوشگوار تصویر ہمارے سامنے نہیں آتی۔

"مذہب عشق" میں نسوانی زبان و محاورے خال خال نظر آجاتے ہیں۔ ہندی کے نرم اور شیریں الفاظ کا بھی کہیں کہیں برمحل استعمال ہوا ہے۔ فارسی اثرات کے بعد یہ الفاظ بڑے خوشگوار اور بھلے محسوس ہوتے ہیں۔ اس داستان میں اس عہد کی معاشرت کے

---

[1] مذہب عشق۔ مطبوعہ محمدی پریس ص ۴۵۔

مرقعے بھی بڑے خوبصورت پیرائے میں جا بجا ملتے ہیں۔ نہال چند نے فطری عمل اور وصل کے بیان میں جگہ جگہ تفصیل سے کام لیا ہے۔ ان بیانات میں وہ تشبیہات کا بھی سہارا لیتے ہیں اور ابیات کے ذریعے بھی واضح اور مکمل تصویریں پیش کرتے ہیں لیکن ان بیانات میں نہ تو تاثیر ہے اور نہ خوبصورتی۔

نہال چند نے "مذہب عشق" میں داستان گوئی کی فضا ہر طرح سے برقرار رکھی ہے۔ ہر داستان کا آغاز وہ یوں کرتے ہیں۔ گویا داستان گو محض داستان بیان کر رہا ہو۔ ایسا ہرگز محسوس نہیں ہوتا کہ واقعات نظروں کے سامنے رونما ہوتے گزر رہے ہیں یا ایک منظر کے بعد دوسرا منظر سامنے آگیا۔ یہاں تو قدم قدم پر واقعات کا سلسلہ منقطع ہوتا ہے یہ بے ربطی اور انتشار داستان کے لطف کو متاثر کرتی ہے۔

گل کرسٹ نے ۹ ستمبر ۱۸۰۳ء کی فہرست میں کالج کونسل سے ان مصنفین کی کتابوں پر انعام کی سفارش کی تھی جو فورٹ ولیم کالج کے باتنخواہ ملازم نہیں تھے۔ اس فہرست میں "گل بکاؤلی" (مذہب عشق) پر ۱۵۰ روپے انعام کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ ۱ اکتوبر ۱۸۰۳ء کی کالج کونسل کی کارروائی میں گل بکاؤلی پر مندرجہ ذیل تبصرہ پیش کیا گیا:۔

"گل بکاؤلی۔ زبان اور طرز بیان دونوں غلط ہیں۔ لیکن مصنف کچھ ہمت افزائی کا مستحق ہے۔ مسٹر گل کرسٹ نے ڈیڑھ سو روپے کا انعام تجویز کیا ہے جو گھٹایا جا سکتا ہے۔"[1]

لیکن نہال چند کو اس پر ڈیڑھ سو روپے کا ہی انعام ملا۔[2]

---

[1] Proceeding of the College of Fort William vol. 559 P. 287-288

گیان چند جین نے مذہب عشق کی زبان پر یوں رائے دی ہے :۔

"..........اس میں زبان و بیان کی وہ خوبیاں نہیں
ہاں قصے کی دلچسپی کے لحاظ سے یہ باغ و بہار یا آرائش محفل سے کم نہیں
لیکن ادبی تخلیق کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں"[۱]

مذکورہ بالا دونوں تبصرے اس نکتے کو ثابت کرتے ہیں کہ زبان کی خامیوں اور اسلوب کے انتشار نے داستان کی دلکشی اور خوشگواری کو متاثر کیا ہے۔

شیر علی افسوس نے گل بکاؤلی کی تصحیح کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"قصہ گل بکاؤلی کا یعنے مذہب عشق ہر چند کہ اسکے مترجم کو نثر نویسی کا سلیقہ بھلا چنگا تھا لیکن اصل سے اس نے بھی اکثر جاگہہ مطابق نہ کیا۔ نظم کو تو بیشتر چھوڑ دیا۔ بلکہ کئی مقام نثر کے بھی ترجمے نہ کئے تھے۔ سوائے اسکے اس زبان کی جمیع طرزوں سے بھی واقف نہ تھا۔ لہٰذا مضمون رنگین اس قصے کا اسے دکندا، رنگت کے ساتھ بندھ نہ سکا قصہ کوتاہ اس ہیچ مداں کو از بسکہ اسکا مضمون عالی پسند آیا بے اختیار جی لگ گیا اس لئے موافق اسکے مرتبے کے عبارت تمام و کمال بہ طرز شاہی درست کی۔ لیکن جہاں مترجم کی بھی عبارت اس وضع پر دیکھی رہنے دی کیونکہ کچھ اپنے تئیں تعصب نہ تھا۔ فقط اس قصے ہی کا بنانا منظور تھا۔"[۲]

---

[۱] ...ردو کی نثری داستانیں ص ۲۲۲۔ [۲] دیباچہ آرائش محفل (ق.ن) شیر علی افسوس د.ق م۔

۲

سکنتلا ناٹک

کاظم علی جواں

کاظم علی جواں نے گل کرسٹ کی فرمائش پر برج بھاشا کی منظوم سکنتلا ناٹک کا ترجمہ بہ زبان ریختہ ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں کیا۔[۱] جواں سکنتلا کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"یہ قصہ فرخ سیر بادشاہ کے سلطنت میں سنسکرت (سے)
برج بھاشا میں ترجمہ ہوا تھا۔ اب شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں اور
.... مارکویس ولزلی گورنر جنرل .... کی حکومت میں
سن اٹھارہ سو ایک عیسوی مطابق سن بارہ سو پندرہ ہجری کے جناب
جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام ظلہٗ کے حسب الحکم کاظم علی جواں نے
اسے زبان ریختہ میں بیان کیا۔"[۲]

سکنتلا ناٹک کے قلمی نسخے کے[۳] اختتام پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

"اب یہاں کہانی تمام ہوئی۔ اپنے خواں[۴] لفظ و معنی سے بخوبی

---

[۱] مولوی عبدالحق نے سن تالیف ۱۸۰۲ء درج کیا ہے (مقدمہ تذکرہ گلشن ہند ص ،) جو درست نہیں ہے۔

[۲] دیباچہ سکنتلا ناٹک (ق۔ن) ورق ۳۔ [۳] ڈاکٹر عبادت بریلوی نے برٹش میوزیم (لندن) میں دریافت شدہ

(بقیہ حاشیہ آگے صفحہ پر)

سرانجام ہوئی۔ ازبسکہ زبان ریختہ میں لکھی۔ سال ہجری کے موافق ریختہ (۱۲۱۵ھ)

تاریخ ہوئی ؎

سکنتلا کا۔ جو احوال اسمیں ہے مذکور ؞ سکنتلا کے اسے نام سے کیا مشہور[1]

جواں کی سکنتلا ناٹک اس لحاظ سے کافی اہمیت کی حامل ہے کہ سکنتلا ناٹک کے کم و بیش تیس ترجمے اردو زبان میں ہو چکے ہیں لیکن جواں کا یہ ترجمہ ان ترجموں میں نقش اول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے قبل سکنتلا ناٹک کے کسی اردو ترجمے کا سراغ نہیں ملتا۔ اس ترجمے میں للوجی لال کوی بھی جواں کے شریک تھے۔ للوجی کے ذمہ برج بھاشا کے دوہوں کو پڑھ کر جواں کو سمجھانا تھا۔ جواں اسے سمجھ کر اپنی زبان میں لکھا کرتے تھے۔ اگرچہ جواں نے یہ ترجمہ ۱۸۰۱ء میں مکمل کر لیا تھا لیکن اس وقت یہ شائع نہ ہو سکی۔ گل کرسٹ کی ۱۲ر جنوری ۱۸۰۳ء کی رپورٹ سے علم ہوتا ہے کہ اس کے چوبیس صفحات ناگری رسم الخط میں چھپ چکے تھے[2] اس وقت دوسری کتابوں کے ساتھ اس کی بھی طباعت ملتوی کر دی گئی تھی لیکن یہ مطبوعہ صفحات گل کرسٹ کی مرتبہ ہندی مینول (مطبوعہ ۱۸۰۲ء) میں شامل کر دیئے گئے تھے[3]۔ گل کرسٹ کی ۱۹ر اگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست

۲۴۸ کا بقیہ حاشیہ

نسخے سے اسے جوان ! نقل کیا ہے۔ (سکنتلا ناٹک مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۱۰۱) لیکن ایشیاٹک سوسائٹی والے نسخے میں "اپنے خوان" ہی درج ہے۔

[1] سکنتلا ناٹک (ق۔ ن) ورق ۴ م۔

[2] Proceedings of the College of F. W. Vol. 559, P. 45

[3] Annals of the College of F. W. Appendix, P. 23

ہیں سکنتلا ناٹک شامل ہے۔ اس وقت یہ پریس بھیجے جانے کے لئے تیار تھی اور اس پر سّو روپے انعام کی تجویز پیش کی گئی تھی لیکن کالج کونسل نے یہ پوری فہرست مسترد کر دی تھی[1]۔ جواں کی سکنتلا ناٹک کو ۱۸۰۴ء میں مکمل طور سے اشاعت نصیب ہوئی[2]۔ اس اشاعت کے وقت جواں اور للوجی نے نظر ثانی بھی کی تھی۔ اس سلسلے میں جواں کا بیان بہت واضح ہے:۔

" دوسرے دن انہوں (گلکرسٹ) نے نہایت مہربانی و الطاف سے ارشاد فرمایا کہ سکنتلا ناٹک کا ترجمہ اپنی زبان کے موافق اور کر للوجی لال کُب کو حکم کیا کہ بلا ناغہ لکھایا کرے اگرچہ کبھی سو انظم کے نثر کی مشق نہ تھی لیکن خدا کے فضل سے بخوبی انصرام ہوا۔ کہ جس نے سنا پسند کیا اور اچھا کہا۔ بہت سا پڑھنے لکھنے میں آیا اور کچھ چھپ کر

---

[1] Proceedings of the College of F. W. Vol. 559, P. 277

[2] ۱۸۰۴ء میں سکنتلا ناٹک رومن رسم الخط میں شائع ہوئی تھی۔ اسے گلکرسٹ نے مرتب کر کے The Hindee Orthoepigraphical Ultimatum کے نام سے شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے بموجب اردو رسم الخط میں پہلی بار سکنتلا ناٹک ۱۸۰۳ء میں The Hindee and Hindoostanee Selections میں شامل کر کے شائع کی گئی (پیش لفظ سکنتلا ناٹک ص ۸) یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ راقم الحروف کو اس کی صرف پہلی جلد ہی دستیاب ہو سکی جو ۱۸۲۷ء میں ہندوستانی پریس سے شائع کی گئی تھی۔ اس میں سکنتلا ناٹک شامل نہیں ہے۔ ناگری رسم الخط میں "بیتال پچیسی" البتہ شامل ہے۔ ممکن ہے دوسری جلد میں سکنتلا ناٹک فارسی رسم الخط میں شائع کی گئی ہو۔

اتفاقات سے رہ گیا۔ ان دنوں میں کہ سن اٹھارہ سو چار ہیں[1] اور احقر قرآن شریف کے ہندی ترجمے کا محاورہ درست کرتا ہے صاحب ممدوح نے فرمایا ہم چاہتے ہیں کہ اب اس کتاب کو سرنو سے چھپواویں۔ نظر ثانی لازم ہے۔ اور اس کُب کو فرمایا کہ تم بھی اس کتاب سے مقابلہ کرو کہ اگر کہیں مطلب کی کمی بیشی ہوئی ہو نہ رہے۔ چنانچہ ہم انکا فرمانا بجالائے پھر موافق حکم صاحب بندے نے تھوڑا سا دیباچہ اور بھی لکھا۔ والّا نہ اگلا یہ ہے خدا کا نام ہے۔"[2]

برج بھاشا میں یہ سکنتلا ناٹک نوآزؔ ی شاعر نے نظم کیا تھا۔ جوآں اپنے ماخذ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اس داستان کے لکھنے والے نے یوں لکھتا ہے کہ فرخ سیر بادشاہ کے ندویوں میں سے موئے خاں[3] فدائی خاں کے بیٹے نے جب ایک لڑائی ماری تب حضور پر نور سے اسکا خطاب اعظم خاں ہوا۔[4] اسی ایام میں نواز کبیشر[5] کو حکم کیا کہ سکنتلا ناٹک جو سنسکرت میں ہے برج

---

[1] بعض نسخوں میں [illegible] درج ہے جو درست نہیں۔

[2] دیباچہ سکنتلا ناٹک (ق.ن) کاظم علی جوآں ورق ۲۔

[3] یہ دراصل محمد صالح خاں ہے۔ جو نواز نے مسالے خان (मुसाले खान) لکھا ہے۔ جوآں نے اسے موسیٰ خاں لکھا ہوگا۔ جو بدلتے بدلتے مولی خاں ہوگیا۔

[4] [5] پرکاش مونس نے اپنے تحقیق مقالے "اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر" (ص ۲۱۴) میں جوآں کے مندرجہ بالا

(بقیہ حاشیہ آگے صفحہ پر)

کی بولی میں کہہ۔ اس کبیشر نے دیہہ کہانی کبت دوہروں میں کہی جسکا ترجمہ یہ ہے "۔[1]

مذکورہ شاعر نواز کے بارے میں اردو ادب کی تاریخ لکھنے والوں میں اختلافات کا ایک طویل سلسلہ پایا جاتا ہے۔ کچھ محققین نے انہیں مسلمان شاعر ثابت کیا ہے اور بعض نے مختلف شواہد سے انہیں برہمن بتایا ہے۔ خصوصاً سید مسعود حسن رضوی ادیب نے بڑی عالمانہ کاوش سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ نوازؔ مسلمان شاعر تھا۔[2] لیکن پرکاش مونس صاحب نے

بیان میں دو غلطیوں کی نشاندہی کی ہے:۔

"اس بیان میں جوآن سے دو غلطیاں ہوگئی ہیں۔ سکنتلا کے اس مترجم کا نام نواز نہیں بلکہ نیواج ہے اور اسکے مربی کو عظیم خاں نہیں بلکہ اعظم خاں خطاب ملا تھا۔"

راقم الحروف کو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں جو قلمی نسخہ دستیاب ہوا اسمیں نواز کے مربی کا نام عظیم خاں نہیں بلکہ اعظم خاں ہی درج ہے۔ دوسرے نسخوں میں ممکن ہے کاتب کی غلطی سے عظیم خاں لکھ گیا ہو۔ اور اگر جوآن نے "نیواج" کو نواز لکھا تو کوئی غلطی نہیں کی۔ نیواج کا لفظ ہندی زبان کے لئے اجنبی ہے۔ البتہ یہ اردو لفظ نواز ہی ہوسکتا ہے۔ جسے نواز نے رسم الخط کی مجبوری کیوجہ سے نیواج لکھا ہو۔ جو شاعر محمد صالح خاں کو "مسالے خان" فرخ سیر کو "پھرک سیر"۔ فتح کو "پھتے" لکھتا ہو۔ اس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ نواز کو نیواج بھی لکھا ہوگا۔ جوآن نے اگر نیواج کو نواز لکھکر غلطی کی تو ڈاکٹر پرکاش صاحب نے سکنتلا کو شکنتلا لکھکر بھی غلطی کی ہے جبکہ نواز واضح طور پر سکنتلا (सकुन्तला) لکھتا ہے۔

[1] دیباچہ سکنتلا ناٹک (ق.ن) کاظم علی جوآن ورق ۳۔

[2] نگارشات ادیب۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب، ص ۲۰۔

اپنے تحقیقی مقالے میں نوازؔ کی سکنتلا ناٹک کے ترقیمے کی عبارت درج کرکے جس میں مصنف نے خود کو "تواری" لکھا ہے۔ اس بحث کا دروازہ بند کر دیا۔ ترقیمے کی عبارت یہ ہے :۔

"اِتی نواج تواری درچتایام (مصنفہ شکنتلا ناٹک)"[1]

نوازؔ کا سرپرست محمد صالح خاں تھا۔ جسے فرخ سیر نے اعظم خاں کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ انہیں کی فرمائش پر نوازؔ نے سکنتلا ناٹک کو برج کی زبان میں نظم کیا۔ نوازؔ نے خود لکھا ہے ؎

نول پھدائی کھان جو بڑی مسالے کھان

پھرک سیر کو دے پھتے بھیو و آجم کھان

آجم کھان نواب کو بھاوہی سُوکوی سماج

تاتیں اتی ہی کری کرپا راکھیو سُوکوی نیواج

آجم کھان نیواج کو دینو یہ پھرمائی — سکنتلا ناٹک ہمیں بھاشا دیہو بنائی[2]

---

[1] سروج سروکیش بار اوّل ص ۳۹۸۔ بحوالہ اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر۔ ڈاکٹر پرکاش مونس ص ۲۱۴۔

[2] नवल फिदाई षान जो बड़ी मुसालेषान।
फरुकसेर को दे फते भयो वो आजमषान॥
आजम षान नवाब को भावहि सुकवि समाज।
तातें अति ही करि कृपा राख्यो सुकवि नेवाज॥
आजम षान नेवाज को दीनों यह फरमाई।
सकुन्तला नाटक हमें भाषा देहु बनाई॥

(بحوالہ نگارشات ادیب۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب ص ۲۲، ۲۳)

سکنتلا ناٹک سنسکرت میں کالی داس کی عظیم الشان تالیف ہے۔ حالانکہ یہ قصہ کالی داس سے پہلے مہابھارت میں بیان کیا جاچکا تھا۔ کالی داس نے اس میں جابجا اضافہ کرکے اور ڈرامے کا رنگ روپ دیکر اسے انتہائی دلکش بنا دیا ہے۔ انہوں نے اس ناٹک کو نکھارنے کے لئے سنسکرت کے قدیم دیو مالائی قصوں سے بھی کافی مدد لی ہے۔

لیکن نوازؔ کا سکنتلا ناٹک بس نام ہی کا ناٹک ہے۔ یہ ایک منظوم قصہ ہے جس کی بنیاد کالی داس کے ڈرامے پر رکھی گئی ہے۔ اس میں ناٹک کی کوئی خصوصیت موجود نہیں ہے۔ نوازؔ بھی اس کہانی کو ناٹک نہیں بلکہ کتھا لکھتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ پہلے اور چوتھے حصے کے خاتمے پر سکنتلا ناٹک کتھا اور تیسرے حصے کے اختتام پر سکنتلا کتھا لکھتا ہے[1]۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں سکنتلا ناٹک کی کہانی یا سکنتلا کی کہانی مذکور ہے۔ چونکہ نوازؔ کے پیش نظر کالی داس کا ڈرامہ تھا اس لئے اس نے "سکنتلا ناٹک" ہی نام رکھا۔

سکنتلا ناٹک میں ہندوستان کا قدیم رومان مذکور ہے۔ اس میں سکنتلا اور راجہ دشینت کا معاشقہ اور ہجر و وصال کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ وشوامتر، منیکا پری، کن رشی اور گوتمی وغیرہ کے کردار بھی اس کہانی کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

سکنتلا ناٹک میں اعلیٰ کردار نگاری کے نمونے نہیں ملتے۔ راجہ دشینت کا کردار داستانوں کے عام ہیرو سے مشابہ ہے۔ اس میں راجاؤں کا کوئی وصف نہیں۔ اس کے عاشقانہ جذبات میں عامیانہ پن کو دخل ہے۔ وہ سکنتلا کو ایک نظر دیکھتے ہی عشق کا شکار ہوجاتا ہے اور بے خود

---

[1] نگارشات ادیب ص ۱۸۔

ہو کر خاک پر گر پڑتا ہے۔ اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔ وہ سرد آہیں بھرتا ہے اور نالۂ فریاد کرتا ہے۔ سلطنت کے کاموں سے اسے دلچسپی نہیں رہ جاتی۔ عشق کا یہ انداز ایک بادشاہ کے شایان شان نہیں۔ وہ عاشق آشفتہ سر ہے۔ آتش عشق اور سوز فراق میں جلتا رہتا ہے۔ اختر شماری کرتا ہے۔ لیکن اپنا درد کسی سے نہیں کہتا۔ آخر کار وہ سکنتلا سے شادی (گندھرو وواہ) کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ لیکن شومیٔ تقدیر سے درباسا رشی کی بد دعا کا شکار ہو کر سکنتلا کو ہی پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے اور نہایت سنگدلی سے اپنے محل سے نکال دیتا ہے۔ بعد میں جب وہ اپنی انگوٹھی پاتا ہے اور سکنتلا کے لڑکے سے ملاقات کے بعد سکنتلا کو پہچانتا ہے۔ تب اپنے فعل پر شرمندہ ہو کر معافی مانگ لیتا ہے۔

سکنتلا شرم و حیا اور حسن و جمال کا پیکر ہے۔ وہ عشق میں صادق ہے۔ اسکے جذبات میں رکھ رکھاؤ اور وقار ہے۔ وہ راجہ دشینت کو دل و جان سے چاہتی ہے۔ اس کے فراق میں سکنتلا کو دنیا کی کوئی شئے نہیں بھاتی۔ اس کی راز دار دو سہیلیاں ہیں۔ جب وہ جنگل سے رخصت ہوتی ہے تو ہر ایک شجر و حجر اور چرند و پرند کے لئے آنسو بہاتی ہے۔ راجہ دشینت جب اسے پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے تب وہ اپنی خودداری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتی اور راجہ سے رحم کی درخواست بھی نہیں کرتی۔ آخر کار راجہ کے معافی مانگنے پر وہ خلوص اور فراخ دلی کا مظاہرہ کر کے ماضی کے واقعات کو قسمت کی ستم ظریفی پر محمول کرتی ہے۔

وشوامتر کا کردار زنفرق تا بہ قدم عبادت اور ریاضت گزار سادھو کا کردار ہے۔ لیکن اسے خود پر ذرا بھی قابو نہیں۔ جب منیکا پری اسکی عبادت میں دخل انداز ہوتی ہے تو وہ ساری عبادت و ریاضت بھول کر اسکے عشق میں دیوانہ ہو جاتا ہے۔ دیگر کرداروں میں کن منی، گوتمی، پریم ودا اور انسویا وغیرہ کے کردار مناسب اور متوازن ہیں۔

جوآن کو حکم دیا گیا تھا کہ منظوم سکنتلا ناٹک کا ترجمہ" اپنی زبان کے موافق کرو"[1] انہوں نے سکنتلا ناٹک کو ریختہ میں منتقل تو کر دیا لیکن نثر کے میدان میں اپنی بے بضاعتی کا ذکر کر کے یہ معذرت بھی پیش کی :۔

"کبت اور دوہرے کا ترجمہ جیسے چاہیے ویسا زبان ریختہ میں کب ہو سکتا ہے۔ اس کے اور اسکے مضمون کی بندش کا فرق کھلا ہوا ہے۔ بیان کی احتیاج کیا............ قطع نظر اسکے کبت ہو یا دوہرا نظم کا ترجمہ نثر میں طبیعت کو منتشر کرتا ہے"[2]

سکنتلا ناٹک میں جوآن کی زبان فورٹ ولیم کالج کی سادہ نگاری کی نمائندہ ہے۔ یہ اس زبان کا ہی اعجاز ہے کہ کہانی میں حقیقی زندگی کا رنگ نمایاں ہو گیا ہے۔ اسلوب بیان کا سیدھا سادا انداز ذہن و دماغ پر بڑا خوشگوار اثر مرتب کرتا ہے۔ اور اس سے گفتگو کا سا لطف حاصل ہوتا ہے۔ جوآن کی سادہ نگاری نہ تو عامیانہ ہے اور نہ سطحی۔ وہ ایک خاص سطح سے بول چال کے انداز میں ادبی معیار کو برقرار رکھتے ہیں۔ آسان اور متناسب خدوخال کے جملوں کی شعریت، آہنگ اور قافیہ پیمائی بڑی مسحور کن ہے۔

سکنتلا ناٹک میں ہندی کے مترنم اور سریع الفہم الفاظ کثرت سے اور برمحل استعمال کئے گئے ہیں۔ ان کے دوش بدوش فارسی کے سبک اور شیریں الفاظ و تراکیب بڑی دلفریب فضا قائم کرتے ہیں۔ جوآن نے سکنتلا ناٹک میں استعارات و تشبیہات کا بھی استعمال کیا ہے یہ بعید از فہم نہیں ہیں بلکہ انکو انہوں نے گرد و پیش کے ماحول سے ہی اخذ کر کے بڑی خوبصورتی سے

---

[1] [2] دیباچہ سکنتلا ناٹک (ق۔ ن) کاظم علی جوآن ورق ۲، ۳۔

پیش کیا ہے۔ سکنتلا ناٹک میں قدم قدم پر اشعار بھی ملتے ہیں۔ ان اشعار کو مختلف جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنایا گیا ہے لیکن ان سے نہ تو روانی مجروح ہوتی ہے اور نہ یہ اشعار طبع لطیف پر گراں گزرتے ہیں۔

سکنتلا ناٹک کے مطالعہ سے جمالیاتی ذوق کی تسکین ہوتی ہے۔ اس میں حسن و جمال، فضا و ماحول کے بڑے لطیف اور مسحور کن مرقعے نظر سے گزرتے ہیں۔ ان مرقعوں میں انسانی نفسیات کی باریک بینی بھی منعکس ہوتی ہے۔ جواں نے الفاظ سے تصویر کشی کا فن بڑی خوبصورتی سے نبھایا ہے۔ مثال ملاحظہ فرمائیے:۔

"بین بجاتی ہوئی، ہولی گاتی ہوئی۔ دھیان تالوں پر
دھرے، پھول دامن و گریبان میں بھرے ہوئے آکر وہاں جلوہ گر ہوئی جہاں
وہ جوگ سادھے تپسیا کر رہا تھا"[1]

جواں نے سکنتلا ناٹک میں فضا اور ماحول کی ہندوستانیت کو مکمل طور سے برقرار رکھا ہے۔ وہ کنول کے پھول، مور، کوئل، ہرن، پرندوں اور درختوں وغیرہ کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ قدیم آشرموں اور واٹیکاؤں (باغوں) کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ سکنتلا کا پورا قصہ ہندو دیومالا سے ماخوذ ہے۔ جابجا ہندو تلمیحات اور تصورات جلوہ گر ہیں۔ مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو۔ راجہ دشینت سکنتلا کو پہلی بار دیکھ کر سوچتا ہے:۔

"اگر ہم اسے سرسوتی کہیں تو بین اس کے کاندھے پر کہاں ہے۔
اگر گورا پاربتی کہیں تو بھی نہ کہہ سکیں کہ آدھا انگ مہادیو کا آدھا انگ

---

[1] سکنتلا ناٹک (مطبوعہ) مرتبہ اسلم قریشی ص ۱

اسکا ہے۔ یا لچھی کہیں تو کیوں کر کہیں۔ وہ چھاتی پر لشن کی رہتی ہے۔ ایک (دم)

ان سے جدائی نہیں سہتی۔ اگر رمبھا یا مینکا پارت سوچیں تو وے جوانیں نہیں۔

یہ جو اس کے نئے جوبن کا سن وسال ہے وے کب رکھتی ہیں ہے[1]

لسانی سطح پر سکنتلا ناٹک میں قدامت کا رنگ نمایاں ہے۔ جوآں آونا، آتیاں،

جاتیاں، رہیاں وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی سکنتلا ناٹک اپنی زبان دبیان میں بڑی لطیف تاثیر رکھتی ہے اور اسکی

یہی خوبی کلاسیکی ادب میں اسکا مقام برقرار رکھے گی۔

۳

سنگھاسن بتیسی

کاظم علی جواں

سنگھاسن بتیسی ۳۲ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اسے کاظم علی جواں نے للوجی لال کوی کی مدد

سے فورٹ ولیم کالج کے لئے برج بھاشا سے اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ برج بھاشا میں ان کہانیوں

کو سندر کبیشور نے شاہجہاں کے عہد میں سنسکرت سے ترجمہ کیا تھا۔ سنسکرت میں ان بتیس

کہانیوں کے دو مجموعوں کا سراغ ملتا ہے۔ ایک کا نام سنہاسن دواترن ست" (SINHASAN

---

[1] سکنتلا ناٹک (مطبوعہ) مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۸۱،۴۰۔

(DAWATRINSAT ہے۔[1] اور دوسرے کا نام "وکرما چرترم" ہے۔ سنگھاسن بتیسی ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوئی۔ سنگھاسن بتیسی کے دیباچے میں کاظم علی جوآں نے سبب تالیف یوں بیان کیا ہے:۔

"یہ کہانی سنگھاسن بتیسی کی سنسکرت میں تھی۔ شاہ جہاں بادشاہ کی فرمائش سے سندر کبیشور نے برج بولی میں کہی۔ اب شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں موافق ارشاد جناب جان گل کرسٹ صاحب والا مناقب سن بارہ سو پندرہ ہجری مطابق سن اٹھارہ سو ایک عیسوی کاظم علی شاعر نے جس کا تخلص جوآں ہے۔ محاورۂ خاص و عام میں اہل ہند کے لکھی۔ اس لئے کہ نوسکھ صاحبوں کے سیکھنے اور سمجھنے کو سہج ہو اور ہر ایک کے روزمرے کی انہیں سمجھ ہو۔ ہندو۔ مسلمان۔ شہری بیرونجاتی اعلیٰ ادنیٰ کے کلام کو جانیں اور دوسرے کے سمجھانے کے محتاج نہ ہوں"[2]

گل کرسٹ کی ۱۲ر جنوری ۱۸۰۲ء کی فہرست سے علم ہوتا ہے کہ اس وقت سنگھاسن بتیسی ہرکارہ پریس میں ناگری رسم الخط میں چھپ رہی تھی اور اس کے چھتیس[3] صفحات طبع ہو چکے تھے۔[3] لیکن بعض وجوہات کی بنا پر دیگر کتابوں کے ساتھ سنگھاسن بتیسی کی طباعت بھی روک دی گئی۔ اسکے مذکورہ مطبوعہ صفحات گل کرسٹ کی ہندی مینوئل میں شامل کرلئے گئے۔[4]

---

[1] A Classical Dictionary of Hindu Mythology by J. Dowson 273

[2] دیباچہ سنگھاسن بتیسی (ق۔ ن) ورق ۱۰۲۔

[3] Proceedings of the College of F.W. vol. 559, P. 45

[4] Annals of the College of F.W. Appendix P. 23

گل کرسٹ کی ۱۹ راگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں سنگھاسن بتیسی بھی شامل ہے۔ اس وقت یہ طباعت کے لئے تیار تھی اور پریس بھیجی جانیوالی تھی۔ گل کرسٹ نے اس پر دو سو روپلے انعام کی تجویز پیش کی تھی[1]۔ کالج کونسل نے یہ پوری فہرست مسترد کر دی تھی۔

سنگھاسن بتیسی اردو رسم الخط میں مکمل طور سے ۱۸۰۵ء میں ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی[2]۔ ۱۶ر فروری ۱۸۱۳ء کو سنگھاسن بتیسی بھی دیگر کتابوں کیساتھ فورٹ سینٹ جارج کالج (مدراس) کے طلباء کیلئے بھیجی گئی تھی[3]۔ مجنوں گورکھپوری نے ۱۹۴۱ء میں سنگھاسن بتیسی کو آسان اردو میں منتقل کیا تھا[4]۔

سنگھاسن بتیسی میں راجہ بکرماجیت کے عدل وانصاف، جود وسخا اور شجاعت و مروت پر مبنی ۳۲ کہانیاں درج ہیں۔ یہ کہانیاں ۳۲ پتلیاں سناتی ہیں۔ بنیادی قصہ یوں ہے کہ راجہ بھوج اجین پر حکومت کرتا تھا۔ ایک دن راجہ زمین سے ایک سنگھاسن (تخت) نکلواتا ہے اس میں چاروں طرف آٹھ آٹھ پتلیاں بنی ہوئی ہیں۔ پنڈت بتاتا ہے کہ یہ پتلیاں راجہ اندر کے یہاں کی پریاں ہیں۔ خیر نیک ساعت دیکھ کر راجہ بھوج اس سنگھاسن پر بیٹھنا چاہتا ہے۔ جیسے ہی وہ قدم بڑھاتا ہے پتلیاں کھل کھلا کر ہنس پڑتی ہیں۔ راجہ غصہ ہوجاتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ کس بات میں کم ہے۔ تب پہلی پتلی رتن منجری اسے بکرماجیت کے عہد کے عدل وانصاف اور امن وآسائش کی کہانی سناتی ہے۔ دوسرے دن جب راجہ بھوج پر بیٹھنا چاہتا ہے تو دوسری پتلی چتر ریکھا بکرماجیت کی تعریف کی کہانی سناتی ہے۔

اس طرح سنگھاسن میں جڑی ہوئی ۳۲ پتلیاں روزانہ بکرماجیت کی نیا نصی، دریا دلی، جرأت وشجاعت اور رحم وکرم کی کہانیاں سناتی ہیں۔ ان کہانیوں کو سنکر راجہ بھوج جہاں سے سنگھاسن نکلواتا ہے۔ وہیں دفن کروا دیتا ہے۔ اور خود راج پاٹ چھوڑ کر جنگل میں تپسیا

---

[1] Proceedings of the of F.W. Vol. 559, P. 277

[2] Annals of the College of F.W. Appendix, P. 25

[3] فورٹ ولیم کالج (ہندی) لکشمی ساگر وارشنے ص ۱۰۴۔ [4] ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں، گوپی چند نارنگ ص ۲۴۴۔

(عبادت) میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اور اس کا وزیر تخت نشین ہوتا ہے۔

سنگھاسن بتیسی کی ضمنی کہانیاں حکایتوں یا مختصر داستانوں کے دیگر مجموعوں سے قدرے مختلف ہیں۔ یہ ضمنی کہانیاں اپنی ساخت اور خد و خال میں مکمل اور آزاد نہیں ہیں یہ صرف راجہ بکرماجیت کی کسی ایک خوبی کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان کہانیوں میں بعض کہانیاں بے حد مختصر ہیں۔ بعض رومانی کہانیوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ کہانیاں ہند داستالیر سے بھی متاثر ہیں۔ ان میں فوق فطرت عناصر کی کارفرمائی بھی ملتی ہے۔ سنسکرت کے قدیم قصوں کی طرح سنگھاسن بتیسی کی ضمنی کہانیوں میں بھی عورتوں کی بے راہ روی بیان کی گئی ہے۔ اکیتویں کہانی میں فنون لطیفہ کی باریکیوں اور نزاکتوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان سب سے قطع نظر ان ضمنی کہانیوں میں اخلاقی درس اور تجربات و مشاہدات کا ایک جہان پوشیدہ ہے

چونکہ سنگھاسن بتیسی فارسی کی بجائے برج بھاشا سے اردو میں آئی ہے۔ اس لئے اس میں ہندوستانی معاشرت اور تہذیب و تمدن کے نقوش بڑے گہرے ہیں اول تو بنیادی قصہ ہی ہندوستانی سرزمین سے ماخوذ ہے۔ دوم فارسی سے ترجمہ نہ ہونے کی بنا پر اس کے ہندوستانی خدّوخال مسخ نہیں ہوئے۔ سنگھاسن بتیسی کی ضمنی کہانیاں ہندو معاشرت، رسم و عقائد کے بے حد نادر مرقعے پیش کرتی ہیں۔ یہ مرقعے ہماری ہزار سالہ تہذیب و تمدن کے نقوش ہیں۔ سنگھاسن بتیسی کی کئی کہانیاں کتھا سرت ساگر، بیتال پچیسی اور جاتک کہانیوں سے مماثلت رکھتی ہیں۔

سنگھاسن بتیسی کا مرکزی کردار راجہ بکرماجیت ایک روایتی ہیرو ہے جس سے ہزاروں ہندوستانی کہانیاں منسوب کی جاتی ہیں۔ وہ نہ صرف بہادر اور جری ہے بلکہ سخاوت و مروت، دریا دلی و فیاضی اور جود و سخا جیسی انسانی خوبیوں سے متصف ہے۔

وہ دوسروں کی پریشانیوں اور مشکلوں کو حل کرنا اپنا اوّلین فرض سمجھتا ہے۔ لیکن اسے حریفوں سے مقابلہ نہیں کرنا پڑتا۔ اسے دو فوق الفطری قوتوں (بے تال اور تال) کی مدد حاصل ہوتی ہے۔ یہ تال اور بے تال راجہ بکرماجیت کو تینوں لوکوں کی سیر کراتے ہیں۔ اسے امرت دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ کئی بار اپنی جان کی قربانی دے کر دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے۔

سنگھاسن بتیسی کا اسلوب سادہ اور آسان ہے۔ لیکن یہ ہندی سے متاثر ہے اس میں برج بھاشا کے الفاظ کثرت سے مستعمل ہیں۔ لیکن ان الفاظ کے استعمال میں نفاست اور خوش ذوقی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ یہ الفاظ ناگوار اور جمالیاتی احساس پر گراں نہیں گزرتے موضوع کے لحاظ سے سنگھاسن بتیسی کا انداز بیان موزوں اور مناسب ہے الفاظ کی نشست برمحل ہے۔ جملے آہنگ اور ترنم سے پر ہیں۔ سنگھاسن بتیسی میں ہندی انشا پردازی کے بڑے خوبصورت نمونے ملتے ہیں۔ ان میں تصنع اور آورد کا شائبہ تک نہیں۔ کیا منظر نگاری۔ کیا واقعہ نگاری کہ حسن بیان کے ہندی لب و لہجے نے ایک دوسرا ہی سماں پیدا کر دیا ہے۔ مثلاً چھٹی کہانی میں تالاب کا منظر دیکھیے:۔

"چاروں گھاٹ اس کے پختہ ہیں۔ ہنس، بگلے اس میں پھرتے ہیں۔ اور مرغابیاں، چکوریں، پنڈبیاں کلولیں کرتی ہیں۔ کنول کے پھولوں پر بھونرے گونج رہے ہیں۔ مور بول رہے ہیں۔ کویل کوک رہی ہے اور طرح طرح کے پنچھی خوشی میں ہیں۔ پھولوں کی سوگندوں کے ساتھ پون چلی آتی ہے اور میوہ دار درختوں کی ڈالیاں لچکے کھاتی ہیں"[1]

---

[1] بحوالہ نثری داستانیں ص ۳۱۰۔

سنگھاسن بتیسی کے مختلف بیانات کی خوبی یہ ہے کہ ان میں تاثیر ہے اور یہ واقعات کی صحیح تصویر پیش کرنے میں کامیاب ہیں۔ ہاں داستان کے ابتدائی حصوں میں راجہ بھوج کے شہر اور محل کے بیانات قصے کی ہندوستانی فضا سے مطابقت نہیں رکھتے۔ انہیں پڑھ کر اسلامی عہد کے محل اور کوچہ و بازار کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ خال خال عربی کے الفاظ بھی مستعمل ہیں اور ہندی الفاظ دلب و لہجہ کی فضا میں یہ وزن دار معلوم ہوتے ہیں۔

سنگھاسن بتیسی پر گیان چند جین نے بے حد جامع رائے دی ہے:۔

"سنگھاسن بتیسی، بیتال پچیسی سے کم رتبہ کتاب سمجھی جاتی ہے اس کی کہانیاں بیتال پچیسی کے مقابلے کی نہیں۔ اردو افسانوں میں اسکی اہمیت نہیں لیکن اس کا جائزہ لینا اس لئے ضروری تھا کہ یہ ان چند قصوں میں سے ہے جو سنسکرت الاصل ہیں اور فارسی کے دوش پر ہاتھ رکھ کر نہیں برج بھاشا کی انگلی پکڑ کر ہم تک آئے ہیں اور اپنی شکل میں آئے ہیں"[1]

۴

قصہ مادھونل اور کام کندلا

مظہر علی خاں ولا

مادھونل اور کام کندلا کے عشق کی یہ کہانی بہت قدیم ہے جسے عوام میں مقبولیت کا درجہ

---

[1] اردو کی نثری داستانیں۔ گیان چند جین ص ۳۱۲۔

حاصل تھا۔ ابھی تک اس کہانی کے اصل ماخذ کی دریافت میں ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے محققین ناکام رہے ہیں۔ ۱۹۳۳ء کی کل ہند اورینٹل کانفرنس میں شری کرشن سیوک گٹی نے اپنے ایک مقالے میں مختلف شہادتوں سے اس کہانی کو ایک تاریخی واقعہ پر مبنی قرار دیا ہے۔[1] انہیں کے مطابق اس کہانی کو "مادھونل آکھیانم" کے نام سے سب سے پہلے آنند دھر شاعر نے سنسکرت میں لکھا تھا۔ ڈاکٹر پانڈے کے مطابق ۱۳۰۰ء کے قریب یہ قصہ "مادھونل آکھیانم" اور "مادھونل ناٹکم" کے نام سے سنسکرت میں دو بار لکھا گیا۔ اس کے بعد پرانی ہندی کی مختلف بولیوں میں اس قصے کو بار بار لکھا گیا۔

۱۔ مادھونل کام کنڈلا۔ گن پتی۔ ۱۵۲۷ء۔

۲۔ مادھونل کام کندلا رس ولاس۔ مادھو شرما۔ ۱۵۴۳ء۔

۳۔ مادھونل کام کندلا چوپئی۔ کشل لابھ۔ ۱۵۵۹ء۔

۴۔ مادھونل کتھا چوپئی۔ پریم وتس۔ ۱۵۵۹ء۔

۵۔ مادھونل کام کندلا (اودھی)۔ عالم۔ ۱۵۸۳ء۔

۶۔ مادھونل کتھا۔ دامودر۔ ۱۶۸۰ء[2]

ڈاکٹر ہری کانت شریواستو نے مادھونل اور کام کندلا کے قصے پر مبنی دو اور تالیفوں کے

---

[1] Proceedings and Transactions of seventh All India Oriental Conference, Baroda Dec. 1933

بحوالہ بھارتی پریم آکھیان کاویہ۔ ڈاکٹر ہری کانت شریواستو ص ۲۲۲، ۲۲۳۔

[2] مدھییگین پریم آکھیان ڈاکٹر پانڈے ص ۴۷، ۱۰۵۔ بحوالہ مقدمہ مادھونل کام کندلا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۱۹۔

نام درج کئے ہیں۔ 'ورہ واریش' جسے بودھانے لکھا اور 'مادھونل ناٹک' جسے راج کوی کیس نے تالیف کیا[1]۔ لیکن انہوں نے ان تالیفات کی زبان اور سن تالیف درج نہیں کیا ہے۔ ممکن ہے مادھونل ناٹک اور مادھونل ناٹکم، جسکا ذکر ڈاکٹر پانڈے نے کہا ہے ایک ہی تالیف ہو۔

ولاؔ کے ترجمے سے پہلے اردو نثر میں اس کہانی کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ البتہ دکنی زبان میں اس کہانی کو ۱۲۰۴ھ ۱۷۸۹ء میں عباؔس شاعر نے نظم کیا تھا[2]۔

مظہر علی خاں ولاؔ نے گل کرسٹ کی فرمائش پر اس قصے کو برج بھاشا سے اردو میں منتقل کیا۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"مظہر علی خاں متخلص بہ ولا یہ قصہ مادھونل اور کام کنڈلا کا کہ زبان برج میں موتی رام کبیشور نے کہا ہے، بموجب فرمائش جناب گل کرسٹ صاحب دام اقبالہٗ کے بہ محاورۂ زبان اردو بیان کرتا ہے"[3]

اس ترجمے میں مظہر علی خاں کے ساتھ للو جی بھی شریک تھے لیکن ولاؔ نے اپنے دیباچے میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔ للوؔجی لکھتے ہیں :۔

"ایک دن صاحب (گل کرسٹ) نے کہا کہ برج بھاشا میں کوئی اچھی کہانی ہو اسے ریختے کی بولی میں کہو۔ میں نے کہا بہت اچھا، پر اس کے لئے کوئی پارسی لکھنے والا دیجیے، تو بھلی بھانت لکھی جائے۔ انہوں نے دو

---

[1] بھارتی پریم آکھیان کاویہ ص ۲۲۲۔

[2] اردو کی نثری داستانیں۔ گیان چند جین ص ۳۰۱۔

[3] دیباچہ مادھونل اور کام کندلا (مطبوعہ) مظہر علی خاں ولاؔ ص ۱۹، ۲۰۔

شاعر میرے (کذا) تعینات کئے، مظہر علی خاں ولاؔ اور کاظم علی جواںؔ. ایک

ورش میں چار پوتھی کا ترجمہ برج بھاشا سے ریختے کی بولی میں کیا. سنگھاسن بتیسی،

بیتال پچیسی، سکنتلا ناٹک، او ر مادھونل ؔ[1]

للوجی کے سپرد برج بھاشا سے پڑھکر ولاؔ کو سمجھانا رہا ہوگا. ولاؔ نے انکے بیان کردہ مفاہیم

کو اردو کا پیکر عطا کیا. ولاؔ نے یہ ترجمہ ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں مکمل کیا[2] قصے کے اختتام پر ولاؔ

لکھتے ہیں:۔

"الحمد للہ کہ یہ رنگین دلچسپ داستان تاریخ دسویں ذیقعدہ

کی سنہ بارہ سو پندرہ ہجری مطابق سنہ اٹھارہ سو ایک عیسوی میں مع دو

تاریخ ہجری و عیسوی کے تمام ہوئی"[3]

اسکے بعد ابیات درج ہیں. جن سے تاریخ ہجری و عیسوی بر آمد ہوتی ہے ؎

جو کہتے ہوں باتیں بتا عشق کی — تو سننے کہانی ذرا عشق کی

ہے رنگین و مطبوع و دلکش تمام — لکھی داستاں یہ ولاؔ عشق کی

کہ تاریخ یہ ہے ز روئے بیاں — کہی من لگن سب کتھا عشق کی

۱۲۱۵=۱۲۱۳+۲ھ

ردیف و قوافی بدل اور بھی — ولا کہہ یہ آئی ندا عشق کی

---

[1] فورٹ ولیم کالج (ہندی) لکشمی ساگر وارشنے ص ۴۸، ۴۹۔

[2] حامد حسن قادری (داستان تاریخ اردو ص ۱۱۱) اور سید محمد (ارباب نثر اردو ص ۱۹۷) نے تالیف کا سنہ ۱۸۰۲ء تحریر کیا ہے جو درست نہیں۔

[3] مادھونل اور کام کندلا (مطبوعہ) مظہر علی خاں ولاؔ ص ۸۳۔

سنہ عیسوی کے مطابق تمام — جو اعداد تاریخ چاہے تمام
سرجہل کر دور اور دیکھ لے — فسانہ ہے یکسر عجیب وغریب[1]

گل کرسٹ کے ۱۹؍ اگست ۱۸۰۳ء کے مراسلے سے علم ہوتا ہے کہ مادھونل پریس میں جانے کے لئے تیار تھی اور گل کرسٹ نے اس پر ۹۰ روپیہ انعام کی سفارش کی تھی[2] لیکن کالج کونسل نے مذکورہ مراسلے میں جتنی کتابوں کی فہرست تھی ان سب پر غور کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مادھونل کے اقتباس گل کرسٹ کی ہندی مینول (HINDEE MANUAL) میں بھی شامل تھے[3]

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے برٹش میوزیم لندن میں اسکا ایک نسخہ دریافت کیا اور مقدمے کے ساتھ ۱۹۶۵ء میں اردو دنیا کراچی سے شائع کیا ہے۔

ولاؔ نے اپنے مذکورہ بالا بیان میں قصے کا ماخذ موتی رام کبیشور کے برج بھاشا کے قصے کو بتایا ہے لیکن ڈاکٹر پرکاش مونسؔ نے بہت سے خارجی اور داخلی شواہد سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ قصہ برج بھاشا سے نہیں بلکہ عالم کی اودھی تالیف "مادھونل اور کام کنڈلا" سے ترجمہ کیا گیا ہے[4]

ڈاکٹر موصوف کے پیش کردہ دلائل اتنے مضبوط ہیں کہ انہیں اس وقت تک چیلنج نہیں کیا جاسکتا تاآنکہ موتی رام کوی کا برج بھاشا کا نسخہ دریافت نہ ہو جائے۔

---

[1] مادھونل اور کام کندلا (مطبوعہ) مظہر علی خاں ولاؔ ص ۳۰۳۔

[2] Proceedings of the Coll.ge of F.W. Vol 559, P.277

[3] Annals of the College of F.W. Appendix, P. 23
عتیق صدیقی نے ہندی مینول کی جو تفصیل درج کی ہے اسمیں مادھونل کا نام شامل نہیں ہے (گل کرسٹ اور اسکا عہد طبع ثانی ص ۱۶۸)

[4] اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر۔ پرکاش مونس ص ۳۸۹ تا ۳۹۹۔

قصہ مادھونل اور کام کندلا میں مادھونامی خوبرو برہمن اور کام کندلا نام کی ایک درباری رقاصہ کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ یہی قصہ قدرے اختلاف کے ساتھ سنگھاسن بتیسی کی اکیسویں کہانی میں مذکور ہے۔ مادھو پہپاوتی نگر کے راجہ گوپی چند کا مصاحب تھا۔ وہ نہایت عاقل و دانا اور فن موسیقی میں طاق تھا مادھونل کے حسن و وجاہت اور جملہ خوبیوں پر شہر کی تمام عورتیں فریفتہ تھیں۔ رشک وحسد کی آگ میں جلتے ہوئے شہر کے لوگوں نے راجہ سے اسکی شکایت کی۔ نتیجتاً مادھو کو شہر سے نکال دیا گیا۔ یہاں سے وہ کام وتی نگر پہنچا۔ جہاں کا راجہ کام سین تھا۔ اس کے دربار کی رقاصہ کام کندلا تھی۔ مادھو اسکا عاشق ہو گیا۔ ایک دن راجہ نے بحث و تکرار کی بناپر اسے شہر بدر کر دیا۔ چنانچہ مادھو کام کندلا کے فراق کا غم سہتے اور اذیتیں اٹھاتے اجین پہنچا۔ یہاں کا راجہ بکرماجیت مادھو کی حالت دیکھ کر اسکی مدد کرنے پر آمادہ ہوا اور کام وتی نگر پر حملہ کرنے روانہ ہو گیا۔ جب شہر چالیس کوس کے فاصلے پر رہ گیا تب بکرماجیت کام کندلا سے ملنے گیا اور اس کی آزمائش کے لئے کہا کہ مادھو مر گیا ہے۔ یہ سن کر کام کندلا مر گئی۔ راجہ کی زبانی مادھو کو جب اس واقعے کا علم ہوا تو وہ بھی مر گیا۔ راجہ کو بہت غم ہوا۔ آخر بیتال کی مدد سے امرت چھڑکنے پر وہ دونوں زندہ ہو گئے۔ راجہ بکرماجیت نے کام سین سے بہت سخت جنگ کر کے کام کندلا کو حاصل کیا اور مادھو کے حوالے کر دیا۔

مادھونل اور کام کندلا کا یہ قصہ اردو میں منتقل ہونے کے باوجود اپنی اصل سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس کی فضا مکمل طور سے ہندوستانی ہے۔ پورے قصے میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور علوم وفنون کے نمونے بکھرے پڑے ہیں۔ مثلاً پہپاوتی نگر کا راجہ گوپی چند راجہ اندر کیطرح راج کرتا ہے۔ سازندے مردنگ، کنگری، بین، بانسری، روزبین، اُپنگ، سرمنڈل گن، تنتی تال، کرتال، منھ چنگ اور جل ترنگ وغیرہ ہندوستانی ساز بجاتے ہیں۔ بکرماجیت کا

محل کیلاش پربت کیطرح چمکتا ہے۔ ان مثالوں کے علاوہ نشست و برخاست، رفتار، وگفتار اور خلوت وجلوت کا تمام ذکر ہندوستانی روایات کی نمائندگی کرتا ہے۔

مادھونل اور کام کندلا کے قصے کی تکمیل میں ہندو دیو مالا کی کہانیاں بہت معاون ثابت ہوئی ہیں۔ مادھوایسا راگ بجاتا ہے کہ چاند کے رتھ کے ہرن کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بیتال کا کردار داستانوں کے مافوق الفطرت عناصر کی نمائندگی کرتا ہے۔ قصے کا پلاٹ اتنا مضبوط ہے اور واقعات کی ترتیب اتنے سلیقے سے پیش کی گئی ہے کہ یہ قصہ مختصر ہوتے ہوئے بھی بے انتہا دلچسپ اور اپنے انجام میں بے حد کشش رکھتا ہے۔

مادھونل اور کام کندلا اس کے مرکزی کردار ہیں۔ مادھوایک غیور، باوفا اور صادق گو برہمن ہے۔ وہ نہ صرف وجیہہ اور شکیل ہے بلکہ فن موسیقی میں بے انتہا مہارت رکھتا ہے۔ راجہ گوپی چند اسکا امتحان لینے کے لئے خوبصورت عورتوں کو کنول کی پتیوں پر باریک ساڑی میں ملبوس کرکے بٹھاتا ہے اور مادھوسے اسکا سارا ہنر ظاہر کرکے گانے کو کہتا ہے۔ جب مادھوبین سے ساتوں سُر ملاکر گاتا ہے تو:۔

"بس اتنے میں یہ سماں اور عالم اسکا دیکھتے ہی ہر ایک عورت
کی ویسے ہی حالت ہوئی اور کنول کی پتیاں ہر ایک کے بدن سے چپک گئیاں"[1]

راجہ یہ دیکھ کر بہت حیرت زدہ ہوا۔ اسی طرح وہ بین سے ایسا راگ بھی چھیڑتا ہے کہ چاند کے رتھ والے ہرن بھی رک جاتے ہیں اور رات ٹھہر جاتی ہے۔ وہ کام وتی نگر کے دربار کے دروازے سے ہی یہ بتا دیتا ہے کہ پورب رخ کے مردنگوں میں سے کسی ایک کا انگوٹھا نہیں ہے۔ وہ جہاں

---

[1] مادھونل اور کام کندلا (مطبوعہ) مظہر علی خاں ولا ص ۲۵۔

اپنی عزت نہیں دیکھتا وہاں رہنا گوارا نہیں کرتا۔ مادھو اس قدر غیرت مند ہے کہ کسی سے براہِ راست امداد طلب نہیں کرتا۔ بکرماجیت سے مدد حاصل کرنے کے لئے "وہ اس سے کچھ نہیں کہتا بلکہ مندر کی دیوار پر ایک دوہا لکھ دیتا ہے۔ مادھو عشق میں صادق اور باوفا ہے۔ وہ" کام کندلا کے عشق میں ہزار طرح کی اذیتیں سہتا ہے لیکن اس کا خیال ترک نہیں کرتا۔ وہ بکرماجیت سے کہتا ہے:۔

" مہاراج! کام کندلا نے میرا مال و دولت دل و جان لیا
اور اس کے بدلے برہ کا دکھ دیا۔ جب تلک آنکھوں میں ہے جان اور
تن میں ہے سانس تب تک نہ چھوڑوں گا اس کے ملنے کی آس۔ جبتک
نہ مروں گا اور دوزخ بہشت میں نہ جاؤں گا۔ پپیہے کیطرح کام کندلا ہی
کا نام جپوں تھا (کذا)"[1]

اور جب وہ بکرماجیت سے کام کندلا کے موت کی خبر سنتا ہے تو مر جاتا ہے۔

کام کندلا بے حد حسین اور مشاق رقاصہ ہے۔ وہ مادھو کے لئے اپنے دل میں عشق کا بے پناہ جذبہ رکھتی ہے۔ جب راجہ کام سین مادھو کو شہر بدر کرتا ہے اسوقت بغیر کسی خوف کے اسے اپنے گھر میں رکھ لینے کی خواہش ظاہر کرتی ہے۔ اس کے علاوہ بکرماجیت محض کام کندلا کے عشق کو آزمانے کے لئے مادھو کی موت کا ذکر کرتا ہے جسے سن کر وہ مر جاتی ہے:۔

" .... راجہ نے واسطے آزمائش کے یہ کہا کہ مادھو کو ہم نے
جوگی کے بھیس اجین نگری میں بیوگ بھرا دیکھا تھا۔ ندان بیوگ کی سول سے بہت

---

[1] مادھونل اور کام کندلا (مطبوعہ) مظہر علی خاں ولا ص ۵۹۔

دکھ پا کے مر گیا۔" جب یہ بات راجہ نے تمام کی کام کنڈلا نے ایک پچھاڑ کھائی اور مانند پنگلا کے تمام ہوئی۔"[1]

راجاؤں کے کردار میں راجہ کام سین اور بکرماجیت کے کردار مختصر لیکن جاندار ہیں۔ انمیں فعالیت ہے۔ بکرماجیت دردمند اور فیاض راجہ ہے۔ مادھو کی داستان سننے کے بعد وہ نہ صرف گھمسان کی جنگ کرتا ہے بلکہ کام کندلا کو حاصل کر کے دم لیتا ہے۔

مادھونل اور کام کندلا کا قصہ چونکہ برج بھاشا سے ماخوذ ہے اسلئے زبان اور اسلوب بیان کے نقطۂ نظر سے بھی یہ اپنے اصل ماخذ سے مطابقت رکھتا ہے اس کے لب ولہجے پر ہندی کے اثرات گہرے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ زبان مکمل طور سے ہندی رنگ میں رنگی ہوئی نہیں ہے۔ اردو اور فارسی کا اثر بھی ملتا ہے۔ لیکن زبان کا عام انداز ہندی الفاظ اور زبان سے بہت قریب ہے۔ اسکا اسلوب آسان اور نکھرا ستھرا ہے۔ ہندی کے آسان اور شیریں الفاظ نے ایک ایک جملے اور عبارت کو خوبصورت اور نفیس بنا دیا ہے۔ اس قصے میں فارسی اور ہندی الفاظ کے امتزاج کا بہت عمدہ نمونہ نظر آتا ہے۔ زبان بے حد رواں اور سلیس ہے۔ یہ روانی اور سلاست قصے کے کسی خاص حصے میں جلوہ گر نہیں بلکہ ہر جگہ جاری وساری ہے۔ اسکی نثر میں شعر کی سی لطافت اور نثر کی سلاست دونوں موجود ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی تصورات نے بھی بیان میں نزاکت پیدا کر دی ہے۔ یہ مثال ملاحظ ہو۔ کام کندلا مادھو سے کہتی ہے:۔

"تم نے نیہہ کی ناؤ کا گن ہاتھ میں لے کر اسکو جدائی کے سمندر میں چھوڑ دیا۔ بدون گن کھینچے کشتی کنارے نہیں لگتی۔ اور بغیر ملاح کے نہیں چلتی تو بھی

---

[1] مادھونل اور کام کندلا (مطبوعہ) مظہر علی خاں ولا ص ۴۴۔

اس کشتی کا کھینے والا ہے۔ جو تو جائے گا تو میں ڈوب جاؤں گی کیونکہ اس دریا
میں بہت سی دکھ کی لہریں اٹھتی ہیں۔ اگر مجھے ڈوبنے سے بچایا چاہتا ہے تو اکیلا
نہ چھوڑ اور میرے پاس سے نہ جا! یہ ممکن نہیں کہ تجھ بن یہاں رہوں۔ میں بھی پیچھے
تیرے کنتھا جھولی لے، بھبوت مل، مندرا پہن، جوگن ہو، تپسّی کے بھیس بن بن
پھرونگی۔ تیرے ہی گن گاؤں گی، اور گورکھ گورکھ گہراؤں گی۔ غرض روئے زمین
کے سارے تیرتھ پھرونگی۔ قرار جی کو جب ہووے گا جب تجھ سے ملونگی۔ کھنڈ
کھنڈ تیرت کروں اور کاشی میں بھی کروٹ لوں۔"[1]

مادھونل میں ہندی تلمیحات اور تشبیہات واستعارات کثرت سے مستعمل ہیں۔ حالانکہ
ان کے دوش بدوش عجمی اثرات بھی نظر آجاتے ہیں۔ یہ تلمیحات ملاحظہ ہوں :۔

"......... تقدیر سے کچھ بس نہیں چلتا۔ جیسے کرم کے لکھے سے
رام بن بن پھرا اور راون نے خویش و قوم سمیت سمیت (کذا) سب کچھ گنوایا۔ اور
پنڈووں کا راج گیا۔ راجہ نل بھیک مانگتا تھا۔"[2]

حسن کے بیان میں ہندی اور فارسی تشبیہات کا امتزاج دیکھئے :۔

"اس کے شہر میں ایک زہرجبیں کام کندلا کنچنی تھی، نہایت
حسین، بڑی چترا ور پربیں، آنکھیں نرگس کی سی، چتون مرگ کی سی، زلف
مثل زنجیر، پلکیں ناوک کا تیر، ابرو مانند ہلال، بینی الف کی مثال۔"[3]

---

[1] مادھونل اور کام کندلا (مطبوعہ) مظہر علی خاں ولاؔ ص ۴۴، ۴۵۔

[2] [3] " " " " " " " ص ۳۶۔

اس قصے میں ہندوستانی فضا کا اثر اتنا گہرا ہے کہ خلوت کا بیان ہو کہ جلوت کا ہندوستانی تصورات و معتقدات قدم قدم پر جلوہ گر ہیں۔ وصل کے بیان میں علم کوک کے بڑے گہرے رموز و نکات بڑی باریک بینی سے اشاروں اور کنایوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ ہندوستانی عقیدے کی یہ مثال ملاحظہ ہو:۔

"وہاں سے جا، ندی میں نہا دھو، دھوتی باندھ، بہت دان کیا، منھ میں تلسی دل اور گنگا جل لے بارہ تلک دیئے، سورج کو ڈنڈوت کر، چتا میں آ بیٹھا"[1]

مادھونل اور کام کندلا میں جابجا پند و نصائح سے پر عبارتیں درج ہیں۔ ان میں تجربات بھی ہیں اور نصیحت و سبق آموزی بھی۔ قصے کے درمیان میں اکثر و بیشتر اشعار و ابیات بھی درج ہیں لیکن یہ تاثیر اور شدت پیدا کرنے میں ناکام ہیں۔ بلکہ ایک حد تک قصے کی روانی میں مانع ہیں۔

مادھونل اور کام کندلا کی تصحیح شیر علی افسوس نے کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"مادھونل کا تو مترجم زبان دانی میں کامل صاحب دیوان لیکن ترجمے کے وقت اُنے شاید مطابقت کا قصد نہ کیا یا للو سری لال کب کہ مدادن تھا وہی اسبات پر متوجہ نہ ہوا۔ الغیب عند اللہ بنا پر اسکے نئے سرے سے بنانے میں آیا۔ کچھ فقرے رہ گئے ہوں تو رہ گئے ہوں۔"[2]

---

[1] مادھونل اور کام کندلا (مطبوعہ) مظہر علی خاں ولا ص ۰۰

[2] دیباچہ آرائش محفل (ق۔ن) شیر علی افسوس ورق ۳

بحیثیت مجموعی مادھونل اور کام کندلا اپنے قصے کے علاوہ زبان و بیان کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے۔ ترجمہ ہوتے ہوئے بھی اس میں ترجمے پن کا سا انداز نہیں ملتا۔ زبان و بیان کی روانی ہر منظر اور ہر واقعے میں مکمل طور سے جاری و ساری ہے۔ مادھونل اور کام کندلا کا اسلوب آج کی ترقی یافتہ نثر کی ہم سری کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی روایات اور تصورات کے بہت سے نادر مرقعے اس قصے کے ذریعے اردو ادب میں داخل ہوئے ہیں۔

۵

بیتال پچیسی

مظہر علی خاں ولا

بیتال پچیسی سورت کبیشور کی برج بھاشا کی بیتال پچیسی کا ترجمہ ہے۔ سورت کبیشور[۱] نے اسے اٹھارہویں صدی کے اوائل میں سنسکرت سے ترجمہ کیا تھا[۲]۔ وقار عظیم نے اس کا قطعی سنہ ۱۷۴۰ء درج کیا ہے[۳]۔ سنسکرت میں بیتال پچیسی کے کئی نسخے ہیں۔ سنسکرت کے علاوہ یہ قصہ دیگر زبانوں کے مولفین کے لئے بھی کشش کا باعث بنا رہا۔ ولا نے للوجی لال کوی کی مدد سے برج بھاشا

۱؎ گیان چند جین نے سورت کبیشور کا نام سواتی مہر درج کیا ہے (اردو کی نثری داستانیں ص ۲۸۹)

۲؎ اردو کی نثری داستانیں۔ گیان چند جین ص ۲۸۹۔

۳؎ ہماری داستانیں۔ وقار عظیم ص ۲۰۶۔

کے ترجمے کو اردو میں منتقل کیا۔ بیتال پچیسی کے متعلق ولا کا بیان یوں ہے:۔

"راجہ جے سنگھ سوائی جو مالک جے نگر تھا۔ اس نے صورت نام کبیشور سے کہا کہ بیتال پچیسی کو جو زبان سنسکرت میں ہے اس کو تم برج کی بھاکا میں کہو۔ تب اس نے بموجب حکم راجہ کے برج کی بولی میں کہی۔ سو اب عالی گوہر بادشاہ کے عہد کے بیچ اور عصر میں .... مارکوئس ولزلی بہادر گورنر جنرل .... فدوی شاہ عالم بادشاہ غازی کے مظہر علی خاں شاعر جس کا تخلص ولا ہے۔ واسطے سیکھنے اور سمجھنے صاحبان عالیشان کے بموجب فرمانے جناب گل کرسٹ صاحب دام اقبالہ کے زبان سہل میں جو خاص و عام بولتے ہیں اور برج کی بھاکا اکثر اس میں ہووے بلکہ کہہ دیوے، روزمرے کے موافق جسے عالم و جاہل گنی کور سب سمجھیں اور ہر ایک کی طبیعت پر آسان ہووے مشکل کسی طرح کی ذہن پر نہ گزرے۔ بیان کیا۔"[۱]

ولا نے بیتال پچیسی میں سنہ ترجمہ کہیں درج نہیں کیا ہے۔ جاوید نہال نے بیتال پچیسی کے قلمی نسخے سے دیباچے کا جو اقتباس نقل کیا ہے اسمیں مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے:۔

"۱۸۰۲ء میں للولال جی کب کے تعاون سے ترجمہ کیا۔"[۲]

لیکن قلمی نسخے میں یہ عبارت درج نہیں ہے۔ بیتال پچیسی کا سنہ ترجمہ متعین کرنے میں للوجی لال کے مندرجہ ذیل بیان سے مدد ملتی ہے:۔

"ایک دن صاحب دگل کرسٹ نے کہا کہ برج بھاشا میں

---

[۱] دیباچہ بیتال پچیسی (ق۔ن) مظہر علی خاں ولا ورق ۱۰۲ [۲] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب۔ جاوید نہال ص ۱۶۲

میں کوئی اچھی کہانی ہو اسے ریختے کی بولی میں کہو، میں نے کہا بہت اچھا،
پر اس کے لئے کوئی پارسی لکھنے والا دیجیے، تو بھلی بھانت لکھی جاتے،
انھوں نے دو شاعر میرے تعینات کئے، مظہر علی خاں ولاؔ اور کاظم علی جوانؔ
ایک ورش میں چار پوتھی کا ترجمہ برج بھاشا سے ریختے کی بولی میں کیا۔
سنگھاسن بتیسی، بیتال پچیسی، سکنتلا ناٹک اور مادھونل [1]

ان میں سے سنگھاسن بتیسی، سکنتلا ناٹک اور مادھونل کا سنہ ترجمہ ۱۸۰۱ء ہے۔ یوں مندرجہ بالا بیان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ بیتال پچیسی کا سنہ ترجمہ بھی ۱۸۰۱ء ہی ہے۔ گل کرسٹ کی ۱۲ر جنوری ۱۸۰۲ء کی فہرست سے علم ہوتا ہے کہ اس وقت تک یہ چھپنا شروع نہیں ہوئی تھی [2]۔ ۱۹ر اگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں یہ طباعت کے لئے تیار شدہ کتابوں کے ذیل میں شامل تھی۔ گل کرسٹ نے اس پر دو سو روپے انعام کی سفارش کی تھی [3]۔ لیکن کالج کونسل نے اس فہرست کو نامنظور کر دیا تھا۔ بیتال پچیسی کے اقتباس گل کرسٹ کی ہندی مینول (مطبوعہ ۱۸۰۲ء) میں شامل ہیں [4]۔

---

[1] فورٹ ولیم کالج (ہندی) لکشمی ساگر وارشنے ص ۴۸، ۴۹۔

[2] [3] Proceedings of the College of F.W. Vol. 559 P. 45, 277

[4] Annals of the College of F.W. Appendix P. 23

بیتال پچیسی ۱۹۰۵ء میں ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی۔ یہ ناگری اور فارسی دونوں رسم الخط میں تھی۔ بیتال پچیسی کا ایک قلمی نسخہ فارسی رسم الخط میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔ یہ ۹۸ اوراق پر مشتمل ہے۔ ۱۶ فروری ۱۸۱۳ء کو دیگر کتابوں کے ساتھ بیتال پچیسی بھی فورٹ سینٹ جارج کالج کے طلبا کے لئے بھیجی گئی تھی۔[۲]

حکایتوں پر مشتمل دیگر کتابوں کی طرح بیتال پچیسی کا بنیادی پلاٹ قصے کے آغاز اور اختتام میں ملتا ہے۔ درمیان میں ضمنی کہانیاں یا حکایتیں درج ہیں اور یہ کہانیاں ہی اہمیت کی حامل ہیں۔

بیتال پچیسی میں ۲۵ حکایتیں درج ہیں۔ انکا راوی بیتال نامی ایک بھوت ہے۔ ان کہانیوں کو بیتال نے راجہ بکرم کو سنایا تھا۔ بنیادی قصہ اسی راجہ بکرم سے متعلق ہے۔ وہ دھارانگر کے راجہ گندھرپ سین کا دوسرا بیٹا ہے اور دھارانگر پر حکومت کرتا ہے۔ وہ کچھ دنوں بعد بھرتری کو حکومت سپرد کرکے خود سیر و تفریح کی غرض سے چلا جاتا ہے۔ بعض وجوہات کی بنا پر بکرم کا قائم مقام راجہ بھی تخت و تاج چھوڑ کر جنگل کی راہ لیتا ہے۔ دھارانگر کی حفاظت کے لئے راجہ اندر ایک دیو کو متعین کردیتا ہے۔ راجہ بکرم حکومت کی بے سروسامانی کی خبر سن کر آتا ہے اور دیو سے لڑائی میں غالب ہوتا ہے۔ دیو جاں بخشی کی اجازت لے کر راجہ بکرم کو بیتال کی حقیقت بتاتا ہے۔ بیتال ایک پیڑ میں لٹکا ہے۔ راجہ بکرم اسے اتار کر اور لے کر ایک جوگی کے پاس جانا چاہتا ہے لیکن بیتال یہ شرط رکھتا ہے کہ اگر راجہ اسے بیں کچھ

Annals of the College of F.W. Appendix P. 25 ۱

۲ فورٹ ولیم کالج (ہندی) لکشمی ساگر وارشنے ص ۱۰۴

بھی بولا تو وہ واپس اسی پیڑ پر لٹک جائے گا۔ راستے میں بیتال ایک کہانی سناتا ہے جسکے اخیر میں راجہ بول پڑتا ہے۔ چنانچہ بیتال واپس پیڑ پر جاکر لٹک جاتا ہے۔ بکرم اتار کر پھر لاتا ہے اسطرح بیتال ۲۵ کہانیاں سناتا ہے لیکن آخری (۲۵ ویں کہانی) کہانی سناکر سوال کرتا ہے جسکا جواب راجہ کو نہیں آتا ہے۔ چنانچہ بیتال راجہ کی کم فہمی پر رحم کھاکر اسے جوگی کا فریب بتا دیتا ہے اور راجہ جوگی کو قتل کر کے عیش و عشرت سے حکومت کرنے لگتا ہے۔

اس بنیادی قصے میں اصل اہمیت کی حامل بیتال کی بیان کردہ درمیانی کہانیاں ہیں ان کا بنیادی قصے سے بس اتنا ہی تعلق ہے کہ بیتال انہیں راجہ بکرم کو سناتا ہے۔ ورنہ یہ اپنی جگہ آزاد اور مکمل ہیں۔ یہ کہانیاں مختصر داستان کی بھی نمائندہ ہیں اور رومانی کہانی کی بھی۔ ان میں کہیں کہیں مافوق الفطرت عناصر کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے۔ بیتال پچیسی پر رائے زنی کرتے ہوئے گیان چند جین لکھتے ہیں :-

"بیتال پچیسی کی بنیادی کہانی بہت خوب ہے۔ اس سے بکرم کے اقبال اور قوت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ضمنی کہانیاں سنانے کی جتنی اچھی ترکیب اس قصے میں پیدا کی گئی ہے ویسی بہت کم جگہ ملے گی۔ اسکی کہانیوں کی معاشرت نہ صرف قدیم ہندو دور کی ہے بلکہ ان میں ہندو دیو مالا کا بھی گہرا اثر ہے"[1]

بیتال پچیسی کی کہانیاں اخلاق اور نصائح سے پُر ہیں۔ ان کہانیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں ایسے آفاقی رموز نکات اور مشاہدات موجود ہیں جو صدیوں کی سوجھ بوجھ اور تجربات کا نچوڑ ہیں۔ ان میں ہندوستانی تہذیب و معاشرت اور فکری سرشتے اپنی قدیم

---

[1] اردو کی نثری داستانیں۔ گیان چند جین ص ۲۹۶، ۲۹۰۔

شکل وصورت میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ یہ کہانیاں علم وحکمت اور دانش وبینش پر زور دیتی ہیں۔

اس سلسلے میں وقار عظیم لکھتے ہیں:-

"بیتال پچیسی کی پوری فضا اس علم و ہنر اور حکمت و دانش کی فضا ہے اور ہر کہانی پڑھ کر پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ علم و دانش انسانی زندگی کی سب سے اعلیٰ وارفع قدریں ہیں۔ راجہ مہاراجا انکے مربی اور قدرشناس ہیں۔ ماں باپ اپنی روپ وتی اور سندر بیٹیوں کیلئے علم وحکمت والے شوہر کو زندگی کا بہترین ساتھی جانتے ہیں۔ شہزادیاں اور راج کماریاں صرف ایسے بر پر جان دیتی ہیں جو علم وہنر کے زیور سے آراستہ ہو۔ زندگی کی ہر مشکل علم وہنر سے آسان ہوتی ہے اور ہر الجھن اسی کے ناخن تدبیر سے سلجھتی ہے۔"[1]

ولاکی بیتال پچیسی چونکہ برج بھاشا سے براہ راست اردو میں منتقل ہوئی ہے اس لئے قصے کے ہندوستانی خدوخال جوں کے توں برقرار ہیں۔ اسکے ہندوستانی کردار اور فضا و ماحول میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ بیتال پچیسی کی ہندوستانی فضا کسی خاص مقام پر جلوہ گر نہیں بلکہ قصے کے آغاز سے لے کر انجام تک ہر مقام پر بکھری پڑی ہے۔ ذہنی اور فکری زاویوں سے بھی ہندوستانیت نمایاں ہے۔ باہمی میل جول کے مواقع اور خلوص و محبت کا انداز خالص ہندوستانی ہے۔ خاطر تواضع میں اوّل اوّل پان پیش کیا جاتا ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں میں مٹھائی کو اولیت حاصل ہے۔ رسم ورواج اور عقائد ہندوستانی طور طریقوں سے متاثر ہیں۔ زمان ومکان، اشخاص واسماء، مناظر و مواقع کہیں سے بیرونی تخئیل اور تاثیر کی ہوا تک نہیں لگتی ہے۔ تشبیہات و

---

[1] ہماری داستانیں۔ وقار عظیم ص ۲۹۲

استعارات میں بھی خالص ہندوستانی رنگ نمایاں ہے:۔

"حسن ایسا گویا اندھیرے گھر کا اجالا ہے۔ آنکھیں مرگ جیسی،
چوٹی ناگن جیسی، بھویں کمان کی سی، ناک تیر کی سی، بتیسی موتی کی لڑی
ہونٹ کنول کے سے، وہ چندر مکھی، چمپک بدنی، ہنس گمنی اور کوکل بینی تھی"[۱]

بیتال پچیسی میں کردار نگاری کے نمونے نہیں ملتے۔ نمایاں ترین کرداروں میں راجہ بکرم کا کردار قابل ذکر ہے۔ وہ علم و دانش، علم و تدبر اور قوت و عزم کا پیکر ہے۔ وہ مشکل سے مشکل مراحل سے بھی ہراساں نہیں ہوتا بلکہ پوری طاقت اور ہمت سے مصائب اور پریشانیوں کا سامنا کرتا ہے۔ نتیجتاً فتح اسکے ہاتھ آتی ہے۔

بیتال پچیسی کی زبان کے سلسلے میں یہ اعتراض کیا جاتا رہا ہے کہ اس میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کی کثرت ہے۔ شاید ان معترضین کی نظر سے ولا کی یہ صراحت نہیں گزری۔ ولا جہانگیر شاہی کے دیباچے میں واضح طور سے لکھتے ہیں:۔

"........صاحب ممدوح (گل کرسٹ) کے فرمانے سے
مادھونل اور بیتال پچیسی جو زبان برج میں ہے ان کا ترجمہ للوجی لال کب کی
مدد سے اس طرح کیا کہ بیشتر برج کی بولی بیتال پچیسی میں رہنے دی کہ مرضی صاحب
مدرس کی یوں ہی تھی"[۲]

بیتال پچیسی کے دیباچے میں بھی انہوں نے لکھا ہے:۔

"بموجب فرمانے جناب گل کرسٹ صاحب دام اقبالہ کے زبان سہل

---

[۱] بحوالہ ہماری داستانیں از نعیم حسن ص ۲۰۰-۲۰۹ [۲] دیباچہ جہانگیر شاہی از ص، مرتبہ علی ... ولا ۔ ورق۔

میں جو خاص و عام بولتے ہیں اور برج کی بھاکا اکثر اس میں ہووے بلکہ کہہ
دمہ کے روزمرے کے موافق جسے عالم و جاہل گنی کو رسب سمجھیں اور ہر ایک
کی طبیعت پر آسان ہووے مشکل کسی طرح کی ذہن پر نہ گزرے بیان کیا۔"[1]

بیتال پچیسی کا اسلوب اردو اور برج بھاشا کے الفاظ کے امتزاج کا نمائندہ اسلوب ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس میں مستعمل اکثر و بیشتر الفاظ نامانوس اور نہ ہی اجنبی بھی ہیں لیکن قصے کی ہندوستانی فضا اسی اسلوب اور اسی زبان کی متقاضی تھی۔ سنسکرت اور ہندی کے یہ الفاظ اپنی ساخت اور خدوخال کے اعتبار سے وزن دار اور گراں نہیں ہیں۔ ان میں ترنم بھی ہے اور آہنگ بھی۔ بعض نامانوس الفاظ کے سمجھنے میں قصے اور کہانی کے وہ مقامات بھی معاون ہوتے ہیں جن میں وہ مستعمل ہوئے ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

"ہر ایک جی کو رکشا کرنا دھرم ہے۔ سنسار میں اس کے سمان
کوئی ادھرم نہیں کہ منش پرایا ماس کھا اپنا ماس بڑھاتے ہیں۔"[2]

مندرجہ ذیل نصیحت میں ہندی اسلوب ملاحظہ ہو:۔

"راج کمار بولا اے گنہ بر کچھ چھایا کرتے ہیں اوروں کے اوپر اور
آپ دھوپ میں بیٹھتے ہیں۔ پھولتے پھلتے ہیں۔ پرائے واسطے۔ اچھے پرشوں کا
اور برچھوں کا یہی دھرم ہے جو یہ دیہہ غیر کے کام نہ آوے تو اس دیہہ سے کیا۔
پر دچن سے مثل مشہور ہے کہ جوں جوں چندن گھستے ہیں توں توں دونی

---

[1] دیباچہ بیتال پچیسی (ق۔ ن) مظہر علی خان ولا۔ ورق ۲۔

[2] ہماری داستانیں۔ وقار عظیم ص ۲۹۴۔

سوگندھ دیتا ہے اور جوں جوں چھیل چھیل کاٹ ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں
توں توں ایک ادھک سواد دیتی ہے۔ جوں جوں کنچن کو جلاتے ہیں توں توں
ات سندر ہوتا ہے۔ اتم لوگ جو ہیں سو پران جانے سے بھی سبھاؤ نہیں
چھوڑتے۔ کسی نے بھلا کہا تو کیا اور برا کہا تو کیا۔"[1]

ولاؔ نے برج بھاشا کے دوش بدوش عربی اور فارسی کے الفاظ کو بڑی خوبصورتی
سے کھپایا ہے۔ روزمرہ کی خوبی سے متصف یہ الفاظ بیان کی دلچسپی میں اضافہ کرتے ہیں۔ ہاں
جہاں ثقالت کے درجے پر آجاتے ہیں وہاں بیانات غیر مانوس اور بدنما ہو گئے ہیں۔
بیتال پچیسی کے اسلوب کی یہ خوبی ہے کہ ولاؔ نے ہر مقام اور فرد کے مطابق بہت مناسب
انداز بیان اختیار کیا ہے جس سے ہر کردار، مقام اور ماحول کے خد و خال نمایاں ہو گئے ہیں۔
قصے پر گرفت کے باعث ولاؔ نفس مضمون کی ادائیگی میں کامیاب ہیں۔ انہوں نے جن خیالات
اور تصورات کو جس ماحول اور جس سیاق و سباق میں پیش کیا ہے۔ وہ واضح ہے ہندوستانی
معاشرت اور شوکت رفتہ کی تصاویر زبان و بیان کی خوبی سے نمایاں ہوئی ہیں۔
بیتال پچیسی میں سادہ اور رواں اسلوب بھی نظر آتا ہے جہاں اردو کے سادہ
الفاظ کے ساتھ ہندی کے نرم الفاظ بڑی خوبی سے استعمال کئے گئے ہیں۔

---

[1] بیتال پچیسی (د ت ن) مظہر علی خاں ولاؔ ورق ۔۔۔

۶

قصۂ لیلےٰ مجنوں

حیدر بخش حیدری

حیدری نے "قصۂ لیلےٰ مجنوں" کو ۱۸۰۱ء ۱۲۱۵ھ میں اردو نثر میں منتقل کیا تھا۔ اس قصے کا ماخذ امیر خسرو کی مثنوی "لیلےٰ مجنوں" ہے۔ حیدری سے قبل اس قصے کو خواجہ یٰسین شاہجہان آبادی نے اردو نظم میں بیان کیا تھا۔ حیدری قصۂ لیلےٰ مجنوں کے دیباچے میں مذکورہ تفصیلات کو یوں درج کرتے ہیں:۔

"یہاں سے احوال یوں ہے کہ حضرت امیر خسرو دہلوی مرید حضرت نظام الدین اولیاؒ کے کہ کئی کتابیں فارسی کی اس حقیقت آگاہ نے تالیف کی ہیں اور ایک مثنوی میں احوال لیلےٰ مجنوں کا جو لکھا ہے سو اس کے مضمون کو ساتھ فصاحت و بلاغت کے ادا کیا ہے اور ہاتفی نے بھی اس قصہ دلچسپ کو اپنے خمسے میں بخوبی تمام نظم کیا اور عبارت فصیح سے اس کے ہر ایک بیت معشوقہ کو زیور معنی پہنایا اور اس قصہ کو خواجہ یٰسین شاہجہاں آباد کہ شاعری میں یکتائے عصر ہیں اور بالفعل مسند حیات پر جلوہ گر ہیں بموجب فرمائش اظہر علی خاں مرحوم کہ سے چھبیر زنا صاحب نے حکیم موصوف سے ذوات اس قصے کی نظم ہندی میں کی تھی، خواجہ ممدوح نے زبان ریختہ ہندی میں حقیقت

اسکی سابق سلطنت شاہ عالم بادشاہ غازی کے بوجہ احسن بطور مثنوی لکھی اب ۱۲۱۵ بارہ سے پندرہ ہجری مطابق اٹھارہ سے ایک عیسوی کہ سنہ پینتالیسواں جلوس بادشاہ موصوف سے ہے۔ جناب عالیشان ....
جان گل کرسٹ صاحب بہادر زاد افضالہٗ نے اس سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری دہلوی خوشہ چیں خرمن علم کونین مولوی غلام حسین غازیپوری مولوئ عدالت نواب علی ابراہیم خاں بہادر مرحوم حاکم بنارس کو فرمایا کہ تو اس قصۂ پرسوز ہندی کو بیچ زبان ریختہ اردوئے معلیٰ کے ساتھ فصاحت شیریں سخنی کے نثر کر اور احاطۂ تحریر میں لا۔ کیوں کہ عبارت سلیس مفید ہے ان صاحبوں کو جو کہ بالفعل اس گفتگو سے واقف نہیں انکی درستگی زبان کے واسطے بہتر اس نثر سلیس سے اور کوئی عبارت نظر نہیں آتی۔ چنانچہ اس کمترین ہیچ مداں نے موافق اپنی طبع کے زبان محاورہ اردوئے معلیٰ کے قصۂ نظم کو ہندی میں نثر کیا۔ اور اگر ایک صاحب سخن سے سوال رکھتا ہے کہ جو کوئی اس ترجمہ کو چشم فیض اثر سے دیکھے اور کچھ نامربوطی الفاظ کی دکھلائی دے تو لازم ہیکہ وہ اپنی دستگیری قلم غلط بردار سے اس حرف افتادہ کو صفحۂ غلط سے اٹھالے اور اجر اس کا اس کو دونوں جہان میں خدا دے ؎

کمیت خامہ کو میں نے اٹھا کر — کیا ہے صفحۂ مضمون پہ جولاں
لکھا ہے قصۂ لیلیٰ و مجنوں — سنو ٹک گوش دل سے نکتہ سنجاں[1]

---

[1] دیباچہ قصہ لیلیٰ مجنوں۔ بحوالہ مقدمہ مختصر کہانیاں۔ عبادت بریلوی ص ۹۷۸۔

قصہ لیلےٰ و مجنوں کا کوئی قلمی یا مطبوعہ نسخہ دستیاب نہ ہوسکا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کو اسکا قلمی دیباچہ برٹش میوزیم لندن میں دستیاب ہوا تھا[1]۔ یہ دیوان حیدری، مختصر کہانیاں اور گلزار دانش کے مقدموں میں بھی درج ہے۔

---

(۷)

توتا کہانی

حیدر بخش حیدری

توتا کہانی کا سلسلہ سنسکرت کی کتاب "شک سپ تتی" (یعنی توتے کی کہی ہوئی ستر کہانیاں) تک پہنچتا ہے[2]۔ سنسکرت میں اس کے کئی نسخوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے پہلا چنتامنی بھٹ کا ہے اور دوسرا سویتامبر جین کا[3]۔ گیان چند جین نے شک سپ تتی کے ان قصوں کو قدیم ہندوستانی قصے کہانیوں (یعنی پنچ تنتر، ہتوپدیش اور بیتال پچیسی) سے ماخوذ قرار دیا ہے[4]۔ شک سپ تتی کے ان

---

[1] راقم الحروف کے نام تحریر کردہ ایک ذاتی مراسلے میں موصوف نے یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے کہ ان کو دیباچے کے علاوہ لیلےٰ مجنوں کا دفتر ہزار تلاش کے باوجود دستیاب نہ ہوسکا۔

[2] A Classical Dictionary of Hindu Mythology P. 307

[3] اردو کی نثری داستانیں گیان چند جین ص ۳۱۵۔

[4] " " " " ص ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳۔

نسخوں کے صحیح زمانے کا علم نہیں۔ ہاں بارہویں صدی میں سنسکرت کا مصنف ہیم چند اپنی تصنیف "یوگ شاستر" میں شک سپ تتی کا ذکر کرتا ہے[۱]

شک سپ تتی سے ماخوذ ہندی اور فارسی کے نسخے بھی ملتے ہیں۔ بھیروں پرشاد نے سنسکرت قصے کو برج بھاشا میں شک بہتری کے نام سے منتقل کیا ہے[۲]۔

ضیاء الدین نخشبی بدایونی نے ۷۳۰ھ/۱۳۲۹ء میں فارسی میں "طوطی نامہ" مرتب کیا۔ نخشبی کے دیباچے سے علم ہوتا ہے کہ ان سے قبل کسی اور شخص نے شک سپ تتی کو فارسی میں لکھا تھا۔ فارسی کی اس توتا کہانی کے بارے میں معلومات دستیاب نہیں۔ نخشبی نے اپنے ماخذ کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مختلف ماخذوں سے کچھ کہانیاں اخذ کر کے اپنے طوطی نامہ کو مرتب کیا ہے۔ اس میں ۵۲ کہانیاں ہیں۔ ان میں سے چند سنسکرت شک سپ تتی سے ماخوذ ہیں[۳]۔ نخشبی کا اسلوب مرصع اور ادق ہے۔

دسویں صدی ہجری کے وسط میں اکبر بادشاہ کے حکم سے ابو الفضل نے نخشبی کے طوطی نامہ کا خلاصہ آسان اور سلیس فارسی میں کیا[۴]۔ اور طوطی نامہ ہی نام رکھا۔ طوطی نامہ کا ایک اور ملخص فارسی نسخہ سید محمد خداوند قادری کا ہے۔ قادری کے طوطی نامہ کا ماخذ نخشبی کا نسخہ ہے۔ انہوں نے نخشبی سے صرف ۳۵ کہانیاں مستعار لے کر ۱۰۹۳ھ/۸۱-۱۶۸۲ء میں اپنا نسخہ سلیس فارسی

---

[۱] اردو کی نثری داستانیں۔ گیان چند جین ص ۳۱۵، ۳۱۶۔

[۲] " " " " " " " "

[۳] " " " " " ص ۳۱۶

[۴] ایتھے نمبر ۵۲، نیز ریو ۵۴، بحوالہ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ص ۵۵۔

میں تالیف کیا۔[٥١] گیان چند جین نے ان کہانیوں کی تعداد ٥٠ م بتائی ہے[٥٢]۔ جو درست نہیں معلوم ہوتی۔
ابوالفضل اور قادری کے طوطی نامہ کو دکنی نثر میں بھی منتقل کیا گیا ہے۔ نظم میں غواصی کی مثنوی "طوطی نامہ" (١٠٤٩ھ/١٦٣٩ء) مشہور ہے۔ محمد غوث زریں کو بھی طوطی نامہ کا مؤلف قرار دیا گیا ہے[٥٣]۔

حیدر بخش حیدری نے ١٢١٥ھ/١٨٠١ء میں گل کرسٹ کی فرمائش پر سید محمد خداوند قادری کے طوطی نامہ کو "توتا کہانی[٥٤]" کے نام سے "زبان ہندی میں موافق محاورۂ اردوئے معلیٰ کے نثر میں عبارت سلیس وخوب والفاظ رنگین ومرغوب سے ترجمہ کیا" حیدری کا بیان یوں ہے:-

"............بموجب فرمایش صاحب موصوف کے سن بارہ سے (سو) پندرہ ہجری مطابق اٹھارہ سو ایک عیسوی کے حکومت میں ...... مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ کی محمد قادری کے "طوطی نامے" کا (جس کا ماخذ "طوطی نامہ" ضیاء الدین نخشبی ہے) زبان ہندی میں موافق محاورۂ اردوئے معلیٰ کے نثر میں عبارت سلیس وخوب والفاظ رنگین ومرغوب سے ترجمہ کیا اور نام اسکا "توتا کہانی" رکھا۔[٥٥]

---

[٥١] ایتھے نمبر ٢ھ، نیز ریو ٣ ص، باڈلین ٥-١٩٠ اور ٢٠٢٦ بحوالہ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ص ٥٥

[٥٢] اردو کی نثری داستانیں۔ گیان چند جین ص ٢١٦۔ [٥٣] اردو کی نثری داستانیں۔ گیان چند جین ص ٢١٧۔

[٥٤] توتا کی وضاحت حیدری نے یوں کی ہے:-

"ظاہر امعلوم ہوتا ہے کہ ہندی میں صرف طوطے (بطا) نہیں اور اس احقر نے "طوطی نامہ" فارسی کو زبان ریختہ میں لکھا۔ اسواسطے طوطی کی طوے (طا) کو تے (تا) سے بدل کیا۔ (توتا کہانی دیباچہ ص ٣)

[٥٥] دیباچہ توتا کہانی (مطبوعہ) حیدر بخش حیدری ص ٢٠١۔

توتا کہانی مکمل طور سے ۱۸۰۴ء میں طبع ہوئی۔[1] گل کرسٹ نے ۱۲ر جنوری ۱۸۰۳ء کے مراسلے میں کالج کونسل کے سامنے ان کتابوں کی تفصیل پیش کی تھی جو چھپ رہی تھیں۔ اس فہرست میں توتا کہانی کا نام شامل ہے۔ اس وقت یہ ٹیلی گراف پریس میں فارسی رسم الخط میں چھپ رہی تھی۔[2] لیکن بعد میں تمام کتابوں کے ساتھ اس کی طباعت بھی روک دی گئی۔ توتا کہانی کے اس مطبوعہ حصے کو گل کرسٹ نے "ہندی مینول" میں شامل کر لیا تھا۔[3]

مطبوعہ توتا کہانی اپنے ماخذ کے مطابق ۳۵ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلی اور ۳۵ ویں کہانی میں بنیادی قصہ مذکور ہے۔ پہلی کہانی میں ہی توتے کی بیان کردہ پہلی کہانی شامل ہے۔ دیگر کہانیاں درمیان میں ہیں۔ انکے بعد اختتام میں توتا آخری کہانی سناتا ہے اور اسی میں توتا کہانی کا انجام بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ تمام کہانیوں کے عنوانات مختلف ہیں۔ مثلاً کوئی قصہ ہے، کوئی کہانی کوئی نقل اور کوئی داستان۔ توتا کہانی کی بعض کہانیاں حکایت کا بہترین نمونہ ہیں۔ بعض رومانی کہانیوں کی نمائندگی کرتی ہیں اور بعض داستانوی تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ حالانکہ توتا کہانی میں نہ تو مافوق الفطرت عناصر ہیں نہ ہفت خواں کی فتحیابیاں، نہ پیچیدگی اور نہ استعجاب و اضطراب، یہ محض سیدھی سادی کہانیاں ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے توتا کہانی کو مختصر داستان کہا ہے۔[4] اور یہ بات ایک حد تک صحیح ہے کیونکہ اس میں بنیادی کہانی موجود ہے جو پہلے قصے میں شروع ہو کر

---

[1] Linguistic Survey of India Vol. IX Part I. P. 33

[2] Proceedings of the College of F. W. Vol. 559, P. 45

[3] Annals of the College of F. W. Appendix, P. 23

[4] اردو کی نثری داستانیں ص ۵۲۔

۳۵ ویں قصے میں مکمل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں داستان کے چند دیگر عناصر بھی ملتے ہیں۔

توتا کہانی کا بنیادی پلاٹ بہت ہی نحیف ہے۔ بنیادی قصہ بہت مختصر ہے۔ اسے ابتدار اور خاتمے پر جوڑ دیا گیا ہے۔ اصل اہمیت کی حامل ضمنی کہانیاں ہی ہیں۔ یہ ضمنی کہانیاں اپنی جگہ آزاد اور مکمل ہیں۔ انکا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔ بقول گیان چند جین :۔

"پلاٹ ایک کھونٹی کی مانند ہے جس پر مختلف کہانیوں کے تار ٹانگ دیئے گئے ہوں"[1]

ہندوستان کے قدیم قصوں میں عورتوں کو عموماً بدکردار، عیار اور شاطر دکھایا گیا ہے۔ توتا کہانی میں بھی کہانی کی ہیروئن خجستہ عورتوں کے اس قبیل سے تعلق رکھتی ہے جو شوہر کی عدم موجودگی میں غیر مرد سے تعلقات قائم کرلینے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتیں۔ آٹھویں، نویں، دسویں اور ۲۵ ویں کہانیوں میں عورتوں کی بے راہ روی کی داستانیں مذکور ہیں۔ یہ داستانیں بے حد بدنما انداز میں بیان کی گئی ہیں۔

ضمنی کہانیوں کے حیوانی کردار بھی خیر و شر کے وصف سے متصف ہیں۔ بائیسویں کہانی میں پری کا ذکر بھی شامل ہے۔

سنسکرت توتا کہانی کی تمہید میں تفصیل سے کام لیا گیا ہے اس کے علاوہ کرداروں کے نام مکمل طور سے ہندوستانی ہیں۔ قصہ کا انجام طربیہ ہے۔ سنسکرت سے فارسی میں منتقل ہوکر قصہ کی تمہید اور کرداروں کے نام فارسی داستانوں کے رنگ میں رنگ گئے۔ اور قصہ کا انجام تبدیل ہوکر طربیہ کی بجائے المیہ ہوگیا۔ حیدری کی توتا کہانی کا انجام بھی المیہ ہی ہے۔

---

[1] اردو کی نثری داستانیں۔ گیان چند جین ص ۵۹۔

حیدری کی توتا کہانی میں قصہ کا ہیرو میمون سفر پر چلا جاتا ہے۔ اس کی عدم موجودگی میں میمون کی بیوی خجستہ ایک شہزادے کے عشق میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اور اس کا وصال حاصل کرنے کیلئے مضطرب رہتی ہے۔ توتا اس کو، جو کہانیاں سناتا ہے انکا مقصد خجستہ کو اس کے محبوب کے پاس جانے سے روکنا ہے۔ خجستہ شام ہوتے ہی زیب وزینت کا اہتمام کر کے توتے سے اجازت لے کر رخصت ہونے آتی ہے۔ اور توتا کسی نہ کسی بہانے روز ایک کہانی سنانا شروع کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ میمون سفر سے لوٹ آتا ہے اور خجستہ کے عشق کے بارے میں سن کر اسے قتل کر دیتا ہے۔ دو ڈھائی صفحات کو محیط ان کہانیوں کو توتا نہ جانے کیسے اور کس انداز سے سناتا تھا کہ صبح نمودار ہو جاتی تھی۔ ان میں سے بیشتر کہانیاں بے محل ہیں اور خجستہ کے حسب حال بھی نہیں۔ ہر کہانی ایک جیسے جملے سے شروع ہوتی ہے اور ایک ہی طرح سے ختم ہو جاتی ہے۔ ان کہانیوں میں نہ کوئی نیا زاویۂ حیات مضمر ہے اور نہ انوکھا پن۔ ہاں یہ کہانیاں اپنی تاثیر میں اخلاقی نکتہ ضرور پوشیدہ رکھتی ہیں۔

حیدری نے دیباچے میں واضح کیا ہے کہ انہوں نے توتا کہانی کو:-

> "زبان ہندی میں موافق محاورۂ اردوئے معلّٰی کے نثر میں عبارت سلیس وخوب والفاظ رنگین ومرغوب سے ترجمہ کیا"[1]

توتا کہانی میں ترجمہ پن کی جھلک بالکل نہیں ملتی۔ حیدری نے فارسی کی عبارتوں کو ایسی خوبصورتی سے اردو میں منتقل کیا ہے کہ حیدری کی ذاتی صلاحیتوں کے جوہر نمایاں ہو گئے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ کہیں کہیں انہوں نے اصل نسخے کی بھی پاسداری کی ہے۔ کہیں وہ فارسی محاوروں کا استعمال کر جاتے کہیں صرف مفہوم ہی اخذ کر لیتے ہیں۔ انہوں نے اشعار کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ یہ اشعار

---

[1] دیباچہ توتا کہانی (مطبوعہ) حیدر بخش حیدری ص ۲۔

بیان میں لطف پیدا کرتے ہیں اور ان سے بیان کی روانی بھی مجروح نہیں ہوتی۔

توتا کہانی میں سادہ و سلیس زبان کہانی کے ہر حصے میں نمایاں ہے۔ اس میں گفتگو کا سا لطف ملتا ہے۔ نہ کہیں ابہام ہے نہ اختصار۔ اس کی نثر ٹھہری ہوئی اور متوازن سی ہے۔ اس میں نہ تصنع ہے اور نہ الفاظ کی شعبدہ گری۔ حیدری نے فارسی اور ہندی کے درمیان بڑا خوشگوار توازن قائم کیا ہے۔ یہ مثال ملاحظہ فرمایئے:۔

"توتے نے کہا کہ ایک گیدڑ تھا کہ وہ ہمیشہ شہر میں جاتا اور ہر ایک آدمی کے باسنو میں منھ ڈالتا؛ چنانچہ اسی اپنی عادت سے ایک رات نیل گر کے گھر گیا اور اس کے نیل کے ماٹ میں منھ ڈالتے ہی اس میں گر پڑا اور تمام بدن اسکا نیلا ہو گیا۔"[1]

حیدری کو فقروں اور جملوں کے تناسب، محاوروں اور روزمروں کے استعمال کا بہت سلیقہ ہے۔ وہ ان سب سے واقعات کی کڑیاں ملانے میں مدد لیتے ہیں۔ حیدری نے حالانکہ دلی کا محاورہ استعمال کیا ہے لیکن وہ لکھنؤ کے روزمرہ سے بھی اپنا دامن نہیں بچا سکے۔ سراپا نگاری تو خالص لکھنوی انداز میں کرتے ہیں:۔

"خجستہ نہا دھو، تھوڑا سا میوہ کھا، اطلس کا پاجامہ ... نیفہ کا ازار بند ڈالے، کا کلیوں دار کرتا، تاش کی سنجاف لگا، جالی کی کرتی، ... کی انگیا، بنارسی دوپٹا، مسی کی دھڑی، پانوں کا لکھوٹا، آنکھوں میں ... بالوں میں کنگھی، اس طرح بنا ؤ ٹھنا ؤ کر جواہر کے گہنے پاتے سے آراستہ ہوا ایسی

---

[1] توتا کہانی (مطبوعہ) حیدر بخش حیدری ص ۴۰۔

بنّی بنی کہ احوال اس کے سگھڑاپے کا بیان نہیں کیا جاتا[1]

توتا کہانی میں نسوانی زبان اور محاورے بھی خال خال نظر آجاتے ہیں۔ حیدری نے مقامی زبان کا بھی جا بجا استعمال کیا ہے۔

توتا کہانی کو اپنی سلیس اور بامحاورہ زبان کی بدولت آج بھی امتیاز حاصل ہے۔ شیر علی افسوس نے توتا کہانی کی عبارتوں کی تصحیح بھی کی تھی۔[2]

۸

آرائش محفل (قصۂ حاتم طائی)

حیدر بخش حیدری

حیدری نے آرائش محفل کے آغاز میں لکھا ہے کہ:۔

"......... یہ قصہ عبارت فارسی میں زبان سلیس سے کسی شخص نے آگے لکھا تھا۔ اب اس سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری دلّی کے رہنے والے نے حکومت میں .... مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ کی بموجب حکم .... جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کے سنہ

---

[1] توتا کہانی (مطبوعہ) حیدر بخش حیدری ص ۱۱۶۔

[2] دیباچہ آرائش محفل (ق۔ن) شیر علی افسوس ورق ۳۔

بارہ سو سوالہ (کذا) ہجری[1] مطابق اٹھارہ سو ایک عیسوی موافق سنہ جلوس
تینتالیس شاہ عالم بادشاہ غازی کے زبان ریختہ میں موافق آپنی (کذا)
طبع کے اس کتاب سے جو ہاتھ لگی تھی ترجمہ نسر (کذا) میں کیا اور اس کا نام
آرائش محفل رکھا۔ پر اکثر اس میں زیادتیاں اپنی طبیعت سے بھی جہاں
جہاں موقع اور مناسب پائیں وہاں کیں تاکہ قصہ طولانی ہو جائے۔"[2]

حیدری نے آرائش محفل کے اس اجمالی دیباچے میں جسقدر معلومات فراہم کی ہیں اس میں انہوں نے اہم نکتہ یعنی داستان کے ماخذ کو واضح نہیں کیا اور یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے کہ یہ قصہ پہلے کسی شخص نے فارسی میں لکھا تھا۔ دراصل آرائش محفل فارسی کے "حاتم نامہ" سے ماخوذ ہے۔ اور اس کے مصنف عبداللہ ہیں۔[3] لیکن آرائش محفل اپنے ماخذ کا ہو بہو ترجمہ نہیں ہے بلکہ حیدری نے قصہ کو طول دینے اور قبول عام حاصل کرنے کے لئے اپنی طبیعت سے اضافے بھی کر دیئے ہیں جس کا مذکورہ دیباچے میں انہوں نے ذکر بھی کیا ہے۔

گل کرسٹ کی ۱۹ راگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں آرائش محفل (حاتم طائی) کا نام شامل ہے۔ اُس وقت یہ پریس میں تھی۔ گل کرسٹ نے رائے کے کالم میں لکھا تھا کہ یہ بہت عمدہ تالیف ہے اور تمام سچے مستشرقین کے لئے قابل قبول ہوگی۔ اس نے اس کتاب کے لئے چار سو روپے انعام کی تجویز بھی پیش کی تھی[4] لیکن کالج کونسل نے یہ پوری فہرست ہی نامنظور

---

[1] گلدستۂ حیدری کے دیباچے میں حیدری نے آرائش محفل (حاتم طائی) کی تکمیل تاریخ ۱۲۱۵ھ درج کی ہے [2] دیباچہ آرائش محفل (ق۔ن) ص ۲۔ [3] قومی زبان کراچی، بابت جنوری ۱۹۶۲ء ص ۲۲ بحوالہ اردو کی نثری داستانیں ص ۲۰۳۔

[4] Proceedings of the college of F. W. Vol. 559 P 277

کر دی۔ عبادت بریلوی کو غلط فہمی ہوئی کہ اس کتاب کے لئے حیدر بخش حیدری کو چار سو روپے کا انعام حاصل ہو گیا تھا۔[1]

لکشمی ساگر وارشنے کی پیش کی گئی ایک فہرست سے، جو کالج کونسل کی ۲۰ ستمبر ۱۸۰۴ء کی کارروائی پر مبنی ہے، یہ علم ہوتا ہے کہ آرائش محفل اُس وقت بھی چھپ کر تیار نہیں ہوئی تھی بلکہ پریس ہی میں تھی۔[2] راقم الحروف کی رسائی اُس زمانے کے کسی مطبوعہ نسخے تک نہ ہو سکی۔ البتہ بعد میں مختلف مطبعوں سے اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ عبادت بریلوی نے مزید لکھا ہے کہ ۱۸۰۳ء میں آرائش محفل طبع بھی ہو گئی تھی۔[3] لیکن مذکورہ بالا فہرست کی روشنی میں یہ اطلاع بھی درست نہیں معلوم ہوتی۔

آرائش محفل داستان بھی ہے اور اخلاق و عمل کا صحیفہ بھی۔ ایثار، حب انسانی اور خدمت خلق جیسے بیش قیمت جذبے پوری داستان میں جاری و ساری ہیں اور انہیں بنیادوں پر داستان کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ اپنے خدوخال کے اعتبار سے آرائش محفل بڑی داستانوں کا سا انداز رکھتی ہے

عام داستانوں کی طرح آرائش محفل کا پلاٹ غیر مربوط اور وحدت سے عاری ہے۔ اس میں حاتم طائی کی سات مہموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سات مہمیں دراصل حسن بانو کے سات سوالوں کے باعث وجود میں آئی ہیں۔ وہ سات سوال یوں ہیں :-

۱۔ ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔

---

[1] مقدمہ گلزار دانش ص ۳۵۔

[2] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۱۹۳۔

[3] مقدمہ مختصر کہانیاں ص ۱۲۔

۲۔ نیکی کر دریا میں ڈال۔

۳۔ کسی سے بدی نہ کر۔ اگر بدی کرے گا تو بدپاوے گا۔

۴۔ سچ کہنے میں ہمیشہ راحت ہے۔

۵۔ کوہ ندا کی خبر لانا۔

۶۔ اس موتی کا جوڑا تلاش کرنا جو مرغابی کے انڈے کے برابر ہے۔

۷۔ حمام بادگرد کی خبر لانا۔

ان میں سے ہر سوال اپنے اندر مہم جوئی کی دعوت پوشیدہ رکھتا ہے۔ بقول کلیم الدین احمد:۔

> "یہاں ہر سوال ایک دروازہ ہے جس سے کسی مہم کی راہ کھلتی ہے۔ ہر سوال ایک دعوت ہے۔ جرأت و بلند حوصلگی کی آزمائش کی۔ ہر سوال ایک بیج ہے جس سے مختلف قسم کے واردات نکلتے اور پھولتے پھلتے ہیں"[1]

اس تجزیے سے قطع نظر ان سوالوں کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دوسرے تیسرے اور چوتھے سوال میں بہترین اخلاقی درس پنہاں ہے۔ مذکورہ سات مہموں کو سات آزاد کہانیاں بھی کہا جا سکتا ہے۔ انکا آپس میں اگر کوئی تعلق ہے تو بس اسی حد تک کہ کسی سوال کا تو اکسی مہم میں آجاتا ہے اور مرکزی کردار ایک ہی ہے۔ اسی بنا پر یہ ساری مہمیں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ حاتم کی ہر مہم اپنے دامن میں قصہ در قصہ کی پیچیدگی بھی رکھتی ہے۔ یہ قصے اپنے ضمن میں اصل قصے کے ہی حاشیے ہیں۔ یہاں ضمنی کہانیاں بھی ہیں اور مہم در مہم کا سلسلہ بھی جاری و ساری ہے۔ ان سب کا واسطہ مرکزی قصے سے نہیں بلکہ محض حاتم کی ذات سے ہے۔ ضمنی کہانیوں میں چوتھے سوال میں بادشاہ اور

---

[1] اردو زبان اور فن داستان گوئی۔ کلیم الدین احمد ص ۱۱۔

بدکردار عورت کی چھٹے سوال میں بندری کی اور ساتویں سوال، میں مینڈکوں کے بادشاہ کی
کہانیاں شامل ہیں۔

آرائش محفل میں فوق الفطری عناصر کی کثرت ہے۔ یہاں دیو بھی ہیں اور پریاں بھی۔
ساحر بھی ہیں اور انکے سحر بھی۔ عجیب وغریب جانور بھی ہیں اور حشرات الارض کی حشر سامانیاں
بھی۔ ان دیوؤں اور پریوں کے کرشمات معمولی ہیں۔ انکی سرشت میں برائی نہیں ہے۔ حاتم کے
فعل وعمل کے آگے یہ سب بے بس ہیں۔ ساحروں اور ان کے طلسم کا یہ عالم ہے کہ شام کا جادوگر
حاتم سے مہرہ نہیں چھین پاتا۔ شام کے جادوگر کا استاد کملاق کا سحر بھی حاتم سے مقابلے میں
دم توڑ دیتا ہے۔ کوہ ندا اور حمام بادگرد کے طلسمات دلچسپ ہیں لیکن ان میں ہیبت اور دہشت
کے تأثر کا پرتو بھی نہیں جھلکتا۔ ہاں اتنا تو بہرحال ہے کہ یہ سارے عناصر داستانوی رنگ کو
تیز کرنے میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔ آرائش محفل میں بھی جگہوں کے ناموں کی فراوانی ہے۔
مثلاً طومان، تہران، یمن، شام، خوارزم، چین، ہندوستان، شہر سورت، کوہ قاف، دریائے
قلزم وغیرہ۔ اور یہ سارے مقامات جغرافیائی حدود سے ماورا ہیں۔

یوں تو اس داستان کا ماخذ فارسی قصہ ہے لیکن آرائش محفل میں جا بجا ہندوستانی
تہذیب اور رسم ورواج کے عناصر اپنی جھلک دکھا جاتے ہیں۔ مثلاً پانچویں مہم میں حاتم کوہ ندا کی خبر
لانے کے لئے چلتے چلتے ہندوستان آپہنچتا ہے۔ یہاں اسے دودھ اور مٹھا (چھاچھ) پینے کو دیا جاتا ہے۔
اس کے علاوہ ستی کی روایت کا ذکر بھی قصے میں ملتا ہے۔ داستانوں کا اہم جزو تبلیغ مذہب ہے۔
اس قصے میں بھی مذہبی تبلیغ کا عنصر موجود ہے۔ حاتم کا خدا کی تائید اور اس کی قدرت پر کامل
اعتقاد ہے۔ ایمان کی اس پختگی کے باعث وہ ہر مشکل مرحلے سے گزر جاتا ہے اور اس کی فتح حق کی
فتح کا درجہ رکھتی ہے۔

اس داستان کا مرکزی کردار حاتم ہے جو سات مہمیں سر کرتا ہے۔ وہ بہادری، جفاکشی جرأت و ہمت، سخاوت و مروت، حسن اخلاق اور نیکی کا پیکر ہے۔ یہ وہ مثالی کردار ہے جو دوسروں کے لئے بخوشی مصیبتیں اور پریشانیاں جھیلتا ہے۔ اس کا یہ جذبہ محض انسانوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ وہ چرند و پرند سب کا بھی خواہ اور مددگار رہے۔ حاتم کی اس فطرت کا سراغ قصے کی ابتدا رہی میں مل جاتا ہے۔

حاتم کی مہموں کا خاص رنگ یہ ہے کہ وہ جن پریشانیوں یا مصائب سے برسرِ پیکار ہوتا ہے اوّل تو وہ ایسی نہیں کہ انہیں محسوس کر کے دہشت یا خوف طاری ہو۔ دوسرے یہ کہ اسے مصائب سے نپٹنے کے لئے اپنی جدوجہد سے پہلے ہی کسی نہ کسی کے ذریعے کوئی نہ کوئی فوق البشری طاقت یا غیبی امداد ضرور مل جاتی ہے۔ یہ حاتم کو پریشانیوں اور مصیبتوں سے نجات دلانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً خرس کی بیٹی کا مہرہ، پرندوں کا پر، اسم اعظم اور غیبی امداد وغیرہ۔ یوں تو حاتم کی جواں مردی اور بہادری کے ساتھ ساتھ وقت پسندی کا انداز یہی ہے کہ وہ ہر مہم کو سر کرنے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ اسے ہم اس کی ہمت و جرأت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

حاتم کی زندگی کا نصب العین دوسروں کی مدد کرنا ہے۔ قصے کے آغاز میں ہی اسکا ثبوت یوں مل جاتا ہے کہ وہ منیر شامی کی مشکل حل کرنے کے لئے آمادۂ کار ہوتا ہے۔ اس کے بعد تو واقعات کا طویل سلسلہ ہے اور ان سارے سلسلوں میں ہر واقعہ یا ہر صورت حال میں وہ اپنا یہ مقصد نہیں فراموش کرتا کہ وہ منیر شامی کے لئے سات سوالوں کے جوابات کی تلاش میں نکلا ہے۔ حاتم فرشتہ صفت نہیں۔ اس میں انسانی ذات کی کمزوریاں موجود ہیں لیکن اس کے کردار کے یہ متضاد رخ ہیں کہ ایک جانب تو وہ خود ہی دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے اور ملکہ زریں پوش سے عقد کے بعد فطری تقاضوں کی تکمیل کرنا چاہتا ہے لیکن اسی وقت اسے منیر شامی

کیا ہوا وعدہ یاد آجاتا ہے اور وہ اپنی ذات کے مقابلے میں اپنے مقصد کو اولیت دیتا ہے۔ دوسری جانب قصے میں تین موقعے ایسے ہیں جہاں وہ خرس کی بیٹی شہزادی (جس کے سر پر جن سوار تھا) اور حسنا پری کی رفاقتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ یہاں نہ تقویٰ آڑے آتا ہے اور نہ منیر شامی سے کیا ہوا وعدہ یاد آتا ہے۔ کہاں تو وہ بلا کا سخی اور غنی ہے لیکن ہیرے اور جواہرات کے ڈھیر کو دیکھ کر وہ خود پر قابو نہیں رکھ پاتا ہے۔ حاتم ان تمام تضادات اور کمزوریوں کے باوجود عیش و عشرت کا دلدادہ بنکر ہمارے سامنے نہیں آتا۔ اس میں داستانوں کے عام ہیرو کی سی عیش کوشی اور عیاشی نہیں۔ وہ پاکیزہ اخلاق وصفات کا مالک ہے۔ اور اسے ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرنے کی عادت ہے۔

حاتم کے بعد دیگر کرداروں میں حسن بانو اور بادشاہ کے پیر کے کردار نمایاں بھی ہیں اور قابل ذکر بھی۔ حسن بانو زہد و تقویٰ کی پابند ہے۔ دنیا اور دنیاوی معاملات میں اسکا نظریہ خاصا راہبانہ ہے۔ وہ فہم و ذہانت کا پیکر ہے۔ بادشاہ کے پیر کی گرفتاری کے واقعہ میں اس کی ذہانت کھل کر سامنے آتی ہے۔ بادشاہ کا پیر مختصر سے کردار میں اپنی تمام شیطنت کا گہرا نقش چھوڑ جاتا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو بظاہر تو فرشتہ صفت لیکن بہ باطن شیطان صفت ہوتے ہیں۔ زہد و تقویٰ کے خول کے پیچھے سے اس کی ظاہرداری اور عیش پسندی ظاہر ہوتی ہے۔

سید وقار عظیم نے حاتم طائی کے قصے اور کرداروں پر مجموعی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

> "حاتم کے قصے کی بنیاد سرتاسر ایثار اور خدمت گزاری کے جذبات پر ہے۔ حاتم کا ہر قدم نیکی اور خدا ترسی کی طرف ایک قدم ہے۔ اور اس کے ہر قدم پر سننے اور دیکھنے والوں کے لئے ایک ناقابل فراموش

درس خیر پنہاں ہے۔ داستان گو نے خیر کی اس فضا کو پورے قصے پر اسطرح جاری و ساری رکھا ہے کہ حاتم کے علاوہ بھی پڑھنے والے کا سابقہ جن جن کرداروں سے ہوتا ہے انکا ہر عمل نیکی کے جذبات واحساسات کا حامل و تابع ہے۔[1]

حیدری نے آرائش محفل میں بالعموم سادہ اور سلیس زبان استعمال کی ہے لیکن اس سادگی اور سلاست میں گفتگو کا سا انداز نہیں ہے۔ اسلوب بیان کی روانی کبھی لڑکھڑاتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ حیدری نے قصے کی ابتدا میں سادہ نگاری کی جو فضا قائم کی ہے اسے اخیر تک کامیابی سے نباہ نہیں سکے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ حیدری نے نثر کو بطور خالص نثر کے ہی برتا ہے۔ نثر کے پردے میں شاعری نہیں کی ہے۔ موقع اور محل کے لحاظ سے بڑا موزوں اور مناسب انداز بیان اختیار کیا ہے۔ وہ جو کہنا چاہتے ہیں اسے پورے اثر اور صداقت کے ساتھ کہہ گئے ہیں۔ انہوں نے خوانخواہ بیانات کو طویل کرنے کے لئے تشبیہات واستعارات کے دریا نہیں بہائے ہیں۔ غلو اور اغراق سے بھی کام نہیں لیا ہے۔ بلکہ قصے پر اپنی گرفت مضبوط رکھی ہے۔ ہاں رعایت لفظی کا مظاہرہ خال خال نظر آجاتا ہے۔ اسے ہم انشاء پردازی کا نمونہ کہہ سکتے ہیں یہ حصے بھی پرکشش ہیں۔

حالانکہ آرائش محفل کے جملوں میں ترنم اور آہنگ کا فقدان ہے۔ ان کے اکثر بیانات فرسودگی اور بوسیدگی کا لبادہ اوڑھے نظر آتے ہیں جسے ہم بڑی حد تک فارسی کا اثر قرار دے سکتے ہیں لیکن کہیں کہیں حیدری نے آرائش محفل میں روزمرہ اور محاورے کا بڑا خوشگوار توازن پیش کیا ہے۔ اس داستان میں سراپا نگاری، جزئیات نگاری اور مناظر فطرت کے مرقعے نہیں ملتے۔ ہاں معاشرت کی تصویریں کہیں کہیں منعکس ہو جاتی ہیں۔ آرائش محفل کی عبارت کی تنقیح شیر علی

---

[1] ہماری داستانیں۔ سید وقار عظیم ص ۲۵۶۔

افسوس نے کی تھی[1]۔

کلیم الدین احمد آرائش محفل کے اسلوب سے بحث کرتے ہوتے لکھتے ہیں :۔

"......... یہ بھی درست ہے کہ یہاں سادگی اور اختصار ہے اور عبارت فطری ہے لیکن اس میں کوئی خاص بات بھی نہیں وہ ادبی خوبیاں نہیں جو کسی انشا رکو ابدیت عطا کرتی ہیں۔ اسکی یہ اہمیت ضرور ہے کہ یہ موجودہ سادہ اردو نثر کا ایک اوّلین نمونہ پیش کرتی ہے۔ اور یہ اس کی تاریخی اہمیت ہے۔ اس کے علاوہ کافی عرصہ گزر جانے کے بعد بھی یہ اس قابل ہے کہ پڑھی جا سکے"[2]

دیگر اعتراضات سے قطع نظر آرائش محفل کی مذکورہ تاریخی اہمیت کے بعد آخری بات یہی ہے کہ یہ آج بھی پڑھے جانے کے قابل ہے اور یہی اسکی کامیابی کی دلیل ہے۔

۹

داستان امیر حمزہ
خلیل علی خاں اشک

داستان امیر حمزہ اردو کی سب سے مشہور اور ضخیم داستان ہے۔ یہ محض ایک داستان

---

[1] دیباچہ آرائش محفل (ق۔ن) شیر علی افسوس ورق ۳۔ [2] اردو زبان اور فن داستان گوئی۔ کلیم الدین احمد ص ۱۵۰۔

نہیں بلکہ داستانوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو صدیوں سے اپنے مترجمین اور مؤلفین کی مرضی کے مطابق مختلف نشیب و فراز سے گزرتا حذف و اضافے کی نذر ہوتا ہوا اپنی ہیئت بدلتا رہا ہے۔ یہ ان داستانوں میں سے ایک ہے جو ہندوستانی اور ایرانی دونوں تہذیبوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس کے ترجمے عربی زبان میں بھی ہوئے۔ اس کے کرداروں کے ڈانڈے عہد محمدؐ سے ملائے جاتے ہیں۔ فارسی نسخوں سے قطع نظر صرف اردو میں اس داستان کے اسقدر ترجمے ہوئے ہیں اور اس کی بنیاد پر اتنی داستانیں لکھی گئی ہیں کہ انکا تنقیدی مطالعہ تقریباً ناممکن ہے۔ اس لئے سید وقار عظیم کو لکھنا پڑا:۔

> "ان حیرت انگیز ترجموں اور تصنیفوں کا مکمل جائزہ لینا اور انکے سب پہلوؤں کی وضاحت کرنا ایک ایسا کام ہے کہ آدمی اپنی عمر اسی کے لئے وقف کردے تو ممکن ہے اس کا حق ادا کرسکے"[1]

ڈاکٹر گیان چند جین نے بڑی محققانہ کاوش سے ان داستانوں کی بعض گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے اور قابل قبول نتائج اخذ کئے ہیں۔ داستان امیر حمزہ فارسی میں کب لکھی گئی اور اس کا اصل مصنف کون تھا اس کے بارے میں بھی درست پتہ نہیں چلتا۔ مختلف فارسی اور اردو نسخوں کی مدد سے مندرجہ ذیل مصنفوں کا نام سامنے آتا ہے:۔

۱۔ عباس برادر حمزہ　　۲۔ امیر خسرو معاصر اکبر

۳۔ فیضی　　۴۔ ملا جلال بلخی

۵۔ ابوالمعالی　　۶۔ شاہ ناصر الدین محمد

---

[1] ہماری داستانیں۔ سید وقار عظیم ص ۱۹۲، ۱۹۳۔

لیکن ڈاکٹر گیان چند نے بڑی عالمانہ بحث سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان میں سے کوئی اصل مصنّف نہیں ہے۔

سید محمود نقوی نے اپنے مقالے (غیر مطبوعہ) "اردو داستانوں کا تنقیدی مطالعہ" میں تاریخ سیستان کے حوالے سے یہ انکشاف کیا ہے کہ "داستان امیر حمزہ کے ہیرو نہ حضرت حمزہ عم رسولؐ ہیں نہ حضرت علی بلکہ ایک اور حمزہ ہے جسکا ذکر تاریخ سیستان میں ہے۔"[۱]

"سبک شناسی" میں تاریخ سیستان کے حوالے سے محمد تقی بہار لکھتے ہیں کہ "خلیفہ ہارون رشید کے عہد میں ایک شخص حمزہ بن عبداللہ اشاری الخارجی خارجیوں کا سردار تھا۔ وہ ایک عرصہ تک ہارون الرشید کے ساتھ معرکہ آرا رہا۔ ہارون کے انتقال کے بعد وہ اپنے رفقا کیساتھ سندھ، ہند، سراندیپ، چین، ترکستان اور روم وغیرہ کا سفر کرکے سیستان واپس آگیا۔ اس کے معتقدین نے اسکی لڑائیوں اور سیاحتوں کی تفصیل میں کتاب "مغازی حمزہ" لکھی۔ بعد میں غیر خارجی ایرانیوں نے اس کتاب کو عام مسلمانوں میں مقبول بنانے کے لئے اسمیں حمزہ بن عبدالمطلب کا نام ڈال دیا اور خلفائے بن عباس کی جگہ کفار کو حریف قرار دیا۔"[۲]

"مغازی حمزہ" نویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے۔ امیر حمزہ کے تمام فارسی نسخے جو اب تک دریافت ہوئے ہیں وہ بہت بعد کے ہیں۔ اس لئے یہ تسلیم کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ داستان امیر حمزہ کی بنیاد "مغازی حمزہ" پر ہی رکھی گئی ہے اور بعد میں ترمیم و اضافے ہوتے رہے۔ فارسی کا سب سے قدیم نسخہ جو دستیاب ہے ۱۶۱۳ء سے قبل "رموز حمزہ" کے نام سے تالیف کیا گیا۔[۳]

۱۔ بحوالہ اردو کی نثری داستانیں۔ گیان چند جین ص ۱۸۴۔

۲۔ " " " " " ص ۱۸۴ ۳۔ اردو کی نثری داستانیں ص ۱۸۴، ۱۹۰۔

داستان امیر حمزہ اشک سے پہلے ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء میں دکنی زبان میں "قصۂ جنگ امیر حمزہ" کے نام سے ترجمہ کیا گیا۔[1]

خلیل علی خاں اشک نے ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں گل کرسٹ کی فرمائش پر "داستان امیر حمزہ" کو اردو میں منتقل کیا۔ انہوں نے دیباچے میں اپنے ماخذ کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی ہیں:۔

"بنیاد اس قصۂ دلچسپ کی سلطان محمود بادشاہ کے وقت سے ہے۔ اس زمانے میں جہاں تک راویان شیریں کلام تھے، انہوں نے آپس میں مل کر امیر حمزہ کے قصے کی چودہ جلدیں کہیں۔ واسطے بادشاہ کے سنانے کے۔ اسکے سننے سے آئین ہر طرح کی خلقت کا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے منصوبے لڑائیوں کے اور قلعہ گیری اور ملک گیری کے یاد آتے ہیں۔ اس خاطر ہر روز بادشاہ کو سناتے تھے کہ کسی امر میں غیر کی مصلحت کا درماندہ نہ رہے۔ اور اب اس عصر میں شاہ عالم بادشاہ کے مطابق سن ہجری بارہ سو پندرہ اور اٹھارہ سو ایک عیسوی کے خلیل علی خاں نے جو تخلص بہ اشک ہے بموجب خواہش مسٹر گل کرسٹ صاحب عالی شان والا مناقب کے، واسطے نو آموزان زبان ہندی کے، اس قصے کو زبان میں اردوے معلّی کی لکھا کہ صاحبان مبتدیوں کے پڑھنے کو آسان ہووے۔"[2]

---

[1] اردو کی نثری داستانیں۔ گیان چند جین ص ۲۷۰۔

[2] دیباچہ قصہ امیر حمزہ۔ اشک (ق۔ن) بحوالہ مقدمہ رسالہ کائنات جو مرتبہ عبادت بریلوی ص ۱۶، ۱۷۔

اشکؔ نے دیباچے میں آگے چل کر اس قصے کے منصف کا نام ملّا جلال بلخی لکھا ہے اور یہ اطلاع بھی فراہم کی ہے کہ مکمل قصہ نو دفتروں کو محیط تھا۔ جس میں بائیس جلدیں تھیں۔ ابتدائی چار جلدوں کا ترجمہ اشکؔ نے کیا تھا۔ یہ غالباً دفتر اوّل ہے۔ اشکؔ کا ارادہ تمام جلدوں کو ترجمہ کرنیکا تھا لیکن زمانے نے انہیں موقع نہیں دیا۔[1] لیکن ملّا جلال بلخی کی یہ تصنیف محققین کی نظروں سے نہیں گزری ہے۔

اشکؔ کی امیر حمزہ ۱۸۰۳ء میں طبع ہوئی۔ ۱۹ اگست ۱۸۰۴ء کی تصانیف پر انعام کے لئے سفارشی فہرست میں گل کرسٹ نے اس کتاب کا نام مطبوعہ کتابوں کے ذیل میں درج کیا ہے اور اس پر پانچ سو روپے کے انعام کی تجویز پیش کی تھی[2]۔ لیکن اس پوری فہرست کو کالج کونسل نے نامنظور کر دیا تھا۔

اشکؔ کے بیان کے مطابق اس دفتر اوّل میں اسّی داستانیں ہیں۔ لیکن بعض داستانیں دو اور بعض تین داستانوں پر مشتمل ہیں۔ اسطرح داستانوں کی کل تعداد اٹھاسی ہو گئی ہے۔ قصہ امیر حمزہ کا مقصد تبلیغ اسلام تو نہیں لیکن مسلمانوں میں اسے مقبول بنانے کے لئے اسے اسلامی رنگ ضرور دے دیا گیا ہے۔

چنانچہ امیر حمزہ اسلام دشمن طاقتوں اور سرکشی کرنے والوں کے خلاف برد آزما رہتے ہیں۔ میدان حرب میں انکو عجیب وغریب حریفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان میں انسان بھی ہیں اور دیو بھی۔ ساحر و عیار بھی ہیں اور خود ساختہ خدا بھی۔ لیکن کامیابی و کامرانی خدا پرست انسان

---

[1] دیباچہ قصہ امیر حمزہ۔ اشکؔ (ق۔ ن) بحوالہ مقدمہ رسالہ کائنات جو۔ مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۱۶،۱۷۔

[2] Proceedings of the College of F. W. Vol. 559 P. 278

امیر حمزہ ہی کے ہاتھ آتی ہے۔ اس داستان میں بظاہر کوئی ضمنی قصہ نہیں ہے لیکن اس انداز سے پلاٹ بُنا گیا ہے کہ واقعات پر واقعات رونما ہوتے چلے جاتے ہیں اور داستان نامعلوم دستوں کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔ اس داستان کی ساخت اور ہیئت میں بہت سے فنی نقائص ہیں۔ تناسب اور موزونیت کی بے حد کمی ہے۔ غیر ضروری واقعات اور کرداروں کی تکرار نے داستان کے حسن کو متاثر کیا ہے۔

امیر حمزہ کا کردار اپنے موضوع کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ وہ مثالی حرکت و عمل کا مالک ہے۔ نہ صرف ہمت و جرأت بلکہ فوق الفطری اور فوق البشری حربوں سے لیس ہے۔ نہ صرف امیر حمزہ بلکہ انکے رفقا کی سرشت میں بالعموم نیکی ہے۔ اور یہ ہر اس طاقت کے خلاف جنگ کرتے ہیں جو شر کے تابع ہوتی ہے۔ امیر حمزہ کے کردار میں انسان کی ظاہری اور باطنی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ داستان میں انکی شخصیت سب سے نمایاں ہے۔

امیر حمزہ کے علاوہ بزرچمہر اور خواجہ عمرو کے کردار بھی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

بزرچمہر علم و فضل، حکمت و دانش میں یکتا ہے۔ علم نجوم و رمل کے علاوہ دیگر علوم و فنون میں بھی مہارت رکھتا ہے۔ یہ امیر حمزہ کا دست راست ہے۔ ہر ہر قدم پر معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے۔ قصے کے آغاز میں بزرچمہر سائے کی طرح امیر حمزہ کے ساتھ رہتا ہے۔

عمرو عیار کا کردار مشہور زمانہ ہے۔ اسکی فعالیت کے باعث ہی امیر حمزہ کو اتنی وسیع و عریض سلطنت قائم کرنے میں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ کلیم الدین احمد نے چند سطروں میں عمرو عیار کی صورت و سیرت کی جامع تصویر پیش کی ہے:-

"لیکن سب سے ممتاز ہستی خواجہ عمرو کی ہے۔ ان کی عجیب و غریب صورت، انکی بخالت اور طمع، انکا امیر حمزہ اور امیر حمزہ کے فرزندوں سے عشق،

ان کا لحن داؤدی، انکی حیرت انگیز پرواز یہ سب چیزیں بس انہیں کی ذات
سے وابستہ ہیں۔ وہ عجب "مجموعۂ اضداد" ہیں۔ تمسخر اور سنجیدگی، بزدلی اور
جانبازی، سختی اور نرم دلی بیک وقت انکی شخصیت میں موجود ہیں۔ سب
دوست دشمن ان پر ہنستے ہیں اور وہ سبھوں کو ہنساتے ہیں اور ہنسنے دیتے ہیں۔
پھر انہیں بیوقوف بنا کر ان پر خندہ زن ہوتے ہیں۔ کبھی وہ ایسی حرکتیں کرتے
ہیں کہ اپنا سارا وقار کھو بیٹھتے ہیں اور کبھی ایسا رعب و دبدبہ ایسی شان و
شوکت دکھاتے ہیں کہ انکی عظمت دلوں پر نقش ہو جاتی ہے۔ بزرگان دین نے
انہیں ایسی ایسی چیزیں دی ہیں جو کسی کو میسر نہیں .... انکی عجیب
دلچسپ ہستی ہے۔"[1]

داستان امیر حمزہ کی فضا اگرچہ ایرانی ہے لیکن جگہ جگہ مقامی رنگ نمایاں ہو جاتا ہے۔
اکل و شرب کا ذکر ہو یا رسم و رواج کا ہر انداز سے ہندوستانی تہذیب کا عکس جھلکتا ہے۔ اسکے
کردار اگرچہ ہندوستانی نہیں ہیں لیکن ان کا طرز عمل ہندوستانیت سے عاری بھی نہیں۔
کلیم الدین احمد لکھتے ہیں:۔

" امیر حمزہ اور ان کے فرزند عرب کے باشندے ہیں اور ایک
حد تک وہ ان اوصاف کے حامل ہیں جو عربوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ وہ
جری بہادر ہیں۔ نڈر، بے مثل لڑنے والے ہیں۔ حمیت، فیاضی، مہمان نوازی
یہ خوبیاں گویا انہیں کے لئے پیدا ہوئی ہیں لیکن انکی زندگی کا ایک مخصوص پہلو

---

[1] اردو زبان اور فن داستان گوئی کلیم الدین احمد ص ۱۷۱، ۱۷۲۔

ہندی رنگ میں رنگا ہوا ہے اور اس عہد کی یاد تازہ کرتا ہے جب بادشاہوں
اور امیروں میں عیش پسندی آگئی تھی۔ جب ہندوستان میں اسلامی
سلطنت کے شیرازے بکھرنے لگے تھے۔[1]

اشک کی یہ داستان عموماً سادہ اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہے۔ دیباچے میں وہ خود واضح کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ قصہ نوآموزان زبان ہندی کے واسطے اردوئے معلیٰ کی زبان میں لکھا تاکہ صاحبان مبتدیوں کے پڑھنے کو آسان ہووے" لیکن اشک کی یہ داستان لکھنوی مؤلفین کے ہاتھوں جہاں مواد کے سلسلے میں حذف و اضافے کی نذر ہوئی وہیں اس کی زبان نے بھی اپنی سادگی اور بے تکلفی کھودی۔

اشک نے واضح اور بے تکلف فضا پیدا کرنے کے لئے طویل عبارتیں لکھی ہیں چنانچہ انکی عبارتوں میں ربط و آہنگ، اعتدال و توازن کی عام طور سے کمی ہے۔ واقعات کے بیان اور کرداروں کی گفتگو کے موقعوں پر یہ بے ربطی اور بے آہنگی زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ فقروں اور جملوں میں نہ تو ترنم ہے اور نہ نغمگی۔ اشک نے یوں تو سادگی بیان کا اہتمام کیا ہے لیکن جہاں جہاں انہوں نے اپنے طرز میں شعریت لانے کی کوشش کی ہے۔ وہ مقامات بھی کیف و نشاط کے اثر سے خالی ہیں۔ خصوصاً منظرکشی میں انہوں نے جو تخیلی رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے وہ پھیکے ہیں۔ اشک بہت اچھے شاعر نہیں تھے اس لئے تشبیہ و استعارے کے استعمال میں انہوں نے جگہ جگہ دھوکے کھائے ہیں۔ پھر بھی بعض مقامات پر مناظر فطرت کی تصویرکشی میں وہ خاصے کامیاب بھی ہیں۔

---

[1] اردو زبان اور فن داستان گوئی۔ کلیم الدین احمد ص ۸۵۔

داستان امیر حمزہ میں رزم کے مناظر بھی ہیں اور بزم کے بھی۔ خلوت کا بیان بھی ہے اور جلوت کا بھی۔ لیکن ان بیانات میں تاثیر نہیں ہے۔ میدان جنگ کے ذکر سے جو ہیبت یا جوش و ولولہ پیدا ہونا چاہیئے، نہیں ہوتا۔ ملاحظہ ہو:۔

"صبح کو نعمان بن منذر دس ہزار سوار لیکر میدان میں کھڑا ہوا۔ اس طرف سلطان صاحبقراں امیر حمزہ نامدار ہزار سوار کی جمعیت ہمراہ لے کر تمام سلاح بنیوں کا لگائے ہوئے مرکب سیاہ قیطاس پر سوار ہوئے۔ اور طوق بن حران ہاتھ میں علم لیا ہوا، اسکا سایہ صاحبقران پر کیا ہوا۔ دست راست امیر کے سلطان بخت مغربی سلاح جواہر نگار میں مغرق اور دست چپ کو سہیل اور اسی طرح پیچھے امیر کے مقبل وفادار دو ترکش قضاتی ایک گھوڑے سے لگائے ہوئے اور ایک کمر بند سے کمان ہاتھ میں لئے ہوئے مستعد اور آگے جلو میں عمرو عیار پیک نامدار خنجر گزار چست و چالاک بنا ہوا۔ اس طرح آہستہ آہستہ جس طرح پہلی کرن سورج کی نکلنی شروع ہوئی اسوقت مقابل نعمان کی فوج کے جاکر کھڑی ہوئی۔"[1]

لیکن داستان امیر حمزہ اپنی تمام فنی خامیوں کے باوجود ایک خیالی دنیا تعمیر کرنے میں کامیاب ہے جو داستانوں کی سب سے بڑی خصوصیت ہے اور اشک کی نثر اس دور میں لکھی گئی جب سادہ اور سلیس اردو کے نمونے نہیں کے برابر تھے۔ اس لحاظ سے اشک کا یہ کارنامہ قابل قدر ہے۔

---

[1] ہماری داستانیں۔ سید وقار عظیم ص ۲۰۴۔

۱۰

قصۂ رضوان شاہ (نگار خانۂ چین)
خلیل علی خاں اشک

خلیل علی خاں اشک نے ۱۸۰۵ء میں قصۂ رضوان شاہ[1] تالیف کیا تھا۔ یہ قصہ اپنے زمانے میں شائع نہ ہو سکا۔ اسکا ایک خطی نسخہ ڈاکٹر عباوت بریلوی کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں ملا۔ جسے انہوں نے مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ اس قصے کا ایک خطی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں بھی محفوظ ہے۔ اسکے دیباچے سے علم ہوتا ہے کہ اشک نے یہ قصہ مارو انٹ رکٹس صاحب کے لئے لکھا تھا۔ انکے الفاظ درج کئے جاتے ہیں :۔

"............ عصر میں .... مارکویس ولزلی گورنر جنرل .... کے سن ہجری بارہ سو انیس اور اٹھارہ سو چار عیسوی میں اس بے نام ونشان خلیل علی خاں نے جسکا تخلص اشک مشہور ہے اس قصے کو .... مسٹر مارو انت[2] رکٹس صاحب دام دولتہ کی خاطر زبان اردوئے معلا کی تیار کیا۔"[3]

---

[1] قصۂ رضوان شاہ کو نگار خانۂ چین کے علاوہ گلزار چین بھی کہا گیا ہے۔

[2] مارو انٹ رکٹس۔

[3] قصۂ رضوان شاہ (ق۔ن) ورق ۳۰۲۔

لیکن لندن والے نسخے (مرتبہ عبادت بریلوی) میں درج شدہ عبارت میں اس پورے اقتباس میں "مسٹر مارونٹ رکٹس" کی جگہ "جاناتھن ہنری لوٹ نصرت جنگ بہادر" لکھا ہوا ہے۔ جس سے علم ہوتا ہے کہ یہ قصہ اشک نے ہنری لوٹ کے لئے لکھا تھا۔

اس سلسلے میں کچھ اور باتیں غور طلب ہیں۔ جن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اشک نے یہ قصہ ہنری لوٹ کے لئے لکھا یا مار وانٹ رکٹس کے لئے۔

لندن والے نسخے میں دیباچۂ مؤلف کے پہلے یہ عبارت درج ہے:۔

گلزارِ چین

"قصۂ رضوان شاہ شہزادۂ چین کا اور روح افزا پری زاد بادشاہ جن کی بیٹی کا تصنیف خلیل علی خاں اشک۔ اس جلد میں لکھا گیا واسطے خداوند نعمت جوہر شناس و قدردان سخن وان مسٹر مار وانٹ رکٹس صاحب عالی جاہ والا حشمت کے۔ سن ہجری بارہ سو انیس (۱۲۱۹) میں مطابق اٹھارہ سو چار (سنہ ۱۸۰۴ء) عیسوی کے"[1]۔

مندرجہ بالا عبارت سے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ نسخہ خاص طور سے مصنف نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر مار وانٹ رکٹس کو پیش کیا ہوگا۔ نسخۂ لندن میں درج دیباچے سے اس بات کا ثبوت بھی مل جاتا ہے کہ اوّل اوّل یہ قصہ ہنری لوٹ کے لئے ہی لکھا گیا تھا لیکن شاید ہنری لوٹ نے خاطر خواہ قدر نہ کی ہوگی اسلئے مصنف نے اسے مسٹر مار وانٹ کو پیش کیا۔ جس نے اسے پسند کیا ہوگا

---

[1] قصہ رضوان شاہ (مطبوعہ) مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۲۔

اس کے بعد مصنف نے دیباچے میں بھی ہنری لوٹ کا نام ہٹا کر مار وانٹ رکٹس کا نام لکھدیا۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال والا نسخہ اسی ترمیم کے بعد کا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ لندن والے نسخے کے علاوہ اور کہیں ہنری لوٹ کا نام اس سلسلے میں نہیں ملتا۔ رکٹس کو یہ قصہ اتنا پسند آیا ہوگا کہ اس نے اشکؔ کو "انتخاب سلطانیہ" تصنیف کرنے پر آمادہ کیا۔ "رسالہ کائنات" تو بھی اشکؔ نے مار وانٹ رکٹس کیلئے ہی لکھ کر گل کرسٹ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ "انتخاب سلطانیہ" کے دیباچے میں اشکؔ قصہ رضوان شاہ کے لئے رکٹس ہی کا نام لکھتے ہیں:۔

"............... راتوں کو محنت کرکے دو جلدیں امیر حمزہ کے قصے کی کہیں اور رسالہ کائنات جو کہ فن حکمت سے تعلق رکھتا ہے تصنیف کر کے حضور عالی میں گزرانا اور قصہ رضوان شاہ کا کہ نگار خانہ چین موسوم ہے واسطے صاحب عالی شان خداوند نعمت مسٹر مار وانٹ رکٹس صاحب کے تصنیف کیا۔"[1]

قصہ رضوان شاہ کالج کونسل کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ کالج کونسل کی کارروائیوں سے علم ہوتا ہے کہ قصہ رضوان شاہ اور "انتخاب سلطانیہ" کے ترجمے پر اشکؔ کو ستر روپیہ بطور انعام دیا گیا تھا۔[2]

قصہ رضوان شاہ کے بارے میں عام خیال پایا جاتا ہے کہ یہ قصہ کسی فارسی قصے سے مستعار ہے۔ لیکن محققین اس کے کسی فارسی ماخذ کا ابھی تک پتہ نہیں لگا سکے ہیں۔ صرف قصے کے ماحول اور انداز بیان کی بنیاد پر یہ رائے قائم کی جاتی رہی ہے لیکن میرے خیال میں کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس قصے کو مصنف کی طبع زاد داستان تسلیم نہ کیا جائے۔ اشکؔ ایک کامیاب قصہ گو تھے (گل کرسٹ نے "نقلیات" کے دیباچے میں ان کی قصہ گوئی کی تعریف کی ہے) اسی لئے انہیں

---

[1] دیباچہ انتخاب سلطانیہ (ق۔ن) ص ۷، ۱۸۰۱۔
[2] فورٹ ولیم کالج (ہندی) لکشمی ساگر وارشنے ص ۵۰۔

امیر حمزہؓ کی تالیف کا کام سونپا گیا تھا اور اس قصے کو لکھنے سے پہلے اشکؔ نے امیر حمزہ کی دو جلدیں مکمل کر لی تھیں۔ جس شخص نے امیر حمزہ کی دو جلدیں مکمل کی ہوں اس کے لئے یہ ناممکن نہیں تھا کہ کوئی طبع زاد قصہ فارسی طرز پر ترتیب دے۔ ہاں اگر اشکؔ اس داستان میں ہندوستانی فضا پیش کرتے تو یقیناً حیرت انگیز بات تھی۔ اگر قصۂ رضوان شاہ کے واقعات جزوی طور پر فارسی داستانوں کے مماثل بھی ہوں تو بھی اس پر ترجمے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ اس لئے کہ زیادہ تر قدیم داستانوں میں واقعات اور جزئیات کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ صرف نام اور مقام کا فرق برقرار رہتا ہے۔ جیسے اولاد کا نہ ہونا اور پھر کسی فقیروں کی دعا یا تبرک سے اولاد کا ہونا۔ انسان کا قالب بدل لینا۔ یا کسی توتے کے ذریعے کسی کے حسن کی تعریف سن کر فریفتہ ہو جانا وغیرہ وغیرہ۔

اشکؔ نے اپنے دیباچے میں کسی فارسی داستان سے ترجمے کا ذکر نہیں کیا ہے اور ابتک کی تحقیق کے مطابق قصۂ رضوان شاہ اشکؔ کی فارسی طرز پر لکھی ہوئی ایک طبع زاد داستان ہے۔

قصۂ رضوان شاہ نو ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں شہزادۂ چین رضوان شاہ اور بادشاہ جن کی بیٹی روح افزا کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اسکا آغاز خالص داستانوی انداز پر بادشاہ چین کی لاولدی سے ہوتا ہے۔ ایک فقیر کے عطا کردہ انار کی کرامت سے بادشاہ صاحب اولاد ہوتا ہے۔ بارہ برس کی عمر میں رضوان شاہ ایک دن شکار کھیلنے جاتا ہے اور ایک ہرن کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ شہزادہ اس ہرن کو پکڑنے کی جد وجہد کرتا ہے مگر بے سود۔ آخر کار وہ اس ہرن کی خاطر اسی جگہ محل بنوا کر رہنے لگتا ہے۔ شہزادے کی ایک دائی اس کو سمجھا بجھا کر بادشاہ کے محل واپس کرتی ہے اور خود طرح طرح کی تدبیر کرتی ہے۔ اسی بیچ ایک دن پریوں کا غول بادشاہ جن کی بیٹی روح افزا کے ساتھ آسمان سے اترتا ہے۔ اسی دائی کے توسط سے رضوان شاہ اور روح افزا سے ملاقات ہوتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے بادشاہ جن کے وزیر کی بیٹی میمونہ روح افزا کے چچا کے لڑکے منوچہر کے

مشورے سے رضوان شاہ کو اٹھالے جاتی ہے۔ اور قید کر دیتی ہے۔ جب روح افزا کو رضوان شاہ نہیں ملتا تو وہ منوچہر کو قید کر دیتی ہے لیکن میمونہ سحر و جادو سے روح افزا کو بھی قید کر دیتی ہے۔ بڑی جد وجہد کے بعد رضوان شاہ قید سے نکلتا ہے اور روح افزا کو آزاد کرواتا ہے۔ میمونہ اور منوچہر اپنے بد اعمال کی سزا پاتے ہیں۔ رضوان شاہ روح افزا سے شادی کرتا ہے۔ شاہ ختن سے معرکہ سر کرتا ہے اور اپنے وطن چین لوٹ جاتا ہے۔

قصہ رضوان شاہ داستان کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اس میں آغاز سے لیکر انجام تک داستان کی روح جاری وساری ہے۔ یہاں حسن وعشق بھی ہے اور فوق الفطرت عناصر کی کارفرمائی بھی۔ یہاں سحر بھی ہے اور عیاری بھی۔ پیچیدگی بھی ہے اور اضطراب بھی۔ واقعات میں مہم جوئی اور معرکہ آرائی کا انداز بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ یعقوب معظم کا قصہ ضمنی کہانی کی مثال ہے۔ اس قصے کا آغاز ہی خالص داستانوی انداز سے ہوتا ہے۔ بادشاہ کی لاولدی، شہزادے کا کسی جانور کے پیچھے پڑ جانا اور جن یا پری کے عشق میں مبتلا ہونا داستانوں کا خاص وصف ہے۔ اور یہی خوبی اس داستان میں بھی موجود ہے۔ روح افزا اور رضوان شاہ کی واردات عشق کے بیان میں رنگینی تو نہیں لیکن ظاہری کیفیات کے بیانات انکی باہم شدید محبت کی عکاسی کرتے ہیں۔ روح افزا اور اسکا سارا کارخانہ فوق فطرت عناصر کی نمائندگی کرتا ہے۔ میمونہ اور منوچہر کے فعل وعمل سے عیاری نمایاں ہے۔ بدرہ جادوگرنی کے سحر اور طلسم سے ایک عالم عاجز و پریشان ہے۔ آٹھویں باب میں بدرہ کے طلسمات کا ذکر ہے۔ یعقوب معظم روح افزا کو آزاد کرانے کے مقصد سے بدرہ کے قلعے پر جاتا ہے کہ اچانک ایک ہوا چلتی ہے۔ قلعے کے سامنے شمشاد کا درخت ایستادہ ہے:-

"وہ درخت مثل عروس جلوہ گری میں آیا۔ جہاں تک وہ پتے
اس میں ہم شکل گل و غنچہ تھے، درخت کی شاخوں سے جدا ہو کر فلک پر اڑے

اور بلبل عندلیب کی شکل لگے بولنے ۔ وہ پتلے جو قلعے کے دروازے پر تھے ۔ان کے
ہاتھوں میں نفیریں تھیں انہوں نے بجانا شروع کیا اور ایک آواز غل وشور کی
ہر طرف پیدا ہوئی اور قلعے کی طرف سے ایک سرخ ابر پیدا ہوا ۔ اور آسمان پر
چھایا گیا۔ صاعقہ بھی لگا ہر طرف گرنے اور رعد گڑگڑانے لگی ۔اس بیابان کی عجب
صورت ہوگئی کہ اگر رستم دیکھے تو اسکا زہرہ بھی پانی ہو کر بہہ جائے "[1]

بدرہ کا طلسم توڑنے اور روح افزا کو آزاد کرانے کے واقعات مہم جوئی کے ذیل میں شامل کیے جا سکتے ہیں ۔ اس کے علاوہ شاہ ختن سے جنگ معرکہ آرائی کی مثال ہے ۔ان واقعات کے علاوہ دیگر بیانات داستانوی رنگ کو تیز کرنے میں معاون ثابت ہوئے ہیں ۔ان سے داستان کی دلچسپی میں بھی اضافہ ہوا ہے ۔

اشکؔ نے اس داستان کے پلاٹ کو بڑی چابکدستی سے ترتیب دیا ہے ۔کیا واقعات کیا بیانات ہر سطح پر قصے میں داستان کا رنگ موجود ہے ۔اشکؔ کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے اس قدرے مختصر سی داستان میں طویل اور ضخیم داستانوں کے سارے عناصر یکجا کر کے رکھدیئے ۔یہی وجہ ہیکہ قصہ رضوان شاہ میں قصے اور داستان دونوں کا حسن موجود ہے ۔

اس داستان کے کرداروں میں کوئی نیا پن نہیں ۔یہ اپنے فعل وعمل میں داستانوں کے روایتی کرداروں کی نمائندگی کرتے ہیں ۔

قصہ رضوان شاہ کی زبان پر فارسی کے اثرات بہت گہرے ہیں ۔اشکؔ کے انداز بیان میں بے ساختگی کی بجائے شعوری کوشش اور مرصع و مسجع رنگ جھلکتا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ اس داستان

---

[1] قصہ رضوان شاہ (مطبوعہ) مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۹۴ ۔

میں جابجا زبان و بیان کی ایک غیر فطری فضا کا احساس ہوتا ہے۔ انداز بیان کی فارسیت نے بیانات کی روح، انکی دلکشی اور تاثیر کو غارت کر کے رکھدیا ہے۔ جزئیات نگاری ہو کہ سراپا نگاری گفتگو ہو کہ فضا و ماحول، طلسمات کا بیان ہو کہ رزم و بزم کا منظر اشکؔ فارسی کے سحر سے آزاد نہیں ہو سکے ہیں۔ بیانات میں فارسی تراکیب اور تشبیہات و استعارات کثرت سے مستعمل ہیں۔ روح افزا کے سراپا کا بیان ملاحظہ ہو:۔

"........چشمۂ خورشید تاباں اس چاہ زنخداں کا ایک رشحہ معلوم ہوتا ہے اور مطلع ماہ و درخشاں عکس رخسار پرنیاں پوش دلبر خوش ادا، دلربا ماہ وش، عالم آرا، سرو قد۔ لالہ عذار۔ آہو چشم۔ سنبل موئے۔ خوش خوئے۔ ہلال وابرو، مرغولۂ زلف دراز، دراز مژہ۔ بلور بدن۔ مروارید دنداں، باریک سپاں آرام جاں، حقہ ناف، حباب پستاں۔ مدعا فہم، خون دل عاشقاں۔ جونہیں اس خورشید رو کی شکل رضوان شاہ نے دیکھی آنکھوں میں چکا چوند سی آگئی۔"[1]

طرز تخاطب میں فارسی لہجہ ملاحظہ ہو:۔

سن اے حور فردوس زندگانی، اے جان جہاں و اے ثمر شجر خورسندگی۔ اے مرہم زخم دل افگاراں، اے یار وفادار غمگسار، اے یار ہر منزل و اے ہمدار وغیرہ

ہاں یہ ضرور ہے کہ جن مقامات پر اشکؔ نے خود کو آزاد چھوڑ دیا ہے وہاں وہ سادہ نگاری کا مظاہرہ کر جاتے ہیں۔ یہ بیانات بڑے بامزہ اور جاندار ہیں۔ یہ منظر دیکھئے:۔

"اس روز ابر چھایا ہوا آسمان پر اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کیساتھ

---

[1] قصہ رضوان شاہ (مطبوعہ) ص ۶۱، ۶۲۔

ہلکی ہلکی ترشح کا ہونا اور وہ کاہ سبز کوسوں تلک لہلہاتی ہوئی جس میں بادشاہ
زادے کے شکار کی خاطر ہزاروں جانور مثل ہرن، پاڑھے، چیتلیں، سابر، گوزن
پال کر چھوڑے تھے۔ انکا دم کرتے پھرنا اور پہاڑوں کی ترائی میں ندیوں کے
کنارے دھانوں کے کھیتوں میں تیتروں کا بولنا اور درامریوں میں سے کویل کے
کوکنے کا عالم، وہ رعد کی گڑ گڑاہٹ اور ابر سے بجلی کا کوندنا۔ ایک طرف اس بنگلے
کے بڑے بڑے زرنگار جھولے اور ہنڈولے گڑے ہوئے تھے[1]۔

اس قسم کی سادہ نگاری کے نمونے قصے میں اکثر و بیشتر مل جائیں گے۔ اشک نے بعض مقامات پر
مقامی الفاظ کا استعمال بھی بہت سلیقے سے کیا ہے۔

قصہ رضوان شاہ کی زبان پر ڈاکٹر عبادت بریلوی کا یہ تبصرہ بے حد جامع ہے:۔

"اس کا اسلوب اور انداز بیان کہیں کہیں مرصع ضرور ہے۔ کہیں
کہیں اس میں رنگینی اور پرکاری بھی اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی سادگی
اور روانی کا حسن بھی نمایاں نظر آجاتا ہے اور ان دونوں کے حسین اور متوازن
امتزاج نے اس داستان کو فنی اعتبار سے ایک شاہکار بنا دیا ہے"[2]

---

[1] قصہ رضوان شاہ (مطبوعہ) ص ۵۰۔

[2] مقدمہ قصہ رضوان شاہ (مطبوعہ) ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۲۲۔

(۱۱)

باغ وبہار

میرامن دلّی والے

باغ وبہار اپنے ماخذ کے سلسلے میں ایک طویل عرصے تک، شدید غلط فہمی کا شکار رہی ہے حالانکہ میرامن نے اپنی تالیف کی اوّلین اشاعت میں یہ واضح کر دیا تھا کہ:۔

"باغ وبہار تالیف کیا ہوا میرامن دلی والے کا۔ ماخذ اس کا نوطرز مرصع، کہ وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خاں کا ہے، فارسی قصہ چہار درویش" سے "

لیکن بعد کی اشاعتوں میں ناشرین نے سرورق کی یہ عبارت حذف کر دی۔ چنانچہ اسی ماخذ کی تلاش میں مولوی عبدالحق نے بڑی عالمانہ کاوش کی۔ مندرجہ بالا وضاحت کے بعد میرامن نے فارسی قصہ چہار درویش کے بارے میں جو تفصیلات فراہم کیں اس میں انہوں نے لکھا کہ ابتدا میں یہ قصہ امیر خسرو اپنے مرشد نظام الدینؒ اولیا کی علالت کے دنوں میں انکا دل بہلانے کے واسطے کہا کرتے تھے۔ جب حضرت نظام الدین کو شفا ہوئی تب انہوں نے دعا کی کہ جو کوئی اس قصہ کو سنے گا تندرست رہے گا۔ اسی وقت سے یہ قصہ فارسی میں رائج ہوا۔[1]

---

[1] باغ وبہار۔ میرامن مرتبہ ابوالخیر کشفی ص ۵،۔

یوں اوّل اوّل میرامن نے قصہ چہار درویش کو امیر خسرو سے منسوب کر کے ایک شدید قسم کی غلط فہمی کو راہ دی۔ ورنہ میرامن سے قبل یہ روایت نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ باغ و بہار کے ماخذ نو طرز مرصع میں بھی اس روایت کا ذکر نہیں ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے بہت سے داخلی اور خارجی شواہد کی بنیاد پر یہ ثابت کیا ہے کہ چہار درویش کا کوئی فارسی نسخہ بارہویں صدی ہجری سے پیشتر کا نہیں ملتا۔ فارسی نسخے میں خسرو سے بعد کے شعرار کے اشعار مندرج ہیں۔ قصے میں بعض ایسے نام شامل ہیں جو خسرو کے عہد میں رائج نہیں تھے۔ خسرو کی تصانیف میں نہ تو چہار درویش کا نام ملتا ہے اور نہ امیر خسرو اور حضرت نظام الدینؒ کے سوانحی حالات میں حضرت نظام الدینؒ کی علالت اور امیر خسرو کی داستان گوئی کا قصہ مذکور ہے۔[1] ان نکات سے واضح ہوتا ہے کہ امیر خسرو کا اس قصے سے کوئی تعلق نہیں۔

اس سلسلے میں حافظ محمود شیرانی کا یہ قیاس بھی بہت درست معلوم ہوتا ہے کہ میرامن نے قصہ کو اہم، مقبول اور جاذب توجہ بنانے کے لئے یہ بات تخلیق کر لی ہو۔ شیرانی صاحب کہتے ہیں:

> " مسلمانوں میں قصوں اور افسانوں کے متعلق ہر زمانہ میں تعصب رہا ہے۔ علمائے کرام مخرب اخلاق قصوں کے ہمیشہ مخالف رہے ہیں۔ فسانہ وامق و عذرا اور ویس و رامین اسی بنار پر ممنوع تھے اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر امیر خسرو کو اسکا مصنف بنا کر اور نظام الدینؒ اولیا سے تبریک دلوا کر مرتب قصہ نے اس کو مقبول عام بنانے کی غرض سے دروغ مصلحت آمیز والا حیلہ تراشا ہو۔ نیم مذہبی قصوں میں مصنفین قاری و سامع کو ثواب دارین کی بشارت اکثر دیا کرتے ہیں۔"[2]

---

[1] مقالات شیرانی۔ حافظ محمود شیرانی ص ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳۔ [2] مقالات شیرانی۔ حافظ محمود شیرانی ص ۵۸۔

قصہ چہار درویش اپنے عہد کا مقبول قصہ تھا۔ فارسی میں اس کے متعدد نسخوں کا ذکر ملتا ہے اور ان میں سے ہر نسخہ مختلف متن کا حامل ہے[1] چہار درویش کا ایک قابل ذکر نسخہ محمد احمد خلف شاہ محمد کا ہے۔ جو پہلی بار ۱۸۸۱ء میں مطبع حیدری سے شائع ہوا۔

اردو میں چہار درویش کے قصے پر مبنی تین نسخے ملتے ہیں:۔

۱۔ نوطرز مرصع ۔ تحسین ۱۱۷۵ء۔

۲۔ باغ و بہار ۔ میرامن ۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۲ء۔

۳۔ چہار درویش ۔ محمد غوث زریں ۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۲ء۔

باغ و بہار کا ماخذ نوطرز مرصع ہے لیکن باغ و بہار کے سارے واقعات نوطرز مرصع سے مماثلت نہیں رکھتے۔ بعض جگہ باغ و بہار نوطرز مرصع سے اختلاف کرتی ہے۔ دیگر شواہد کی نایابی کے باعث قیاس غالب ہے کہ جہاں اختلاف ہے وہاں میرامن نے چند واقعات اختراع کر لیئے ہیں۔

باغ و بہار کے ماخذ کے سلسلے میں میر احمد کے مطبوعہ نسخے سے متعلق غلط فہمی پائی جاتی ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تحسین کی نوطرز مرصع کے علاوہ میر احمد کا مطبوعہ نسخہ بھی میرامن کے پیش نظر تھا۔ اسی لئے جن جگہوں پر میرامن نوطرز مرصع سے اختلاف کرتے ہیں۔ وہاں وہ میر احمد کی روایت سے استفادہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے اسی بات کو یوں لکھا ہے:۔

"لیکن ایک بات اور بھی ہے میرامن نے صرف تحسین کی نوطرز مرصع ہی کو پیش نظر نہیں رکھا بلکہ مطبوعہ فارسی نسخہ چہار درویش مصنفہ

---

[1] اردو کی نثری داستانیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین ص ۱۶۸۔ ۱۶۹۔

میر احمد خلف شاہ محمد کو بھی پیش نظر رکھا ہے کیوں کہ باغ و بہار میں قصہ کے اجزاء

کی جو ترتیب ہے وہ اسی فارسی نسخے کے مطابق ہے البتہ کہانی کہنے کا ڈھنگ

اور عبارت نوطرز مرصع ہی کی سامنے رکھی ہے صرف اپنی ٹیٹھ ہندوستانی زبان

میں اسکا ترجمہ کر دیا ہے"[1]

اس خیال کا اعادہ ڈاکٹر موصوف نوطرز مرصع کے مقدمے میں جا بجا کرتے ہیں۔ حافظ محمود شیرانی کو

بھی ایسی ہی غلط فہمی ہے۔ وہ بھی باغ و بہار کو میر احمد کی چہار درویش کے بعد کی تالیف سمجھتے ہیں

اور امیر خسرو والی روایت کو بھی میر احمد سے ماخوذ بتاتے ہیں[2]۔ ڈاکٹر گیان چند جین اس قسم کی کسی

غلط فہمی کا شکار تو نہیں۔ لیکن میر احمد والے نسخے کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے باوجود وہ یہ کہنے سے

گریز نہ کر سکے کہ میر امن کے پیش نظر وہ فارسی نسخہ بھی تھا جس پر میر احمد کا نسخہ مبنی ہے[3]۔

میر احمد نے اپنے نسخے (پہلی اشاعت) کے دیباچے میں واضح طور سے لکھا ہے کہ انہوں نے

نسخے کی تالیف میں دیگر فارسی مخطوطات کے علاوہ اردو باغ و بہار سے بھی استفادہ کیا ہے[4]۔ اسکے

قطعی سنہ تالیف کا تو علم نہیں لیکن اتنا تو ظاہر ہی ہیکہ میر احمد کا نسخہ ۱۸۰۲ء کے بعد کا ہے۔ یہ پہلی بار

۱۸۴۶ء میں شائع ہوا[5]۔ ہمارے سامنے چہار درویش کے تمام فارسی نسخے نہیں ہیں۔ ان دیگر فارسی

---

[1] مقدمہ نوطرز مرصع۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ص ۴۳۔

[2] مقالات شیرانی۔ حافظ محمود شیرانی ص ۵۸۔

[3] اردو کی نثری داستانیں۔ گیان چند جین ص ۱۶۸۔

[4] باغ و بہار کے ماخذ سے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ از عظیم الشان صدیقی، ہماری زبان، ۲۴ اپریل سنہ ۱۹۶۴ء

بحوالہ اردو کی نثری داستانیں ص ۱۶۹۔ [5] اردو کی نثری داستانیں ص ۱۶۹۔

نسخوں سے متعلق بحث سے قطع نظر میر احمد کی اس وضاحت کے بعد کہ انہوں نے باغ و بہار سے استفادہ کیا ہے. باغ و بہار کے سلسلے میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ میر امن کے بعد میر احمد کے یہاں امیر خسرو والی روایت بھی اسی شکل و صورت میں مل جاتی ہے۔ اب اگر امیر خسرو والی روایت اور باغ و بہار کے واقعات میر احمد کے یہاں مل جاتے ہیں تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ میر امن نے میر احمد کا تتبع کیا ہے۔

ایسی صورت میں جبکہ فارسی قصہ چہار درویش کے تمام نسخے ہماری نظروں کے سامنے نہیں ہیں. ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ میر امن نے باغ و بہار میں جن مقامات پر نو طرز مرصع سے اختلاف کیا ہے. وہاں فارسی کے کسی نسخے کا تتبع کیا ہے. اس کے ثبوت میں ٹھوس دلائل بھی موجود نہیں ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میر امن نے باغ و بہار میں جن واقعات کا اضافہ کیا ہے وہ کہیں سے اخذ کردہ نہ ہوں بلکہ میر امن کی ذہنی افتاد کا نتیجہ ہوں۔

باغ و بہار کے سال تالیف کے ضمن میں میر امن کا ہی بیان مل جاتا ہے. وہ باغ و بہار کے اختتام پر ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۲ء) کے آغاز میں خاتمہ کتاب بتاتے ہیں[1] گنج خوبی کے دیباچہ میں بھی یہی سنہ مذکور ہے[2]

کالج کونسل کی کارروائیوں میں ۱۲ جنوری ۱۸۰۲ء کا گل کرسٹ کا ایک مراسلہ ملتا ہے جس سے یہ علم ہوتا ہے کہ باغ و بہار (چہار درویش) جنوری ۱۸۰۲ء میں ہرکارہ پریس میں زیر طبع تھی. اسوقت اس کے ۸۵ صفحات چھپ چکے تھے[3] بعد میں بعض وجوہ کی بنا پر کالج کونسل نے ان کتابوں کی

---

[1] باغ و بہار۔ میر امن مرتبہ ابوالخیر کشفی ص ۳۶۷،۳۶۸۔ [2] دیباچہ گنج خوبی (مطبوعہ ۱۸۴۶ء) میر امن ص ۶۔

[3] Proceedings of the College of for L william vol. 559 P. 45

طباعت روک دی تھی۔ چنانچہ زیر طبع کتابوں کے اجزا ر گل کرسٹ کی ہندی مینول (H I N DEE MANUAL) میں شامل کر لئے گئے تھے۔ باغ وبہار اس وقت تک مکمل نہیں ہوئی تھی بلکہ اسکا کچھ ہی حصہ تالیف ہوا تھا اور گل کرسٹ نے اسکے اتنے ہی حصے کو پریس میں دیدیا تھا۔ بقول میرامن اسے انہوں نے باعث عدم فرصت ۱۲۱۷ھ کے آغاز (تقریباً مئی ۱۸۰۲ء) میں مکمل کیا[1]۔ تاریخی نام باغ وبہار نکال کر اسے چہار درویش سے باغ وبہار بنادیا۔ یہ ۱۸۰۴ء میں ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی[2]۔ اسکا دوسرا ایڈیشن ۱۸۱۳ء میں غلام اکبر نے تھامس روبک کی نگرانی میں ترتیب دیا تھا[3]۔

باغ وبہار اپنی ہئیت کے اعتبار سے ایک داستان ہے۔ چنانچہ اس میں کسی نہ کسی شکل میں داستانوی عناصر کی کارفرمائی بھی موجود ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ داستانوی عناصر دیگر داستانوں سے مختلف شکل میں سامنے آتے ہیں۔ یہاں بھی داستان کا آغاز بادشاہ آزاد بخت کی لاولدی سے ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس ایک مسئلے پر بادشاہ ہفت خواں نہیں طے کرتا۔ باغ وبہار میں داستان در داستان کا انداز بھی نمایاں ہے۔ فوق الفطرت عناصر پر حالانکہ زور نہیں دیا گیا ہے تاہم انکی ہلکی سی جھلک مل جاتی ہے۔ مہم جوئی سے اگرچہ درویشوں کا کوئی واسطہ نہیں لیکن دو جگہ مہم جوئی کا بھی انداز ملتا ہے۔

---

[1] باغ وبہار۔ میرامن مرتبہ ابوالخیر کشفی ص ۳۴۷۔

[2] Annal of the College of F.W. Appendix P. 25

[3] " " " " " " " " " " " P. 26

اور Linguistic Survey of India, Vol. IX Part I P. 30

عام داستانوں کی طرح باغ وبہار کے پلاٹ میں وحدت مفقود ہے۔ اسمیں چار درویشوں کا قصہ مذکور ہے۔ باغ وبہار کا آغاز خالص داستانوی انداز میں بادشاہ آزاد بخت کی لاولدی سے ہوتا ہے۔ درمیان میں چار درویشوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ دو درویشوں کے بعد بادشاہ آزاد بخت ایک پانچواں قصہ خواجہ سگ پرست کا سُنا تا ہے ــــ باغ وبہار کا داستانوی رنگ دیگر داستانوں سے یوں بھی مختلف ہے کہ بادشاہ آزاد بخت قصے کے اختتام پر صاحبِ اولاد ہوتا ہے اور اس میں کسی فقیر یا کسی عامل کی دعا کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ آزاد بخت قصے کا ہیرو بھی نہیں ہے۔ باغ وبہار کا نہ تو بنیادی قصہ ہی عشق پر مبنی ہے اور نہ ہی آزاد بخت کی زندگی میں عشق کا گزر ہے۔ آزاد بخت کے قصے کو ابتدار اور انتہا سے ملا دیا گیا ہے۔ پلاٹ کے اس انتشار کا ذمہ دار ہم میرامن کو نہیں قرار دے سکتے۔ اول تو داستانوں کی روایت ہی یہی ہے۔ دوم یہ کہ باغ وبہار میرامن کی طبع زاد داستان نہیں ہے اس لئے وہ داستان کے دروبست سے بری ہیں۔ ہاں باغ وبہار میں جہاں داستانوی عناصر کی شکل واضح نہیں ہے وہاں وہ داستانوں کے روایتی انداز سے مختلف ہو جاتی ہے اور دو چار قدم آگے بڑھ کر ناول کا سا انداز پیش کرتی ہے۔

باغ وبہار کے کردار اتنے بھرپور ہیں کہ میرامن نے گویا زندہ تصویریں پیش کی ہیں۔ وہ کردار نگاری میں جزئیات اور واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ بڑی واضح تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ چار درویشوں کی حیات اور کردار میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ چاروں شہزادے، دولت وحشمت کے مالک، عشق کے ستائے اور زندگی سے عاجز ہیں۔ ان چاروں نے خودکشی کی کوشش کی ہے لیکن عین وقت پر غیبی امداد سے بچ کر بارہ برس بعد ملک شہپال کی مدد سے ان سب کی محبوباؤں کی بازیافت ہوتی ہے۔

ان درویشوں کے کردار میں بڑی حد تک یکسانیت ہے۔ ان کے کردار میں نہ تو رفعت ہے

اور نہ کوئی وقار۔ ان میں سے ہر ایک نے محبوب کے وصال کو اپنی زندگی کا اہم مقصد سمجھ رکھا ہے۔ اور اسکے حصول میں نہ انکو اپنی انا کا خیال ہے اور نہ خود داری کا۔ محبوب کے وصال کے بعد جب یہ کسی نہ کسی افتاد کے تحت ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں تو انکی نگاہوں میں دنیا تاریک ہو جاتی ہے۔ اور موت کو آخری منزل سمجھ لیتے ہیں۔ اور غیبی مدد کے بعد درویشی اختیار کر لیتے ہیں۔ ان درویشوں کے کردار میں نہ کہیں بہادری کی تصویریں ہیں اور نہ جوانمردی کے مرقعے۔ یہ ضرور ہے کہ انمیں سے ہر کردار اپنی معاشرت اور ماحول کی ترجمانی کرتا ہے۔ تاہم شہزادوں کے کردار میں شہزادگی کے وصف مفقود ہیں۔ یہ عشق کے تیر سے زخمی ہونے کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور نیش عشق کے بعد کسی کام سے انکا واسطہ نہیں رہ جاتا۔ خوشامد، انکساری، لجاجت اور عاجزی انکا شیوہ ہے۔ دوسرے درویش نے نیم روز کے شہزادے کا اسرار معلوم کرنے کے لئے اور چوتھے درویش نے جنوں کے بادشاہ ملک صادق کے لئے جو نام نہاد مہم سر کی ہے اسے مہم کہنا بھی بے جا ہے۔

باغ و بہار کے ذیلی قصوں میں بھی مردوں کے کردار عام طور سے امیرزادوں سے عبارت ہیں۔ یہ بھی عشق کے ہاتھوں تباہ اور بے عمل قسم کا کردار پیش کرتے ہیں۔ باغ و بہار کے بیشتر کردار مذہب کے تابع اور تقویٰ گزار ہیں۔ ان میں سے خواجہ سگ پرست اور آذربائیجان کا نوجوان اپنی محبوبہ کو دائرۂ اسلام میں داخل کرتے ہیں۔ میرامن نے اس داستان میں تبلیغ مذہب کے کسی موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

خلوت کا ذکر کسی نہ کسی انداز میں تقریباً ہر کردار کے ضمن میں موجود ہے۔ شاید میرامن نے اپنے قارئین کو ہر طرح سے تلطف کا سامان بہم پہنچانے کا ارادہ کر لیا تھا چنانچہ انکو جہاں جیسے اور جس انداز میں موقعہ ملا ہے وہ دو چار حرف لکھنے سے گریز نہیں کرتے۔

مردانہ کرداروں کے برعکس باغ و بہار کے چند ایک نسوانی کرداروں میں انفرادیت بھی

ہے اور حسن بھی۔ میرامن نے ان کرداروں کا ایک ایک نقش نمایاں کرنے میں فنی جابکدستی اور باریک بینی کا ثبوت دیا ہے۔ داستان میں کل تین کردار ایسے ہیں جو کچھ دیر تک ہماری نظروں کے سامنے رہتے ہیں۔ اول پہلے درویش کی سیر میں دمشق کی شہزادی۔ دوم بادشاہ آزاد بخت کی داستان والی وزیر زادی اور سوم خواجہ سگ پرست کی داستان میں سراندیپ کی شہزادی ـــــ یہ تینوں کردار اپنے ماحول اور معاشرت کی مکمل ترجمانی کرتے ہیں۔ اور بہت تیز اور باعمل نظر آتے ہیں۔

دمشق کی شہزادی کے کردار میں غرور بھی ہے اور برتری کا احساس بھی۔ رکھ رکھاؤ بھی ہے اور وقار بھی۔ لیکن ابتدا میں وہ اپنے کردار سے ہمیں ہرگز متاثر نہیں کرتی۔ وہ اپنے ملازم لڑکے کے عشق میں گرفتار ہوتی ہے اور اس کیلئے کچھ بھی کر گزرنے سے گریز نہیں کرتی۔ حالانکہ یہ ایک شہزادی کے شایان شان ہرگز نہیں۔ شہزادی کے کردار کا بہت عمدہ نمونہ ہمیں پہلے درویش کے ذیل میں ملتا ہے۔ یہاں وہ مکمل طور سے شہزادی ہے اور ناز و نخوت، شاہانہ تمکنت۔ احساس جاہ اور خودداری کی زندہ تصویر ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:ـ

"......... یہ سن کر تیکھی ہو، تیوری چڑھا کر خفگی سے بولی یہ خوش! آپ ہمارے عاشق ہیں؟ مینڈکی کو بھی زکام ہوا۔ اے بیوقوف! اپنے حوصلے سے زیادہ باتیں بنانیں۔ خیال خام ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ بس چپ رہ، یہ نکی بات چیت مت کر۔ اگر کسی اور نے یہ حرکت بے معنی کی ہوتی، پروردگار کی سوں اسکی بوٹیاں کتوا چیلوں کو بانٹتی، پر کیا کروں؟ تیری خدمت یاد آتی ہے۔ اب اسی میں بھلائی ہے کہ اپنی راہ لے۔ تیری قسمت کا دانا پانی ہماری سرکار میں یہیں تک تھا۔"[1]

---

[1] باغ و بہار۔ میرامن مرتبہ ابو الخیر کشفی ص ۱۲۰، ۱۲۱۔

وزیر زادی کمسن سہی لیکن اپنے کردار و عمل اور رفتار و گفتار سے غیر معمولی طور پر سمجھ دار، دانشمند، مصلحت بیں، دور اندیش، باہمت اور جری ہے۔ وہ حسن صورت اور حسن سیرت دونوں کی مالک ہے۔ سراندیپ کی شہزادی پر ہندوستانی ماحول کا گہرا اثر ہے۔ وہ بے حجاب گھومتی ہے۔ بے پناہ حسن کے ساتھ وہ سنگدلی، نرمی اور گداز جیسے متضاد جذبات کی حامل ہے۔ اس کے دل میں بڑے بت کا خوف ہے۔ لیکن خواجہ جب کلمہ پڑھواتا ہے تو وہ اتنے ہی صدق دل سے اسلام قبول کر لیتی ہے اور خواجہ کے لئے جذبۂ وفاداری اخیر دم تک نبھاتی ہے۔

دیگر نسوانی کرداروں میں دوسرے درویش کی محبوبہ، بصرہ کی شہزادی، تیسرے اور چوتھے درویش کی محبوباؤں کے کردار میں نہ کوئی تازگی ہے اور نہ حرکت۔ یہ حسن میں بے مثال ضرور ہیں مگر انمیں کوئی اور بات بے مثال نہیں۔ ان کے علاوہ ضمنی کرداروں میں سب سے جیتا جاگتا کردار پہلے درویش کی بہن کا ہے۔ وہ اپنے رفتار و گفتار اور حرکت و عمل سے ایک مثالی بہن کو داستان کے صفحات پر زندہ کر گئی ہے۔ نیز تیسرے درویش کے سیر کی کٹنی۔ جو شہزادی کی تلاش میں نکلی اور مر کر ایک ایک جملے سے ذہن پر اپنا نقش چھوڑ گئی:-

"۔۔۔۔۔۔۔ الٰہی تیری نتھ جوڑی سہاگ کی سلامت رہے اور کماؤ پگڑی قائم رہے۔ میں غریب رنڈیا نقیرنی ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"[۱]

زیر باد کی کنیا اپنے مختصر سے کردار میں گوارہ ہے۔ وہ ہندوستانی تہذیب کی نمائندہ ہے لیکن بعد میں اسلام قبول کر لیتی ہے۔ میرامن کے مسلم نسوانی کردار مذہب کے پابند ہیں۔

باغ و بہار میں جغرافیائی غلطیاں موجود ہیں۔ میرامن جن ملکوں کا ذکر کرتے ہیں وہ نہ صرف

---

[۱] باغ و بہار۔ میرامن مرتبہ ابوالخیر کشفی ص ۳۲۵۔

وہاں کے رسم و رواج اور تہذیب سے نا واقف ہیں بلکہ انہیں جغرافیائی محل وقوع سے بھی واقفیت نہیں۔ ان کو ملکوں کے نام گنانے کا شوق ہے۔ اسی شوق میں وہ سراندیپ، زیر باد، قسطنطنیہ، بخارا، فارس، یمن، دمشق، آذربائیجان، بصرہ، نیشاپور، ترکستان، چین، فرنگ اور روم کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن وہ اسلامی اور غیر اسلامی ممالک میں بھی تفریق نہیں کر سکے۔ روم کا ذکر کر رہے ہوں یا فرنگ کا ہر ایک جگہ پر ہندوستانیت کا رنگ غالب ہے۔

گارسن دی تاسی "باغ و بہار" سے بہت متاثر تھا۔ وہ باغ و بہار پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

"جیسا کہ اکثر مشرقی کتابوں میں پایا جاتا ہے اس قصے میں کئی اور قصے شامل ہیں اور (ORDANDO FURIOSO) کی طرح قصے کا انجام عام ہے جس میں قصے کے تمام خاص اشخاص شریک ہیں۔ یہ کتاب کئی شخصیتوں کی عجیب و غریب آپ بیتیوں کا مجموعہ ہے۔ جن میں عجائب نگاری کی شان ہر جگہ پائی جاتی ہے اور باوجود بار بار اعادہ کے اہلِ مشرق اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ مگر اسے درحقیقت اکثر اوقات قصوں کا لطف کم ہو جاتا ہے لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ قصہ اسلامی روایات پر مبنی ہے جو دل و دماغ کے لئے زیادہ قابل قبول اور لطف آمیز ہیں ....

اس کتاب کے پڑھتے وقت آپ بہت مفید اور کارآمد بات یہ پائیں گے کہ ان قصوں میں ہر صفحہ پر آپ کو قومی خصوصیات کے متعلق ایسی باتیں ملیں گی جو ہمیں اصلی ہندوستان اور خاص کر اسلامی ہندوستان کے سمجھنے میں بہت کارآمد ہوں گی۔ اس قسم کی باتیں قصے کے ہر صفحے میں پائی جاتی ہیں۔ اور اس میں

شک نہیں کہ بعض جگہ بعض جوش اور ظلم کی کارستانیاں اس ناگوار طریقہ سے
بیان کی گئی ہیں کہ وہ حصے کسی قدر خلاف قیاس معلوم ہوتے ہیں لیکن بہت سے
حصے ایسے ہیں کہ انکا وجود بڑی خوبصورتی سے نبھایا گیا ہے۔ اور درحقیقت
بہت دلچسپ ہیں۔[۱]

باغ و بہار کا سب سے بڑا حسن اسکی زبان ہے۔ یہ زبان میرامن نے اس عہد میں لکھی جب انشا رپردازی کا طلسم مکمل طور سے نہیں ٹوٹا تھا۔ فارسی لکھنا اور عبارت آرائی کا کمال دکھانا علیت اور قابلیت کا معیار سمجھا جاتا تھا۔ میرامن نے باغ و بہار میں خالص نثر لکھی ہے۔ انہوں نے باغ و بہار میں جو زبان استعمال کی اس پر اس عہد میں شدید نکتہ چینیاں کی گئیں لیکن یہ وہی زبان ہے جس پر آج کی نثر کا ایوان تعمیر ہوا۔

باغ و بہار کی زبان کے بارے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکھا ہے:۔

"باغ و بہار اپنے وقت کی نہایت فصیح و سلیس زبان میں لکھی گئی
ہے۔ میرامن خاص دلّی کے رہنے والے ہیں اور انکی زبان ٹھیٹ دلّی کی زبان ہے
اور انکا لکھا سند ہے..................اردو کی پرانی کتابوں میں کوئی کتاب
زبان کی فصاحت اور سلاست کے لحاظ سے اس سے لگا نہیں کھاتی۔"[۲]

کلیم الدّین لکھتے ہیں:۔

"........یہ سادگی سپاٹ نہیں۔ یہاں ناگوار زیرنگی نہیں۔ یہاں
"سادگی و پرکاری" بیک وقت جمع ہیں..........میرامن کی عبارت میں ایک

---

[۱] خطبات گارساں دی تاسی۔ مرتبہ عبدالحق ص ۴۲، ۴۳۔

[۲] مقدمہ باغ و بہار۔ مولوی عبدالحق ص ۱۲، ۱۳۔

خاص آہنگ ہے جسے موسیقیت یا وزن سے کوئی سروکار نہیں. جملوں کی ساخت، ترتیب اور حرکت میں باریک تناسب اور جاذبیت ہے"[1]

سید وقار عظیم کی رائے ہے:۔

"........میر امن کی سادگی، سلاست اور فصاحت میں دلی کی گلیوں میں رہنے بسنے اور وہاں کی محل سراؤں اور قلعۂ معلیٰ کی شہ نشینوں میں پرورش پانے والی روایت کی سجاوٹ اور رچاؤ بھی ہے. اور ان کے رنگ طبیعت کی لطافت اور ستھرا پن بھی اور یہی وجہ ہے کہ نہ اس سلاست و فصاحت کا زور کم ہوتا ہے. نہ اس کا رنگ پھیکا پڑتا ہے. اور ہر زمانے کا پڑھنے والا اس کی سادہ پرکاری سے متأثر ہوتا ہے"[2]

میر امن کی نثر کے بارے میں یہ مختلف آرا ان کی زبان کے خدوخال کو واضح کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں. خود میر امن اپنی زبان کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں:۔

"........اور جو شخص سب آفتیں سہہ کر دلی کا روڑا ہو کر رہا اور دس پانچ پشتیں اسی شہر میں گزریں اور اس نے دربار امراؤں کے اور میلے ٹھیلے، عرس، چھڑیاں، سیر تماشا اور کوچہ گردی اس شہر کی مدت تلک کی ہوگی اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا اسکا بولنا البتہ ٹھیک ہے. یہ عاجز بھی ہر ایک شہر کی سیر کرتا اور تماشا دیکھتا یہاں تلک پہنچا ہے"[3]

---

[1] اردو زبان اور فن داستان گوئی۔ کلیم الدین احمد ص ۱۵۴، ۱۵۵۔ [2] ہماری داستانیں۔ سید وقار عظیم ص ۳۱۔

[3] دیباچہ باغ و بہار۔ میر امن مرتبہ ابوالخیر کشفی ص ۸۔

میرامن کے زبان کی سادگی اور سہل ممتنع کسی خاص مقام یا کسی خاص "سیر" میں جلوہ گر نہیں ہوئی ہے بلکہ وہ شروع سے اخیر تک جاری وساری ہے۔ انکے دسترس میں سہل اور عام فہم الفاظ کا ایک وسیع ذخیرہ ہے۔ اور اس ذخیرے کے سہارے وہ واقعات بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور ہر واقعے کی مکمل اور بھرپور تصویریں پیش کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے الفاظ اور مترنم جملے ہیں۔ ان میں نہ کہیں بناؤ ہے اور نہ مصنوعیت۔ یہ نظر سے گزر کر ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔ زبان کی ایک تصویر ملاحظہ فرمایئے:۔

" .... آگے ملک روم میں کوئی شہنشاہ تھا کہ نوشیرواں کی سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت اسکی ذات میں تھی۔ .... اس کے وقت میں رعیت آباد، خزانہ معمور، لشکر مرفہ، غریب غربا آسودہ ایسے چین سے گزران کرتے اور خوشی سے رہتے کہ ہر ایک گھر میں دن عید اور رات شب برات تھی اور جتنے چور چکار، جیب کترے، صبح خیزے، اٹھائی گیرے، دغا باز تھے سب کو نیست ونابود کر کر نام ونشان انکا اپنے ملک بھر میں نہ رکھا تھا۔ ساری رات دروازے گھروں کے بند نہ ہوتے اور دکانیں بازار کی کھلی رہتیں۔ راہی مسافر جنگل میدان میں سونا اچھالتے چلے جاتے کوئی نہ پوچھتا تمہارے منھ میں کے دانت ہیں اور کہاں جاتے ہو"[1]

باغ وبہار کی سلاست اور سادگی کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ یہ کہیں بے روح اور بے جان نہیں ہے۔ اس میں سوقیت اور ابتذال بھی نہیں۔ میرامن نے سادگی میں ایک خاص سطح کی پاس داری کی ہے۔ باغ وبہار کے اسلوب کا یہ وصف صرف باغ وبہار کا ہی نہیں بلکہ اس میں میرامن کے مزاج اور انکی شخصیت کا پرتو نمایاں ہے۔

---

[1] باغ وبہار۔ میرامن مرتبہ ابوالخیر کشفی ص ۷۹، ۸۰۔

میرامن کی زبان دلی کے روزمرہ اور محاورہ کی نمائندہ زبان ہے۔ اس کے کتنے محاورے آج بھی اسی شکل وصورت میں رائج ہیں۔ میرامن نے فارسی اور عربی کے الفاظ کی بجائے ہندی کے نرم اور شیریں الفاظ کا بڑا مناسب اور برمحل استعمال کیا ہے۔ انکے استعمال سے نہ صرف عبارت کے حسن میں اضافہ ہوا ہے بلکہ قاری کے ذہن پر بھی بڑا خوشگوار اثر مرتب ہوتا ہے۔ ان میں سے کوئی لفظ ایسا نہیں جو عام فہم اور سریع الفہم نہ ہو۔ ہندی الفاظ کا استعمال ملاحظہ ہو :۔

"............ میں کنیا زیرباد کے دیس کے راجہ کی بیٹی ہوں۔

.... میرے پتا کے منتری کا بیٹا ہے ایک روز مہاراج نے اگیا دی کہ ...."[1]

میرامن نے نہ تو تشبیہات اور استعارات کے دریا بہائے ہیں اور نہ انوکھی مثالیں تلاش کرکے لائے ہیں۔ انہوں نے تو آس پاس کے ماحول ہی سے جو کچھ اخذ کرنا تھا کر لیا اور پھر بڑی دیانت داری سے اپنے قاری تک پہنچا دیا۔ یہاں نہ ذہنی کاوشیں ہیں اور نہ مغز پاشیاں۔ میرامن نے مروجہ الفاظ اور عوامی کہاوتوں کا کھل کر اور برمحل استعمال کیا ہے۔ یہاں بول چال کی زبان اپنے نقطۂ [illegible] کو پہنچ گئی ہے۔ جملوں کی ساخت، الفاظ کی باہمی ترتیب، حسن تناسب اور حسن انتخاب نے [illegible] کی فضا کو ہر جگہ قائم رکھا ہے۔

میرامن کے اسلوب میں بڑی مناسب اور متوازن روانی ہے [illegible] کو کھو کر ختم کرتے ہیں اور نہ ٹھہر ٹھہر کر سست رفتاری سے۔ اسلوب [illegible] نے [illegible] میں اضافہ کر دیا ہے۔ وہ ہر مقام و ہر کردار اور ہر باتوں کی [illegible]

---

[1] باغ وبہار۔ مرتبہ ابوالخیر کشفی ص ۲۵۳۔

کرتے ہیں۔ انکو فضا اور واقعے کی تخلیق کا سلیقہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنے اسلوب کے سہارے آگے بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ واقعے کے لحاظ سے ان کے اسلوب میں تغیر آتا جاتا ہے۔ انہوں نے سراپا نگاری، منظر نگاری اور جزئیات نگاری بہت ہی سادہ انداز میں کی ہے۔

باغ وبہار میں میرامن نے دہلوی معاشرت کی بڑی زندہ تصویریں پیش کی ہیں۔ اور یہ تصویریں میرامن کے علاوہ اور کون پیش کر سکتا تھا جس نے شاہی عہد کو برتا تھا اور اس کے ایک ایک رمز کو سمجھا تھا۔ دہلوی معاشرت کی مرقع نگاری کو میرامن نے جزئیات سے مالا مال کر دیا ہے۔ سامانوں کا بیان ہو کہ کھانوں کا، عہدوں کا ذکر ہو کہ دیگر تفصیلات کا میرامن کا قلم نام گناتے نہیں تھکتا۔

میرامن نے شعوری طور پر انشا نگاری نہیں کی ہے بلکہ انہوں نے نفس مضمون کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اسلوب اور اپنی داستان دونوں سطح پر کامیاب ہیں۔ نثر میں میرامن کے مقام کو متعین کرنے میں یہ رائے بڑی جامع ہے:۔

"میرامن کا نثر میں وہی مرتبہ ہے جو میر کا غزل گوئی میں"

باغ وبہار کی زبان پر تبصرہ کرتے ہوئے گارسن دی تاسی کہتا ہے:۔

"حضرات اس کتاب میں آپ اس زبان کا مطالعہ کریں گے جو ہندوستانی کہلاتی ہے اور اس میں آپ ان الفاظ کو نہیں پڑھیں گے جنکا کوئی مفہوم نہیں۔ بلکہ ایسے الفاظ دیکھیں گے جو ان اشیاء کا مفہوم بتاتے ہیں جو بہت دلچسپ ہیں۔ اور جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے آپ اسکے علاوہ ایک اور بات بھی پائیں گے اور وہ یہ ہے کہ اس کے الفاظ خیالات کی نیابت کرتے ہیں کیونکہ ان کا تجزیہ کرنے سے ہم ان مادوں تک پہنچتے ہیں جو انڈو یورپین زبانوں کے

ایک بہت بڑے مجموعہ کی کنجی ہیں اور خود ہماری زبان بھی انہیں میں شامل ہے اور در حقیقت ہندوستانی کی ایک بہن ہے۔[1]

باغ و بہار کے بعض بے ربط جملوں کو شیر علی افسوس نے مربوط کیا تھا۔[2]

باغ و بہار سول ملٹری عہدہ داروں کے نصاب میں شامل تھی۔

۱۲

چار گلشن

بینی نرائن جہاں

بینی نرائن نے منشی امام بخش کی تحریک پر ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں چار گلشن تصنیف کی۔ اور کپتان ٹیلر کے وسیلے سے کالج کونسل کے سامنے پیش کیا۔ اس پر جہاں کو ساٹھ روپے بطور انعام ملے تھے۔[3]

چار گلشن میں شاہ کیواں اور شہزادی فرخندہ کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس قصے کو گارسن دی تاسی[4] اور کریم الدین[5] نے فارسی قصہ شاہ درویش (نظم ہلالی) سے ماخوذ قرار دیا ہے

---

[1] خطبات گارساں دی تاسی۔ مرتبہ عبدالحق ص ۴۳، ۴۴۔ [2] دیباچہ آرائش محفل (ق۔ن) شیر علی افسوس ورق ۳۔

[3] فورٹ ولیم کالج (ہندی) لکشمی ساگر وارشنے ص ۱۰۴۔ [4] خطبات گارساں دی تاسی ص ۱۵۱۔

[5] طبقات شعرائے ہند۔ کریم الدین و فیلن، طبقہ سوم ص ۶۳۔

لیکن بلوم ہارٹ نے اسکی تردید کردی ہے۔ اسکا کہنا ہے کہ چار گلشن کا قصہ شاہ درویش سے بالکل مختلف ہے[1]۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی بھی یہی لکھتے ہیں کہ جہاںؔ نے اس کہانی کو فارسی کی کسی خاص داستان کو سامنے رکھ کر نہیں لکھا ہے[2]۔ لیکن سید محمد نے اس قصے کو کسی قدیم فارسی قصے سے منسوب کیا ہے[3]۔

بینی نرائن نے چار گلشن کے دیباچے میں اس داستان کے متعلق جو معلومات بہم پہنچائی ہیں اس سے علم ہوتا ہے کہ یہ کہانی ان کو بہت دنوں سے یاد تھی۔ ایک دن انہوں نے منشی امام بخش کے روبرو بیان کی۔ منشی صاحب کو یہ قصہ اتنا پسند آیا کہ انہوں نے جہاںؔ کو اسے لکھنے پر اکسایا۔ چنانچہ انہیں کی تحریک پر جہاںؔ نے اس قصے کو سپرد قلم کیا :-

" ....اب کہ سن ایک ہزار اور دو سو اور پچیس (۱۲۲۵) ہجری ہیں عہد دولت میں نواب ....گورنر جنرل .... لارڈ منٹو صاحب بہادر دام اقبالہ کے ایک دن اس کہانی کو کہ بہت دنوں سے اس گنہگار کو یاد تھی، برسبیل مذکور کے روبرو منشی صاحب مہربان معدن لطف واحسان منشی امام بخش صاحب کے بیان کیا۔ منشی صاحب ممدوح اس کہانی کے سننے سے نہایت محظوظ ہوئے اور مسجد ہو لئے (کذا) اس عاصی کو فرمایا کہ اس قصہ لطیف اور کہانی نادر کو قلم زبان سے زبان قلم میں لائے۔ اور زبان ریختہ ہندی میں اوپر صفحہ کاغذ کے لکھئے اور جناب مستطاب میں صاحب والا مناقب یعنے کپتان ٹیلر

---

[1] فہرست مخطوطات برٹش میوزیم لندن۔ بلوم ہارٹ ص ۳۱۹ بحوالہ مقدمہ چار گلشن مرتبہ عبادت بریلوی ص ۴۲۔

[2] مقدمہ چار گلشن (مطبوعہ) ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۴۵۔ [3] ارباب نثر اردو ص ۲۸۹۔

صاحب بہادر دام دولتہ کے گزرانئے کہ .... اس کے سننے سے وہ جتنا
محظوظ ہو دیں اور بسبب اس قصے کے نام آپ کا بھی ورد زبان رہے۔ سو
اس عاصی نے بموجب فرمانے منشی صاحب موصوف کے جو کہ عقل ناقص میں
آیا قلم زبان سے زبان قلم میں حوالہ کیا۔[1]

قیاس کہتا ہے کہ یہ کہانی انھوں نے کسی سے سنی یا پڑھی ہو گی لیکن ظاہر ہے کہ لکھتے وقت انکے سامنے کوئی کتاب نہیں تھی۔ صرف یادداشت کی بنا پر انھوں نے یہ کہانی سپرد قلم کی۔ اس لئے اسے کسی بھی داستان سے مکمل طور پر ماخوذ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر اس میں شاہ درویش یا دیگر داستانوں کے اجزا بھی موجود ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن جب کہ بلوم ہارٹ نے اس بیان کی تردید کر دی ہے کہ بینی نرائن کا یہ قصہ فارسی کی شاہ درویش سے ماخوذ ہے۔ ہمیں مصنف کے اس بیان پر یقین کر لینے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ اس نے یہ قصہ اپنی عقل کے مطابق سپرد قلم کیا۔

بینی نرائن کا یہ قصہ طبع نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کو برٹش میوزیم لندن میں چار گلشن کا ایک نسخہ دریافت ہوا۔ یہ نسخہ نوٹے اوراق پر مشتمل ہے۔ اسے انھوں نے مقدمے کے ساتھ ۱۹۶۲ء میں کراچی سے شائع کر دیا ہے۔[2] پیش لفظ میں ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں:۔

"خیال یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں اس دلچسپ داستان کا صرف
یہی ایک قلمی نسخہ ہے۔ کریم الدین نے یہ معلومات فراہم کی ہے۔ اس کا

---

[1] دیباچہ چار گلشن (ق۔ ن) بینی نرائن جہاں ورق ۳-۴۔

[2] یہی چار گلشن کا پہلا ایڈیشن ہے۔

قلمی نسخہ فورٹ ولیم کالج کے کتب خانے میں تھا جو بعد میں ایشیاٹک سوسائٹی کے
کتب خانے میں منتقل کر دیا گیا لیکن اب یہ نسخہ نایاب ہے۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی
لندن کے کتب خانے میں اسکا کوئی نسخہ موجود نہیں۔ ہو سکتا ہے کلکتہ میں رہ گیا ہو۔
لیکن اب یہ نسخہ ظاہر ہے کہ ہماری دسترس سے باہر ہے"[1]

ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں مذکورہ نسخہ موجود ہے۔ یہ ۹۲ اوراق کو محیط ہے۔ راقم الحروف نے
اس نسخے سے استفادہ کیا ہے۔

چار گلشن کے قصے میں شاہ کیواں ایک فقیر سے حاصل کی ہوئی تین باتوں پر عمل کرکے "بادشاہ زادی" اور وزیر زادی کو انکی بدکرداریوں کی بنا پر قتل کر دیتا ہے۔ ان دونوں کی بے سر لاشیں کوتوالی کے چبوترے پر پڑی تھیں۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ جو کوئی ان پر جو کچھ کہے وہ لکھ کر بادشاہ تک پہنچایا جائے۔ اسی اثنا میں بادشاہ بیدار بخت کی لڑکیاں دل آرام، دل رُبا، زیب النسا اور فرخندہ مردانہ پوشاکوں میں ادھر سے گزریں۔ اور ان لاشوں پر رائے زنی کرنے لگیں۔ بادشاہ کے ملازموں نے ان کی تفصیلات درج کرکے بادشاہ کو بھیجیں۔ ان لڑکیوں کی دانشمندانہ آرا سے مطلع ہو کر بادشاہ کو انہیں حاصل کرنیکا اشتیاق ہوا۔ چنانچہ وہ ان سے شادی کرکے ان کی باتوں کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہے۔ تین لڑکیاں اسے اپنی باتوں کی حقیقت بتا دیتی ہیں لیکن چوتھی لڑکی فرخندہ بادشاہ کے سامنے شرط رکھتی ہے کہ بادشاہ اسکے پلنگ کے گرد چالیس گھڑے پانی سے چھڑکاؤ کرے تب وہ بادشاہ کو اپنی بات سمجھائے گی۔ اس شرط کے باعث فرخندہ پر بادشاہ کا عتاب نازل ہوتا ہے۔ بادشاہ تین شرطوں کے ساتھ اسے سال بھر کیلئے ایک گنبد میں قید کر دیتا ہے۔ فرخندہ طرح طرح کی ترکیبیں لگا کر بادشاہ کی ساری شرطوں کو پورا کرتی ہے۔

---

[1] مقدمہ چار گلشن۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۴۔

اور اپنی بات بھی بادشاہ کو سمجھاتی ہے چنانچہ بادشاہ اس سے معافی مانگتا ہے اور دونوں ہنسی خوشی رہنے لگتے ہیں۔

جہاں نے چار گلشن کے اس قصے کا پلاٹ بڑی چابکدستی سے بُنا ہے۔ آغاز میں فقیر سے تین باتیں خریدنے اور بادشاہ زادی اور وزیر زادی کے قتل کے واقعات بظاہر تو اصل قصے سے الگ معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل بنیادی کہانی کا ان واقعات سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ بقیہ واقعات اور کردار بھی اس بنیادی کہانی کو انجام تک پہنچانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ جہاں کا یہ قصہ بہت مربوط ہے۔ واقعات پر انکی گرفت بہت مضبوط ہے۔ درمیان میں جتنے بھی واقعات رونما ہوتے ہیں وہ اصل قصے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کوئی تبدیلی یا کوئی واقعہ بے محل اور غیر متعلق نہیں۔ چار گلشن اپنی ہیئت اور خدوخال میں قصہ یا کہانی کی صف میں شمار کی جا سکتی ہے۔ اس میں داستانوں کا سا روایتی انداز تو ملتا ہے لیکن یہ داستان کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ جاوید نہال لکھتے ہیں:۔

> "چار گلشن میں بھی اس عہد کی دوسری طویل عشقیہ داستانوں کی طرح عجیب و غریب کردار، طلسمی فضا اور مشکوک ماحول اور مافوق العادت خصوصیات اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہیں"[1]

لیکن قصے میں نہ تو طلسمی فضا ہے اور نہ مشکوک ماحول اور نہ کرداروں میں مافوق العادت خصوصیات ہی پائی جاتی ہیں۔ مہم جوئی اور جادوگر و ساحر وغیرہ یہاں ناپید ہیں۔ داستانوں میں عموماً ایسی عمارتوں کا بھی ذکر آتا ہے جو مافوق الفطرت عناصر کے زیر اثر ہوتی ہیں اور کوئی باہمت اور جری کردار اسکے طلسم کو نیست و نابود کر کے سارے عناصر کو اپنے قابو میں کر لیتا ہے۔ اس قصے کے درمیان میں گنبد کا

---

[1] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب۔ جاوید نہال ص ۲۶۳۔

ذکر ضرور آیا ہے لیکن یہ طلسماتی گنبد نہیں کہ اس کے لئے کوئی معرکہ در پیش آئے۔ یہ اگر گنبد کی بجائے کوئی کمرہ ہوتا تو اس سے بھی کام چل سکتا تھا۔ اس کے علاوہ قصے کی ہیروئن فرخندہ بادشاہ کی شرطوں کو پورا کرنے کے لئے جن مراحل سے گزرتی ہے اسے مہم جوئی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ تو فرخندہ کی ذہانت اور دور رسی کے مظاہر ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات داستانوں میں مہم جوئی کسی شہزادے یا مرد کردار کا ہی حصہ رہی ہے۔ اسے کسی نسوانی کردار نے شاذ ہی انجام دیا ہوگا۔ چار گلشن کے قصے میں طوالت اور پیچیدگی بھی نہیں ملتی۔ یہ تو سیدھا سادا قدرے مختصر سا قصہ ہے جو بغیر ذہن و دماغ کو تھکائے چند خوشگوار تاثرات دے کر ختم ہو جاتا ہے۔

شاہ کیواں اپنے کردار اور خیالات و عمل میں روایتی سخت گیر اور عیش پسند بادشاہ ہے۔ فرخندہ کو اپنی بات کی حقیقت نہ بتانے کی بنا پر گنبد میں مع شرطوں کے قید کر دینا اسکی سخت گیری کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ فرخندہ کو مختلف شکلوں میں دیکھ کر وصل کے لئے بیتابی اس کی عیش کوشی کی غماز ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں داستانوں اور کہانیوں کے بادشاہوں کی یہی فطرت ہی ہوا کرتی تھی۔

اس قصے کا سب سے اہم کردار فرخندہ ہے۔ وہ حسین ہونے کے علاوہ فہم و ذکاوت کا پیکر ہے۔ وہ سخت سے سخت آزمائش سے اپنی ذہانت کی بنا پر ہی گزر جاتی ہے۔ اسے بادشاہ کا عتاب منظور ہے لیکن وہ اپنی بات پر اسقدر ثابت قدم رہتی ہے کہ بادشاہ سے شرطیں پوری کرائے بغیر اپنی بات کا راز اسے نہیں سمجھاتی۔ یہ فرخندہ کے عزم کی مثال ہے کہ اپنی آزمائش کے دوران آخرکار وہ بادشاہ سے چالیس گھڑے پانی بھروا ہی لیتی ہے۔ اس کے کردار میں جدوجہد اور ہمت و عمل کے اوصاف بھی پائے جاتے ہیں۔ گنبد میں قید کر دیئے جانے کے بعد وہ بادشاہ کی شرطوں کو پورا کرنے کے لئے سخت جدوجہد اور بے انتہا ہمت سے کام لیکر کامیاب ہوتی ہے۔ نتیجتاً بادشاہ کو شرمندہ ہو کر معافی مانگنی پڑتی ہے۔

جہاںؔ نے قصے کے مزاج کے مطابق بہت آسان اور رواں زبان استعمال کی ہے۔ قصے کے آغاز سے انجام تک ایک سا انداز بیان جاری وساری ہے۔ ثقیل الفاظ خال خال ہی نظر آئیں گے۔ ورنہ اسلوب بیان ہماری روزانہ کی بول چال سے بہت قریب ہے۔ سیدھے سادے لہجے نے قصے کی دلچسپی کو بڑھا دیا ہے۔ زبان اسقدر رواں اور نکھری ستھری ہے کہ پڑھ کر طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے۔ جہاںؔ نے خوامخواہ قافیہ بندی یا مقفیٰ مسجع انداز، ضرب الامثال اور محاوروں وغیرہ کا استعمال نہیں کیا ہے۔ درمیان میں کثرت سے اشعار مستعمل ہے لیکن ان کے استعمال سے بیانات یا قصے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر یہ نہ ہوتے تب بھی کوئی بات نہیں تھی۔ ان سے نہ تو واقعات کی دلچسپی متاثر ہوتی ہے اور نہ بیانات کی معنویت اور دلکشی میں اضافہ ہوتا ہے۔

چار گلشن میں جزئیات نگاری نہیں ملتی۔ سراپا نگاری بھی نہیں ہے۔ صرف قدرے طویل منظر نگاری ہے۔ لیکن یہ منظر نگاری بھی تصویر کشی کی سی کیفیت پیدا نہیں کرتی۔ مثال ملاحظہ ہو:-

"..........اور روبرو اس مکان کے ایک نہر چوپڑ کی تعمیر کی ہے۔ پانی صاف مانند آب گہر کے اس میں بھرا ہے اور فوارے ہزار اسمیں چھوٹ رہے ہیں۔ چاروں طرف اس نہر کے برہے پانی کے جاری ہیں اور آواز چدّر پر پانی گرنے کی ہر طرف سے آرہی ہے۔ روشوں کے گرد چمن اس قرینے سے درست کئے ہیں کہ انکی رنگ پر دازی دیکھ کے باغبان قضا بھی بیلچہ پھینک کے بھاگتا ہے ایک طرف جو تختہ سوسن کھلا ہے اسکی خوشبو سے مغز عاشقوں کا معطر ہوا جاتا ہے۔ ڈالیاں میوہ دار درختوں کی پھلوں کے بوجھ سے اور پرچھینوں کے جھک رہی ہیں[1]

[1] چار گلشن (مطبوعہ) مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۲۰۔

اس قصے میں فحاشی اور عریانی کے مرقعے بھی نہیں ہیں۔ جہاں نے تشبیہہ و استعارے کا استعمال بھی کم ہی کیا ہے۔

۱۳

بہارِ دانش

مرزا جان طپشؔ

طپشؔ نے فورٹ ولیم میں قید کے دوران منشی عنایت اللہ کی فارسی داستان "بہارِ دانش" کا منظوم ترجمہ اسی نام سے اردو میں کیا۔ منشی عنایت اللہ کو یہ کہانی ایک برہمن زادے نے سنائی تھی اور اسی کی خواہش پر انہوں نے یہ داستان تالیف کی۔ جو ۱۰۶۱ھ (مطابق ۱۶۵۱ء) میں مکمل ہوئی[1]۔

طپشؔ بہارِ دانش میں سببِ تالیف یوں بیان کرتے ہیں ؎

طبیعت کو تھا ایک شب اضطراب — جگر تفتہ تھا اور آنکھیں پر آب

دل و سینہ بھی متصل تھے تپاں — الم سے تھی ہر اک مژہ خوں چکاں

تھا ہر ایک نالے میں شور نشور — کہ جانِ حزیں سخت تھی ناصبور

اسی بے کلی میں یہ گزرا خیال — کہ کب تک رہے یوں ہی آشفتہ حال

مناسب ہے بہلاؤں جی کے تئیں — بھلاؤں اس آشفتگی کے تئیں

---

[1] دیباچہ بہارِ دانش (مطبوعہ فارسی نسخہ) ص ۴۔

کروں طبع مصروف شعر و سخن — کہ ہے نالہ ہی شغل مرغ چمن
مگر ہو سخن قسم افسانہ سے — کہ جس میں دل مضطرب کچھ لگے
کروں عشق موزوں جہاں داز کا — جو طوطی کی ترغیب سے ہو گیا
کہ ہے قصہ یہ فارسی میں بیان — بھلا ہو اگر ہو یہ ہندی زبان
سخن وہ کہ ہووے مفید انام — کریں جسکو ادراک سب خاص و عام
فوائد کے اس بیر، ہیں کتنے نکات — ہر اک بات میں اک نکلتی ہے بات
بس اسکی ہی تنظیم کچھ خوب ہے — کہ ارباب دانش کو مرغوب ہے

افادات کے رسم و آئیں تمام
مروج ہیں اس دور میں صبح و شام[1]

بہار دانش مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی میں خاتمے پر مندرجہ ذیل شعر درج ہے جس سے بہار دانش کا سنہ ترجمہ ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۲ء برآمد ہوتا ہے ؎

ہوا جس گھڑی ترجمہ یہ تمام — بطرز لطیف و بہ حسن کلام
طپش نے وہیں فکر کر ایک بار — کہی اس کی تاریخ باغ و بہار[2]

۱۲۱۶ھ = ۱۸۰۲ء

لیکن بہار دانش کا جو قلمی نسخہ راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے اس میں یہ شعر موجود نہیں ہے۔ بلکہ قلمی نسخے کا خاتمہ ان اشعار پر ہوتا ہے ؎

وہی ملک و مال اور وہی سلطنت — وہی تاج و تخت اور وہی مکنت

---

[1] بہار دانش (قلمی نسخہ) ص ۱۶۔

[2] " " (مطبوعہ) مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی ص ۱۶۰۔

طپش جیسے مقصود ان کا مِلا ہمارا تمہارا ملے مُدعا[1]

طپش نے بہار دانش کے آغاز میں گورنر جنرل لارڈ منٹو، ہارنگٹن اور مدرس عالی شان کپتان ولیم ٹیلر کی مدح درج کی ہے۔ یہ عہدہ دار ۱۸۰۲ء میں موجود نہیں تھے۔ لارڈ منٹو کا تو عہدہ ہی ۱۸۰۷ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ طپش نے بہار دانش کا ترجمہ دوران اسیری ہی کیا لیکن بعد میں عہدہ داروں، صاحبان کونسل صدر، صاحبان عالی شان کی مدح اور کالج کی تعریف و توصیف کے اضافے شامل کر کے اسے انعام کی خاطر پیش کیا اور اس پر انکو پانچ سو روپے کا انعام بھی ملا[2]۔ بہار دانش کا ۱۹۵ اوراق پر مشتمل بہت عمدہ اور خوبصورت قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔

بہار دانش کے مقدمے میں خلیل الرحمٰن داؤدی نے لکھا ہے کہ حیدری نے بھی بہار دانش کے قصے کو ۱۸۰۲ء میں ہی مکمل کیا تھا۔ موصوف کے الفاظ یہ ہیں:۔

"فورٹ ولیم کالج کے ایک اور نامور اہل قلم سید حیدر بخش حیدری نے بھی فورٹ ولیم کالج میں مسٹر ولیم ہنٹر کی فرمائش پر اسی بہار دانش کا اردو نثر میں بھی ترجمہ کیا تھا جسکا نام گلزار دانش رکھا تھا۔ حیدری کا نثری ترجمہ ۱۸۰۲ء میں مکمل ہوا تھا اسکا مطلب یہ ہے کہ عنایت اللہ کنبوہ کی بہار دانش کے دو ترجمے ساتھ ساتھ فورٹ ولیم کالج میں ہو رہے تھے۔ پہلا اردو نظم میں مرزا جان طپش کر رہے تھے اور دوسرا اردو نثر میں سید حیدر بخش حیدری۔ دونوں ترجمے تقریباً

---

[1] بہار دانش (ق۔ ن) ص ۱۹۵۔

[2] فورٹ ولیم کالج (ہندی) لکشمی ساگر وارشنے ص ۱۰۲ تا ۱۰۳۔

ایک ساتھ مکمل ہوتے لیکن تعجب یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج نے ان دونوں ترجموں میں سے
کسی کو شائع نہیں کیا۔ طپش کا ترجمہ تو بعد میں شائع بھی ہوگیا لیکن حیدری کا
ترجمہ آج تک غیر مطبوعہ ہے[1]

داؤدی صاحب کا محولہ بالا بیان قطعی درست نہیں۔ حیدری نے بہار دانش کا ترجمہ "گلزار دانش" کے نام سے ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۴ء میں کیا تھا۔[2] یوں داؤدی صاحب کا یہ بیان بھی غلط ثابت ہو جاتا ہے کہ ۱۸۰۲ء میں فورٹ ولیم کالج میں دو ترجمے ہو رہے تھے۔ داؤدی صاحب طپش کی قید کے واقعے کی تفصیل سے بھی ناواقف ہیں۔ ورنہ وہ یہ نہ کہتے کہ طپش کا ترجمہ بھی کالج کے لئے تھا یا کالج میں ہو رہا تھا۔ انہیں یہ غلط فہمی اس وجہ سے بھی ہوئی کہ طپش نے "در تعریف مدرس عالی شان کپتان صاحب" کے عنوان سے جو مدح درج کی ہے[3] داؤدی صاحب اسے گل کرسٹ کی مدح سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ مدح کپتان ولیم ٹیلر کی شان میں ہے۔ جو ۱۸۰۸ء میں کالج کے شعبۂ ہندوستانی سے منسلک ہوا۔ "گلزار دانش" کا فورٹ ولیم کالج کے زمانہ کا کوئی مطبوعہ نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔ لیکن حال ہی میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اسے دو جلدوں میں شائع کر دیا ہے۔ خلیل الرحمٰن داؤدی کی مرتبہ "بہار دانش" کے خاتمے پر ناشرین کا ایک اشتہار دیا گیا ہے جس میں یہ درج ہے کہ مرزا شیر علی اور محمد فیض اللہ نے اس کتاب کو بہت سعی اور کوشش سے بہم پہنچا کر ۱۲۵۵ھ (م ۱۸۳۹ء) میں پہلی بار محمدی چھاپہ خانہ سے طبع کرایا۔ چونکہ ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء کے پہلے کسی مطبوعہ نسخے کا سراغ نہیں ملتا اس لئے یہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے کہ یہ پہلا ایڈیشن ہے لیکن اس بیان

---

[1] مقدمہ بہار دانش۔ خلیل الرحمٰن داؤدی ص ۴۴۔

[2] گلزار دانش (ق۔ن) حیدر بخش حیدری ص ۵۔

[3] مقدمہ بہار دانش۔ خلیل الرحمٰن داؤدی ص ۲۱۔

میں ناشرین کہتے ہیں کہ مرزا جان طپش نے بموجب فرمائش صاحبان کونسل وغیرہ کے ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء میں زبان اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ بیان درست نہیں ہے۔ اوپر دیئے ہوئے شواہد کے علاوہ مترجم طپش نے سبب تالیف میں بھی کسی کی فرمائش کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

بہار دانش داستانوں کے اس قبیل سے تعلق رکھتی ہے جن کا بنیادی قصہ بہت نحیف ہوتا ہے۔ بہار دانش کا بھی بنیادی پلاٹ بہت مختصر ہے۔ جہاندار شاہ ایک لاولد بادشاہ کا بڑی آرزوؤں اور مرادوں کا شہزادہ ہے۔ وہ ایک دن اپنی پالتو طوطی کی زبانی شہزادی بہرہ ور بانو کے حسن کا ذکر سن کر غائبانہ عاشق ہو جاتا ہے اور اپنے آرٹسٹ وزیر بے نظیر کو شہر مینوسواد روانہ کرتا ہے۔ بے نظیر نہ صرف شہزادی کی تصویر بنا کر لاتا ہے بلکہ کسی حیلے سے اسے شہزادے کی تصویر بھی دے آتا ہے۔ شہزادہ تصویر پاکر اسی میں غرق ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسے سمجھانے کے لئے سات راتوں تک ہر وزیر عورتوں کے مکر و فریب کی کہانیاں سناتے ہیں۔ مگر شہزادے پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آخر کار اسکی شادی کا پیغام بھیجا جاتا ہے۔ مگر شہزادی کا والد اسے مسترد کر دیتا ہے۔ انجام کار شہزادہ خود بہت سی اذیتیں سہہ کر بہرہ ور بانو تک پہنچتا ہے۔ ان دونوں کی شادی ہو جاتی ہے مگر استعجاب اور پیچیدگی پیدا کرنے کے لئے ہرمز کا کردار شامل کیا گیا ہے اور اسی سے گفتگو کی بناء پر شہزادہ آہو کے قالب میں اور پھر طوطی کے قالب میں جاتا ہے۔ بہ ہزار خرابی وہ اپنی اصلی شکل میں واپس آتا ہے۔ اور یوں جہاندار شاہ اور بہرہ ور بانو کے اچھے دن آجاتے ہیں۔ بس یہی بہار دانش کی بنیادی کہانی ہے۔ اسے ابتدا اور خاتمے پر جوڑ دیا گیا ہے۔ درمیان میں تھوڑی دیر کے لئے جہاندار کا ذکر آتا ہے۔ اسکے بعد پھر ضمنی کہانیاں۔ یہ ضمنی کہانیاں اپنی جگہ مکمل ہیں اور اپنے فارسی اصل کے مطابق ہیں۔

بہار دانش کا آغاز عام داستانوں سے ہی مشابہ ہے۔ بادشاہ کی لاولدی اور کسی درویش کے عطا کردہ پھل سے صاحب اولاد ہونا اور شہزادے کا کسی کی زبانی کسی شہزادی کے حسن کا بیان سن کر

نادیدہ عاشق ہو جانا داستانوں میں عام ہے۔ یہاں بھی جہاندار شاہ بڑی ناامیدی کے بعد عالم وجود میں آتا ہے اور طوطی کا بیان بہرہ ور بانو کے عشق کا محرک ہوتا ہے۔ اس کے بعد کے مراحل بھی اپنے جلو میں کوئی نیا انداز نہیں رکھتے۔ بہار دانش کی داستان میں ایک حد تک داستانوی تقاضوں کا فقدان ہے شہزادہ جہاندار شاہ مہم جوئی کے نام پر بہرہ ور بانو کی تلاش میں نکلتا ہے لیکن اسے ہفت خواں نہیں طے کرنے پڑتے۔ اس سفر میں طوطی اس کی رفیق ہے اور وہی اس کی مشکلوں کو دور کرتی ہے۔

بہار دانش میں اصل اہمیت کی حامل ضمنی کہانیاں ہیں۔ سات وزیروں کی بیان کردہ کہانیوں میں عورتوں کے مکر و فریب کی داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ کہانیاں سنسکرت کی ان قدیم کہانیوں سے مشابہ ہیں جن میں عورتوں کو عموماً بدکردار، شاطر اور عیار دکھایا گیا ہے۔ اسکے علاوہ شاہ گیلان، ملک زادہ اور مہربانو، بہرام و زہرہ، حسن سوداگر و گوہر اور داستان چہار پری کے قصے داستانوی تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ داستان سہ جوان غریب، حکایت دختر بادشاہ، حکایت کامگار شہزادہ اور حکایت زن عاقلہ کہانی اور حکایت کی مشترکہ شکلیں ہیں۔ یہ ساری ضمنی کہانیاں بے حد دلچسپ ہیں اور اپنے جلو میں حیرت و استعجاب، پیچیدگی، مہم جوئی اور فوق الفطرت جیسے داستانوی عناصر بھی رکھتی ہیں۔ یہ ضمنی کہانیاں سبق آموز ہیں۔ ان میں حیات و کائنات کے رموز بھی پنہاں ہیں۔

جہاندار شاہ اور بہرہ ور بانو اس داستان کے نمایاں کردار ہیں۔ لیکن دیگر داستانوں کی طرح ان کے کردار میں کوئی خوبی نہیں۔ جہاندار شاہ اور بہرہ ور بانو دونوں عشق کی صفات سے متصف ہیں لیکن جہاندار شاہ نے اس عشق کی خاطر کوئی ہفت خواں نہیں طے کیا کوئی مہم نہیں سر کی۔ وہ مجہول اور ناکام عاشقوں کی طرح بہرہ ور بانو کی تصویر سے ہم کلام رہتا ہے۔ جب وہ بہرہ ور بانو

کی تلاش میں نکلتا ہے اسوقت بھی طوطی اسکی مشکلیں آسان کر دیتی ہے۔یوں وہ بہت آسانی سے بہرہ وربانو کے وصل سے شادکام ہوجاتا ہے۔اخیر میں وہ جس پریشانی سے دوچار ہوتا ہے وہ بھی اپنے غصے کے باعث۔جہاندارشاہ بہرہ وربانو کے فراق میں جو کچھ اذیتیں برداشت کرتا ہے وہ ایسی نہیں کہ ہماری ہمدردیاں اسکے ساتھ ہوجائیں۔اسکے اضطراب کا اثر یہیں تک ہوتا ہے کہ ہم جلد از جلد اسے بہرہ وربانو تک پہنچاکر قصہ ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

بہرہ وربانو کا کردار بھی بہت مجہول سا ہے۔وہ بلا کی حسین ہے۔اس کے عشق اور دردو فراق کی تصویریں نہیں کے برابر ہیں۔وہ فعال بھی نہیں۔جب جہاندارشاہ اسکے باغ میں پہنچتا ہے تو وہ اسے دیکھ کر مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنے کرب کا بیان کرتی ہے ؎

اسی کے لئے ہے مرا سب یہ حال ؎ اسی کے الم کی ہوں میں پائمال
اسی موذی نے دی ہے ایذا مجھے اسی نے دیا ہے یہ سودا مجھے
بس اب میرے دل کا ملا مجھ کو چور ولے چور ہے یا عجب زور و شور[1]

آگے چل کر بہرہ وربانو کی کیفیات کا بیان یوں ہے ؎

خوشی اور چہلیں گئی ساری بھول لگی رات دن رہنے یہ ہم ملول
جو دن ہے تو یاد جہاں دار ہے جو شب ہے تو پھر یہ ہی اذکار ہے
نہ کھانا نہ پینا نہ سونا کبھی نہ باتوں میں مشغول ہونا کبھی
وہی دیکھنا بیٹھے تصویر کو وہی کرنا پھر پھر کے تقریر کو[2]

طپش نے بہار دانش میں باقاعدہ معیاری شاعری کا نمونہ پیش کیا ہے۔اس میں آسان

---

[1] [2] بہار دانش (مطبوعہ) مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی ص ۱۴۸، ۱۴۹۔

لب ولہجہ بھی ہے اور خال خال مرصع انداز بھی۔ یہ ضرور ہے کہ بہار دانش کے بیانات داستان کی اصل فضا سے مطابقت نہیں رکھتے۔ مثلاً جہاندار شاہ کے عشق و فراق کی کوئی مکمل، واضح اور درد و کرب میں ڈوبی ہوئی تصویر نہیں ملتی۔ یہی حال بہرہ وربانو کا بھی ہے۔ یہ سارے مواقع طپش سے زور بیان کے متقاضی تھے۔ مگر طپش ان تمام مقامات سے سرسری ذکر کرکے گزر گئے۔ حسن اور واردات عشق کا بیان بھی مفقود ہے۔ بہرہ وربانو کے حسن کا بیان اس سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے ؎

کھنچی دستِ ایزد کی تصویر ہے ۔۔۔ نگہ کے لئے طرفہ تاثیر ہے
پری بھی جو دیکھے تو شرمندہ ہو ۔۔۔ فرشتہ بھی فوراً سر افگندہ ہو
نہ اس منھ کا سا شمع ہی میں ہے نور ۔۔۔ نہ گل ہی میں اس رنگ کا ہے ظہور[1]

یہ پیکر نگاری بھی اپنے جلو میں کوئی تاثیر نہیں رکھتی اور نہ اس سے حسن کی کوئی واضح تصویر سامنے آتی ہے۔ جزئیات نگاری ملاحظہ ہو ؎

در و بام یکسر جواہر نگار ۔۔۔ مرصع دکانوں کی ہر سو قطار
عمارات رنگین ہر ایک سو ۔۔۔ صفائی و پاکیزگی کو بہ کو
زمرد کے اور لعل کے سنگ و خشت ۔۔۔ زمیں کا ہر اک قطعہ رشکِ بہشت
خوشی ہر طرف راگ اور رنگ کی ۔۔۔ مچی تھی صدا بربط و چنگ کی[2]

بہار دانش کے بیانات میں تاثیر کا فقدان ہے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ داستان کی تلبیاں کے لئے نظم کی صنف موزوں نہیں اس لئے کہ میرحسن کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اور "سحرالبیان" "بہار دانش" سے قبل کی ہے۔ ہاں یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ داستان کے تقاضوں کے لئے جس زبان و

---

[1] [2] بہار دانش (مطبوعہ) ص ۱۲، ۱۴۔

بیان یا زور بیان کی ضرورت ہوتی ہے طپش اس سے ناواقف تھے۔ سحر البیان کے سامنے یہ مثنوی بہت پھیکی اور بے رنگ لگتی ہے۔ بہار دانش میں بنیادی داستان کی تفصیلات کی بہ نسبت ضمنی کہانیوں میں طپش کا حسن بیان کچھ نمایاں ہوا ہے۔ انمیں انھوں نے ہر واقعے کو بڑی خوبی سے نظم کیا ہے اور یہ کہنا درست ہی ہوگا کہ یہاں وہ کردار و ماحول کی تصویر کشی میں کامیاب ہیں۔

طپش نے اس مثنوی میں تشبیہات و استعارات کا استعمال کم ہی کیا ہے بلکہ وہ عموماً سادہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ یہ سادگی اور سلاست ہی داستان کا عام انداز ہے۔ جاوید نہال نے لکھا کہ "چونکہ طپش نے کالج کے نووارد طلبار کے لئے یہ مثنوی تالیف کی تھی لہٰذا انھوں نے زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور آسان بنانے کی کوشش کی ہے"[1]۔ لیکن طپش کی صفائی میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے قصداً سادہ انداز بیان اختیار کیا ہے۔ اس لئے کہ نہ تو یہ مثنوی انھوں نے کالج کے نوواردان کے مطالعہ کے مقصد سے تصنیف کی تھی اور نہ ہی کسی عہدہ دار کی فرمائش پر لکھی تھی۔

بہار دانش میں کہیں کہیں تلمیحات نظر آجاتی ہیں۔ ہندوستانی عناصر کی یہ مثال ملاحظہ ہو ؎

کہ جوگی سا کوئی دیکھا اک روبرو | جو تکتا ہے حیرت زدہ سو بہ سو
گلے بیچ کنٹھا، بڑھے سر کے بال | پڑی کاندھے پر یک طرف مرگ چھال
رنگے گیروے کپڑے وہ بھی پھٹے | سرو سینے پر راکھ یکسر ملے[2]

بہار دانش کے بیانات کی یہ خوبی ہے کہ ہماری توجہ اصل قصے پر ہی مرکوز رہتی ہے۔ یہاں طویل اور بے ضرورت تفصیل اور شاعرانہ کمالات کے نمونے نہیں ملتے۔

بحیثیت مجموعی طپش کی یہ کاوش ستائش کے قابل ہے۔

---

[1] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب۔ جاوید نہال ص ۱۴۳۔ [2] بہار دانش (مطبوعہ) ص ۱۱۳۔

۱۴

خرد افروز

حفیظ الدین احمد

خرد افروز کا سلسلہ قدیم ہندوستانی قصہ کلیلہ دمنہ (کرتک دمنک) تک پہنچتا ہے۔ کلیلہ دمنہ سے خرد افروز کے درمیان یہ قصہ مختلف زبانوں میں منتقل ہوتا رہا اور مختلف مترجمین اس میں حذف واضافے کرتے رہے۔

خرد افروز کے دیباچے سے علم ہوتا ہے کہ رائے دابشلیم (جو ہندوستان کے کسی سرحدی علاقے کا حاکم تھا) نے حکیم بیدپائے سے خواہش ظاہر کی کہ وہ بزرگوں کی نصیحتوں کو افسانے کے پیرائے میں بیان کرے۔ جس کے کردار انسان نہیں بے زبان جانور ہوں۔ حکیم بیدپائے نے راجہ کے حکم کے مطابق یہ کتاب ترتیب دی۔ یہ کتاب امور سلطنت کے رموز و نکات سے پُر تھی۔ کسی طرح اس کی شہرت نوشیرواں (۵۳۱-۵۷۹ء) تک پہنچی۔ نوشیرواں کو اس کتاب کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ ہوا۔ تو اس نے برزویہ نامی ایک نوجوان کو کتاب حاصل کرنے کے لئے ہندوستان بھیجا۔ برزویہ مختلف حیلوں اور تدبیروں سے کتاب حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اور اس کتاب کو ہندی سے پہلوی میں ترجمہ کرکے نوشیرواں کے حضور میں پیش کیا۔ لیکن ابوالمعالی نصر اللہ ابن المقفع کے حوالے سے روایت کرتا ہے کہ برزویہ نے کتاب کو صرف نقل کیا تھا اور یہی نقل نوشیرواں کے حضور میں پیش کی۔ نوشیرواں نے بزرجمہر کو اس کتاب کے ترجمے پر مامور کیا۔ اس میں برزویہ نے اپنی خدمات کے سلسلے میں اپنے حالات بھی درج

کروا دیئے تھے[1]

گیان چند جین نے ان تمام واقعات میں رائے دابشلیم اور حکیم بیدپائے کے نام کو عجیب و غریب قرار دیا ہے۔ ان کا وجود صحت سے عاری اور مشتبہ ہے[2]۔ اس کے علاوہ محققین کی نظر میں بزرجمہر کا مقام اور رتبہ بھی اشتباہ کا شکار رہے۔ حالانکہ اسے نوشیرواں کا وزیر کہا گیا ہے۔

نوشیرواں ہی کے زمانے میں فارسی کے عالموں نے اس کتاب کی کئی نقلیں تیار کرلی تھیں جو نہ صرف حفاظت سے رکھی جاتی تھیں بلکہ دوسروں کی نظروں سے بھی پوشیدہ رکھی جاتی تھیں۔ نوشیرواں کے بعد عجم کے دیگر بادشاہ بھی اس کتاب کی یونہی حفاظت کرتے رہے۔ یہانتک کہ سلطنت ابوجعفر منصور دوانقی (عباسیوں کا خلیفۂ دوم) کو پہنچی۔ اس نے بڑی کوششوں سے یہ کتاب حاصل کی جو پہلوی زبان میں تھی۔ امام ابوالحسن ابن المقفع[3] (امام ابوالحسن عبداللہ ابن المقفع ابومنصور کے دربار کا میر منشی اور ہم عصر شعراء کا سرگروہ تھا) کو کلیلہ دمنہ کے عربی ترجمے کا حکم دیا[4]۔ اس ترجمے کا سن ۷۵۰ء ہے[5]۔

اس کے بعد ابوالحسن نصر بن احمد سامانی (۹۱۳ء/۳۰۱ھ - ۹۴۲ء/۳۳۱ھ) کے حکم سے عربی کلیلہ دمنہ کا فارسی میں ترجمہ ہوا[6]۔ اس کا مترجم نصر بن احمد کا وزیر دانش مند ابوالفضل محمد بلعمی تھا[7]۔ فارسی کے

---

[1] دیباچہ خرد افروز (ق۔ن) حفیظ الدین احمد ص ۹۔ [2] اردو کی نثری داستانیں ص ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲۔

[3] خرد افروز کے قلمی نسخے میں عبداللہ المقفع درج ہے (ص ۱۰) لیکن عبدالمقفع ہی درست ہے۔

[4] دیباچہ خرد افروز (ق۔ن) ص ۱۰۔ [5] اردو کی نثری داستانیں ص ۲۵۷۔

[6] دیباچہ خرد افروز (ق۔ن) ص ۱۰۔

[7] مقدمہ خرد افروز (مطبوعہ) سید عابد علی عابد ص ۳۹۔

اس ترجمے کو سلطان محمود غزنوی کے حکم سے رودکی نے منظوم پیکر عطا کیا۔[1]

ان دو نسخوں کے بعد کلیلہ دمنہ کا ایک اور نثری نسخہ ابوالمعالی نصراللہ مستوفی کا ہے۔ انہوں نے بہرام شاہ بن سلطان مسعود (جو محمود غزنوی کی اولاد میں سے تھا) کے حکم سے ابن المقفع کی عربی کلیلہ دمنہ کو فارسی میں منتقل کیا۔[2] یہ ترجمہ ۱۱۲۱ء یا ۱۱۴۲ء میں ہوا۔[3] یہی مشہور کلیلہ دمنہ ہے۔

نصراللہ کے ترجمے کی دقت پسندی کو رفع کرنے کے لئے مولانا حسین واعظ نے نظام الدولہ امیر شیخ احمد سہیلی[4] کی فرمائش پر انوار سہیلی مرتب کی۔[5] حالانکہ انوار سہیلی مقفیٰ و مسجع عبارتوں سے مزین ہے۔ انوار سہیلی کے زمانۂ ترتیب کو ۱۴۷۰ء سے ۱۵۰۵ء کے درمیان متعین کیا گیا ہے۔[6] لیکن مولانا حسین واعظ نے اصل کتاب سے بزرجمہر اور برزویہ سے متعلق دو باب کم کر دیئے۔[7]

شہنشاہ اکبر (۱۵۵۶ء / ۹۶۳ھ - ۱۶۰۵ء / ۱۰۱۴ھ) نے اپنے عہد میں ابوالفضل بن مبارک ہاشمی کو حکم دیا کہ وہ انوار سہیلی کو سلیس محاورے میں لکھے۔[8] ابوالفضل کے اس نسخے کا نام "عیار دانش" ہے۔ ابوالفضل نے

---

[1] دیباچہ خرد افروز (ق۔ن) ص ۱۰۔ [2] دیباچہ خرد افروز (ق۔ن) ص ۱۰۔ سید عابد علی عابد اشتباہ کا شکار ہیں کہ نصراللہ کے پیش نظر کس زبان کا نسخہ تھا جس سے انہوں نے ترجمہ کیا۔ (مقدمہ خرد افروز ص ۴۲)۔

[3] اردو کی نثری داستانیں ص ۲۶۳۔

[4] خرد افروز کے قلمی نسخے میں امیر شیخ سہیلی درج ہے (ص ۱۰) یہ سلطان مرزا کے مہر وار تھے

[5] دیباچہ خرد افروز (ق۔ن) ص ۱۰۔

[6] ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر (کیتھ) بحوالہ اردو کی نثری داستانیں ص ۲۶۳۔

[7] انوار سہیلی (ق۔ن) ورق ۸۔

[8] دیباچہ خرد افروز (ق۔ن) ص ۱۰۔

بزرچمہر اور برزویہ سے متعلق وہ دو باب بھی اپنے ترجمے میں شامل کرلیئے جو مولانا واعظ نے حذف کردیئے تھے۔[1]

"خرد افروز" "عیار دانش" کا ہی ترجمہ ہے۔ اسے حفیظ الدین احمد نے گل کرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۲ء (۱۲۱۷ھ) میں ترجمہ کیا۔[2] حفیظ الدین احمد دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"مدرس ہندی مسٹر جان گل کرسٹ صاحب دام دولتہ نے فرمایا کہ ترجمہ عیار دانش کا جو فی الحقیقت دانش کی کسوٹی اور آئین سلطنت کا دستور العمل ہے۔ کر۔ حقیر نے انکا حکم بجالا کر ترجمے میں کمر باندھی۔ خدا کے فضل سے حسن انصرام کو پہنچا۔ اور نام اسکا خرد افروز رکھا۔ تاریخ۔

بعد اتمام کے تاریخ اس کی ؎ چاہا میں لکھوں لگا اپنا جی کر
آئی ہاتف سے ندا یوں فی الفور خرد افروز (۱۲۱۷) جہاں یہ ہے گی"[3]

جاوید نہال صاحب کو مخطوطے میں یہ عبارت نظر نہ آئی۔ لکھتے ہیں:۔

"عام خیال ہے کہ پروفیسر جان گل کرسٹ کی فرمائش پر مولوی حفیظ الدین صاحب نے خرد افروز کو مرتب کیا لیکن خرد افروز کے خطی نسخہ یا مطبوعہ ایڈیشن ۱۸۱۵ء اور ۱۸۴۰ء سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انہوں نے جان گل کرسٹ یا کسی اور شخص کے ایما پر خرد افروز

---

[1] دیباچہ خرد افروز (ق۔ن) ص ۱۰۔

[2] لکشمی ساگر وارشنے نے خرد افروز کے مترجم کی حیثیت سے تھامس روبک کا نام لکھا ہے (فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۱۰۸) جو صریحاً غلط ہے۔ البتہ ۱۸۱۵ء میں تھامس روبک نے خرد افروز کو مرتب کیا تھا۔ اس میں اسکا عالمانہ دیباچہ بھی شامل ہے۔

[3] دیباچہ خرد افروز (ق۔ن) ص ۴۔

کا ترجمہ کیا تھا۔[1]

خردافروز کے اختتام پر حفیظ الدین احمد کی ایک عرضی شامل ہے۔ جس میں وہ صاحبان عالیشان سے خردافروز پر "نظر عنایت" کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ جاوید نہال نے اسی عرضی کی بنا پر لکھا ہے کہ انہوں نے اشتہار دیکھ کر ترجمہ کیا تھا۔[2] یہ عرضی تو رسمی تھی۔ سبب تالیف کی وضاحت ان کے پہلے بیان سے بخوبی ہو جاتی ہے۔

خردافروز کے خاتمے پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے۔ جس سے سنہ تکمیل کا علم ہوتا ہے :۔

"شکر خدا کا یہ کتاب خرد افروز جو آداب سلطنت کے واسطے دستور العمل تاج سعادت کے لئے در یکتا .... سنہ ۱۲۱۸ بارہ سو سترہ ہجری شہر ذی الحجہ کی دسویں تاریخ روز یکشنبہ موافق تاریخ سنہ ۱۸۰۳ اٹھارہ سو تین عیسوی مطابق تاریخ بائیسویں ماہ چیت سنہ ۱۲۰۹ بنگلہ میں حسن انصرام کو پہنچی۔"[3]

خردافروز سنہ ۱۸۰۹ء میں مکمل طور سے شائع ہوئی۔[4] اسے سنہ ۱۸۱۵ء میں تھامس روبک نے مرتب کر کے ایک عالمانہ دیباچے کے ساتھ ہندوستانی پریس سے شائع کیا۔[5] خردافروز کی مذکورہ ترتیب میں مولوی سید کاظم علی، منشی غلام اکبر، مرزائی بیگ اور غلام قادر شریک تھے۔ راقم الحروف کو ان میں سے کوئی بھی مطبوعہ نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔ البتہ اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ)

---

[1] [2] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۰۸۔

[3] خردافروز (ق۔ن) ص ۳۸۷

[4] Linguistic Survey of India. Vol. IX Part I P. 33

[5] Annals of the College of F.W. Appendix P. 26

میں محفوظ ہے۔ اس میں کل ۳۸۸ اوراق ہیں۔ خرد افروز پاکستان سے شائع ہو چکی ہے۔ یہ نسخہ تھامس روبک کے سنہ ۱۸۱۵ء والے نسخے پر مبنی ہے۔

کلیلہ دمنہ کا ہندی اور پہلوی نسخہ مفقود ہے۔ ہاں ابن المقفع کا عربی ترجمہ دستیاب ہے۔ اس میں حکیم بزرویہ کا دیباچہ (حکیم بزرویہ کے حالات اور افکار) بھی شامل ہے۔ اسی عربی نسخے کی وساطت سے ہم بزرویہ کے دیباچے سے واقف ہوئے۔ سید عابد علی عابد نے بڑی عالمانہ کاوش سے یہ ثابت کیا ہے کہ ابن المقفع نے پہلوی سے عربی میں کلیلہ دمنہ کو منتقل کرتے وقت بعض حصوں میں اپنے افکار و عقائد کو شامل کیا ہے[1]۔ گیان چند جین کا خیال ہے کہ ابن المقفع نے اپنی کتاب کی اہمیت اور انفرادیت ظاہر کرنے کے لئے یہ اضافہ بھی اپنی جانب سے کر لیا کہ یہ کتاب (کلیلہ دمنہ) ہندوستان میں مقفل رکھی جاتی تھی[2]۔ حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کتاب میں نہ کوئی ایسا رمز ہے اور نہ حکمت و دانش کے ایسے در نایاب ہیں جنکی حفاظت کی جائے۔ یہاں تو جانوروں کی زبانی اخلاق و نصیحت کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے۔ حذف و اضافے کا الزام صرف ابن المقفع پر ہی عائد نہیں ہوتا بلکہ بعد کے دیگر مترجمین بھی حسب موقعہ اور حسب سہولت اس کے مرتکب ہوئے ہیں۔

حفیظ الدین احمد نے خرد افروز کے دیباچے میں یہ واضح کیا ہے کہ "ابوالمعالی نصر اللہ مستوفی نے کلیلہ دمنہ مشہور میں لکھا ہے کہ اس کلیلہ دمنہ میں جسکو بزرجمہر حکیم نے پہلوی زبان میں ترتیب دیا ہے۔ سولہ باب ہیں۔ دس باب اصل کرتک دمنک کے اور چھ باب حکیم مذکور نے زیادہ کئے ہیں۔ ان میں سے چار باب رائے دابشلیم اور برہمن بیدپائے کے سوال وجواب کے طور پر آخر کتاب میں لکھے۔ اور دو

---

[1] مقدمہ خرد افروز (مطبوعہ) سید عابد علی عابد ص ۳۱ تا ۳۷۔

[2] اردو کی نثری داستانیں ص ۲۶۲۔

باب اوّل کتاب میں۔ یہ کتاب بھی (خرد افروز) اسی ترتیب پر لکھی گئی ہے[1] چنانچہ خرد افروز کا قلمی نسخہ مندرجہ ذیل سولہ[16] ابواب پر مشتمل ہے:۔

پہلا باب:۔ بزرچمہر کی گفتگو میں۔ جو اس کتاب سے مناسبت رکھتی ہے۔

دوسرا باب:۔ برزویہ طبیب کے احوال میں۔ شروع قصہ رائے دابشلیم اور بیدپائے حکیم کا۔

تیسرا باب:۔ چغل خوروں کی بات نہ سننے (کذا) میں۔

چوتھا باب:۔ بدکاروں کی سزا پانے اور انکی عاقبت خراب ہونے میں۔

پانچواں باب:۔ دوستوں کی یک دلی کے فائدوں میں۔

چھٹا باب:۔ دشمنوں کے کاروبار کے سوچنے اور انکے فریب سے نڈر رہنے میں۔

ساتواں باب:۔ نادانی سے مقصد کھونے کے زیاں میں اور حصول مقصد کے دیر کرنے میں۔

آٹھواں باب:۔ شتابی نہ کرنے کے بیان میں۔

نواں باب:۔ دور اندیشی کے بیان میں اور فریب کر کے دشمن کے ہاتھ سے بچنے میں۔

دسواں باب:۔ پرہیز کرنے میں اہل کینہ سے اور اعتماد نہ کرنے میں چاپلوسی پر انکی۔

گیارہواں باب:۔ بخشنے میں گناہوں کے کہ بادشاہوں کے وصفوں میں سے ایک اچھا وصف ہے۔

بارہواں باب:۔ کاموں کے بدلا پانے میں۔

تیرہواں باب:۔ بسبب زیادہ طلبی کے اپنے کام سے باز رہنے کے بیان میں۔

چودہواں باب:۔ دانش و وقار کی بزرگی اور کاموں کی جلدی نہ کرنے کے بیان میں۔

پندرہواں باب:۔ احتراز کرنے میں بادشاہوں کے بیوفاؤں اور بداندیشوں کی باتوں سے۔

---

[1] دیباچہ خرد افروز (ق۔ن) ص ۱۱، ۱۲۔

سولہواں باب:۔ زمانے کی گردش کے التفات نہ کرنے میں۔اس لئے کہ جو کچھ ہوتا ہے تقدیر الٰہی سے ہوتا ہے۔

لیکن خرد افروز کا موجودہ مطبوعہ نسخہ محض پانچ ابواب (پہلا باب بزرجمہر کی گفتگو میں۔جو اس کتاب سے مناسبت رکھتی ہے، دوسرا باب پزرویہ طبیب کے احوال میں، شروع قصہ رائے دابشلیم اور بیدپائے حکیم کا، تیسرا باب چغل خوروں کی بات نہ سننے میں، شروع قصہ کلیلہ دمنہ کا، چوتھا باب بدکاروں کے سزا پانے اور انکی عاقبت خراب ہونے میں، پانچواں باب دوستوں کی یک دلی کے فائدوں میں) پر مشتمل ہے۔

خرد افروزیوں تو اپنے موضوع کے اعتبار سے حکایتوں اور کہانیوں کا مجموعہ ہے لیکن یہ اخلاق ونصائح، عبرت ونصیحت، حکمت عملی اور سیاسی مصلحتوں کا صحیفہ بھی ہے۔کتاب کے آغاز سے لے کر انجام تک اخلاق کا درس پنہاں ہے۔ بزرجمہر کا ذکر ہو خواہ پزرویہ کا، دابشلیم کا قصہ ہو کہ چرند و پرند کا عبرت ونصیحت کا عنصر ہر جگہ موجود ہے۔اسکے باوجود قصے میں کہیں بے کیفی نہیں۔یہ قصہ نہایت مربوط ہے اور اسکا تسلسل کہیں منقطع نہیں ہوتا۔

اس قصے کے بنیادی کردار جانور ہیں۔یہ کلیلہ اور دمنہ نام کے دو گیدڑ ہیں۔انکے علاوہ دیگر اہم کردار بھی جانور ہی ہیں۔لیکن یہ جانور فہم وذکاوت اور دانشمندی وذہانت میں انسان سے برتر ہیں۔ضمنی حکایتوں کے کردار بھی بڑے فعال اور باعمل ہیں۔انکی سرشت میں بالعموم ہمدردی، نیکی، تعاون اور امداد کا جذبہ موجود ہے۔یہاں کرداروں کے خیالات وافکار زمان ومکان کی قید سے آزاد ہیں۔ان میں آفاقیت بھی ہے اور ابدیت بھی۔

حفیظ الدین احمد نے خرد افروز میں حیرت انگیز حد تک سادہ اور سریع الفہم زبان استعمال کی ہے۔ عربی اور آسان اردو کے امتزاج سے انہوں نے بڑا نکھرا اسلوب اپنایا ہے۔اگرچہ اس سادہ نگاری میں

میرامن کی سی رنگینی اور رعنائی نہیں تاہم اس سادہ اسلوب میں بھی ایک حسن ہے۔ اور یہ کسی خاص باب تک محدود نہیں بلکہ ہر صفحہ پر نمایاں ہے۔ اس سے قطع نظر حفیظ الدین کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی تو یہی ہے کہ یہ نفسِ مضمون کی ادائیگی میں کامیاب ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:۔

"ایک کچھوے اور بچھو کی دوستی تھی، ہمیشہ آپس میں دم یگانگی کا بھرتے تھے۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ دونوں وطن سے نکلے اور باہم سفر اختیار کیا تاکہ کوئی آرام کی جگہ ٹھہرادیں اور وہاں گزران کریں۔

اتفاقاً گزر انہوں کا ایک بڑی سی ندی کے کنارے ہوا، بچھو نے غمگین ہوکر نیچے سر کرلیا، کچھوا بولا "اے عزیز! تجھے کیا ہوا کہ گریبان جان کو غم کے ہاتھ دیا اور خوشی کی طرف سے ایک بارگی دل اٹھالیا؟" بچھو نے کہا "اے بھائی! اس دریا کے پار اترنے کی فکر نے مجھے حیرت کے گرداب میں ڈالا، نہ پار اتر سکتا ہوں، نہ تجھ سے جدا ہونیکی تاب رکھتا ہوں۔"[1]

یہ ضرور ہے کہ اس سادگی میں ایک قسم کی سنجیدگی اور سپاٹ پن ہے۔ جملوں میں ترنم اور آہنگ کا فقدان ہے۔ تاثیر اور گداز کے مواقع اپنی کیفیت میں شدت نہیں رکھتے۔ یہاں حاضر جوابی اور خوش کلامی تو ہے لیکن مزاح وظرافت کا عنصر خال خال نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں ترجمے پن کا اثر بھی نمایاں ہوا ہے۔

حفیظ الدین احمد نے فارسی کے ادق الفاظ اور تراکیب استعمال نہیں کی ہیں تشبیہات واستعارات میں بھی انہوں نے عام فہمی کو مدنظر رکھا ہے اور انکا بہت برمحل اور بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔

---

[1] خرد افروز (مطبوعہ) حفیظ الدین احمد ص ۱۴۳۔

۱۵

گلزارِ دانش

حیدر بخش حیدری

گلزار دانش عنایت اللہ کی فارسی تصنیف "بہار دانش" کا ترجمہ ہے۔ عنایت اللہ نے فارسی میں یہ قصہ ایک برہمن لڑکے کی فرمائش پر ۱۰۶۱ھ؍۱۶۵۱ء میں سپرد قلم کیا تھا۔ حیدری نے بہار دانش کا نثری ترجمہ ولیم ہنٹر کی فرمائش پر ۱۲۱۸ھ؍۱۸۰۴ء میں انجام دیا تھا۔ انہوں نے محمد صالح کے دیباچے کا بھی ترجمہ کر دیا ہے۔ سبب تالیف میں وہ خود لکھتے ہیں:۔

"صاحبان دانش و بینش پر ظاہر ہو کہ کتاب بہار دانش کو شیخ عنایت اللہ طوطی سخن نے ایک برہمن بچہ حسین و مہ جبیں کے کہنے سے تصنیف کیا تھا۔ اور محمد صالح جو اس والا جوہر نسبت ہم گوہری و شاگردی کی رکھتا تھا اُسنے بھی ایک دیباچہ اپنی موزونی طبع سے ساتھ عبارت رنگین و خوب و بندش الفاظ دلچسپ و مرغوب کے تصنیف کر کے اس کتاب میں داخل کیا تھا اب اس ذرۂ بے مقدار ....سید حیدر بخش آبادہ بے ہنری متخلص بہ حیدری.................. نے عہد میں ....شاہ عالم شاہ غازی خلد اللہ ملکہ کے اور حکومت میں.......... مارکویس ویلزلی گورنر جنرل.............. کے سنہ ۱۲۱۸ بارہ سو اٹھارہ ہجری مطابق اٹھارہ سو چار عیسوی کے فرمانے سے جناب مسٹر ولیم ہنٹر دام اقبالہ کے موافق اپنی طبع کے

زبان ریختہ میں ترجمہ کیا اور نام اسکا گلزار دانش رکھ کر اہل دانش وبینش کی نذر گزرانا۔[1]

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے گلزار دانش کے پیش لفظ میں کاظم علی جواں اور کھیم نرائن رند کے قطعات تاریخ کا ذکر کیا ہے۔ جس سے ۱۲۱۴ھ اور ۱۲۱۵ھ برآمد ہوتے ہیں۔[2] راقم الحروف کو گلزار دانش کا جو نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں ملا اس کے اخیر میں کاظم علی جواں اور ابوالقاسم کے قطعات تاریخ درج ہیں۔ اور ان دونوں سے ۱۲۱۹ھ برآمد ہوتے ہیں۔ اچھا ہوتا اگر عبادت بریلوی صاحب جواں اور رند کے قطعات درج کر دیتے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کو گلزار دانش کا قلمی نسخہ دو جلدوں میں کوپن ہیگن کی شاہی لائبریری میں دستیاب ہوا۔ چنانچہ ان دونوں جلدوں کو انہوں نے پاکستان میں شائع کر دیا ہے۔ موصوف کا خیال ہے کہ کوپن ہیگن کی شاہی لائبریری کا نسخہ ہی دنیا میں گلزار دانش کا واحد نسخہ ہے۔ حالانکہ گلزار دانش کا ۱۰۸۲ صفحات کو محیط ضخیم اور خستہ قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔ اور یہ مکمل ہے۔

گلزار دانش میں شہزادہ جہاندار سلطان اور مہرور کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ وہی قصہ ہے جسے طپش نے اپنی منظوم "بہار دانش" میں کسی قدر اختصار سے ترجمہ کیا ہے۔ چنانچہ بعض واقعات بہار دانش میں سرے سے ناپید ہیں۔ حیدری نے یہ قصہ تفصیل سے اور تمام جزئیات کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ شہزادہ جہاندار مہرور سے شادی کے بعد چند ایک دشوار یوں سے گزر کے دوبارہ مہرور کو حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے بعد مہموں اور مرحلوں سے مزین کئی ضمنی عشقیہ داستانیں

---

[1] دیباچہ گلزار دانش (ق۔ن) حیدر بخش حیدری ص ۴، ۵۔

[2] پیش لفظ گلزار دانش (مطبوعہ) ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۱۰۔

بیان کی گئی ہیں ۔ ان داستانوں کے بعد جہاندار سلطان اور بہرہ ور بانو کے عشق اور وصال کی داستان ہے ۔ یہ داستان بھی اپنے جلو میں بہت سی پیچیدگی رکھتی ہے ۔ گلزار دانش کا اختتام جہاندار کی موت اور بہرہ ور کے نالہ و شیون پر ہوتا ہے ۔

گلزار دانش میں حیدری کے اسلوب سے ترجمہ پن کی جھلک صاف نمایاں ہے ۔ انکی زبان بے حد گنجلک اور پر تعقید ہے ۔ تراکیب اور تشبیہات کی کثرت سے قصے کا سارا حسن برباد ہو گیا ہے ۔ زبان و بیان کی یہ دقت پسندی اور رنگینی کسی خاص حصے تک محدود نہیں بلکہ تقریباً پوری داستان میں یہی انداز بیان بکھرا ہوا ہے ۔ حسن کا بیان ہو کہ عشق کا حیدری کی دقت پسندی کے باعث کوئی تصویر واضح نہیں ہوتی اور نہ کوئی تاثر ہی پیدا ہوتا ہے ۔ حیدری کی رنگین بیانی بے حد بے کیف ہے ۔ اور طبع پر گراں گزرتی ہے ۔ سراپا نگاری کی یہ مثال ملاحظہ ہو ۔ انداز بیان کسقدر پر تصنع اور بے کیف ہے :-

”چاند سے مکھڑے پر زلف مشکیں کو چھوڑ دیا ۔ کانوں میں موتیوں کے گچھے ڈال کر بناؤ کیا ۔ عشوہ و ناز کو جادو کے ہنر سکھائے ۔ عقدۂ پرویں کو ماہ سے ملایا ۔ بال بال موتی پرو دیا ۔ فریب کا سرمہ اپنی نرگسی انکھڑیوں میں دیا ۔ نازو انداز پر نظر رکھ کر اپنے سرو سے قد کو کیسریا جوڑے سے ارغوانی کیا ۔ سراپا کو بخوبی سنوارا ۔ تاج عبہر سر پر رکھا“[1]

حیدری نے خال خال مقامی الفاظ اور ضرب الامثال کا بھی استعمال کیا ہے ۔ لیکن انکی دقت پسندی اور مسجع انداز بیان ان سب پر غالب ہے ۔

حیدری نے اشعار کا استعال کثرت سے کیا ہے ۔ اوّل تو پر تصنع اسلوب دوم یہ اشعار قصہ کی

---

[1] گلزار دانش (مطبوعہ) حیدر بخش حیدری مرتبہ عبادت بریلوی ص ۱۹۱ ۔

روانی میں بے حد مانع ہوئے ہیں۔ توتا کہانی کے مصنف کے قلم سے ایسی زبان اور اسلوب دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

۱۶

بحر عشق (قصہ سیف الملوک)

سیّد منصور علی

"بحر عشق" کا ماخذ محمد عمر کی فارسی مثنوی ہے۔ اسے منصور علی نے گل کرسٹ کی فرمائش پر ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء میں "زبان ریختہ نثر" میں ترجمہ کیا۔ بحر عشق کے دیباچے میں منصور علی لکھتے ہیں:۔

"یہ قصہ سیف الملوک شاہزادے کا کہ جس کو محمد عمر نے اپنے دوستوں کے کہنے سے عبارت فارسی میں بطور مسنوی (کذا) کے لکھا تھا سواب یہ کمترین .... سید منصور علی .... نے عہد میں شاہ عالم بادشاہ خلد اللہ ملکہ کے اور حکومت میں زبدۂ نوئیناں .... مارکویس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ کی بموجب ارشاد صاحب عالی .... مسٹر جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام دولتہ کے سن بارہ سو اٹھارہ ہجری میں مطابق اٹھارہ سو تین عیسوی کے زبان ریختہ نثر میں ترجمہ کیا .... اور نام اس کتاب کا بحر عشق رکھا۔"[1]

---

[1] دیباچہ بحر عشق۔ سید منصور علی (ق۔ن) ورق ۲، ۳۔

بحر عشق طبع نہ ہوسکی۔ حالانکہ گل کرسٹ کی ۱۹ راگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں یہ طباعت کے لئے درست کی جانے والی کتابوں کے ذیل میں شامل تھی[1] لیکن دیگر کتابوں کے ساتھ اسکی طباعت بھی ملتوی کرادی گئی۔ گل کرسٹ نے اس پر دو سو روپے انعام کی سفارش کی تھی۔ بحر عشق کا ۱۲۹ اوراق کو محیط قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں محفوظ ہے۔ اس نسخے کے خاتمے کی عبارت یہ ہے :۔

"رمضان کی انیسویں تاریخ منگل کے روز سنہ بارہ سو اٹھارہ ۱۲۱۸ھ

ہجری میں مطابق ۱۸۰۳ء اٹھارہ سو تین عیسوی کے اس کتاب بحر عشق کا ترجمہ تمام ہوا۔

بحق محمد و آلہ الطاہری صلوات اللہ علیہ وعلیہم اجمعین ۔ دوھرہ

لکھارے دن برس جوں نہ مٹا دے کوئے لینکھن ہارا باپرا سو گل مانٹی ہوئے"[2]

بحر عشق اپنے ماخذ کا ہو بہو ترجمہ نہیں ہے۔ بلکہ مترجم نے اس میں اضافے سے بھی کام لیا ہے۔ منصور علی خود کہتے ہیں کہ :۔

"اکثر اس میں زیادتی جہاں مناسب جانی وہاں کی ...."[3]

بحر عشق میں مذکور سیف الملوک کا قصہ حسن وعشق کی واردات، جان لیوا مہمات اور طلسمی واقعات سے عبارت ہے۔ یہ قصہ عام داستانی انداز سے قدرے مماثلت رکھتے ہوئے بھی ذرا مختلف ہے۔ اس قصے کا انجام قصداً طویل کرکے ڈیڑھ سو برس کے بعد شہزادی بدیع الجمال کی موت تک لایا گیا ہے جس کے غم میں سیف الملوک پاگل ہوجاتا ہے۔ اسطرح اس داستان کا انجام عام داستانوں

---

[1] Proceedings of the College of F. W. Vol. 559, P. 279

[2] [3] بحر عشق (ق.ن) سید منصور علی ورق ۱۲۹، ۳۔

کیطرح طربیہ نہ ہوکر المیہ ہے۔

اس داستان کا آغاز قدیم طرز پر ہوتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے عہد میں مصر میں شاہ عاصم نام کا بادشاہ تھا۔ اپنی لاولدی سے آزردہ خاطر ہوکر اس نے تخت و تاج چھوڑکر گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ یہ بات جب اسکے وزیر صالح ابن حمید کو معلوم ہوئی تب اس نے بادشاہ کو سمجھایا اور سلطنت کی جانب راغب کیا۔ رمل اور نجوم کے عالموں سے رجوع کرنے پر پتہ چلا کہ بادشاہ صاحب اولاد ہوگا لیکن اس صورت میں کہ جب وہ شاہ یمن کی بیٹی دلآرام سے عقد ثانی کرے۔ بہرحال دلآرام کے بطن سے سیف الملوک تولد ہوا۔ اسی دن وزیرزادہ صاعد کی بھی ولادت ہوئی۔ ان دونوں کی ساتھ ہی پرورش اور تعلیم و تربیت بھی عمل میں آئی۔ نجومی شہزادے کے لئے چودہ برس کی عمر خطرناک قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ اس عمر کو پہنچا تو بادشاہ عاصم نے ایک جشن منعقد کیا اور شہزادے کو ایک جامہ تحفے میں دیا۔ اسکے نقش و نگار میں اسے ایک شہزادی کی تصویر نظر آئی۔ شہزادہ اس کے عشق میں گرفتار ہوکر اس کی تلاش میں حیران و پریشان نکل کھڑا ہوا۔ بڑے سخت اور دشوار گزار مراحل سے گزرنے کے بعد سراندیپ کی شہزادی کے ذریعے شہزادے کو اپنی معشوقہ پریوں کی شہزادی بدیع الجمال کا سراغ ملا۔ جب بدیع الجمال گلستان ارم سے سراندیپ کی شہزادی سے ملنے آئی تو شہزادے کو وہاں دیکھ کر عاشق ہوگئی۔ اس کے بعد دیگر صعوبتوں اور اذیتوں سے گزرکر شہزادہ سیف الملوک نے بدیع الجمال سے عقد کرلیا۔ شہزادے نے وزیرزادے صاعد کی شادی سراندیپ کی شہزادی سے کروائی اور سب لوگ مصر کے لئے روانہ ہوئے۔ بادشاہ، بیگم اور دیگر اراکین سلطنت انہیں دیکھ کر باغ باغ ہوئے۔ شہزادہ تخت نشین ہوا اور صاعد وزیر۔ سیف الملوک کے پانچ شہزادے ہوئے۔ بدیع الجمال ڈیڑھ سو برس زندہ رہی۔ اسکی موت سے سیف الملوک غم میں دیوانہ ہوگیا۔ یہی قصے کا انجام ہے۔

سیف الملوک اور بدیع الجمال کی اس رنگین داستان میں حسن و عشق کی رنگینیاں بھی ہیں

اور ہجر و فراق کی ہولناکیاں بھی۔ یہاں بزم آرائیاں بھی ہیں اور رزم آرائیاں بھی۔ دیو، پری، طلسمات
مہیں غرضیکہ داستانوی عناصر کی خوب کارفرمائی موجود ہے لیکن قصے کا پلاٹ مربوط نہیں۔ درمیان
میں وقوع پذیر واقعات نے قصے کو الجھا دیا ہے۔ اس سے دلچسپی بھی متأثر ہوئی اور قصے کا تسلسل بھی۔
اسکے کرداروں میں کوئی تازگی اور نیا پن نہیں ہے۔ شہزادہ اور بدیع الجمال کے کردار اپنے
طور پر موزوں اور مناسب ہیں۔ انمیں عشق کا شدید جذبہ اور وصل کی بے پناہ تڑپ موجزن ہے۔

بحرِ عشق کی زبان کے بارے میں منصور علی نے دیباچے میں یہ وضاحت کی ہے کہ :۔

".........زبان ریختہ نثر میں ترجمہ کیا اور اکثر[1] (کذا) ان لفظوں کو کہ
جنہیں خاص و عام ہند و مسلمان سب بولتے ہیں صاحبان نو آموز کے استفادے
کے واسطے قصداً تحریر میں لایا اور بعضے بعضے اشعار فارسی کے متفرق جو اچھے
معلوم ہوئے۔ انکو بھی قرینہ پاکے لکھدیا۔"[2]

منصور علی نے اس داستان میں رنگین بیانی بھی کی ہے اور سادہ نگاری بھی۔ لیکن انکی
سادہ نگاری میر امن کی سی شگفتہ اور رواں نہیں بلکہ اس میں الجھاؤ ہے۔ خال خال زبان و الفاظ
کی فارسیت سادہ نگاری کو متأثر کر دیتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود قصے کے جذباتی اور اہم حصے
کیف سے خالی نہیں بلکہ صحیح اثرات مرتب کرتے ہیں۔ یہ مثال ملاحظہ ہو۔ شہزادہ دیوؤں کی قید سے
آزاد ہو کر آتا ہے اور بدیع الجمال کے محل میں آکر سو جاتا ہے۔ تب بدیع الجمال :۔

"شاہزادے کے گلے سے بے اختیار لپٹ گئی اور اسے جگا کر پوچھنے لگی کہ اے مونس
غم گسار و اے غریب دل فگار تو کس طرح اس اندھیرے کوئیں میں دکھ

---

[1] اکثر [2] دیباچہ بحرِ عشق (ق۔ن) سید منصور علی ورق ۳۔

سے کے دن بھرتا تھا اور کیوں کر اس قید شدید میں فراق کی راتیں کاٹتا تھا۔

میری چاہ میں اپنے تئیں چاہ غم میں ڈبویا، اور میری محبت میں اپنا چین و آرام یک لخت کھویا۔ حیف ہے کہ میں اس بیکسی میں شریک کیوں نہ ہوئی اور اس بے بسی میں رفیق کیوں نہ رہی۔ بے تحاشہ اٹھ کر اس کے پاؤں پر گر پڑا۔"[1]

منصور علی منظر کشی اور جزئیات نگاری کے فرائض سے بھی بخوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ ان کے بیانات اکثر طویل ہیں لیکن ذہن پر گراں نہیں گزرتے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"دیکھا کہ ایک محل بے بدل ولاثانی کہ ایسا روئے زمین پر ہونا ممکن نہیں ہے۔ جگمگا رہا ہے اور اس کے گنبدوں و میناروں کے سر آسمانوں کو لگے ہیں سارے در و دیوار ستون و تختے ماہی دنداں کے ہیں اور اس کے سامنے روشنیں (کذا) چمن بندیاں گل پھل کی نہایت لطائف کے ساتھ ہو رہی ہیں اور ہر ایک مکانات گویا عالم تصور ہے۔ دیکھ کر بہت خوش ہوا خیال کیا کہ شاید یہی میری معشوقہ کا مکان ہے کہ جس کا کوچہ خورد شہر اصفہان ہے۔"[2]

بحر عشق کے عنوانات میں منصور علی نے آسان انداز بیان اختیار کیا ہے۔ واقعات کے درمیان میں انہوں نے فارسی اور اردو کے اشعار و ابیات اور مثنوی کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ ان میں بیشتر اشعار تسلسل میں مانع ضرور ہوتے ہیں لیکن اپنے زمانے کے سیاق و سباق کے لحاظ سے ان کی تعریف کی جا سکتی ہے۔ بدیع الجمال کی تعریف میں منصور علی نے بہت اچھے اشعار کہے ہیں۔ ؎

وہ مکھڑا پری صاف آئینہ دار ۔۔۔ کہ ہوں مہر و مہ اسکے[3] (کذا) پر نثار

---

[1] بحر عشق (ق۔ن) سید منصور علی ورق ۱۰۷ [2] بحر عشق (ق۔ن) سید منصور علی ورق ۶۲ [3] منہ

وہ زلف اسکے چہرے پر بکھری ہے یوں — کہ ابر سیہ مہ کے ہو گرد جوں

لب لعل نازک وہ شیریں دہن — کہ ایک بات پر جان دے کوہ کن

چمک مسی کی ساتھ دانتوں کی یوں — کہ ہو ابر میں برق کی تڑپ جوں

جمی ہونٹھ پر مسی کی یوں دھڑی — ہو لعل بدخشاں میں جوں شب پڑی

وہ رخسارہ نازک گل نوبہار — کہ گلشن میں گل ان سے رکھتے تھے خار[1]

بحیثیت مجموعی بحر عشق اپنے موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے گوارہ ہے لیکن ابتدائی دور کی نثر کے سیاق وسباق میں منصور علی کی کاوش نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔

۱۷

قصہ فیروز شاہ
محمد بخش

محمد بخش نے فورٹ ولیم کالج کے لئے قصہ فیروز شاہ تصنیف کیا تھا۔ اسکا کوئی مطبوعہ نسخہ دریافت نہ ہو سکا۔ البتہ ۵۳ اوراق کو محیط ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں محفوظ ہے۔ زیر نظر قلمی نسخے میں مصنف کا اپنا کوئی بیان شامل نہیں ہے۔ چنانچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ قصہ مصنف کا طبع زاد ہے یا کہیں سے ماخوذ۔ خاتمے کی عبارت سے علم ہوتا ہے کہ قصہ فیروز شاہ ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء میں

---

[1] بحر عشق (ق۔ن) سید منصور علی ورق ۸۷، ۸۸۔

مکمل ہوا تھا:۔

"یہ مسودہ غرہ شہر شوال المکرم ۱۲۱۷ھ روز سہ شنبہ میں تمام ہوا۔"[1]

قصہ فیروز شاہ ۱۸۰۲ء تک طبع ہو چکا تھا. ۱۹ راگست ۱۸۰۲ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں گل گرسٹ نے اس پر ۵۰ روپے انعام کی سفارش کی تھی[2]۔ اس فہرست کی نامنظوری کے بعد اس نے ۹ رستمبر ۱۸۰۲ء کی فہرست میں بھی اسے شامل کیا اور رائے کے کالم میں لکھا تھا:۔

"A native of Hindoostan. This little production has been well spoken by Meer Sher Ulli."[3]

۱۰ راکتوبر ۱۸۰۲ء کی کالج کونسل کی کارروائی میں مندرجہ ذیل تبصرے کے ساتھ پچاس روپیہ انعام دینے کا فیصلہ کیا گیا:۔

"فیروز شاہ ۔ شہر بدخشاں کی کہانی ہے. زبان ٹھیک نہیں ہے اور طرز بیان بھی اچھا نہیں ہے لیکن حوصلہ افزائی کی جا سکتی ہے۔"[4]

لیکن قصہ کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زبان اور طرز بیان دونوں کے لحاظ سے یہ قصہ بہت عمدہ ہے. اگرچہ محمد بخش کی زبان حیدر بخش حیدری، میر امن یا میر شیر علی افسوس کے مقابلے کی نہیں پھر بھی بہت بہتر ہے. کالج کونسل کی مذکورہ بالا رائے زیادہ درست نہیں.

---

[1] قصہ فیروز شاہ (ق.ن) محمد بخش ورق ۵۰۔

[2] Proceedings of the College of F. W. Vol. 559, P. 279

[3] " " " " " " " " " " " " " P. 285

[4] " " " " " " " " " " " " " P. 287

قصہ فیروز شاہ ایک داستان ہے۔ اس میں تقریباً سارے داستانوی عناصر موجود ہیں۔

قصہ یوں ہے کہ شہر بدخشاں کے بادشاہ کے تین بیٹے تھے۔ ان کے نام فیروز شاہ، نوروز شاہ (دوسرے) بہروز شاہ ہیں۔ ملکہ سے ایک دن کچھ ایسی خطا سرزد ہوتی ہے کہ بادشاہ فیروز شاہ کے ساتھ اسے محل سے نکال دیتا ہے۔ ایک بار اچانک بادشاہ کے سینے میں درد اٹھتا ہے جسکا علاج حکیم گل دیوکندہ بتاتے ہیں۔ شہزادہ فیروز شاہ بادشاہ سے آکر اجازت لیتا ہے اور گل دیوکندہ کی تلاش میں نکلتا ہے۔ اپنی اس مہم میں ایک شہر سے گزرتا ہے۔ یہاں کے لوگ ایک موذی شیر سے پریشان رہتے ہیں۔ فیروز شاہ انہیں اس بلا سے نجات دلاتا ہے۔ اس کے صلے میں اسکی شادی وہاں کی شہزادی میمونہ سے کر دی جاتی ہے۔ اگلے مرحلے پر وہ ملک نارایب پہنچتا ہے۔ یہاں کی شہزادی آدم خور ہے اور بیمار ہے۔ شہزادہ اس سے بھی نپٹتا ہے اور شہزادی کو ٹھیک کرتا ہے۔ چنانچہ اس سے بھی اس کی شادی کر دیجاتی ہے۔ اس کے بعد فیروز شاہ ملک گیلان پہنچتا ہے۔ یہاں وہ ایک دیو کا خاتمہ کرتا ہے۔ لہٰذا اس کی بہادری پر گیلان کی شہزادی جیجن سے اسکا عقد کر دیا جاتا ہے۔ مقتول دیو کی دیوتی فیروز شاہ سے دیو کا سر مانگتی ہے مگر وہ اس کی بیٹی سے عقد کی شرط رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ ہمیاں پری سے شادی کر کے گل دیوکندہ کا پتہ پوچھتا ہے۔ ہمیاں پری بتاتی ہے کہ دیوکندہ بادشاہ جنیان کی رانی ہے اور اٹھارہ ہزار دیو اس کی فرمانبرداری کے لئے حاضر رہتے ہیں۔ وہیں گل دیوکندہ بھی ہے۔ فیروز شاہ رانی پر عاشق ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہمیاں پری کے جادو سے طوطی کی شکل میں وہ رانی تک پہنچتا ہے۔ وہ محو خواب ہے۔ فیروز شاہ گل دیوکندہ توڑ کر اور اپنی چیزیں رانی سے بدل کر لوٹ آتا ہے۔ اس بہادری پر رانی بھی عاشق ہو جاتی ہے۔ جب فیروز شاہ اپنے باپ کے پاس روانہ ہوتا ہے تو راستے میں اس کے دونوں سوتیلے بھائی اسے دھوکے سے کنویں میں ڈھکیل کر اور پھول لے کر بادشاہ کے پاس جاتے ہیں اور بادشاہ کو فیروز شاہ کی جانب سے بدظن بھی کرتے ہیں۔ ادھر رانی فیروز شاہ کی تلاش میں اس کی ساری بیویوں کو لیکر مع لشکر نکلتی ہے۔ آخر کار

فیروز شاہ کو کنویں سے نکال کر پورا قافلہ شہر بدخشاں روانہ ہوتا ہے. فیروز شاہ کے دونوں سوتیلے بھائی روپوش ہو جاتے ہیں. مگر دیو انکو ڈھونڈھ کر لاتے ہیں. اور کھا جاتے ہیں. اس کے بعد فیروز شاہ کی نئے سرے سے شادیاں ہوتی ہیں اور وہ تخت نشین ہوتا ہے.

قصہ فیروز شاہ کا پلاٹ دیگر داستانوں سے مماثلت رکھتا ہے. گل دیو کندہ کی تلاش اور فیروز شاہ کے بھائیوں کا اسے دھوکہ دینا قصہ گل بکاؤلی سے ملتا جلتا ہے. فیروز شاہ کی مہمیں حاتم طائی کی مہموں سے بڑی حد تک مشابہ ہیں. اس داستان میں یوں تو کوئی نیا پن نہیں لیکن واقعات کی مربوطی اور روانی نے اسے بہت دلچسپ بنا دیا ہے. فیروز شاہ کا کردار داستانوں کے عام ہیرو سے ہی مشابہ ہے. وہ بے حد جری اور بہادر ہے. ہر مہم سے بڑی دلیری اور دانشمندی سے نبرد آزما ہوتا ہے. وہ عشق کی صفت سے بھی متصف ہے. جس کی مثال ملکہ جنیان کا قصہ ہے.

قصہ فیروز شاہ کا اسلوب مناسب ہے. محمد بخش نے عموماً آسان انداز بیان اختیار کیا ہے. وہ اس داستان کے ہر واقعہ کو بڑی سادگی سے بیان کر گئے ہیں. چنانچہ یہ بیانات واقعہ کی اصل تصویر کو پیش کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہیں. فیروز شاہ اور شہزادی میمونہ کی شادی کا یہ بیان ملاحظہ ہو:-

"شہزادے کی شادی میمونہ شہزادی سے بڑے دھوم دھام سے ہوئی. اور وزیروں امیروں سرداروں کو خلعت زریں مواقع رتبے کے عنایت کئے اور تورے ہر ایک کے یہاں بھجوایئے (کذا) غریب غربا رفقیر فقرار کو بھی اقسام کے کھانے کھلوایئے (کذا) القصہ یہاں تک بخشش کی اور لاکھوں روپے بٹوائے کہ اس شہر میں کوئی محتاج نہ رہا. پھر بادشاہ نے ایک قصر شاہی رہنے کے واسطے انہوں کو دیا اور خوبصورت کمسن خواصیں چھوٹے عمر کے غلام خوش پاکیزہ خو خدمت کے لئے بخشے تب فیروز شاہ شہزادہ بدخشاں کا اور شہزادی شہر خاب کی دونوں عیش و

جیش کرنے لگے ۔" [1]

قصہ فیروز شاہ میں محمد بخش کا انداز بیان قصہ گوئی کے زیادہ نزدیک ہے وہ خوامخواہ طوالت اور پیچیدگی پیدا کرنے کے لئے پرشکوہ الفاظ کا استعمال نہیں کرتے بلکہ چھوٹے چھوٹے اور مختصر جملوں میں اپنی بات کہدیتے ہیں۔ یہ جملے ہماری بول چال سے بھی بہت قریب ہیں۔ کہیں کہیں فارسی تراکیب اور الفاظ بھی نظر آجاتے ہیں۔ یہ مثال ملاحظہ ہو۔ قصے کے آغاز میں بادشاہ کا ذکر کتنا جامع اور مکمل ہے :۔

"شہر بدخشاں کا شہریار خجستہ اطوار اور مبارک کردار تھا۔ چار اس کے خاص محل تھے۔ اور تین بیٹے۔ ایک کا نام فیروز شاہ، دوسرے کا نام نوروز شاہ، تیسرے کا نام بہروز شاہ۔ شاہ غرض نہایت عدل وانصاف سے بادشاہی کرتا تھا اور اسے کسی طور کا غم نہ تھا۔ ؎

کرے تھا وہ شاہی خوشی سے مدام ۔۔۔ گزرتی تھی اوقات خوش صبح وشام
نہ تھی ناچ اور رنگ بن کوئی بات ۔۔۔ پکھاوج کی پڑتی تھیں تانوں کے ساتھ۔" [2]

---

[1] قصہ فیروز شاہ (ق۔ن) محمد بخش ورق ۹۔

[2] ۔ " " " ورق ۱۔

(۱۸)

حسن و عشق (گل و ہرمز)

غلام حیدر عزت

حسن و عشق کا قصہ محمد وارث کے فارسی قصے سے ماخوذ ہے جسے محمد وارث نے فارسی مثنوی گلشن عشق سے نثر میں بطور خلاصہ منتقل کیا تھا۔ غلام حیدر نے ۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۲ء میں گل کرسٹ کے حکم سے اس خلاصے کو اردو میں منتقل کیا۔ سبب تالیف میں وہ بیان کرتے ہیں :۔

"خردمندوں پر یہ پوشیدہ نہ رہے کہ اس قصہ دلآویز کو کسی استاد کامل نے فارسی نظم میں کر آب گلشن عشق نام رکھا تھا۔ ازبسکہ اس کی تمہید طویل اور الفاظ دقیق اور عبارت رنگین اور صنعت اشعار اور فصاحت گفتار کے سبب سے مطلب فہمی میں توقف ہوتا تھا اس واسطے منشی المناشی محمد وارث نے اسے مختصر کر نثر میں لکھا ہے۔ اب غلام حیدر عزت نے ۱۲۱۸ھ[1] بارہ سو اٹھارہ ہجری قدسی سلطنت میں شاہ عالم بادشاہ .... کی اور حکومت میں .... مارکوئس ولزلی گورنر جنرل لارڈ مارنگٹن بہادر کی حسب حکم مسٹر جان گل کرسٹ بہادر دام حشمتہٗ کے زبان ریختہ میں نثر کیا اور حسن و عشق نام رکھا۔ اور اس

---

[1] جاوید نہال نے ۱۲۱۹ھ مطابق ۱۸۰۴ء نقل کیا ہے (انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۳۸۲) جو صریحاً غلط ہے

لحاظ سے کہ یہ اصل اصل اوّل کے مضمون کا ترجمہ ہے نہ الفاظ اور عبارت کا،
عاصی نے مطلب نویسی میں اقدام کر بعضے مقام میں الفاظ کا ترجمہ موقوف کیا
اور بعضے فقرے مبالغے کے کہ ہندی محاورے کے موافق نہ تھے موقوف کر اور
طرح سے لکھے۔"[1]

حسن و عشق غیر مطبوعہ ہے۔ اسکا ۱۷۹ اوراق کو محیط قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے اور آغاز میں فورٹ ولیم کالج کی مہر ثبت ہے۔

گل کرسٹ کی ۱۹ راگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست سے علم ہوتا ہے کہ اسوقت حسن و عشق طباعت کے لئے درست کی جانے والی کتابوں کے ذیل میں شامل تھی۔ اس کے صفحات کی تعداد ۲۰۰ اور انعام کی رقم سو روپے تھی۔[2] مذکورہ فہرست میں حسن و عشق کے بجائے "گل و ہرمز" نام درج ہے۔ لیکن کالج کونسل نے اس پوری فہرست پر غور کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ گل کرسٹ نے ۹ رستمبر ۱۸۰۳ء کو ایک دوسری فہرست پیش کی جو کالج کے بے ضابطہ مصنفین کی تصانیف پر مشتمل تھی اسمیں حسن و عشق بھی شامل تھی۔ گل کرسٹ نے رائے کے کالم میں لکھا تھا:۔

" An exellent translation from the Persian by a native of Bengal."[3]

---

[1] دیباچہ حسن و عشق (ق۔ن) غلام حیدر عزت ورق ۲۔

[2] Proceedings of the College of F.W. Vol. 559, P. 279

عتیق صدیقی نے انعام کی رقم ۱۵۰ روپے درج کی ہے (گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۱۷۵) جو غلط ہے۔

[3] Proceedings of the College of F.W. Vol. 559, P. 285

۱۰ اکتوبر ۱۸۰۳ء کی کالج کونسل کی کاروائی میں مندرجہ ذیل تبصرہ کے ساتھ سو روپے انعام کی تجویز منظور کر لی گئی :۔

"گل و ہرمز۔ زبان اگرچہ صحیح نہیں ہے لیکن موضوع سے مناسبت رکھتی ہے۔

انعام بہرحال گل کرسٹ کی تجویز کے مطابق دیا جا سکتا ہے"[1]

حسن وعشق میں روم کے شہزادے ہرمز اور شاہ خوزاں کی بیٹی شہزادی گل کے عشق کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ شاہ روم بے اولاد تھا۔ ایک فقیر کے ذریعہ تدبیر بتانے پر وہ خواب میں بشارت پاتا ہے کہ اس کے یہاں شہزادہ ہوگا اور شہزادے کا نام ہرمز رکھنا لازم ہے۔ بادشاہ کی ایک حرم حاملہ ہوتی ہے۔ بادشاہ بیگم حسد میں حمل اسقاط کروانا چاہتی ہے۔ لیکن وہ جس دائی کو شریک راز کرتی ہے وہی بادشاہ کی حرم سے یہ راز کہہ دیتی ہے اور جب ہرمز تولد ہوتا ہے تو وہ دائی اسے لیکر ملک سے نکل جاتی ہے اور شہر خوزاں پہنچتی ہے۔ ہرمز کی ماں ایک انگوٹھی اور رومال بادشاہ روم کی نشانی دائی کو دیدیتی ہے تاکہ بادشاہ آئندہ اسی سے ہرمز کو پہچان لے۔ خوزاں پہنچ کر دائی بھوک اور پیاس کی شدت سے شاہ خوزاں کے باغباں بہمن کے دروازے پر بے ہوش ہوکر گر جاتی ہے۔ وہ باغباں اسے اٹھاکر اپنے گھر میں لاتا ہے اور ہرمز کو اپنا بیٹا بناکر پرورش کرنے لگتا ہے۔ ہرمز اور شہزادے کی باہم دوستی ہو جاتی ہے۔ لیکن بادشاہ اسے پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ انہیں جدا کر دیا جاتا ہے۔ شاہ خوزاں کی شہزادی گل شاہ ایران سے منسوب ہے مگر ایک دن باغ کی سیر کے دوران ہرمز کو دیکھ کر عاشق ہو جاتی ہے اور اسکے فراق میں مضطرب رہتی ہے۔ ہرمز بھی گل پر عاشق ہوتا ہے۔ نتیجتاً گل شاہ ایران سے طے شدہ شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ انکار کی صورت میں شاہ ایران حملہ آور ہوتا ہے۔ چنانچہ ہرمز بھی شریک جنگ ہوتا ہے اور فتح ہوتی ہے۔ شاہ خوزاں شاہ روم کو خراج دیتا تھا۔ ہرمز خراج لے کر روم جاتا ہے۔ یہاں

[1] Proceedings of the College of F. W. Vol. 559, P. 287

شاہ روم ہرمز کو اپنا بیٹا بنا کر رکھ لیتا ہے اور ہرمز کی ماں اسکا راز بادشاہ سے بیان کر دیتی ہے۔ ادھر گل ہرمز کی جدائی میں مضطرب رہتی ہے۔ بادشاہ ہرمز سے سلطنت کے کاموں میں دلچسپی لینے کو کہتا ہے لیکن وہ ایک بار خوزاں جانے کی اجازت مانگتا ہے۔ جب وہ خوزاں آتا ہے تو یہاں سارا شہر نیست و نابود پاتا ہے۔ ایک دہقان کی زبانی اسے شاہ ایران کے حملے اور گل کے اغوا کا علم ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ گل کے حصول کے لئے نکلتا ہے۔ بڑے سخت امتحانات اور دشوار گزار مراحل سے گزر کر وہ گل کو حاصل کر لیتا ہے لیکن گل پھر کھو جاتی ہے اور اس بار چین کے بادشاہ کے پاس پہنچتی ہے۔ ہرمز اسے یہاں سے بھی حاصل کر لیتا ہے۔ اور ان دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ ہرمز روم کا بادشاہ بنتا ہے۔ ان تمام مہمات میں ہرمز کے ساتھ حسنہ اور مہر افروز نام کی دو عورتیں لگی رہتی ہیں لیکن وہ حسنہ کو اسکی بدخواہی کی بنا پر قتل کروا دیتا ہے۔ اور مہر افروز سے نکاح کر لیتا ہے۔

گل و ہرمز کی یہ داستان بہت دلچسپ ہے۔ اس قصے میں یوں تو مافوق الفطرت عناصر ناپید ہیں لیکن مہمات اور رزم آرائیوں کے نمونے کثرت سے ملتے ہیں۔ پلاٹ بہت ہی مربوط ہے۔ درمیان میں دو ایک ضمنی کہانیاں بھی ہیں لیکن ان سے قصے کو آگے بڑھنے میں مدد ملتی ہے۔

"حسن و عشق" کے نمایاں ترین کرداروں میں گل و ہرمز کے کردار قابل ذکر ہیں۔ گل قصے کی ہیروئن ہے۔ وہ بہت ہی وفادار ہے۔ اور ہر مصیبت و آزار سے برد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ وہ بے حد حسین ہے۔ اس کے حسن کا بیان ملاحظہ ہو:۔

> "خوبصورت ایسی تھی کہ چودھویں رات کا چاند اسے دیکھ داغ کھاتا اور آفتاب ... ابر کے تلے منھ چھپاتا کبھی جو باغ کی سیر کو نکلتی تو بلبلیں اس کے گل رخسار پر غزلیں پڑھتیں اور کبھی جو محل میں بیٹھ عیش کرتی تو قمری اور فاختہ کوکوکیا کرتیں۔ اس کی صورت کی تعریف ہر ملک میں مشہور ہوئی۔ اکثر بادشاہ اس کی تصویر منگا کر

دیکھتے ہی عاشق ہو جاتے۔"[1]

ہرمز سے عشق کے بعد وہ جسطرح شاہ ایران سے شادی کے لئے انکار کرتی ہے۔ یہ واقعہ اسکی باغیانہ فطرت کی نشاندہی کرتا ہے۔ اپنے عشق کی بنا پر وہ بڑی بڑی اذیتیں برداشت کرتی ہے۔

ہرمز اس قصے کا ہیرو ہے۔ شروع میں عشق و محبت کی باتوں سے بیزار رہتا ہے۔ چنانچہ ایک بار گل اپنی دائی کو ہرمز کے پاس بھیجتی ہے تو وہ کہتا ہے:-

"کہو کیا مطلب تمہارا ہے اور تم کس ارادے سے یہاں آئی ہو۔ دائی نے عرض کیا کہ بادشاہ کی بیٹی گل بانو تم پر عاشق ہوئی ہے اور ملاقات کے لئے تمہارے تئیں بلایا ہے۔ جب ہرمز نے بادشاہ کی بیٹی کا نام سنا تو بہت غصے ہو کر چلا اٹھا کہ مکاری ٹھگنی میرے سامنے سے دور ہو۔ یہ بات میں نہیں سنتا اگر پھر کبھی ایسی بات کہے گی تو سزا پاوے گی۔ مجھ کو تیرے شہزادے کی دوستی سے جو فایدہ ہوا سو یہی ہے کہ اس باغ کے کنج میں اکیلا پڑا ہوں اور غم و غصے میں حیران ہوں۔ اب تیری شہزادی کی دوستی سے مجھے کیا حاصل ہوگا۔"[2]

لیکن جب وہ گل کے عشق میں گرفتار ہوتا ہے تو اس کے لئے میدان جنگ کی سختیوں سے لے کر مختلف قسم کی مہمات سے گزر جاتا ہے۔ وہ اپنے عشق میں صادق ہے اور ہر مصیبت سے گزر جانیکا حوصلہ رکھتا ہے۔

غلام حیدر نے "حسن و عشق" میں آسان، رواں اور بامحاورہ اسلوب اختیار کیا ہے اس سے قصے کی دلکشی میں اضافہ ہوا ہے۔ حالانکہ اس اسلوب میں بھی زبان کی بعض خامیاں ملتی ہیں۔ اس

---

[1] حسن و عشق (ق.ن) غلام حیدر ورق ۱۳۔

[2] ؎ " " " " ورق ۱۹-۲۰۔

قصے کے جذباتی بیانات بہت عمدہ ہیں۔ خال خال رنگین بیانی کے نمونے بھی ملتے ہیں چونکہ مجموعی طور پر سادہ اسلوب رواں دواں ہے اس لئے ایسے مقامات ناگوار نہیں گزرتے۔

۱۹

بہارِ عشق (ترجمہ نل دمن)

سیّد نور علی

"بہارِ عشق" فیضی بن مبارک کی فارسی مثنوی "نل دمن" (۱۰۰۳ھ / ۱۵۹۴ء) سے ماخوذ ہے۔ نل دمن کا قصہ ہندوستان کے قدیم ترین قصوں میں سے ہے۔ یہ قصہ مہا بھارت سے اخذ کیا گیا ہے۔ اور دنیا کی مختلف زبانوں میں اسکا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے نل دمن کے قصے پر مبنی اردو کے تین نثری نسخوں کی نشاندہی کی ہے۔ اوّل الٰہی بخش شوق کا یہ فیضی سے ماخوذ ہے اسکا سنہ ترجمہ ۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۲ء ہے۔ دوم رگھوناتھ کا مطبوعہ نسخہ۔ سوم نامعلوم مترجم کا ۱۸۳۱ء کا مطبوعہ نسخہ فارسی زبان میں سب سے پہلے فیضی نے ترجمہ کیا تھا[۱]۔ گارسن دی تاسی نل دمن کے بارے میں کہتا ہے:-

"ہندوستان میں جو اس پر بے شمار نظمیں لکھی گئی ہیں انہیں یورپ میں کوئی نہیں جانتا۔ بلکہ وہاں مہا بھارت کی وجہ سے مشہور ہوا۔ سب سے مشہور ہندی کے نامور شاعر سورداس کی نظم ہے۔ آخر میں میر علی[۲] بنگالی کی تالیف ہے جسکا نام

---

[۱] ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں۔ گوپی چند نارنگ ص ۱۷، ۲۲۔ [۲] نور علی کا نام اکثر جگہوں پر میر نور علی بھی لکھا گیا ہے۔ بنگال کے رہنے والے تھے اس رعایت سے گارسن دی تاسی نے انہیں میر علی بنگالی لکھا ہوگا۔

بہارِ عشق ہے[1]

بہارِ عشق میں نور علی نے فیضی کے قصے کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے یہ ترجمہ کالج کونسل سے انعام حاصل کرنے کی غرض سے کیا تھا۔ وہ سببِ تالیف میں بڑی وضاحت سے بیان کرتے ہیں :-

"سبب ترجمے کا یہ ہے داناؤں پر مخفی نہ رہے کہ ایک دن بیٹھے بیٹھے اس ہیچ مداں کے دل میں یوں گزرا کہ اکثر اشخاص کونسل کے اشتہار کے بموجب کتب فارسی زبان ریختے میں ترجمہ کرتے ہیں اور حضور میں نذر گزران اپنے اپنے دامنِ امید کو صلہ و انعام کے در و گوہر سے بھرتے ہیں اور سرخ روئی حاصل کرتے ہیں۔ اگر تو بھی کسی کتاب کا ترجمہ کر کونسل میں نذر گزرانے، یقین ہے کہ اپنے شجرِ مدعا سے خاطر خواہ پھل پاوے اور آیندہ کو بھی میری ایک یادگاری رہ جاوے۔ اس لئے خاکسار نے نل دمن فیضی کا خلاصہ مطلب لے کر واسطے پڑھنے صاحبان متعلم کے زبان ریختہ اردو میں ترجمہ کرنا شروع کیا۔ بارے فضل باری سے کتاب مذکور کا آغاز و انجام عہد حکومت میں ....
لارڈ منٹو گورنر جنرل .... کے وقت میں .... ڈاکٹر ولیم ہنٹر صاحب دام حشمتہ کے جو کالج کے حامی و حافظ ہیں .... اور ایام خجستہ انجام میں .... کپتان ولیم ٹیلر صاحب .... کے جو مدرس کالج تفریق ہندی ہیں بخیر و خوبی ہوا۔"[2]

خاتمے کی عبارت سے علم ہوتا ہے کہ بہارِ عشق کا ترجمہ ۱۸۱۰ء میں مکمل ہوا :-

"............ ۱۲۲۵ھ ہجری، شہر شعبان کی پانچویں مطابق ۱۸۱۰ء عیسوی چوتھی

---

[1] خطباتِ گارساں دی تاسی۔ مرتبہ عبدالحق ص ۱۵۵۔ [2] بہارِ عشق (ق۔ن) نور علی ورق ۷، ۸، ۹۔

ستمبر میں یہ ترجمہ بخوبی انجام و انصرام کو پہنچا اور اسکا نام بہار عشق رکھا۔[1]

بہار عشق کے اختتام پر مرزا کاظم علی جواں کا ایک ستائشی قطعہ درج ہے جس سے سنہ تالیف بھی دریافت ہوتا ہے ؎

قطعہ

بلبل طبع میر نور علی ۔ ہے جو دل خستۂ بہار عشق

زمزمہ سنج یوں ہوئی کہ سنے ۔ حرف برجستۂ بہار عشق

جوں بانجام اے جواںؔ پہنچا ۔ راز سربستۂ بہار عشق

کہی بے پائے رنج یوں تاریخ ۔ ہے یہ گلدستۂ بہار عشق[2]

۱۲۲۸ – ۳ = ۱۲۲۵ھ

نور علی کو اس ترجمے پر کالج کونسل نے پچاش روپے بطور انعام عطا کئے تھے۔[3]

بہار عشق غیر مطبوعہ ہے۔ ۱۵۷ اوراق پر مشتمل اسکا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔

چونکہ اس قصے کا تعلق ہندوستان کی سرزمین سے ہے۔ لہٰذا اس میں شروع سے آخر تک ہندوستانی فضا جاری و ساری نظر آتی ہے۔ بہار عشق میں راجہ نل اور شہزادی دمن کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اجیّن کا عاشق مزاج راجہ نل ایک تخیلی پری پیکر کے عشق میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اور اسکے فراق میں راجہ کی حالت غیر رہتی ہے۔ راجہ کے ندیم قیاس کرتے ہیں کہ ہونہ ہو یہ دمن کے "تنور عشق سے طوفان اٹھا ہے"۔ چنانچہ وہ راجہ کو دمن کی کہانی سناتے ہیں۔ دمن ملک بدر کے راجہ کی بیٹی ہے۔

---

[1] بہار عشق (ق.ن) نور علی ورق ۱۵۵، ۱۵۶۔

[2] " " " " ورق ۱۵۷۔

[3] فورٹ ولیم کالج (ہندی) لکشمی ساگر وارشنے ص ۱۰۲۔

ادھر دمن بھی نادیدہ ہی راجہ کے عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ اور ایک بت اور برہمن کی تصویر بنا ک
پرستش کرنے لگتی ہے۔ ایک روز راجہ دمن کے پاس ایک مرغ کے ذریعے نامۂ شوق بھیجتا ہے۔ اس کے
جواب سے راجہ پر دمن کے عشق کا حال کھلتا ہے۔ اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ دمن کے
ماں باپ بھی اسکی شادی کے لئے مختلف راجاؤں کے پاس پیغام بھیجتے ہیں چنانچہ شادی کے دن
دمن پھولوں کا ہار لے کر نکلتی ہے۔ دو تین پری زاد جو دمن کے عاشق تھے۔ نل کی شکل بنا کر کھڑے
ہو جاتے ہیں لیکن دمن اپنی عقل سے کام لے کر راجہ نل کے ہی گلے میں ہار ڈالتی ہے۔ اور راجہ دمن کو
لے کر اجین آتا ہے۔ ایک دن راجہ کا چھوٹا بھائی اسے شطرنج کھیلنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس میں راجہ
اپنا مال و متاع سب ہار جاتا ہے۔ چنانچہ چھوٹا بھائی انہیں ملک بدر کر کے خود تخت سنبھالتا ہے۔ نل
اور دمن دونوں صحرا کی جانب چلے جاتے ہیں۔ نل سے دمن کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی اور وہ اسے چھوڑ کر
فرار ہو جاتا ہے۔ دمن اسے تلاش کرتی ہے۔ دمن کے ماں باپ کو جب ان حالات کا علم ہوتا ہے تو وہ اسے
بلا لیتے ہیں۔ پھر نل بھی آتا ہے۔ اور شطرنج کے سارے جوہر سیکھ کر لاؤ لشکر سے اجین کیلئے روانہ
ہوتا ہے اور اپنے بھائی سے صلح کی گفتگو کے بعد شطرنج کھیلتا ہے۔ آخر کار جیت جاتا ہے اور حکومت کرنے
لگتا ہے پھر جب اسے اپنی حالت بہتر نہیں معلوم ہوتی تو اپنے بڑے بیٹے کو تخت پر بٹھا کر خود عبادت میں
معروف ہو جاتا ہے اور مر جاتا ہے۔ کچھ دنوں بعد دمن بھی مر جاتی ہے

نل اور دمن کی یہ داستان بے حد دلچسپ اور جاندار ہے۔ اس میں نہ تو غیر ضروری اور ضمنی
واقعات و حادثات کی کثرت ہے اور نہ طلسمی فضا و ماحول کی۔ قصے کی فضا مکمل طور سے ہندوستانی ہے۔
اس میں جا بجا ہندوستانی تہذیب کا رنگ نمایاں ہے۔

راجہ نل کا کردار کاہل اور بے عمل انسان کا ہے۔ وہ عشق کا شدید جذبہ ضرور رکھتا ہے لیکن اس
عشق کے لئے آزار و مصیبت سے ٹکرانے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ اس کی سب سے نمایاں مثال اسکا

وہ اقدام ہے جب وہ جنگل میں تنہا اور بے کسی کے عالم میں دمن کو چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے۔ ہاں دمن نہ صرف یہ کہ اپنے عشق میں صادق ہے بلکہ عقل مند اور مختلف حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

نور علی نے بہار عشق میں عموماً رنگین بیانی کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ نہ صرف فارسی الفاظ سے گرانبار عبارتیں لکھتے ہیں بلکہ کثرت سے ابیات کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ اس وجہ سے قصے کا لطف مجروح ہو کر رہ گیا ہے۔ خصوصاً قصے کے آغاز میں وہ ادبی زبان کا استعمال کرتے ہیں :۔

"قصہ کوتاہ ہندوستان کی سرزمین بہشت آئین میں اجین کی اطراف وکناف میں نل نامے ایک راجہ توم کا برہمن عاشق تن تھا۔ سدا آتش عشق میں جلتا تھا اور شمع کی مانند پگھلتا تھا باوجود عقل و دانش کے پنجۂ عشق میں گرفتار تھا اور آوارۂ دشت ادبار۔ اگرچہ وہ جمیع اوصاف سے مشہور اور فضل و ہنر میں مصروف تھا لیکن مقتضائے جوانی سے تذکرۂ عشق میں اوقات بسر کرتا تھا اور آٹھوں پہر اس نسخے پر دھیان دھرتا تھا۔"[1]

قصے کے درمیان میں سادہ نگاری کے نمونے بھی نظر آجاتے ہیں۔ لفظی تصنعات نے قصے کے ان حصوں کو ناکام بنا دیا ہے جو زور بیان سے تاثیر میں شدت اور سوز و گداز کی کیفیت و فضا پیدا کر سکتے تھے۔ نور علی نے اس قدر بے جان پیکر نگاری اور جزئیات نگاری کی ہے کہ یہ ہمارے سامنے واضح تصویر بھی نہیں پیش کرتیں۔ بہار عشق کی ابیات بے حد بے کیف اور بے مزہ ہیں۔ مثلاً ؎

عقل و شعور میں وہ ممتاز شاہان جہاں میں تھا سرافراز

---

[1] بہار عشق (ق۔ن) ، نور علی ورق ۱۰، ۱۱۔

تھا اگرچہ کمال میں وہ کامل ‏ پر عشق پر یہ اسکا دل تھا مائل

تھا کینے میں شیر پیشۂ رزم ‏ تھا مہر میں وہ موافق بزم

با فضل و ہنر کمال دانش ‏ با عقل و شعور و ہوش و بینش

کرتا تھا حدیث حسن دل سے ‏ سنتا حدیث عشق دل دے [1]

بحیثیت مجموعی بہار عشق کی زبان شگفتہ اور رواں نہیں۔ اسلوب کے تصنع اور آورد نے قصے کی فضا کو مجروح کر دیا ہے۔

---

(۲۰)

قصہ دِل آرام وَ دِلرُبا

توتارام

قصہ دل آرام و دلربا توتارام کی طبع زاد تصنیف ہے۔ اسے انہوں نے ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں تصنیف کیا تھا۔ قصے کے منظوم اختتام سے سنہ ہجری و عیسوی کا علم ہوتا ہے ؎

ہزار شکر کہ افسانۂ عشق ہوا انجام ‏ جہاں میں عاشق و معشوق کا رہا نام

بسال ہجرت ہاتف نے دی زغیب ندا ‏ وصال عاشق و معشوق دم بدم [2] بادا

۱۲۱۸ھ

بسن عیسوی غیب یوں ہوئی آواز ‏ ولی ہوا ہے وولعل شب چراغ اعجاز [3]

۱۸۰۳ء

---

[1] بہار عشق (ق۔ن) نور علی ورق ۱۱۔ [2] قصہ دل آرام و دلربا (ق۔ن) توتارام ورق ۸۰۔ [3] بدم ہونا چاہیے۔

گل کرسٹ کی ۱۹ راگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست سے علم ہوتا ہے کہ یہ ۱۸۰۲ء میں شائع ہوچکی تھی۔ اس کے صفحات کی تعداد ۱۱۰ تھی۔ اور انعام کی رقم ساٹھ روپے[۱]۔ گل کرسٹ نے کالج کونسل کے اعتراض پر کالج کے بے ضابطہ ملازمین کی ایک دوسری فہرست ۹ ر ستمبر ۱۸۰۳ء کے مراسلے کے ساتھ بھیجی۔ اس فہرست میں دلربا بھی شامل تھی[۲]۔ لیکن کالج کونسل نے ۱۰ ر اکتوبر ۱۸۰۳ء کی کارروائی میں "قصۂ دلربا" پر بہت سخت الفاظ میں تبصرہ کر کے انعام کی تجویز نامنظور کر دی[۳]۔

جاوید نہال نے قصہ دل ربا کو کاشی راج کھتری کی تصنیف قرار دیا ہے اور اس قصے کا تعارف یوں کرایا ہے:-

"لالہ کاشی راج کھتری لاہور میں پیدا ہوئے اور تلاش معاش میں کلکتے آئے اور فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ پنجابی میں منشی مقرر ہوئے۔ اردو میں انکی ایک ہی تصنیف ہے اور اسی تصنیف کی بدولت فورٹ ولیم کالج کی ملازمت انہیں حاصل ہوئی۔ انکی داستان کا نام ہے "قصہ دلربا اور دل آرام"۔ جسے انہوں نے گل کرسٹ کو پیش کیا تھا۔"[۴]

کالج کونسل کی کارروائیوں سے علم ہوتا ہے کہ کاشی راج ۴ رمئی ۱۸۰۱ء کو کالج کے شعبۂ ہندوستانی میں بحیثیت منشی مقرر ہوئے تھے[۵]۔ اور ۲ ر نومبر ۱۸۰۱ء کو شعبے سے الگ کر دیئے گئے۔ یہ تو واضح ہی ہے ک

---

[۱] [Pro]ceedings of the College of F.W. Vol. 559, P. 278, 285

[۲] " " " " " " " " P. 278

[۳] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب۔ جاوید نہال ص ۳۹۶۔

[۵] [Proc]eedings of the College of F.W. Vol. 559, P. 5

قصہ دل آرام ۱۸۰۳ء کی تصنیف ہے اسے ۱۸۰۱ء میں گل کرسٹ کی خدمت میں پیش کر کے کاشی راج ملازمت کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جاوید نہال کے مذکورہ بالا بیان میں قصے کے مصنف اور وجہ تصنیف کے متعلق تفصیلات درست نہیں۔ دراصل فاضل مقالہ نگار نے قصہ دل آرام کے مخطوطے کو محض سرسری نگاہ سے دیکھا تحقیق کی نظروں کو جنبش نہیں دی۔ اس کا ایک واضح ثبوت اس بیان سے ملتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"قصہ دلربا............ گل کرسٹ کے عہد میں ۱۲۱۸ھ میں تمام ہوا"[1]

رقطعۂ تاریخ پر موصوف نے غور فرمایا ہوتا تو ۱۲۱۶ھ کی بجائے ۱۲۱۸ھ درج کرتے۔

کاشی راج نے اپنی پنجابی کتابوں کے اردو دیباچوں میں اپنی تمام تصانیف کا ذکر کیا ہے لیکن ہیں قصہ دل آرام کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ یہ نکتہ بھی جاوید نہال کے بیان کی تردید کر دیتا ہے۔ اس کے اوہ موصوف نے قصے کے دیباچے اور اصل قصے کے جو اقتباسات پیش کئے ہیں اس سے یہ اندیشہ بھی تا رہتا ہے کہ موصوف کے زیر نظر اس نسخے کے علاوہ کوئی اور نسخہ رہا ہو جو راقم الحروف کی نظروں سے نیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں گزرا۔

قصہ دل آرام کا مطبوعہ نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔ ۱۸۰ اوراق پر مشتمل اسکا قدرے خستہ قلمی نسخہ یاٹک سوسائٹی آف بنگال میں محفوظ ہے۔

قصہ دل آرام میں ایک ہندوستانی راج کنیا اور ایک برہمن زادہ کی داستان عشق مذکور ہے۔ کا آغاز یوں ہوتا ہے:۔

"کہنے والے قصوں اور کہانیوں کے یوں کہتے ہیں کہ ولایت ہندوستان جنت نشان

---

[1] نیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب۔ جاوید نہال ص ۳۹۰

میں شہر قنوج کا ایک راجہ تھا۔ جیپال نام بڑا سخی اور عادل رعیت پرور۔ نہایت
شجاع۔ تمام راجے ہند کے مال گزار و فرمانبردار اسکے تھے۔ مگر خواہش بادشاہ
حقیقی سے کچھ آل واولاد کی نہ رکھتا تھا۔ اسواسطے بہت غمگین و دردمند رہتا اور
عیش ونشاط دنیا کی اس کو ذرہ ایک بھی خوش نہ آتی تھی[1]

چنانچہ ایک فقیر کے عطا کردہ آم سے بادشاہ صاحب اولاد ہوا۔ اور فقیر کی تاکید کے مطابق شہزادی کا نام دلربا رکھا گیا۔ شہزادی بلا کی حسین ہے۔ ایک دن باغ کی سیر کے دوران اس نے ایک برہمن زادے کو دیکھا اور عاشق ہوگئی۔ وہ برہمن زادہ دراصل بادشاہ کے پروہت کا بیٹا دل آرام ہے۔ وہ بھی شہزادی کے عشق میں گرفتار ہوگیا۔ اور یہ دونوں روز رات میں ملنے لگے۔ راجا اور رانی کو جب اس عشق کا علم ہوا تو انہوں نے شہزادی پر پابندی عائد کرکے اسکی شادی جے نگر کے راجا کے بیٹے سے طے کردی۔ اب دلربا اور دل آرام نے فرار ہو جانیکا منصوبہ بنایا۔ عین برات کی رات دلربا فرار ہوئی لیکن غلطی سے دل آرام کی بجائے ایک چور کے ناقہ پر بیٹھ کر چلی گئی۔ دل آرام اسکی تلاش میں نکلا۔ دلربا بھٹکتی بھٹکتی چین پہنچی۔ اور مردانہ انداز اختیار کرکے بادشاہ چین تک رسائی حاصل کی۔ دل آرام بھی اسے تلاش کرتا ہوا چین آیا۔ خیر کسی طرح دونوں ملے۔ چین کے بادشاہ نے اپنی بیٹی اور دلربا کی بھی شادی دل آرام سے کردی۔ اور دل آرام چین پر حکومت کرنے لگا۔ دلربا اور چین کی شہزادی کے ایک ایک اولاد ہوئیں۔ دل آرام اپنے لڑکے کو چین کا بادشاہ بناکر خود دونوں رانیوں کو لے کر قنوج روانہ ہوا۔ وہاں اسنے دلربا کے والد کی موت کے بعد قنوج پر قابض راجاؤں سے جنگ کرکے ملک واپس لیا اور حکومت کرنے لگا۔

قصہ دل آرام کے موضوع میں کوئی نیاپن نہیں ہے لیکن یہ مختصر قصہ بے حد دلچسپ ہے۔ اس کا

---

[1] قصہ دل آرام ودلربا (ق۔ن) توتارام ورق ۵۔

پلاٹ بہت ہی مربوط ہے۔ واقعات کا سلسلہ کہیں منقطع نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ بڑے تواتر اور تسلسل سے پیش آتے ہیں۔ درمیان میں نہ تو ضمنی کہانیاں ہیں اور نہ ہی واقعات وغیرہ کے ذکر میں طول بیانی کہ اصل قصے پر سے گرفت ڈھیلی پڑ جائے۔ قصہ دل آرام میں ہندوستانی فضا کا گہرا اثر ہے۔ کرداروں میں کوئی خاص بات نہیں ہاں دلربا ذہین اور فہم و ذکاوت کا پیکر ہے۔

توتارام نے قصے کی مناسبت سے بہت سلجھا، با محاورہ اور سادہ انداز بیان اختیار کیا ہے۔ اس میں ہندی کے نرم الفاظ بھی بڑی خوبصورتی سے مستعمل ہیں۔ توتارام نے جا بجا فارسی تراکیب بھی استعمال کی ہیں لیکن یہ ترکیبیں مشکل اور ادق نہیں۔ زبان و بیان پر فارسیت کا بہت ہلکا سا اثر ہے۔ قصے کے درمیان میں توتارام نے عام طور پر سادہ نگاری سے کام لیا ہے۔ یہ نمونہ ملاحظہ ہو۔ دل رُبا باغ کی سیر کرتی ہے کہ:۔

"اتفاقاً ایک چبوترہ نہایت خوشنما کہ درمیاں اس باغ کے بنا ہوا تھا وہاں جا نکلی دیکھتی کیا ہے کہ ایک برہمن کا بیٹا از بس حسین و خوب صورت کہ آفتاب و مہتاب بھی آگے اس کے غلام تھے اس پر ورزش و استعمال بدن کی کرتا ہے اس بت غریب کے دوچار ہوتے ہی بے خود ہو کر مرغ نیم بسمل کی مانند زمین پر لوٹ گئی۔ اور عشق کا تیر اس کے کلیجے میں جا لگا۔ جب خواصوں نے حالت اسکی بے طرح دیکھی تب وہاں سے اٹھا کر کشتی پر لے آئیں"[1]

یہ ضرور ہے کہ اس قصے کی عبارتوں میں روانی کی کسی حد تک کمی ہے لیکن اس کے باوجود دل آرام و دلربا کا اسلوب اتنے سخت تبصرے کا حامل نہیں جو ۱۰ اکتوبر ۱۸۰۳ء کی کالج کونسل کی کارروائی

---

[1] قصہ دل آرام و دلربا (ق۔ن) توتارام ورق ۱۱۔

میں پیش کیا گیا تھا :-

" معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اردو زبان سے ناواقف ہے اور شاعری کے اصولوں سے قطعی طور پر ناآشنا۔ اس نے کچھ حصے تو کبت کے طرز پر لکھے ہیں لیکن آگے چل کر اسنے اردو زبان کے الفاظ ٹھونسنے کی ناکام کوشش کی ہے" [۱]

---

(۲۱)

گلشن ہند

باسط خانؔ باسط

گلشن [۲] ہند میں کچھ نقلیں، حسن ملوک کا قصہ اور قصہ گل وصنوبر درج ہے۔ حسن ملوک کا قصہ طبع زاد ہے لیکن قصہ گل وصنوبر فارسی سے ماخوذ ہے۔ گلشن ہند ۱۸۰۲ء میں مکمل ہوئی۔ باسط خاں دیباچے میں لکھتے ہیں :-

" بموجب حکم مسٹر جان گل کرسٹ صاحب دام اقبالہٗ......... واسطے تربیت وتعلیم صاحبان عالی شان والا دودمان، دست گیر بیکساں، سخن آرائی کے ساتھ قصہ گل وصنوبر اور نقلیں چند قطعہ اشعار وقصہ وکہانی اپنی تصنیف اچھی اچھی دلچسپ

---

۱ Proceedings of the College of F. W. Vol. 559, P. 287

۲ کالج کونسل کارروائیوں میں گلشن ہند کی بجائے "گل وصنوبر" درج ہے۔

باتیں جمع کر کے اس مجمع سخن کا نام گلشن ہند رکھا۔"[1]

خاتمے کی عبارت سے سنہ تکمیل کا علم ہوتا ہے:۔

"عید کے مہینے میں قصہ گل صنوبر کا ترجمہ کرنا شروع کیا تھا۔ ربیع الثانی کے مہینے میں پانچویں تاریخ روز دوشنبہ ۱۸۰۲ء عیسوی میں تمام کیا۔ گلشن ہند اس ترجمے کا نام رکھا۔ تاریخ اس کتاب کی دو نکالی ہیں۔ ایک تو ہجری اور دوسری فصلی۔ ہجری ہے خلد بریں روئے زمیں۔ فصلی ہے چشم خوب رویاں[2]۔ جو جس کی پسند خاطر ہو وہی خوب ہے۔"[3]

گل کرسٹ کی ۱۹ راگست ۱۸۰۲ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں باسط خاں کی گل و صنوبر مطبوعہ کتابوں کے ذیل میں شامل ہے۔ اسکے صفحات کی تعداد ۱۵۰ اور انعام کی رقم ستر روپے تھی[4]۔ اس فہرست کی نامنظوری کے بعد گل کرسٹ نے ۹ ر ستمبر ۱۸۰۲ء کی فہرست میں اسے شامل کیا تھا[5]۔ لیکن انکو کوئی رقم بطور انعام نہ مل سکی۔ گل وصنوبر کا کوئی مطبوعہ نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔ گلشن ہند کا ۶۶ اوراق کو محیط خوش خط قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔ یہ کرم خوردہ ہے اور آغاز میں فورٹ ولیم کالج کی مہر بھی ثبت ہے۔

---

[1] دیباچہ گلشن ہند (ق۔ن) باسط خاں باسط ورق ۸۔

[2] باسط خاں سے ترتیب الٹ گئی ہے۔ "خلد بریں رو (ئے) زمین" سے سنہ فصلی ۱۲۱۰ اور "چشم خوب رویاں" سے سنہ ہجری ۱۲۱۷ برآمد ہوتا ہے۔ یہی ۱۸۰۲ء کے سنہ ہجری اور سنہ فصلی ہیں۔

[3] گلشن ہند (ق۔ن) باسط خاں باسط ورق ۶۶۔

[4] [5] Proceedings of the College of F. W. Vol. 559, P. 278,285

گلشن ہند کا آغاز نقلوں سے ہوتا ہے۔ اس میں اٹھارہ نقلیں درج ہیں۔ جنمیں دو کافی طویل ہیں۔ نقلوں میں چھوٹی چھوٹی حکایات اور واقعات مذکور ہیں۔ یہ بہت دلچسپ ہیں۔ ان کے درمیان میں اشعار اور ضرب الامثال کا استعمال بھی بڑی خوبی سے کیا گیا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی نقلیں سبق آموز بھی ہیں اور پر لطف بھی۔ زبان و بیان بہت صاف اور نکھرا ہے۔ مثال کے لئے پہلی نقل درج کی جاتی ہے:۔

"نقل ہے دیارِ ہند میں راجہ جے سنگھ بہت بڑا شخص ہو گزرا۔ چھ برس کی عمر کا ایک لڑکا چھوڑ کر جب مرگیا تب بادشاہ نے اسکے مال و اموال کی ضبطی کی۔ اور یہ حکم دیا کہ لڑکے کو تعلیم کرو۔ اچھا ہوگا تو سب اس کے نام پہ بحال ہوگا۔ لڑکے کا نام بھی جے سنگھ تھا۔ اس لڑکے نے جو ضبطی کی خبر سنی تو بادشاہ کو عرض کی۔ اور اس میں یہ مضمون درج کیا کہ غلام نالائق نہیں جو گھر بار ضبط ہوا اور تعلیم کو حکم ہوا۔ عرضی کو سنتے ہی بادشاہ نے اشتیاق سے اس کو طلب کیا۔ جسوقت سامنے آیا باوصف اس کے کہ لڑکا تھا مگر ہرگز رعب بادشاہی کو خیال میں نہ لایا۔ بادشاہ اسکے ڈھیٹھ پن کو دیکھ کر کہا کہ آگے آ۔ جب پاس آیا تب دونو ہاتھ پکڑ کر زمین سے دو ہاتھ بھر اونچا کیا اور کہا کہ کیوں تجھ کو زمین پر پٹک دوں۔ عرض کی جہاں پناہ جس کو خاک سے اٹھاتے ہیں اسکو پھر خاک میں نہیں ملاتے اور کوئی انگلی پکڑے کا نباہ کرتا ہے آپ نے دونو ہاتھ پکڑا۔ آپ ہی کے ہاتھ پناہ ہے۔ یہ بات سنتے ہی بادشاہ نے فورن ضبطی بحال کی۔ جے سنگھ سوائی خطاب دیا۔ اور یہ مثل کہی ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات"[1]

---

[1] گلشن ہند (ن.ن) لاسطاف اشاعت دوم ص ۱۰۰۹

حسن ملوک کے قصہ پر باسط خاں نے عنوان قائم کیا ہے کہانی حسن ملوک کی ہے۔ ایسی کہانی سن نے (کذا) سے آنکھوں میں نیند آجاوے اور دیکھنے سے نیند جاتی رہے سو کہانی یہ ہے سنو"۔

حسن ملوک کا مختصر سا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ اس میں قدرے داستانوی عناصر بھی شامل ہیں۔ قصہ یوں ہے کہ حسن ملوک کسی بادشاہ کا شہزادہ ہے۔ اور اسکا رفیق وزیر زادہ زیرک ہے۔ ان میں بے پناہ دوستی ہے۔ چنانچہ امیروں کے لڑکے حسد میں شہزادہ کو زیرک سے بدظن کر دیتے ہیں۔ شہزادہ زیرک کا کلیجہ مانگتا ہے۔ چنانچہ زیرک مہرہ کلیجہ اپنا کہہ کر شہزادے کے پاس بھجوا دیتا ہے۔ ایک روز دریا کی سیر کے دوران شہزادہ ایک خوبصورت سندر نام کی شہزادی کو دیکھ کر عاشق ہوجاتا ہے۔ وہ شہزادی اشاروں میں اپنے بارے میں بتاتی ہے۔ شہزادہ اس کے عشق میں گوشہ نشینی اختیار کر لیتا ہے۔ جب وزیر زادہ کو یہ بات معلوم ہوتی ہے تو وہ سامنے آجاتا ہے اور شہزادی کا پتہ بتاتا ہے۔ پھر دونوں اسکے ملک ہلدی نگر جاتے ہیں اور شہزادی کی مالن کے یہاں ٹھہرتے ہیں اور ہار کے ذریعے پیغام بھیجتے ہیں۔ انجام کار حسن ملوک اور شہزادی کی شادی ہوجاتی ہے اور وہ اسے لیکر اپنے ملک آجاتا ہے۔

باسط خاں نے یہ قصہ بڑی خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔ تمام واقعات میں ایک ربط اور تسلسل ہے۔ قصے کی زبان بھی سریع الفہم، آسان اور رواں ہے۔ مثال ملاحظہ ہو۔ مالن شہزادے کے ہاتھ کا گوندھا ہار لے کر شہزادی کے پاس جاتی ہے:۔

"جس وقت لے کر ہار کو شہزادی کے پاس گئی۔ اس وقت دیکھتے ہی اس نے پوچھا کہ آج یہ ہار کس نے گوندھا ہے۔ سچ کہہ۔ کہا بلاوں میرے سوائے تمہارا ہار گوندھنے والا کون ہے۔ کہا تو جھوٹھ (کذا) کہتی ہے۔ یہ تیرے ہاتھ کا نہیں کسی سگھڑ (سگھڑ) کے ہاتھ کا ہے۔ یہ بات کہتے ہی اٹھا کر گلے میں جو ڈالا تو کلیجہ پر مہر کی چوٹ۔ ایسی بیٹھ گئی کہ دم بدم ضعف کی حالت رہی۔ جب اسکا دل غوطہ سے نکلا تب اکیلے مکان میں جاکر حیرانی کیا تو

ہار کے پھولوں کو دیکھنے لگی۔ جب مہر پر نظر پڑی اور اس کے حرفوں کو دیکھا تب معلوم کیا کہ اسی کی چوٹ تھی۔ باہر آ کر اس روز مالن کو جو انعام دیا کرتی تھی اس سے زیادہ دیا۔[1]

اخیر میں قصہ گل و صنوبر درج ہے۔ یہ لعل پوش بادشاہ کے تین بیٹوں مے نوش، مدہوش اور باہوش کے مہموں کی داستان ہے۔ ایک دن بڑا بیٹا مے نوش سفر پر نکلتا ہے۔ سفر میں اس کی ملاقات پیر مرد کی شکل میں بیدار بخت نام کے بادشاہ سے ہوتی ہے۔ وہ اپنی سرگزشت سناتا ہے کہ اس کے سات بیٹے چین کے بادشاہ قیموس بن طیموس کی بیٹی مہر افروز کے سوال "گل با صنوبر چہ کرد و صنوبر با گل چہ کرد" کا جواب دینے جاتے ہیں لیکن ناکام ہو کر قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ جب کہ کامیابی کا انعام مہر افروز سے عقد ہے۔ یہ سن کر مے نوش کو مہر افروز سے عشق ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس کے سوال کا جواب دینے جاتا ہے لیکن نہیں دے پاتا۔ اور قتل کر دیا جاتا ہے۔ پھر دوسرا بھائی مدہوش بھی جاتا ہے اور قتل ہوتا ہے۔ تیسرا بھائی باہوش دیوانوں کی صورت بنا کر مہر افروز کے باغ میں کودتا ہے۔ مہر افروز کی کنیز دل آرام اس پر عاشق ہو جاتی ہے۔ باہوش اس سے مہر افروز کے سوال کا جواب پوچھتا ہے۔ دل آرام کے پتہ بتانے پر وہ گل و صنوبر کا اسرار معلوم کرنے روانہ ہوتا ہے۔ اور بہت سے مراحل، مہمات اور طلسمات سے گزر کر شاہ گل کی بیان کردہ حقیقت، سوال کے جواب میں سناتا ہے۔ اس کے علاوہ مہر افروز کی بدکاریوں پر سے بھی پردہ اٹھاتا ہے۔ اور اسے اپنے گھوڑے سے باندھ کر اپنے شہر لے جاتا ہے۔

---

[1] گلشن ہند (ق۔ن) باسط خاں باسط ورق ۳۳، ۳۴۔

قصہ گل وصنوبر چونکہ فارسی سے ترجمہ ہے۔ اس لئے اس پر فارسی داستانوں کا انداز غالب ہے لیکن اس قصے میں غیر ضروری واقعات ومہمات کا ذکر نہیں ملتا۔ ہر واقعہ ایک دوسرے سے پیوست ہے۔ باسط خاں نے بہت کامیابی سے ترجمہ کیا ہے۔ کہیں بھی ترجمہ پن نمایاں طور سے ظاہر نہیں ہوتا۔ یہاں بھی انکا اسلوب آسان اور رواں ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:۔

"جب اپنے باپ کی خدمت (میں) گیا۔ تب مہر افروز کو سامنے کھڑا کرکے عرض کی کہ اے قبلہ وکعبہ اسی نے میرے دونو بھائیوں کو قتل کیا۔ یہ تقصیر وار ہے۔ اب جو مرضی حضور کی ہو سو بجالاؤں۔ بادشاہ لعل پوش نے کہا کہ جو تمہارا جی چاہے سو کرو۔ غرض جو حالت گل نے صنوبر کی کی تھی سو ہی حالت شہزادہ باہوش نے مہر افروز کی کی"[۱]

گل وصنوبر پر انعام دینے کی گل کرسٹ کی سفارش کے جواب میں ۱۱ اکتوبر ۱۸۰۳ء کی کالج کونسل کی کاروائی میں بہت سخت تبصرہ پیش کیا گیا:۔

"یہ لطیفوں کا ایک مجموعہ ہے۔ جس میں بہت سارے لطیفے تو تلفظ کی غلطی سے فحش اور بھدے بنا دیئے گئے ہیں۔ مصنف کی ناواقفیت کی بنا پر اس میں بے پناہ غلطیاں موجود ہیں۔ انعام دینے کی بجائے مصنف کو کالج کونسل کے سامنے ایک فحش اور گندی تالیف پیش کرنیکی جرأت پر قصور وار قرار دیا جائے"[۲]

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ نہ تو قصہ گل صنوبر اور نہ ہی گلشن ہند کے دوسرے حصے اتنے سخت تبصرے کے

---

[۱] گلشن ہند (ق۔ن) باسط خاں باسط ورق ۶۶۔

[۲] Proceedings of the College of F. W. Vol. 559 P. 287

مستحق ہیں۔ چونکہ کالج کونسل نے یہ ترجمہ پسند نہیں کیا تھا اس لئے منشی امام بخش کی تحریک پر اٹھارہ سو چوبیس عیسوی (۱۸۲۴ء) میں بینی نرائن جہاںؔ نے قصہ گل وصنوبر فارسی سے ترجمہ کیا اور "نوبہار" نام رکھا۔

---

(۲۲)

مثنوی کلکتہ مع قصہ بلند اختر

نور خاںؔ

نور خاں نے فورٹ ولیم کالج کے لئے "قصہ بلند اختر" ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء میں تصنیف کیا۔ اس سے ان کا مقصد حصول انعام تھا۔ اس سے قبل انہوں نے اسی قصے کو مثنوی میں لکھا تھا۔ جس میں چھ ہزار اشعار تھے اس میں مثنوی کلکتہ بھی شامل تھی۔ اس مثنوی کو پیش کرنے پر کالج کونسل سے نور خاں کی کسی طرح کی ہمت افزائی نہیں ہوئی۔ غالباً اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ کالج کو نثر کی کتابوں کی ضرورت تھی۔ نور خاں نے بعد میں اسی مثنوی کو نثر کے قالب میں منتقل کیا لیکن مثنوی کلکتہ بھی شامل رکھی۔ چنانچہ وہ دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"غرض جب شہرہ کالج کا سنا۔ اس شہر میں آیا دیکھا کہ کمپنی بہادر دام ظلہ کی بدولت ایک عالم پرورش پاتا ہے اور کیا کیا زندگی کا لطف اٹھاتا ہے لیکن کمال شرط ہے جس سے قدر و منزلت حاصل ہوا۔ علم و ھنر کے مجمع میں وہ شخص داخل ہو۔ جب یہ بات دریافت ہوئی۔ چھ ھزار بیت کی مثنوی جو آگے کہی تھی در پیش کی۔ کتنی وجہوں سے ملہ محل توقف میں پڑا۔ مجدداً اب یہ

قصہ نثر میں لکھا۔[1]

جاوید نہال صاحب اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"نورخاں نے فورٹ ولیم کالج کے حکام سے انعام حاصل کرنے کے لئے دو کتابیں ترتیب دیں۔ ایک قصہ بلند اختر اور دوسری مثنوی کلکتہ ہے"[2]

آگے مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"مثنوی کلکتہ جو چالیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ صاحبان کونسل کو پسند نہیں آئی۔ غالباً اس لئے کہ کالج میں نثری داستانوں کی ترتیب، تالیف اور اشاعت کا کام ہو رہا تھا۔ نورخاں نے مایوس ہو کر صلہ وانعام پانیکے لئے قصہ بلند اختر لکھا"[3]

نہال صاحب کو مغالطہ ہوا ہے۔ مثنوی کلکتہ اور بلند اختر دو کتابیں نہیں ہیں۔ نورخاں نے پہلے قصہ بلند اختر بطرز مثنوی لکھا تھا جو چھ ہزار ابیات پر مشتمل تھا۔ بعد میں اسی مثنوی کو انہوں نے نثر میں منتقل کیا۔ اور مثنوی کلکتہ جو مثنوی بلند اختر کے ساتھ شامل تھی۔ اسے اس نثری قصے کے ساتھ بھی شامل رکھا۔

اس قصے کے خاتمے کے قطعہ سے سنہ تکمیل کا علم ہوتا ہے ؎

کہانی ختم کی جب میں نے آگاہ   ہوئی تاریخ کی تب فکر در پے

کہا ہاتف نے پائے رنج کر دور   کہانی خوب یہ تجھ سے ہوئی ہے[4]

۱۲۲۲ - ۳ = ۱۲۱۹ء

---

[1] دیباچہ مثنوی کلکتہ مع قصہ بلند اختر (ق۔ن) نورخاں ورق ۱۸، ۱۹۔

[2] [3] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب۔ جاوید نہال ص ۱۳۹، ۱۴۰۔

[4] مثنوی کلکتہ مع قصہ بلند اختر (ق۔ن) نورخاں ورق ۱۸۳۔

یہ کتاب غیر مطبوعہ ہے۔ ۱۰۲ اوراق پر مشتمل اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔ اس پر کالج کی مہر ثبت ہے۔

نور خاں نے مثنوی کلکتہ کا آغاز یوں کیا ہے ؎

کہاں ہے وہ ساقی مرا غم گسار — پیلا دے (کذا) مجھے جام مے ایک بار
لکھوں شہر کلکتہ کا میں بیاں — نہیں ایسے (کذا) رونق کہیں در جہاں
ہر ایک کوچہ ہے یہاں کا جوں شہر روم — ہے ہر ملک میں یہاں کی کسرت کی دھوم
محلا ہر ایک یہاں کا رشک ارم — ہیں آباد لاکھوں میں صاحب کرم[1]

نور خاں نے مثنوی کے بعد ولزلی، مسٹر بار لو بارنٹ، صاحبان کونسل اور ہارنگٹن کی تعریف و توصیف بھی درج کی ہے۔

قصہ بلند اختر میں بلخ کے شہزادے بلند اختر اور فارس کی شہزادی قمر رخ کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ شہزادہ ایک بار شکار کھیلتے کھیلتے ایک منقش محل میں جا پہنچتا ہے۔ وہاں شہزادی قمر رخ نظر آتی ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ قمر رخ کے والد کو جب اس عشق کا علم ہوتا ہے تو شہزادے کو ایک دریا کے قریب واقع پہاڑ میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور شہزادی محل میں مقید کر دی جاتی ہے۔ شہزادہ حکمت لگا کر نکلتا ہے لیکن ایک جادوگرنی کے طلسم میں جا پھنستا ہے۔ وہاں سے بھی آزاد ہوتا ہے اور بلخ جا کر فارس پر حملہ آور ہوتا ہے۔ اس درمیان ملک بخارا کے شہزادے شیر دل سے قمر رخ کی شادی طے ہو جاتی ہے۔ مگر شہزادہ بلند اختر جنگ کے بعد قمر رخ کو حاصل کر کے شادی کر لیتا ہے۔

---

[1] مثنوی کلکتہ مع قصہ بلند اختر (ق۔ن) نور خاں ورق ۲۔

بلند اختر کا یہ قصہ اس زمانے کے عام قصوں کی طرح ہی ہے۔ نور خاں نے اس قصے میں کہیں کہیں سادہ نگاری کا مظاہرہ کیا ہے اور کہیں رنگین بیانی کا شکار ہو گئے ہیں۔ اس قصے میں جزئیات نگاری کی بہت عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ قصہ بلند اختر کی نثر کا نمونہ درج کیا جاتا ہے:۔

"آپ مجھے دیکھتے ہی ایسے دلدادہ ہو گئے۔ مگر یہ صورت لگاوٹ کی تم لوگوں کا ہتھکنڈا ہے۔ تم لوگوں کی بات کا اعتبار نہیں۔ کیوں ہمیشہ ایک طور پر تم نہیں رہتے ہو۔ مرد کی ذات طوطا چشم مشہور ہے۔ جہاں برس دو برس ایک رنگ سے گزرے تو بہت اچنبھا ہے۔ مگر یہ ہم ہی بھولی بھالیاں ہیں کہ تم لوگوں کی باتوں میں آن کر اپنے بھلے چنگے جی کو کر دینا۔ پھر سوا بناہ اور مٹ جانے کے کچھ نہیں سوجھتا۔"[1]

یہ علم نہیں ہو سکا کہ اس کتاب پر نور خاں کو کالج کونسل سے انعام حاصل ہو سکا تھا یا نہیں۔

۲۳

ہفت پیکر

سید حیدر بخش حیدری

حیدری کی منظوم "ہفت پیکر" نظامی کی فارسی مثنوی "ہفت پیکر" کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ حیدری نے ۱۲۲۴ھ مطابق ۱۸۰۹ء میں کیا تھا۔[2] ہفت پیکر کے منظوم دیباچے میں آگے چل کر

---

[1] مثنوی کلکتہ مع قصہ بلند اختر (ق۔ ن) نور خاں ورق ۵۶۔ [2] جاوید نہال نے ۱۸۰۱ء درج کیا ہے (انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۱۲۵)۔ نظم۔

انہوں نے سبب تالیف یوں بیان کیا ہے ؎

اب یہ لازم ہے کہ لکھ رنگیں بیاں — بحر (کذا) نذر صاحبان قدرداں
پہنچے جب کونسل میں یہ رنگین کتاب — بحر بخشش سے تو ہوگا فیضیاب
ہفت پیکر جو نظامی نے کہی — ہے پنٹ دلچسپ خوبی سے بھری
لیک تو اس کو بہ ہندی نظم کر — کیوں کہ ہے قند مکرر خوب تر
جب سنا یاروں سے یہ میں نے سخن — تازہ پھر دل میں ہوا ذوق کہن
جوں خم مے گرچہ بیٹھا تھا خموش — بحر معنی کا اٹھا پھر دل میں جوش
ہفت پیکر تھا نظامی کا کلام — میں نے ہندی کر دیا اس کو تمام
جب یہ نسخہ میں نے ہندی میں لکھا — ہفت پیکر نام بھی اس کا رکھا
فارسی کو کر دیا ہندی تمام — تا رہے ہندوستان میں میرا نام[1]

آگے چل کر حیدری کہتے ہیں ؎

خوب تھے افسانہ ساتوں فارسی — روشن و شفاف مثل ارسی (آرسی)
میں نے ان قصوں کو ہے ہندی کیا — ان کے دیباچے سے کچھ مطلب نہ تھا
کیونکہ تھا جو بادشاہ اس عصر کا — مدح کو اس کی نظامی نے لکھا
جو ہمارے وقت کے ممدوح ہیں — ہم کو لازم ہے کہ مدح ان کی کہیں[2]

اس کے بعد ولیم ٹیلر اور ولیم ہنٹر کی مدح میں توصیفانہ اشعار درج ہیں۔ ہفت پیکر کے اختتام پر حیدری

---

[1] دیباچہ ہفت پیکر (ق۔ن) حیدر بخش حیدری ورق ۳، ۴۔

[2] ″ ″ ″ ″ ″ ورق ۳، ۴۔

کھیم نرائن رندؔ اور جوآںؔ کے تاریخی قطعات درج ہیں جن کے آخری اشعار یوں ہیں ؎

حیدری:۔

پہلے لے ابجد سے حرف اوّلیں — اور لے کر قاف قرشت کے تئیں
اس میں ملحق جس گھڑی میں نے کیا — ہفت پیکر نام بھی اس کا رکھا

۱۰۱ + ۱۱۲۳ = ۱۲۲۴ھ

رندؔ:۔

از سر حق مت گزر اور کر شمار — ہفت پیکر معدن حسن و طرب

۸ + ۱۲۱۶ = ۱۲۲۴ھ

جواںؔ:۔

کہئے تاریخ ایسی تا ہر ایک کے — سب کی تاریخوں سے بہتر یہ ہوئی
از سر جودت کہا میں نے وہیں — جان تازہ ہفت پیکر یہ ہوئی [1]

۳ + ۱۲۲۱ = ۱۲۲۴ھ

ہفت پیکر غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا ۱۴۰ اوراق کو محیط خوش خط قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔ اس کے ہر صفحے پر ۱۲ اشعار مندرج ہیں اور اختتام پر فورٹ ولیم کالج کی مہر ثبت ہے۔

ہفت پیکر میں سات آزاد قصے مذکور ہیں۔ انہیں سات ممالک کی شہزادیاں سات مختلف راتوں میں بہرام گور کو سناتی ہیں۔ پہلی کہانی کی راوی ہندی نژاد شہزادی ہے۔ دوسری کہانی ملک عراق کے بادشاہ کی ہے۔ تیسری روم کے ایک نوجوان کی ہے۔ چوتھی سلطنت روس کی شہزادی کی ہے ؎

سلطنت میں روس کی اے بادشاہ — شہر تھا اک جوں جبین رشک ماہ

---

[1] ہفت پیکر (ق۔ن) حیدر بخش حیدری ورق ۱۴۰۔

اک عمارت ساز اسکا شاہ تھا　　شہر تھا جسم اور وہ جاں دلخواہ تھا

لڑکی اک رکھتا تھا وہ رشک پری　　دولت و ناز و ادا سے تھی بھری[1]

پانچویں کہانی مصر کے ایک خوبرو نوجوان کی ہے ۔

مصر میں تھا ایک ماہاں نام ور　　نیک خو سرو چمن رشک قمر

یوسف مصری گر اس کو دیکھ لے　　خط غلامی کا وہیں لکھ دے اسے[2]

چھٹی کہانی دو نوجوانوں سے متعلق ہے۔ ساتویں کہانی کی راوی شہزادی اپنی ماں کی بیان کردہ ایک حکایت سناتی ہے۔

یہ ساتوں کہانیاں بے حد دلچسپ اور حسن وعشق کی رنگینی سے معمور ہیں۔ ان میں تجسس بھی ہے اور تحیر بھی۔ خلوت وجلوت کا بیان بھی ہے اور منظر نگاری بھی۔ ہفت پیکر کی بعض کہانیاں مختصر داستانوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔

حیدری کی زبان ہفت پیکر میں کسی حد تک اپنے اصل ماخذ سے متأثر ہے انہوں نے اکثر و بیشتر مقامات پر فارسی سے متعلق لب ولہجہ اختیار کیا ہے۔ جہاں سادہ نگاری ہے وہاں ان کے اشعار سپاٹ اور بے کیف ہیں۔ ان میں سلاست، شیرینی اور ترنم کا فقدان ہے۔ ہاں حیدری کی منظر نگاری پیکر نگاری اور جزئیات نگاری خوب ہے۔ یہاں وہ تشبیہات واستعارات اور تراکیب سے نقشہ کھینچ کر رکھدیتے ہیں۔ بادشاہ روس کی لڑکی کے حسن کا بیان ملاحظہ ہو ۔

دلفریب و نغمہ باز و مہ لقا　　گل بدن جوں سرو تھی وہ دل ربا

---

[1] ہفت پیکر (ق۔ن) حیدر بخش حیدری ورق ۶۲، ۶۳ ۔

[2] 〃　〃　〃　〃 ورق ۷۰، ۷۱ ۔

دل کشی میں تھا وہ مکھڑا ماہ سا — قند پر ہنستے تھے لب اس کے سدا
تھی وہ زہرہ مشتری کی جاں نواز — شمع ساں رکھتی تھی عاشق کو گداز
اس کے رخ کو اور دہن کو سوچ کر — شمع تھی بے نور پھیکی تھی شکر
دیکھ کر اس کے دہن کو تنگ تر — تنگ تر ہے تنگ شکر جوں کمر
اس کی زلف عنبریں کے رو برو — مشک تاتاری اگر ہو وے کبھو
کھول کر نافے کو اپنے ایک بار — اس کے ہو ہر بال کے اوپر نثار
عارض گلگوں پر اس کے کب نظر — تاب ہے جو کر سکیں شمس و قمر
وہ گل ریحان زوئے یار ہے — جس کے آگے گل بان خار ہے
تازہ روئی اس کی اے اہل نظر — ہے بہار باغ سے بھی خوب تر
کیا کہوں میں اس کے مکھڑے کی بہار — ہے وہ رنگین تر برنگ لالہ زار
خواب نرگس کیا کہوں میں ہوشیار — ہے اسی کی چشم نرگس کا خمار[1]

۲۴

نو بہار (قصہ گل و صنوبر)

بینی نرائن جہاں

بینی نرائن نے منشی امام بخش کی تحریک پر ۱۸۲۳ء / ۱۲۳۸ھ میں قصہ گل و صنوبر کو دو ہفتے میں فارسی سے

---

[1] ہفت پیکر (ق.ن) حیدر بخش حیدری ورق ۶۳، ۶۴۔

اردو میں منتقل کیا اور "نوبہار" اس کا نام رکھا۔ نوبہار کے کسی نسخے تک راقم الحروف کی رسائی نہ ہوسکی۔ اسکا ایک خطی نسخہ قاضی عبدالودود صاحب نے ادارۂ تحقیقات اردو کی ادبی نمائش میں دیکھا جو حکیم سید محمد تقی حسن بلخی متوطن فتوحہ ضلع پٹنہ کی ملکیت ہے۔ قاضی صاحب موصوف نے اسی نسخے کا تعارف اپنے ایک مضمون میں کرایا ہے۔ یہ وہی قصۂ گل وصنوبر ہے جسے پہلے باسط خاں باسطؔ نے ترجمہ کیا تھا لیکن کالج کونسل نے بہت سخت تبصرے کے ساتھ واپس کر دیا تھا۔ بینی نرائن گل وصنوبر کے دیباچے میں لکھتے ہیں :۔

"............ بالفعل کہ اب سنہ ۱۲۴۰ھ اور سنہ ۱۸۲۴ء ہیں، عہد دولت میں لارڈ امرس صاحب بہادر کے ایک دن منشی امام بخش کہ ۲۵ برس کے عرصے سے اس خاکسار کے ساتھ رابطہ محبت دلی کا رکھتے ہیں، فرمانے لگے کہ سابق میں قصہ گل وصنوبر کو منشی باسط خاں نے تصنیف کیا تھا۔ ظاہراً نامربوطی اور بے محاورگیٔ الفاظ کے باعث صاحبان کالج کونسل کی نظر مبارک میں پسند نہ پڑا بلکہ انہیں کو واپس ہوا۔ حق تو یہ ہے کہ اس زمانہ میں مدرسہ کمپنی انگریز بہادر یعنی کالج دارالضرب عالموں اور فاضلوں کا ہے۔ جو کتاب کہ وہاں کے صاحبوں کو پسند نہ پڑے اور نامنظور ہو کر نکالی جائے پھر اسے کون پوچھتا ہے؟ تم کو حق تعالیٰ نے طبع تند اور ذہن رسا عطا فرمایا ہے۔ اور کئی ایک کتابیں تیری شہر میں مشہور ہوئی ہیں، بلکہ بہت لوگ خوش ہو کر بطریق تحفہ ملک بہ ملک لے گئے، اب تجھ کو لازم ہے کہ اس قصۂ رنگین کو نثر و نظم سے آراستہ کر کے کانوں کو زیب و زینت بخشو۔ ہر چند کہ یہ ہیچ مداں اتنا شعور نہیں رکھتا لیکن بقول حضرت مسلح (کذا) الدین سعدی شیراز کے کہ آزردہ کرنا دل دوستوں کا

جہل ہے اور کفارہ دیناتوں کا آسان ، اس بات کو بہ پاس خاطر منشی صاحب ممدوح کے قبول کیا اور دو ہفتے کے عرصے میں تمام قصہ گل وصنوبر کو کتاب فارسی سے ترجمہ کیا۔"[1]

قصہ گل وصنوبر کے خاتمے پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے جس سے علم ہوتا ہے کہ بینی نرائن نے اسکا نام نوبہار رکھا تھا:۔

"اس کہانی میں جو صنوبر شاہ اور گل بادشاہ زادی کا ذکر ہے، اس واسطے مصنف نے نام بھی اسکا نوبہار رکھا۔"[2]

باسط خاں کے ترجمے میں اس عشقیہ داستان میں عاشق شاہ گل ہے اور معشوق ملکہ صنوبر۔ لیکن بینی نرائن کے ترجمے میں عاشق ومعشوق کا نام مختلف ہوگیا ہے۔

بینی نرائن کے نسخے کی اختتام کی عبارت سے کتابت کی تاریخ کا علم ہوتا ہے:۔

"در شہر کلکتہ بتاریخ شانزدہم ماہ چیت ۱۲۳۱ سنہ بنگلہ۔ الراقم و مصنف بینی نارائن دہلوی۔"[3]

قاضی عبدالودود نے نوبہار کے جو اقتباسات نقل کئے ہیں ان سے بینی نرائن کے اسلوب پر کسی حد تک روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس قصے میں بینی نرائن نے آراستگی سے بھی کام لیا ہے اور جا بجا سادہ وسلیس انداز بیان بھی اپنایا ہے۔ مسجع انداز بیان ملاحظہ ہو:۔

"جب صبح ہوئی اور شاہ خاور نے اپنے تخت زمردی رنگ پر جلوس فرما کر

---

[1] دیباچہ نوبہار یعنی قصہ گل وصنوبر بحوالہ مضمون قاضی عبدالودود، ماہنامہ نیا دور، جولائی ۱۹۵۹ء ص ۴، ۵

[2] [3] نوبہار " " " " " " " " " جولائی ۱۹۵۹ء ص ۳۰۵

وسعت جہاں کو اپنے نور سے نورانی کیا، شاہزادے نے سب کارخانہ جات کے داروغوں کو واسطے تیاری سفر کے حکم کیا۔ ایک آن میں سب کے سب اپنے ساز و براق سے درست ہو کر پایۂ رکاب میں آ حاضر ہوئے۔ شاہزادہ پوشاک ولباس و ساز و براق سے مصلح (کذا) ہو کر سوار ہو بیٹھا اور بطریق ایلغار دلیغار قطع منزلوں کا کرتا ہوا اخاور زمین میں جا پہنچا۔"[1]

سادہ نگاری کی مثال ملاحظہ ہو:۔

"اس جنگل میں خونخوار اور اس بلیعات (کذا) میں کس طرح یہاں تک آن پہنچا اور یہ شخص کون ہے اور کیا مقصد رکھتا ہے۔ دائی جو ہیں شہزادے کے نزدیک آئی جھک کر سلام کیا اور کہا کہ اے جوان رعنا اے دلبر زیبا ہماری بی بی صاحب آپ کو یاد فرماتی ہیں۔"[2]

اس بات کا کوئی سراغ نہیں ملتا کہ بینی نرائن نے نوبہار کو کالج کونسل کے سامنے پیش کیا تھا۔ نوبہار کے دیباچے سے بھی ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

---

[1] نوبہار یعنی قصہ گل وصنوبر بحوالہ مضمون قاضی عبدالودود، ماہنامہ نیا دور، جولائی ۱۹۵۹ء ص ۵۔

[2] " " " " " " " " " " " " " ص ۵۔

۲۵

باغِ عشق

بینی نرائن جہاں

"باغ عشق" عبدالرحمٰن جامی کی فارسی مثنوی لیلیٰ مجنوں کا ترجمہ ہے۔ اسے جہاں نے اردو نثر میں ۱۸۲۴ء میں منتقل کیا تھا۔ جہاں نے باغ عشق کے دیباچے میں مندرجہ ذیل معلومات فراہم کی ہیں:۔

"اور اب کہ ایک ہزار بیس وچار عیسوی اور بارہ سے بنوی[1] ہیں ایک دن اس خاکسار کے گوش زد ہوا کہ قصہ لیلیٰ مجنوں جو مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ (نے) فارسی زبان سے نظم میں تصنیف کیا تھا۔ ہرچند کہ وہ قصہ سماعت میں شہرۂ کمال رکھتا ہے اور فی الحقیقت چنداں لطف نہیں رکھتا۔ ظاہرہ کسی شخص نے اس قصے کو فارسی زبان (سے) ریختہ ہندی میں ترجمہ کیا ہے لیکن اب تک دیکھنے میں کسی کے نہیں آیا۔ صرف نام ہی سنا جاتا ہے۔ اس ہیچ مداں نے دل میں خیال کیا افسوس ہے کہ ایسا قصہ لطیف و نادریوں معطل اور بے کار پڑا رہے۔ اور کوئی اسکے پڑھنے اور سننے سے فائدہ نہ اٹھاوے۔ ہرچند کہ یہ بے بضاعت چنداں سلیقہ

---

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نے ایک ہزار آٹھ سو بیس وچار لکھنا چاہا ہے لیکن بیچ سے آٹھ سو چھوٹ گیا ہے یہی نسخہ گیان چند جین نے دیکھا ہے وہ اس ترجمے کا سنہ ۱۸۲۴ء لکھتے ہیں (اردو کی نثری داستانیں ص ۲۳۸)

اور شعور نہیں رکھتا............ اس عجز ضعیف نے قصہ نادر ولطیف کو فارسی
سے زبان ریختہ ہندی از روئے معلّیٰ میں ترجمہ کیا۔ ہر چند کہ یہ قصہ طویل نہیں لیکن
اس مؤلف نے عبارت کی درازی کے واسطے بہت ساخون جگر کھایا۔ قصہ قلیل کو
کس طرح درازی بخشے"[1]

خاتمے کی عبارت سے علم ہوتا ہے کہ جہاںؔ نے دانستہ مرصع اور مسجع انداز بیان اختیار
کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"اس ہیچ مداں نے قصہ لیلیٰ اور مجنوں کو جو پہلی کتاب پنج گنج جامی
سے ہے۔ خوب سیر کر حرفاً حرفاً اپنی عقل کے موافق ترجمہ کیا اور کوئی دقیقہ
فروگزاشت کرنے میں نہیں آیا اور اشعار مضامین موقع کے جابجا درج کئے اور
موافق استعداد و مقدور کے عبارت کو رنگین کیا۔ آئندہ چشم داشت اس حکیم
علی الاطلاق سے یہ ہے کہ تصدق سے اس جناب پاک کے یہ قصہ خوب رِوَا نُج
پاوے۔ اور پسند نظر خاص وعام ہووے۔ سبب تالیف اس کہانی دلاویز کا صرف
یادگاری اپنی ہی ہے اور کسی سے امید صلے کی نہیں۔ جو کوئی اس قصے دلاویز
کی سیر کرے اور ملاحظہ فرماوے، محظوظ ہو کر اس عاجز کے حق میں دعا کرے"[2]

باغ عشق کی تعریف میں جہاںؔ کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

الٰہی جو کہ اس نسخے کو دیکھے   دعا دے مجھ کو اور تحسین بھیجے

---

[1] باغ عشق (ق۔ن) ورق ۲ بحوالہ اردو کی قدیم داستانیں۔ ایم حبیب خاں ص ۹۱ -

[2] " " " ورق ۹ " " " " " " ص ۸۸، ۸۹-

سراپا[1] اپنی اوقات اسمیں کی صرف ۔۔۔ تب ایسے آبدار و خوش لکھے حرف
پڑھے جو کوئی یہ نادر کہانی ۔۔۔ تو دیکھے یہ مری گوہر فشانی
پڑھے اور آفریں مجھ کو کہے وہ ۔۔۔ ہمیشہ عشق میں ڈوبا رہے وہ
اگر مجنوں و لیلےٰ جیتے رہتے ۔۔۔ حدیث عشق اس دفتر سے لکھتے[2]

گیان چند جین نے باغ عشق کا ایک اقتباس نقل کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں نے کسی حد تک سادہ نگاری بھی کی ہے:-

"کہتے ہیں کہ نواح عرب میں نوفل نام ایک بادشاہ بڑے داب و رعب سے سلطنت کرتا تھا۔ رعیت اس کی خوش دل اور لواحق اس کے غموں سے جہاں کے فارغ البال تھے۔ اتفاقاً وہ بادشاہ شکار کو گیا تھا۔ یکایک نجد کے پہاڑ کے دامن میں آنکلا۔ اسی پہاڑ کے نیچے مجنون دیگر اپنے دوست کے فراق میں پڑا ہائے وائے کرتا تھا۔ جوں ہی اس کی آواز دردناک نوفل کے کان میں پہنچی۔ اپنے ہمراہیوں سے پوچھا کہ اس صحرائے لق و دق میں کون ایسا مصیبت زدہ پڑا نعرے مار رہا ہے"[3]

بینی نرائن کے دیباچے یا کسی اور ذریعے سے یہ علم نہیں ہو سکا کہ باغ عشق کو انھوں نے کالج کونسل کے سامنے پیش کیا تھا یا نہیں۔

---

[1] سراپا [2] باغ عشق (ق.ن) ورق ۴ بحوالہ اردو کی قدیم داستانیں ص ۲۹۰۔
[3] بحوالہ اردو کی نثری داستانیں۔ گیان چند جین ص ۳۳۹۔

۲۶

نثرِ بے نظیر

بہادر علی حسینی

نثرِ بے نظیر میر حسن دہلوی کی مثنوی "سحر البیان" (۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۴ء) کا نثری پیکر ہے۔ اسے حسینی نے گل کرسٹ کی فرمائش پر ۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۲ء[1] میں نثر میں منتقل کیا تھا۔ اس کے دو اسالیب تھے اور دو مقاصد۔ اول کالج کے طلبار کے لئے۔ اس میں انداز بیان سادہ اور ہندی الفاظ کا مرکب ہے۔ دوسرا منتہیوں کے مطالعہ کے لئے تھا چنانچہ اس میں خواص کے محاوروں اور عربی فارسی کے الفاظ وغیرہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں حسینی کا بیان یوں ہے:-

"...........میر بہادر علی حسینی نے حسن دہلوی کی مثنوی اردو کی زبان میں جو نظم رنگیں ہے سو سراسر اسے دو طرح سے زبان ریختہ میں شاہ عالم کے عہد میں سنہ ۱۲۱۵ھ[2] بارہ سو پندرہ ہجری مطابق سنہ ۱۸۰۲ء اٹھارہ سو دو عیسوی

---

[1] اگرچہ نثرِ بے نظیر کے قلمی نسخے (مخزونہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) کے دیباچے میں اس تالیف کی تاریخ سنہ ۱۲۱۵ھ مطابق سنہ ۱۸۰۲ء درج ہے لیکن یہ سہو کاتب معلوم ہوتا ہے۔ تقویم سے علم ہوتا ہے کہ سن ہجری ۱۲۱۵، ۲۵؍ مئی سنہ ۱۸۰۰ء سے شروع ہو کر ۱۳؍ مئی سنہ ۱۸۰۱ء کو ختم ہو جاتا ہے۔ سالار جنگ کے کتب خانے میں نثرِ بے نظیر کا جو قلمی نسخہ ہے اس میں تاریخ تالیف سنہ ۱۲۱۶ھ درج ہے (بحوالہ مقدمہ اخلاق ہندی از ڈاکٹر وحید قریشی ص ۱۷) جو درست معلوم ہوتی ہے۔

بموجب حکم صاحب خداوند نعمت مسٹر جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کے نثر کیا۔ ایک کو عام کی بولی میں جس ڈھب سے سب کوئی آپس میں بولتے ہیں، سو مبتدیوں کے حق میں ہندوستانی زبان سیکھنے کے واسطے بہت اچھی ہے۔ کیوں کہ اس میں ہندی کے بہت سے لفظ ہیں اور دوسری خاص کے محاوروں میں کہ جس وضع سے اشخاص امتیازی باہم گفتگو کرتے ہیں سو وہ منتہیوں کے مطالعہ کے واسطے نہایت خوب ہے۔ کس واسطے کہ اس میں الفاظ عربی اور فارسی کے زیادہ مخلوط ہیں۔"[1]

گل کرسٹ نے ۱۲ جنوری ۱۸۰۲ء کو کالج کونسل کے سامنے ان کتابوں کی تفصیل پیش کی تھی جو مختلف پریسوں میں چھپ رہی تھیں۔ اس میں نثر بے نظیر کا نام شامل ہے۔ اس وقت یہ کلکتہ گزٹ پریس میں فارسی رسم الخط میں چھپ رہی تھی۔ اس کے ۳۶ صفحات طبع ہو چکے تھے[2] لیکن اس کے بعد تمام کتابوں کے ساتھ اسکی بھی طباعت روک دی گئی تھی۔ بعد میں یہی صفحات گل کرسٹ کی "ہندی مینول" میں کئے گئے[3]۔ ڈاکٹر وحید قریشی عتیق صدیقی کے حوالے سے "اخلاق ہندی" کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ "۱۲ جنوری ۱۸۰۲ء کو گل کرسٹ نے جن کتابوں کی اشاعت کی اطلاع کالج کونسل کو دی تھی اس میں نثر بے نظیر کا نام نہیں ملتا۔[4] عتیق صدیقی کی ایک معمولی سی غلط وضاحت ڈاکٹر

---

[1] دیباچہ نثر بے نظیر (ق۔ن) ورق ۱، ۲۔

[2] Proceedings of the College of F. W. Vol. 559, P. 45

[3] Annals of the College of F. W. Appendix, P. 23

[4] مقدمہ اخلاق ہندی ص ۱۸۔

وحید قریشی کی اس غلط فہمی کا سبب بنی۔ گل کرسٹ کی ۱۲ر جنوری ۱۸۰۲ء کی فہرست میں نثر بے نظیر کا نام صرف "میر حسن" درج ہے۔ صدیقی صاحب نے اس کے ساتھ "مثنوی" کا اضافہ کر دیا۔[۱] "مثنوی میر حسن" (سحر البیان) تو ۱۸۰۵ء میں ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی تھی۔[۲]

نثر بے نظیر مکمل طور سے ۱۸۰۳ء میں ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی۔[۳] اس کے دوسرے ایڈیشن کے لئے شیر علی افسوس نے نظر ثانی کی تھی۔[۴] نثر بے نظیر کا ۱۰۶ اوراق کو محیط قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔ اس پر فورٹ ولیم کالج کی مہر بھی ثبت ہے۔ گل کرسٹ نے ۱۹ر اگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں نثر بے نظیر پہ ۱۵۰ روپے بطور انعام تجویز کئے تھے۔[۵] لیکن کالج کونسل نے اس فہرست کو نامنظور کر دیا تھا۔

نثر بے نظیر میں شہزادہ بے نظیر اور بدر منیر کی واردات عشق مذکور ہے۔ یہاں واقعات اور حالات کی وہ دلچسپ، خوشگوار اور پُر کیف فضا نہیں ہے جو میر حسن کے یہاں جاری و ساری ہے۔

حسینی قصے کا آغاز یوں کرتے ہیں:۔

> "کہتے ہیں کہ کس (کذا) وقت میں ہندوستان کی سرزمین میں ایک بادشاہ عالم پناہ رعیت پرور غریب نواز تھا۔ ملک اسکا بڑا، دولت اسکی بہت، نوکر چاکر ہزاروں فوج و لشکر بے شمار، اپنے ملک و مال و سپاہ کی کثرت، زیادتی، بہتات سے ہمیشہ

---

[۱] گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۱۴۵۔

[۲،۳] Annals of the College of F.W. Appendix, P. 25, 24

[۴] Linguistic Survey of India, Vol. IX, Part I P. 35

[۵] Proceedings of the College of F.W., Vol. 559, P. 277

خوش وقت، دل غنی فارغ البال رہتا جو کوئی اس کے لشکر کو ایک نظر دیکھتا
حیرت کے مقام میں اکثر متعجب ہو یوں کہتا الٰہی یہ کیا عالم طلسمات ہے کہ کوسوں تک
جوں دریا موج مارتا ہے۔[1]

اس اقتباس میں الفاظ کی کثرت بھی میر حسن کی فضا کو چھو نہیں سکی ہے۔

حسینی نے نثر بے نظیر کے دیباچہ میں اس کے اسلوب بیان پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:۔

"............ پس اب یہاں سے کہانی کی داستان جو نئی زبان
تازہ مضمون ہے سو شروع ہوئی ٹک اس شیریں قصے بے نظیر کے کا بیان دل
دیگر سنو تو سہی کیا خاصہ نو طرز مضمون ہے کہ کیا کہئے جو کوئی اسے بہ نظر تامل ملاحظہ
کرے سو اس کلام کی بندش درست اور الفاظ دلچسپ سے حظ وافر اٹھاوے تب
ہندوستانی زبان کی کیفیت معلوم کرے کہ ہاں ریختہ اسکو کہتے ہیں اور بولنے کی طرز
اس کے یوں کر ہی (کذا)............"[2]

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ نثر بے نظیر میں حسینی کے اسلوب نے قصے کی شگفتگی اور روانی کو متاثر کیا ہے۔
نثر بے نظیر میں سادہ اور سلیس انداز بیان کے بجائے مقفٰی اور مسجع انداز مستعمل ہے۔ عبارت آرائی کے
نمونے بھی جا بجا ملتے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نثر بے نظیر کا یہ وہ نسخہ ہے جسے حسینی نے منتہیوں کے
لئے تیار کیا تھا۔ نثر بے نظیر میں مستعمل تشبیہات واستعارات بے مزہ ہیں۔ حسینی خال خال سادہ
زبان بھی لکھ گئے ہیں۔ لیکن اس سادہ نگاری میں بھی عبارت آرائی کا انداز ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ

---

[1] نثر بے نظیر (ق۔ن) ورق ۲۔

[2] " " ورق ۲۔

ہو۔ پری شہزادے کا پلنگ اڑا کر پرستان لے جاتی ہے:۔

"القصہ وہ پری جو اس کو وہاں سے لے اڑی پرستان کے اندر جا پہنچی اور ایک باغ میں اسے آتارا۔ وہاں کا عالم دنیا سے نرالا تھا۔ بیت:-

طلسمات کے سارے دیوار و در
نہ یاں کے سے کوٹھے نہ یاں کے سے گھر

کا (کذا) باغیچہ معمار قدرت الٰہی نے بنایا تھا اور باغبان قضا نے رنگ برنگ کا گل بوٹا اس میں لگا تھا (کذا) کیوں نہ اس کے دیکھنے سے دل کو تازگی اور روح کو طراوت ہو۔ اسکی عمارتیں رنگین رشک عمارات خلد بریں۔ نہ انہیں آگ پانی کا خطرا نہ سردی گرمی سے دھڑکا۔"[1]

نثر بے نظیر کی تصحیح شیر علی افسوس نے کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"نثر بے نظیر بھی چھاپے کے وقت اسی طرح درست کرنے میں آئی۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ بے رنگ تھی اور نظم اس کی نہایت رنگین صنائع بدائع سے بھری ہوئی۔ میر حسن سا شاعر اسکا مصنف اور مؤلف اسکا فن شاعری سے ماہر نہ تھا۔ بنا بر اس کے مطابق اس کے نہ کر سکا۔ ہاں اپنی وضع کی ایک کتاب جدی لکھی۔ چنانچہ اکثر صاحبوں کے پاس وہ موجود ہے۔"[2]

---

[1] نثر بے نظیر (ق۔ن) ورق ۷، ۳۔

[2] دیباچہ آرائش محفل (ق۔ن) شیر علی افسوس ورق ۳، ۴۔

۲۷

ہفت گلشن

مظہر علی خاں ولا

ہفت گلشن ناصر علی خاں بلگرامی کی فارسی تالیف ہے۔ مظہر علی خاں ولاؔ نے گل کرسٹ کے حکم سے اسکا اردو میں ترجمہ کیا اور "ہفت گلشن" ہی نام رکھا۔ ولاؔ دیباچے میں لکھتے ہیں :۔

"ابتدائے رسالہ یوں ہے کہ بیشتر کتنی حکایتیں بطور نصایح کے سخنان بزرگانہ سے ناصر علی خاں بلگرامی واسطے (کذا) نے زبان فارسی میں تالیف کیں اور نام اسکا ہفت گلشن رکھا سو اب عصر میں عالی گوہر بادشاہ ظل اللہ کے اور عہد میں اس عادل زمان کے کہ جس کے عدل سے ایک گھاٹ (کذا) باگ بکری پانی پیتے ہیں......... وہ حاتم دوراں امیرالامرا......... مارکوس ولزلی بہادر کورنر (کذا) جنرل ممالک محروسہ سرکار کمپنی انگریز متعلقہ کشور ہند فدوی شاہ عالم بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ مظہر علی خاں شاعر کہ ولا جسکا تخلص ہے واسطے سمجھنے اور سیکھنے نوآموز صاحبوں کے بموجب حکم جناب گل کرسٹ صاحب دام اقبالہ زبان اردو میں بیان کرتا ہے"[1]

---

[1] دیباچہ ہفت گلشن (ق ن) مظہر علی خاں ولا ورق ۲۰۱۔

ہفت گلشن ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوئی۔ خاتمے کی عبارت سے سنہ تکمیل کا علم ہوتا ہے:۔

"شکر اس خدا کا کہ جس کے فضل و عنایت سے یہ نصیحت آمیز کتاب ہفت گلشن

ہے تاریخ چودھویں جمادی الثانی کی سن بارہ سو سولہ ہجری مطابق اٹھارہ سو

ایک عیسوی میں روز جمعہ دوپہر اوّل وقت نماز ظہر کلکتے میں بہ محاورہ زبان اردو

دو تاریخ سمیت تمام ہوئی ....

یہی ہاتف غیب کی ہے ندا | یہی کہتے ہیں انس وجان وحش وطیر
ولاؔ نے کہی خوب تاریخ یہ | بجا اب ہوئی ہفت گلشن کی سیر ۱۲۱۶ھ

ردیف و قوافی کو تبدیل کر"[1]

ہفت گلشن فورٹ ولیم کالج کے زمانے میں طبع نہ ہو سکی۔ گل کرسٹ کی ۱۹ اگست ۱۸۰۲ء کی

انعام کے لئے سفارشی فہرست میں یہ طباعت کے لئے تیار شدہ کتابوں کے ذیل میں شامل تھی۔ اسکے

صفحات کی تعداد تین سو تھی اور گل کرسٹ نے اس پر اسّی روپے انعام کی سفارش کی تھی[2] لیکن کالج کونسل

نے یہ فہرست نامنظور کر دی تھی۔ ہفت گلشن کا ۱۲۹ اوراق کو محیط خوش خط اور قدرے کرم خوردہ قلمی

نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔ اسکا ایک قلمی نسخہ ڈاکٹر عبادت بریلوی کو

برٹش میوزیم لندن میں دستیاب ہوا۔ اسے انہوں نے اپنے مقدمے کے ساتھ ۱۹۶۴ء میں کراچی سے

شائع کر دیا ہے۔

ہفت گلشن اخلاق او پند و نصائح پر مبنی حکایات کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کا ایک گلشن بطور ایک

---

[1] دیباچہ ہفت گلشن (ق۔ن) مظہر علی خاں ولاؔ ورق ۲۹۔

[2] Proceedings of the College of F. W. Vol. 559, P. 277

باب کے ہے۔ یوں ہفت گلشن سات ابواب پر مشتمل ہے۔ تمام گلشنوں میں پہلا گلشن نسبتاً طویل ہے۔
اس میں پچیس حکایات مذکور ہیں۔ انسانوں، جانوروں اور پرندوں پر مبنی یہ دلچسپ حکایات بے حد
نصیحت آموز ہیں۔ دوسرے گلشن کی حکایت میں زمانیکی تبدیلی بیان کی گئی ہے۔ اس حکایت سے علم
کی افادیت پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔ تیسرے گلشن میں آداب گفتار بیان کئے گئے ہیں۔ چوتھا گلشن
آداب مباحثہ پر مشتمل ہے۔ پانچویں گلشن میں آداب نوکری مذکور ہیں۔ چھٹے گلشن میں حضرت علیؓ کی
نصیحتیں درج ہیں۔ ساتویں گلشن میں کلمات طیبات حضرت محمدؐ پیش کئے گئے ہیں۔

ہفت گلشن سے پند و نصیحت کے جو نکات ظاہر ہوتے ہیں وہ حیات انسانی کے ہر پہلو سے
تعلق رکھتے ہیں۔ یہ نصائح کسی خاص زمانے یا عہد تک محدود نہیں بلکہ زمان و مکان کی قید سے
آزاد ہیں۔ ان کا اثر اور تازگی ہمیشہ قائم رہے گی۔

موضوع کے علاوہ ہفت گلشن کی سب سے بڑی خوبی اس کی زبان ہے۔ یہ بے حد سادہ،
سلیس، رواں اور شگفتہ ہے۔ اس میں مستعمل روزمرہ اور عام بول چال کے الفاظ نے عبارت میں
دلکشی پیدا کر دی ہے۔ کہیں کہیں ولاؔ نے فارسی کے الفاظ اور تراکیب استعمال کی ہیں۔ لیکن ان سے
عبارت کے حسن اور تاثیر میں خلل نہیں پڑتا بلکہ اضافہ ہی ہوتا ہے۔ ولاؔ کا اسلوب مکمل طور سے اپنے
موضوع سے مطابقت رکھتا ہے۔ حکایات جس طرز بیان کی متقاضی ہوتی ہیں ولاؔ نے اس کی کامیاب
مثال پیش کی ہے۔ مندرجہ ذیل مثال ملاحظہ ہو۔ اس سے ہفت گلشن کے اسلوب کی خصوصیات
کسی حد تک واضح ہوں گی:۔

"ایک لڑکا گلہ بانی کرتا تھا اور ہر روز گوسفندوں کے تئیں
چرایا کرتا اور ٹھٹھے کرتا کہ بھیڑیا آتا ہے۔ وہ بھیڑیں اس کی آواز سے دوڑ دوڑ
آتی تھیں اور کبھی بھیڑیئے کو نہ پاتی تھیں۔

جب کہ پانچ چھ باری یہ بات جھوٹ دیکھی پھر اس کی آواز پر کوئی اس کے نزدیک نہ جاتی۔

ناگہانی ایک روز بھیڑیا جنگل سے نکلا اور یہ لڑکا گلہ بان ہر چند انکو پکارا لیکن کسی نے باور نہ کیا آخر گلے سے گلا ایک گوسفند کا پکڑا جنگل کیطرف لے گیا۔

فائدہ قصے کا یہ ہے کہ شیوہ خوش طبعی کا اور دروغ گوئی کا پسند مت کر اِس واسطے کہ جو کوئی جھوٹا مشہور ہوتا ہے اگر کبھی سچ کہے تو بھی کوئی اسکی بات باور نہیں کرتا ہے۔[1]

۲۸

لطایف ہندی
للوجی لال کوی

لطائف ہندی میں ایک سو مختصر حکایتیں درج ہیں۔ انہیں للوجی نے مرتب کیا تھا۔ یہ فارسی اور ناگری دونوں رسم الخط میں ایک ساتھ انڈیا گزٹ پریس سے ۱۸۱۰ء میں شائع ہوئی تھی۔[2] فارسی

---

[1] ہفت گلشن (مطبوعہ) مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۳۰۔

[2] Annals of the College of F.W., by T. Roebruck Appendix P. 25,26
اور سرورق لطایف ہندی مطبوعہ ۱۸۱۰ء۔

رسم الخط والے حصے کی زبان ریختہ ہے۔ اور ناگری رسم الخط کی زبان برج بھاشا ہے۔ لطائف ہندی کو "نقلیات" بھی کہا گیا ہے۔ اسکا مطبوعہ نسخہ (سنہ ۱۸۱۰ء) ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔ یہ نسخہ قدرے کرم خوردہ ہے۔ اس لئے برج بھاشا والے حصے میں درج ایک بیان واضح نہیں ہو سکا۔ اس بیان میں غالباً یہ وضاحت درج ہے کہ اسے للوجی نے سمبت ۱۸۶۷ (مطابق سنہ ۱۸۱۰ء) میں ولیم ٹیلر اور لاکٹ کے حکم سے ترتیب دیا تھا"[1]

لطائف ہندی کی حکایتیں مختلف موضوعات کو محیط ہیں۔ یہ مزاحیہ بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔ ان میں ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی تصویریں بھی جا بجا مل جاتی ہیں۔

ان حکایات میں للوجی کا اسلوب بیان انکی دیگر تصانیف سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں انکے اسلوب میں اردو اور ہندی کے آسان الفاظ کا امتزاج نظر آتا ہے۔ یہ انداز بیان موزوں، واضح اور بے حد رواں ہے۔ اس اسلوب پر برج بھاشا کے اثرات چھو بھی نہیں گئے ہیں۔ للوجی جہاں ہندی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں وہ اتنے مناسب، شیریں اور آسان ہیں کہ طبع لطیف پر گراں نہیں گزرتے۔ للوجی نے ہر حکایت میں موضوع کے لحاظ سے لب و لہجہ اور انداز بیان بھی بدل دیا ہے۔ یہ مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

"ایک اندھا بیراگی کاشی کے بیچ منکرنکا گھاٹ پر بیٹھا گہن میں دہی پیڑے کھا رہا تھا کہ دیکھ کر کسی پنڈت نے پوچھا سور داس جی یہ کیا کرتے ہو۔ بولا مہاراج دہی پیڑے کھاتا ہوں۔ کہا گہن میں۔ جواب دیا بابا میرے گھر وکی دیا سے سدا ہی گہن ہے۔ یہ سن پنڈت ہنس کر چپ ہو رہا"[2]

---

[1] خاتمہ لطائف ہندی۔ [2] لطائف ہندی (مطبوعہ سنہ ۱۸۱۰ء) للوجی لال کوی ص ۳۰۲۔

"ایک روز کسی حبشی نے راہ میں درپن پڑا پایا۔ ہاتھ میں لے جوں اس نے اس میں دیکھا تو اسے اپنے چہرے کا عکس نظر آ دیا۔ تب لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھ۔ آرسی پر تھوک یہ کہہ کر پھینک دیا کہ جب ایسا برا منھ ہے تبھی کوئی رستے میں ڈال گیا ہے۔"[1]

لطائف ہندی کی حکایتوں میں ہندی محاورے اور ضرب الامثال بھی مستعمل ہیں۔ اس مجموعے میں ایک فرہنگ کے ذریعے مشکل الفاظ کے معنی انگریزی اور ہندی میں درج کیے گئے ہیں۔

۲۹

نقلیات (نقلیات ہندی)

(The Hindee Story Teller)

مرتب:۔ میر بہادر علی حسینیؔ

شائع کردہ:۔ گل کرسٹ

"نقلیات" مختصر نقلوں کا مجموعہ ہے۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اسے بہادر علی حسینی نے مختلف منشیوں کی مدد سے یکجا کیا تھا اور گل کرسٹ نے اسے صرف شائع کیا۔ اس کی پہلی جلد میں گل کرسٹ کا انگریزی زبان میں تحریر کردہ پیش لفظ اور اختتامیہ شامل ہے۔ دوسری جلد میں گل کرسٹ نے صرف پیش لفظ لکھا ہے۔ نقلیات کی پہلی جلد ۱۸۰۲ء میں اور دوسری ۱۸۰۳ء میں ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی۔[2]

---

[1] لطائف ہندی (مطبوعہ ۱۸۱۰ء) للوجی لال کوی ص ۱۲۵، ۱۲۶۔ [2] سرورق نقلیات جلد اوّل و جلد دوم۔

دوسری جلد کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۰۶ء میں THOMAS HUBBARD نے ہندوستانی پریس سے ہی شائع کیا تھا۔[۱] دوسری جلد کے لئے عتیق صدیقی صرف ۱۸۰۶ء والے ایڈیشن کا ذکر کرتے ہیں۔[۲]
گل کرسٹ نے ۱۹ اگست ۱۸۰۲ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں نقلیات کی دونوں جلدوں پر کل دو سو روپے انعام کی سفارش کی تھی اور رائے کے کالم میں لکھا تھا:-

"The head Moonshee, who collected, collated, translated and prepared these stories from various sources in his own house with the aid of other Moonshees Occassionally."[۳]

لیکن کالج کونسل نے اس فہرست پر غور کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ نقلیات کی بعض نقلیں حیدر بخش حیدری کی "مختصر کہانیاں" میں بھی کسی قدر مماثلت کے ساتھ ملتی ہیں۔

نقلیات کی پہلی جلد رومن فارسی اور ناگری تینوں رسم الخط میں ایک ساتھ شائع کی گئی تھی تاکہ صاحبان نوآموز کو دقت نہ ہو۔ اس میں ایک سو آٹھ (۱۰۸) نقلیں ہیں۔[۴] دوسری جلد صرف فارسی اور ناگری رسم الخط میں ہے۔ اس میں ایک سو بانوے (۱۹۲) نقلیں درج ہیں۔[۵] نقلیات کی یہ دونوں جلدیں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ۱۹۰۹ء میں اورینٹل کالج کے

---

[۱] Annals of the College of F.W. by Thomas Roebuck Appendix P.25

[۲] گل کرسٹ اور اس کا عہد۔ عتیق صدیقی طبع اوّل ص ۱۹۱۔ طبع ثانی ۱۴۹

[۳] Proceedings of the College of F.W. Vol. 559, P. 276

[۴] نقلیات جلد اول مطبوعہ ۱۸۰۲ء۔

[۵] " جلد دوم " ۱۸۰۳ء۔

میگزین میں ان دونوں جلدوں کو شائع کر دیا ہے۔

نقلیات مختلف موضوعات پر مشتمل دلچسپ اور مزاحیہ نقلوں کا مجموعہ ہے۔ ان نقلوں کا مقصد بھی کالج کی دوسری تصانیف کی طرح صاحبان نوآموز کو اردو زبان سے روشناس کرانا تھا۔ یہ مختصر نقلیں اس مقصد کے لئے بے حد موزوں اور مناسب ہیں۔ ان میں عقل و دانش کے رموز بھی ہیں اور پند و نصیحت بھی۔ مزاح بھی ہے اور درس و عبرت بھی۔ نقلیات میں قواعد کے طریقے بھی درج ہیں۔

جاوید نہال نے نقلیات کو "نقلیات لقمانی" سمجھ کر اسے تارنی چرن متر کا کارنامہ قرار دیا ہے۔ انہوں نے جو تفصیلات اور مثالیں درج کی ہیں وہ نقلیات سے متعلق ہیں۔ تارنی چرن متر نے غلام اکبر اور نور علی کے ساتھ مل کر نقلیات کی صرف تصحیح کا کام انجام دیا تھا۔

نقلیات کی زبان بے حد آسان اور رواں ہے۔ ہر قسم کا مضمون اور اردو کے اشعار و ابیات، خال خال ہندی کے الفاظ، محاورے اور ضرب الامثال سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اکثر ضرب الامثال اور محاوروں کو نظم بھی کیا گیا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:۔

۔۔۔۔۔ ۴۵ نقل ۔۔۔۔۔

"دو آدمی آپس میں لڑتے تھے۔ ایک شخص چھڑانے لگا تب ان دونو (کذا) نے کہا کہ تو کون ہے جو چھڑاتا ہے ہم جانیں یہ جانے تب اس نے کہا مجھے کیا تم لڑا کرو

گوشتِ خر دندان سگ "[1]

۔۔۔۔۔ ۲۵۹ نقل ۔۔۔۔۔

"ایک منجم کو دار پر کھینچا چاہتے تھے۔ اتنے میں کسو نے اس سے پوچھا کہ یہ شکل بھی تو نے

---

[1] نقلیات جلد اول مطبوعہ ۱۸۰۲ء ص ۲۷۔

کبھی اپنے طالع میں دیکھی تھی، بولا ایک بلندی نظر آتی تھی مجھے پر میں نہ جانتا تھا
کہ اس بلندی کو پہنچوں گا۔"[1]

---

۹۴ نقل

"ایک غریب مفلس ایک دن اپنے یاروں سے کہنے لگا کہ میں اگر بادشاہ ہوؤں تو
تم سب آشناؤں کو بڑا آدمی کر دوں" ان میں سے ایک بول اٹھا کہ "نہ نو من تیل
ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔"[2]

۳۰

نقلیات لقمانی

(ORIENTAL FABULIST)

گل کرسٹ، تارنی چرن متر، امانت اللہ، سدل مشر پنڈت،
میر بہادر علی حسینی، میر شیر علی افسوس، للوجی لال کوی، غلام اشرف

نقلیات لقمانی میں AESOP'S FABLES اور دیگر قدیم قصوں کا انگریزی سے ہندوستانی

---

[1] نقلیات جلد دوم مطبوعہ ۱۸۰۳ء ص ۱۰۲۔

[2] " " (اورینٹل کالج میگزین لاہور، فروری، مئی ۱۹۶۹ء) ص ۲۶۔

فارسی، عربی، برج، بھاشا، بنگلہ اور سنسکرت میں ترجمہ درج ہے۔ مختلف زبانوں کے یہ ترجمے رومن رسم الخط میں لکھے گئے ہیں۔ اس ترجمے کے کام میں تارنی چرن متر، امانت اللہ، سدل مشر، بہادر علی حسینی، شیر علی افسوس، للوجی لال کوی اور غلام اشرف شامل تھے۔ اول الذکر تینوں[۲] حضرات نے بالترتیب بنگلہ، عربی اور سنسکرت میں ترجمہ کیا تھا۔ گل کرسٹ نے ہدایت اور رہنمائی کا کام انجام دیا تھا۔ نقلیات لقمانی ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی۔[۱]

گل کرسٹ نے ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں نقلیات لقمانی کو بھی شامل کیا تھا۔ اس پر اس نے چھ سو روپے انعام کی تجویز پیش کی تھی اور رائے کے کالم میں لکھا تھا:۔

"Among these translators the three[۲] first only are peculiarly entitled to any remuneration because the burnden of the Bengalee, arabic and Shanscrit fell on them exclusively and by far the heaviest part on Tarneechurn Mitr.[۳]

لیکن کالج کونسل نے اس پوری فہرست پر غور کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

ایک ہی مواد کو مختلف زبانوں میں ترجمہ کرنے سے گل کرسٹ کا مقصد یہ تھا کہ سول ملازمین ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبانوں کی مطابقت اور تفریق کے بارے میں واقفیت حاصل کر سکیں۔

---

[۱] Annals of the College of F.W. Appendix P. 27

[۲] تارنی چرن متر، امانت اللہ، سدل مشر پنڈت۔

[۳] Proceedings of the College of F.W. Vol. 559, P. 276

اور گل کرسٹ کے نزدیک یہ بہت مؤثر طریقہ تھا کہ سول ملازمین کو رومن رسم الخط کے ذریعے ان تمام زبانوں کے رموز ونکات سے واقف کرایا جائے[1]۔ محترم ڈاکٹر گیان چند کو بھی غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس کے مواد کے لئے مختلف زبانوں سے خوشہ چینی کی گئی ہے۔ تارنی چرن نے بنگلہ سے مولوی امانت اللہ نے عربی سے اور سدل مشر نے سنسکرت سے ترجمہ کیا[2]۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریزی قصوں کو متذکرہ بالا حضرات نے بنگلہ، عربی اور سنسکرت زبانوں میں ترجمہ کیا تھا۔ اسی لئے گل کرسٹ نے اس کتاب کا دوسرا نام POLYGLOT TRANSLATION بھی رکھا تھا[3]۔

جاوید نہال نے نقلیات لقمانی اور نقلیات ہندی (THE HINDEE STORY TELLER) میں کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ چنانچہ وہ نقلیات ہندی کو نقلیات لقمانی سمجھ کر نقلیات ہندی کی ساری تفصیل درج کئے گئے ہیں۔ اور وہ نقلیات ہندی کی مثالوں کو نقلیات لقمانی کی مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں[4]۔

---
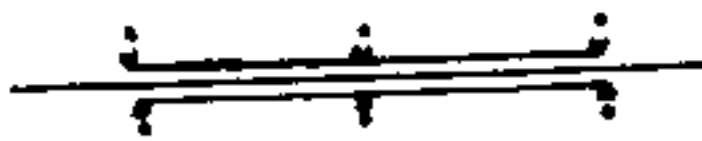
[1] پیش لفظ Oriental Fabulist از گل کرسٹ بحوالہ British Orientalism and Bengal Renaissance by D. Kopf P. 9,10

[2] اردو کی نثری داستانیں۔ گیان چند جین ص ۲۳۴۔

[3] Annals of the College of F. W. Appendix P. 27

[4] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب۔ جاوید نہال ص ۲۸۱ تا ۲۸۳۔

۳۱

بدیا درپن
مرزا ئی بیگ

یہ للو جی لال کوی کی پوربی بولی کی تصنیف "اودھ بلاس" کا ہندوستانی ترجمہ ہے۔ اسمیں رام چندر کی داستان کے علاوہ ان علوم وفنون کا بھی ذکر ہے۔ جو صرف ہندوؤں کی میراث ہیں۔ تھامس روبک اپنی مشہور تصنیف "انالس آف دی کالج آف فورٹ ولیم" میں لکھتے ہیں:-

"بدیا درپن۔ (مرأۃ العلوم) اودھ بلاس سے ماخوذ ہے۔ جسے اصل میں شری لال کوی نے پوربی بھاشا میں ۱۷۰ سال قبل تصنیف کیا تھا اور اب یہ پہلی بار ہندی کی اس انوکھی بولی میں ترجمہ کی گئی ہے جسے عموماً سپاہی بولتے ہیں۔ اس میں رام کی تعریف کے علاوہ ہندوؤں کے دیگر علوم وفنون کا بھی ذکر ہے۔ اس (ترجمہ) کو زبان کے سلسلے میں ایک نرالا اور مفید کارنامہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ ترجمہ مرزا ئی بیگ نے جو اودھ کے رہنے والے ہیں کالج کے اکزامنر اور اسسٹنٹ سکریٹری تھامس روبک کی نگرانی میں انجام دیا ہے۔"[1]

للو جی کی تصنیف اودھ بلاس کو ایک سو ستر سال قبل کا کارنامہ نہیں کہا جا سکتا

---

[1] Annals of the College of F.W. Appendix A P. 424

"اَنالس آف دی کالج آف فورٹ ولیم" میں پرنٹ کی متعدد غلطیاں موجود ہیں۔ یہاں ایک سو ستر سال کی بجائے ستّرہ سال ہونا چاہیئے۔ غالباً اسی وجہ سے محترم جاوید نہال صاحب کو اس تصنیف کے سلسلے میں شدید مغالطہ ہوا ہے۔ وہ "اودھ بلاس" کسی مصنّف کا نام سمجھتے ہیں۔ جس نے ایک سو ستّر سال قبل "بدیا درپن" تصنیف کیا تھا۔ وہ تھامس روبک کے مندرجہ بالا اقتباس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:۔

> "بدیا درپن (مرآۃ العلوم) اودھ بلاس کی تصنیف ہے، یہ ۱۷۰ سال قبل لکھی گئی تھی۔ شری للولال کوی نے اسکا ترجمہ پوربی زبان میں کیا تھا۔ اس وقت ہندوستانی (جو سپاہیوں کی زبان ہے) میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اسمیں رام کی کہانی ہے اور ہندوستان کے تمام علوم وفنون پر مکمل تبصرہ ہے۔ کیپٹن روبک اور کالج کے نائب سکریٹری کی نگرانی میں اسکا ترجمہ مرزا بیگ نے ہندوستانی میں کیا۔ مرزا بیگ اودھ کا رہنے والا تھا۔"[۱]

اب تھامس روبک کی "اَنالس آف دی کالج آف فورٹ ولیم" سے مذکورہ اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔ تاکہ اس بات کا اندازہ ہو سکے کہ نہال صاحب نے غلط ترجمہ کرکے کتنی گمراہ کن معلومات فراہم کی ہیں:۔

> "بدیا درپن Bidya Durpun, or the Mirror of science, from Uwadh Bilas, originally written in the Poorbi Bhasha, by Shree Lal Kavi, about 170 years ago, and now for the

---

[۱] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۶۶۔

first time translated into that peculiar dialect of the Hindee usually spoken by the Sipahees, This work, besides the History of Ramu contains as abstract of almost all the arts and science known to the Hindoos, and is considered generally one of the most valuable and curious work in the Language, by Mirzaee Beg, a native of Uwudh, under the Superintendence of Capt. Thomas Roebuck, Examiner and Assitt. Secretary in the College of Fort William." [1]

"انالس آف دی کالج آف فورٹ ولیم" کی اشاعت (۱۸۱۹ء) کے وقت تک بدیا درپن کالج کونسل کے ذریعے چھپنے کے لئے منظور کر لی گئی تھی۔ اور اس وقت یا تو پریس میں تھی یا طباعت کے لئے درست کی جا رہی تھی۔[2]

Annals of the College of F. W. Appendix A, P. 421, 424 ۱۔۲

۳۲

ہندی مینول

(THE HINDEE MANUAL OR CASKET OF INDIA)

مرتبہ :- گل کرسٹ

ہندی مینول (بیاضِ ہندی) کی ترتیب میں شعبۂ ہندوستانی کے مختلف منشیوں نے ہاتھ بٹایا تھا۔ اس میں اخلاقِ ہندی، مرثیہ مسکین، سنگھاسن بتیسی، مادھونل، سکنتلا ناٹک، بیتال پچیسی، توتا کہانی، باغ و بہار، نثرِ بے نظیر، اور باغ اردو کے اقتباسات شامل ہیں۔[1] عتیق صدیقی نے صرف آٹھ کتابوں کے اقتباسات کا ذکر کیا ہے۔ مادھونل اور نثرِ بے نظیر کا نام انہوں نے نہیں دیا۔ توتا کہانی کے مصنف کا نام حیدری کی بجائے بہادر علی حسینی درج ہے[2] صدیقی صاحب نے اپنے ماخذ کا حوالہ بھی نہیں دیا ہے۔[3]

ہندی مینول ۱۸۰۲ء میں ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی۔[3] "اناس آف دی کالج آف فورٹ ولیم" میں غالباً غلطی سے ۱۸۲۰ء چھپ گیا ہے۔[4]

---

[1] Annals of the College of F.W. Appendix P. 23, 24

[2] گل کرسٹ اور اسکا عہد - عتیق صدیقی ص ۱۹۰

[3] Linguistic Survey of India Vol. IX, Part I, P. 17

[4] Annals of the College of F.W. Appendix P. 24

(۳۳)

چندراوتی

سدل مشر

چندراوتی کو سدل مشر نے ۱۸۰۳ء میں کھڑی بولی میں ترجمہ کیا۔ "یہ ناسکے تو پاکھیان کا ترجمہ ہے۔ چندراوتی ۱۸۰۳ء میں شائع بھی ہوگئی تھی۔ اسے ۱۹۰۱ء میں شیام سندر داس نے مرتب کر کے ناگری پرچارنی سبھا سے ناگری رسم الخط میں شائع کیا ہے۔ راقم الحروف کے زیر نظر یہی نسخہ ہے۔

گل کرسٹ نے ۱۹ راگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں چندراوتی پر ساٹھ روپے انعام کی سفارش کی تھی[1] لیکن کالج کونسل نے اس فہرست کو مسترد کر دیا تھا۔

سدل مشر نے چندراوتی کا سبب تالیف یوں بیان کیا ہے :۔

"سدل مشر پنڈت شری مہاراج جان گل کرسٹ صاحب سے

ملا جو پاٹھ شالہ کے آچاریہ ہیں۔ تن کی آگیا پائے دو ایک گرنتھ سنسکرت سے بھاشا۔

دو بھاشا سے سنسکرت کیئے۔

اب سمبت ۱۸۶۰[2] میں، ناسکے تو پاکھیان کو کہ جس میں چندراوتی کی

---

[1] Proceedings of the College of F. W. Vol. 559, P. 278

[2] سمبت ۱۸۶۰ مطابق ۱۸۰۳ء۔

کتھا کہی ہے دیو واڑی سے کوئی کوئی بجھ نہیں سکتا اس لئے کھڑی بولی میں کیا۔"[1]

سدل مشر کی اس تالیف میں چندراوتی کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔

چندراوتی کی زبان ہندی کی کھڑی بولی ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:۔

ایک سمے راجہ جنیجے گنگا کے تیر پر بارہ برس یگیہ کرنے کو رہے۔ ایک دن اسنان پوجا کری براہمنوں کو بہت سا دان دے دیوتا پتروں کو ترپت کر کے رشی اور پنڈتوں کو ساتھ لئے ویشمپاین منی کے پاس جا ڈنڈوت کر، کھڑے ہو، ہاتھ جوڑ، کہنے لگے کہ مہاراج! آپ دید پراڑ سب شاستر کے سار جان نہار۔ تس پر بیاس منی کے ششیہ۔ سب یوگیوں میں اندرستان ہو۔ ایسی کتھا کہہ جس کے سنے تے پاپ کٹے اور کوئی روگ نہ ہوے۔ بھر جنم سنسار میں اچھا بھوگ۔

---

[1] دیباچہ چندراوتی؛ مطبوعہ ۱۹۰۱؛ سدل مشر ص ۱۵۔

"............ सदल मिश्र पंडित श्री महाराज जान गिलक्रिस्त साहब से [illegible] पाठशाला के आचार्य हैं। तीन श्री [illegible] [illegible] संस्कृत से भाषा, जो भाषा से संस्कृत किये। [illegible] संवत १८६० [illegible] पार [illegible] जिस [illegible] चन्द्रावती की कथा कही है देववाणी में कोई समझ नहीं सकता, इस लिए खड़ी बोली में किया।"

انت میں مکتی ملے، ہم سے کہیئے"[1]

---

(۳۴)

بہار عشق

بینی نراین جہاںؔ

بینی نراین نے ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء اور ۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء کے درمیان اسے تالیف کیا۔ یہ "چار گلشن" کے بعد لکھی گئی۔

اس میں دلآرام کا قصہ مذکور ہے۔

بینی نرائن نے "نو بہار" کے دیباچے میں بہار عشق کا ذکر ان الفاظ میں

---

[1] چندراوتی (مطبوعہ ۱۹۰۹ء) سہول مشرقی ۲۔

"एक समय राजा जनमजय गंगा के तीर पर बारह बरस यज्ञ करने को रहे।

एक दिन स्नान पूजा कर, ब्राह्मणों को बहुत सा दान दे, देवता पितरों का तर्पण

करके ऋषि और पण्डितों को साथ लिये वैशम्पायन मुनि के पास [illegible]

कर, खड़े हो हाथ जोड़, कहने लगे कि महाराज! आप वेद पुराण सब

शास्त्र के सार जान [illegible], तिस पर व्यास मुनि के शिष्य, सब योगियों

में इन्द्र समान हो। [illegible]

[illegible]

کیا ہے:-

"بعد اس کے (چار گلشن) قصہ دلآرام کو............ تصنیف کر کے شہر میں رواج

دیا۔ اور نام اسکا بہار عشق رکھا۔"[1]

بہار عشق کے کسی قلمی یا مطبوعہ نسخے کا سراغ نہ مل سکا اور مزید معلومات بھی دستیاب نہ ہو سکیں۔

۳۵

گلزار حُسن

بینی نرائن جہاںؔ

گلزار حسن میں یوسف و زلیخا کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اسکا زمانۂ تالیف ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء سے ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۲ء کے درمیان واقع ہے۔ جہاںؔ نے نو بہار کے دیباچے میں گلزار حسن کا مختصراً ذکر یوں کیا ہے:-

"تس بعد (بہار عشق) قصۂ یوسف زلیخا جو اوّل فارسی میں ہے اور کسی شخص نے ہندی میں بھی ترجمہ کیا ہے۔ عبارت اسکی مغلق (مغلق) و بے محاورہ تھی۔ اس سبب سے کسی نے پسند نہ کیا۔ سوا اس ہیچمداں نے اسکو بھی نظم دختر کا زیور پہنا کر زبان اردو کے معلی میں تصنیف کیا اور نام اسکا گلزار حسن رکھ کر شہر میں رواج دیا۔"[2]

باغ عشق کے دیباچے میں درج ابیات میں ایک شعر گلزار حسن کے متعلق بھی ہے ؎

کہی ہندی میں پھر یوسف زلیخا لقب گلزار حسن اس کا رکھا تھا[1]

گلزار حسن کے بارے میں مزید معلومات دستیاب نہ ہوسکی۔ اور نہ اس کا کوئی مطبوعہ یا

غیر مطبوعہ نسخہ ہی دستیاب ہوسکا۔

---

(۳۶)

لطائف وظرائف

مظہر علی خاں ولا

لطائف وظرائف۔ کے بارے میں معلومات دستیاب نہیں۔ تاریخ جہاں گیر شاہی کے دیباچے

سے علم ہوتا ہے کہ یہ اسی نام کی کسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ "یہ پند نامہ (۱۸۰۲ء) اور تاریخ جہاں گیر شاہی

(۱۸۰۳ء) کے درمیان کا ترجمہ ہے۔ ولا جہاں گیر شاہی کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"..........بعد اس کے (پند نامہ) صاحب مدرس والا مناقب[2] نے ازراہ

نوازش والطاف مجوز ہوکر فرمایا کہ لطایف وظرایف کا ترجمہ بلطایف ظرایف

کیا جائے۔ بہتر ہے کہ تو ہی اس کا ترجمہ کر کہ زبان اردو میں تجھے خوب دخل ہے۔

اور بہ مرتبہ مہارت راقم نے بہ موجب ارشاد کے قبول کیا اور اسے انصرام کو

پہنچایا۔ اس بیں صاحب ممدوح[3] کو ولایت جانیکا اتفاق ہوا"[4]

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ مکمل ہونے سے قبل ہی گل کرسٹ وطن

واپس جا چکے تھے۔ غالباً اسی لئے اس کا ذکر گل کرسٹ کے عہد کی کالج کونسل کی کارروائیوں میں نہیں ملتا۔

---

[1] اردو کی قدیم داستانیں۔ ایم حبیب خاں ص ۹۱ [2] [3] گل کرسٹ [4] دیباچہ جہانگیر شاہی (ق۔ن) مظہر علی خاں ولا

(ب)

مذہب، اخلاق، حکمت اور سائنس

۳۷

ترجمۂ قرآن شریف

بہادر علی حسینی، مولوی امانت اللہ، مولوی فضل اللہ، حافظ غوث علی، کاظم علی جواںؔ

جواںؔ اور ان کے رفقاء کار نے گل کرسٹ کی فرمائش پر قرآن شریف کے ترجمے کا عظیم اور نازک کام ۱۲۱۹ھ مطابق ۱۸۰۴ء میں مکمل کیا۔ اس کام میں منشیوں کو تقریباً دو سال کا عرصہ محنت و مشقت میں صرف کرنا پڑا۔ اس عظیم کام کے لئے یہ مدت بہت زیادہ تصور نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اس بیچ اس ترجمے نے بہت سے نشیب و فراز دیکھے۔ جن کا ذکر کاظم علی جواںؔ نے خاتمے میں تفصیل سے کیا ہے۔ یہ ترجمہ طبع نہ ہو سکا۔ گل کرسٹ کی ۱۹ر اگست ۱۸۰۴ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست سے یہ علم ہوتا ہے کہ اس وقت اس ترجمے کی طباعت کا کام شروع ہو گیا تھا۔ گل کرسٹ نے اس پر پندرہ سو روپے انعام کی سفارش کی تھی[1]۔ لیکن بعد میں شاید اسکی طباعت ملتوی کر دی گئی۔ گل کرسٹ کی سبکدوشی کے بعد بیشتر کتابیں چھپنے سے روک دی گئی تھیں۔ اس ترجمے کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں محفوظ ہے۔ اس کی دو جلدیں ہیں۔ جن کے اوراق کی مجموعی تعداد پانچ سو چھپن ہے۔ پہلی جلد میں پندرہ

---

[1] Proceedings of the College of F. W. Vol. 559 P. 276

عتیق صدیقی نے انعام کی رقم ۵۰۰ روپے درج کی ہے (گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۱۰۲) یہ درست نہیں۔

پاروں کا ترجمہ ۲۵۲ اوراق کو محیط ہے۔ اور دوسری جلد میں بقیہ پندرہ[۱۵] پاروں کا ترجمہ ہے۔

دوسری جلد ۲۵۳ ورق سے شروع ہو کر ۵۵۵ پر ختم ہوتی ہے۔

نسخے کے شروع میں ایک عبارت درج ہے۔ جس سے اس ترجمے کے آغاز کی تاریخ کا علم ہوتا ہے:۔

"اسکے شروع کی تاریخ موافق سنہ ہجری کے تمام اس مصرع سے نکلتی ہے۔ مصرع

"صراط مستقیم الحق ہے بالکل"[۱]
۱۲۱۸

اس مصرع کے نیچے قلمی نسخے میں ہی ۱۲۱۸ھ درج ہے۔ اس طرح یہ ترجمہ ۱۲۱۸ھ م ۱۸۰۳ء میں شروع ہوا۔ بعد کے حالات کا علم خاتمے میں درج جواں کے بیان سے بخوبی ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:۔

"الحمد للہ والمنہ کہ ماہ مبارک رمضان کی نویں تاریخ سن بارہ سے انیس ہجری[۱۲۱۹] میں مطابق ۱۳ تیرہویں دجنبر (دسمبر) کی ۱۸۰۴ء عیسوی پنج شنبے کے روز ظہر کے اول وقت قرآن شریف کا ترجمہ زبان ریختہ میں تمام ہوا۔ شروع اس کی حسب الحکم صاحب عالی شان جان گل کرسٹ صاحب دام اقبالہ کے ذوالحجہ میں کہ سن بارہ سے سترہ تھے، ہوئی تھی۔ مولوی امانت اللہ صاحب اور میر بہادر علی صاحب میر منشی اور راحقر ترجمے اور محاوروں کے لئے مقرر تھے۔ بعد چندے مولوی فضل اللہ صاحب کو بھی ارشاد حضور ہوا کہ تم بھی شریک ہو کہ بدون دو مولویوں کے یہ امر عظیم ترجمے کا بخوبی انجام نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ نام انکا شروع میں مندرج ہے۔

---

[۱] ترجمۂ قرآن شریف بہ زبان ہندی ونثر (قلمی نسخہ) ورق ۱۔

اس مصرع کے لکھنے میں کاتب سے غلطی سرزد ہوئی ہے۔ "صراط مستقیم الحق ہے بالکل" سے ۱۱۸۰ھ برآمد ہوتا ہے۔ اگر یہ مصرع "صراط المستقیم الحق ہے بالکل" لکھا جائے تو سنہ ہجری ۱۲۱۸ھ برآمد ہوتا ہے۔ مترجمین نے یہی لکھا ہوگا۔

پانچ چھ سیپارے جب ترجمے ہوئے ایسی کچھ نزاع لفظی ان دونوں صاحبوں کے درمیان آئی کہ ان میں سے مولوی فضل اللہ رہے اور دوسرے صاحب کے عوض حافظ غوث علی صاحب مقرر ہوئے۔ دونو صاحب بدستور ترجمہ کرتے تھے۔ جب صاحب ممدوح ذی قعدہ کی دسویں تاریخ سن بارہ سے انیس (ہجری) مطابق ۲۲ بائیسویں فروری ۱۸۰۳ء[1] میں ولایت کو تشریف لے گئے اور اصالتاً مدرسی کپتان مویٹ صاحب دام حشمتہ کو حضور پرنور سے مقرر ہوئی۔ اسی طور سے موافق ان کے ارشاد کے کام ترجمے کا جاری رہا۔ چنانچہ اسی عرصے میں اکیس[۲۱] سیپارے ہوئے تھے کہ صاحب عالی شان نے بندے کو فرمایا مولویوں میں سے ایک مولوی ترجمہ کرے اور تو ہی محاورے کی درستی میں رہ۔ قبول کرکے مولوی فضل اللہ صاحب ترجمے کرتے رہے۔ بندہ محاورہ کرتا رہا۔ اب حق سبحانہٗ تعالیٰ کے تفضلات سے وہ کام انصرام کو پہنچایا ہے[2]۔

عتیق صدیقی کا بیان ہے کہ ترجمۂ قرآن شریف گل کرسٹ کے زمانے میں مکمل ہو چکا تھا اور اسکی طباعت کا کام بھی شروع ہو گیا تھا[3]۔ ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کی فہرست سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن مندرجہ بالا بیان سے علم ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ گل کرسٹ کی سبکدوشی کے بعد مکمل ہوا۔ اس کی موجودگی میں تو اکیس پارے بھی مکمل نہیں ہوئے تھے۔ ممکن ہے جتنے پاروں کا ترجمہ ہو گیا ہو۔

---

[1] ذی قعدہ کی دسویں تاریخ ۱۲۱۹ھ مطابق ۲۲ فروری ۱۸۰۳ء غلط درج ہے۔ یہاں ۱۲۱۸ھ ہونا چاہیے (مفتاح التقویم ص ۲۷۴، ۲۷۵)۔ [2] ترجمۂ قرآن شریف (ق۔ن) ورق ۲۵۶، ۲۵۷۔

[3] گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۱۶۸، ۱۶۹۔

گل کرسٹ نے انکی طباعت شروع کروادی ہو. صدیقی صاحب کے بیان کے مطابق گل کرسٹ کی روانگی تک ۱۷۵ صفحات طبع ہو چکے تھے[۱]. موصوف نے کالج کونسل کی ۱۸۰۶ء کی کارروائی کے حوالے سے یہ معلومات بھی فراہم کی ہے کہ اس ترجمے کا فورٹ ولیم کالج سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ گل کرسٹ نے ہندوستانی پریس سے شائع کرنیکی نیت سے یہ ترجمہ کروایا تھا. لیکن گل کرسٹ کی روانگی کے بعد گورنر جنرل نے قابل اعتراض سمجھ کر اسکی طباعت روک دی تھی. اور اس کے مطبوعہ اجزاء ضبط کر لئے گئے تھے[۲].

لیکن ہمیں یہ ماننے میں تامل ہے کہ اس ترجمے کا فورٹ ولیم سے کوئی تعلق نہیں تھا اور گل کرسٹ صرف ہندوستانی پریس سے شائع کروانیکی نیت سے یہ ترجمہ کروا رہا تھا. اگر اسکا فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی سے کوئی تعلق نہ ہوتا تو وہ اسے ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء اور ۹ ستمبر ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرستوں میں شامل نہ کرتا. ان دونوں فہرستوں کو اس نے کالج کونسل کے سامنے پیش کیا تھا اور رائے کے کالم میں انعام سے نوازنے کے لئے پرزور الفاظ میں سفارش کی تھی. گل کرسٹ ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کی فہرست میں لکھتا ہے :-

"اگر اس انعام (۱۵۰۰ روپے) کو دینے میں کوئی اعتراض ہو تو ان میں سے دو مولویوں کو ۸۰ - ۸۰ روپے تنخواہ ملنی چاہیئے اور مرزا جواں کو جو اسوقت ۸۰ روپیہ پاتے ہیں. کم از کم سو روپیہ مشاہرہ ملنا چاہیئے. اس ترجمے سے میر بہادر علی کی حقیقی صلاحیتیں ظاہر ہوں گی."[۳]

---

[۱] گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۱۷۸، ۱۷۹.

[۲] " " " " ص ۱۷۸، ۱۷۹.

[۳] Proceedings of the College of F. W. Vol. 559 P. 277

لیکن کالج کونسل نے اس پوری فہرست کو نامنظور کر دیا۔ تب گل کرسٹ نے ۹ ستمبر ۱۸۰۳ء کو ایک دوسری فہرست پیش کی۔ اس میں وہ لکھتا ہے:۔

"دونوں[1] مولوی ۸۰ ۔ ۸۰ روپے تنخواہ پانے کے قابل ہیں۔ اور مرزا جواں کو جو اس وقت ۸۰ روپے پا رہے ہیں، کم از کم سو روپے ملنے چاہیئے۔ پچھلے کئی مہینوں سے یہ تینوں[2] ایک ایسے کام میں لگے ہوتے ہیں جو ایک فراخ دل حکومت سے ہر طرح کا مناسب انعام پانے کے قابل ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ کالج کونسل میری اس سفارش پر مہربانی سے غور کرے گی۔ یہ سفارش ان حضرات کے متعلق ہے جو میرے زیر نگرانی بڑے جوش سے قرآن کا ہندوستانی ترجمہ کرنے میں لگے ہوتے ہیں۔ غالباً یہ اٹھارہ مہینے میں یا شاید اس سے جلد ہی مکمل ہو جائے۔"[3]

واضح ہو کہ مذکورہ دونوں فہرستیں شعبۂ ہندوستانی کے ادبی کارناموں پر مشتمل تھیں۔ دراصل گل کرسٹ شعبۂ ہندوستانی کے مصنفین اور انکے کارناموں کے لئے جسقدر ہمدردی اور خلوص کا جذبہ رکھتا تھا۔ اس کے تحت انکی ہمت افزائی اور حوصلہ افزائی کے لئے طرح طرح سے کوشاں رہتا تھا۔ اسکی صدارت کا زمانہ شعبۂ ہندوستانی کا زریں دور تھا۔ اسکی سبکدوشی کے بعد نہ وہ جذبہ کسی میں رہا اور نہ وہ روح۔ شعبے میں افسران کے درمیان اختلافات بھی پیدا ہوئے۔ اس ترجمے کو ضبط کرنیکے پس پشت بھی کوئی نہ کوئی مصلحت رہی ہوگی۔

---

[1] مولوی امانت اللہ اور مولوی فضل اللہ۔

[2] " " " " اور مرزا کاظم علی جواں۔

[3] Proceedings of the College of F.W. Vol. 559, P. 284

جوآں نے اس ترجمے کی زبان و بیان کے متعلق یہ صراحت درج کی ہے کہ انہوں نے عربی کی تفسیر بیضاوی، مدارک اور جلالین اور فارسی کی بحر مواج اور تفسیر حسینی سے استفادہ کیا ہے۔ وہ آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"مگر جہاں زمانے کی مطابقت سے ہندی عبارت کے مطلب میں خلاف نظر آیا چارو ناچار بہ طور محاورے کے رہنے دیا اور اگرچہ لفظ کے ترجمے کی رعایت سراسر رکھی ہے پر کہیں کہیں اصل مطلب لیا ہے کیوں کہ لفظ کی متابعت سے معنوں کا فوت ہونا قباحت عظیم ہے۔ اس لئے اس بات کو ترجیح دی۔ بہر نوع مطلب نہیں چھوڑا۔ اسی لئے محاورے کو چنداں دخل نہیں دیا کہ کتابی عبارت کا داب، روزمرے کی بول چال سے اور ہے۔ حروف مقطعات کا ترجمہ جو باالاتفاق نہ پایا نہ کیا۔ اور مفعول مطلق ہندی میں شاذ و نادر ہے کہیں جو رہ سکا تو رکھا والا نہ (یا) یا چھوڑ دیا۔ یا لفظ تاکید زیادہ کیا کہ اس سے تاکید غرض ہے اور عربی میں التفات بہت سا ہے اور ہندی میں کم۔ لیکن وہ قاعدہ رہنے دیا کہ بہت تکرار رہے۔ واؤ عاطفہ اور حرف ف اور وہ الفاظ کہ معنی میں تحقیق کے آتے ہیں قرآن شریف میں بہت ہیں اور زبان عرب میں نہایت فصاحت رکھتے ہیں۔ ہندی میں گو کہ انکی کثرت محاورے کی رو سے اس قدر نہیں لیکن ترک کرنا انکا جائز نہ دیکھا اسی سبب سے جس طرح جملے میں جسقدر آئے ترجمہ کیا۔"[1]

---

[1] ترجمۂ قرآن شریف (ق.ن) ورق ۲۵۸۔

جوآں کے محولہ بالا بیان سے قرآن کے ترجمے کی زبان اور دیگر نکات پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔

اس ترجمے میں لمبی سورتوں کا ترجمہ رواں، واضح اور صاف ہے۔ الفاظ بھی بہت موزوں اور مناسب استعمال کئے گئے ہیں۔ کہیں کہیں تذکیر و تانیث کی غلطیاں ملتی ہیں۔ پارۂ الٓمٓ سے یہ مثال ملاحظہ ہو:۔

"اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ بے شک خدا تمہیں فرماتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو ط بولے کہ کیا تو ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے ط کہا کہ پناہ چاہتا ہوں میں خدا سے کہ جاہلوں سے نہ ہوں ہ بولے کہ ہمارے واسطے اپنے پروردگار سے سوال کر کہ ہم سے بیان کرے کہ وہ کیا ہے ط کہا بے شبہ وہ کہتا ہے تحقیق کہ وہ ایک گائے ہے نہ بوڑھی ہو نہ جوان ط بین بین اسکے ط پس کرو جو حکم کئے گئے ہو ہ کہنے لگے ہمارے واسطے اپنے پروردگار سے سوال کرتا کہ بتادے کہ ہمیں اسکا کیا رنگ ہے ط کہا تحقیق وہ کہتا ہے کہ وہ ایک زرد گائے ہے نہایت زرد ہے رنگ اسکا خوش کرتی ہے دیکھنے والوں کو"[1]

لیکن چھوٹی سورتوں میں زبان و بیان کا یہ انداز نہیں ملتا۔

---

[1] ترجمۂ قرآن شریف (ق۔ن) ورق ۵۵۵۔

۳۸

دہ مجلس

محمد بخش

"دہ مجلس" کو محمد بخش نے (۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء مین) اردو میں "دہ مجلس" کے ہی نام سے منتقل کرکے گل کرسٹ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ لیکن گل کرسٹ نے اس ترجمے کو اصلاح کی غرض سے مظہر علی خاں ولاؔ کے سپرد کیا۔ اس درمیان گل کرسٹ مراجعت کر گئے۔ چنانچہ ولاؔ نے CAPT. MOUNT کے عہد میں بھی اصلاح کا کام کیا۔ اور جہاں جہاں محمد بخش نے اشعار کا ترجمہ نثر میں کر دیا تھا اسے بھی نظم کیا اور خاتمے کی تاریخ کہی۔ دہ مجلس میں محمد بخش کا کوئی بیان نہیں۔ بلکہ ان تمام نشیب و فراز کو ولاؔ نے دہ مجلس کے دیباچے میں یوں بیان کیا ہے:۔

"سن بارہ سے اٹھارہ ہجری میں نوازش والطاف سے صاحب عالیشان جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام حشمتہ کے یہ اتفاق ہوا کہ جب منشی محمد بخش نے توجمہ دہ مجلس کا زبان اردو میں کرکے گزرانا، انہوں نے اصلاح کے لئے احقر کو فرمایا۔ چندے یہاں ان کے رہتے ان کا فرمانا بجا لایا۔ اور ان کے ولایت کو تشریف لے جانے کے بعد حسب الحکم جناب کپتان مویٹ صاحب دام دولتہ کے جوان کے قایم مقام مدرّس تفرلیق ہندی کے ہیں چندے اصلاح کیا اور جہاں جہاں منشی مذکور نے شعروں کا ترجمہ

نثر میں کیا تھا انہیں نظم کر دیا اور جہاں کہیں چھوڑ دیا تھا انہیں بھی منظوم کرکے تمام کیا۔ بعد اتمام کے ؎

تاریخ کی تھی فکر کہ ہاتف نے یوں کہا
غم نامۂ امام یہ تاریخ اس کی ہے[1]
(۱۲۱۹ھ ۱۸۰۴ء)

وہ مجلس غیر مطبوعہ ہے۔ ۱۸۰۳ء میں یہ طباعت کے لئے درست کی جا رہی تھی لیکن دیگر کتابوں کے ساتھ اسکی طباعت بھی منسوخ کر دی گئی۔ وہ مجلس کا ۱۸۵ اوراق پر مشتمل قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔

وہ مجلس کے مطالعے سے یہ کسی طور واضح نہیں ہوتا کہ اسکا ماخذ کون سی وہ مجلس ہے۔ جاوید نہال نے مذکورہ بالا دیباچے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:-

"فضل علی فضلی کی دہ مجلس یا کربل کتھا کو سامنے رکھ کر کالج کے لئے آسان زبان میں دوبارہ لکھا۔"[2]

حالانکہ دیباچے میں اس قسم کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ کربل کتھا اور زیر نظر وہ مجلس کے ترجمے میں واقعات کی مکمل طور سے مفصل یکسانیت نہیں ملتی۔ اور نہ یہ ثابت ہو پاتا ہے کہ فضلی کے اختصار کو محمد بخش نے تفصیل سے بیان کیا ہو۔ اسکے علاوہ مالک رام اور ڈاکٹر مختار الدین آرزو کی یہ اطلاعات بھی قابلِ غور ہیں کہ "لوگوں کی آسانی کے لئے فارسی روضۃ الشہدا کے اختصار اور خلاصے تیار ہونا شروع ہوئے۔ یہ خلاصے کبھی خلاصۂ روضۃ الشہدا کہلائے اور کبھی انہیں دہ مجلس کا نام دیا گیا۔"[3] اردو میں بھی

---

[1] دیباچہ دہ مجلس (ق۔ن)، ورق ۳۔ [2] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب۔ جاوید نہال ص ۳۷۴۔
[3] مقدمہ کربل کتھا۔ ص ۱۱۔

دہ مجلس کے نام سے خلاصے ملتے ہیں[1]۔ فاضل محققین نے دہ مجلس کے دیگر نسخوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ ممکن ہے کہ محمد بخش کی دہ مجلس ایسی ہی کسی دہ مجلس کا ترجمہ ہو۔

محمد بخش کی دہ مجلس بارہ مجلسوں پر مشتمل ہے۔ آغاز پیغمبر صلعم کے ذکر اور رحلت سے ہوتا ہے۔ اسکے بعد حضرت فاطمہؓ کی رحلت، حضرت علیؓ کی شہادت، حضرت حسنؓ کی شہادت، حضرت مسلم کی شہادت، ان کے دونوں کی بیٹوں کی شہادت، حضرت حسینؓ کی کوفہ کیلئے روانگی، جنگ اور حضرت حُر کی شہادت، حضرت قاسمؓ کی شہادت، حضرت عباسؓ کی شہادت، علی اکبر اور علی اصغر کی شہادت کے بعد اخیر میں حضرت حسینؓ کی میدان جنگ کے لئے روانگی پر یہ مخطوطہ ختم ہو جاتا ہے:-

"اس تاجدار میدان کربلا نے زرہ گلے میں ڈالی اور عمامہ رسول خدا صلے اللہ علیہ کا سر مبارک پر باندھا اور سپر حضرت امیر حمزہ سیّد الشہدا کی پشت سے لگائی۔ اور ذوالفقار جناب مرتضیٰ علیہ السلام کی حمایل کر کے ذوالجناح پر سوار ہوئے اور ارادہ میدان کا کیا اسوقت تمام پردہ نشینان حرم خیمے سے باہر نکل کر پیچھے اس جناب کے دوڑیں اور اپنے تئیں، خاک پر ڈال کر مانند مرغ بسمل کے طرح لگیں لوٹنے اور کہنے اے شاہ شہیداں ہم کو کس کے حوالے کیا۔ فرمایا خدا گے کہ وہ وکیل ہے میرا تمہارے واسطے۔ یہ کہہ کر گھوڑا فوج اعدا میں ڈال دیا۔ زیادہ اسے روایت تو ہو نہیں سکتی۔ اب آگے شرح شہادت تو ہو نہیں سکتی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ہ"[2]

---

[1] مقدمہ کربل کتھا۔ ص ۱۱۔ [2] دہ مجلس (ق۔ ن) ورق ۸۵۔

دہ مجلس کے بیانات درد و تاثیر اور سوز و گداز کی پوری کیفیت رکھتے ہیں۔ ان میں مزید درد پیدا کرنے کے لئے ابیات اور مرثیے کا بھی کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ حضرت علیؓ کے بیان سے منقول یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔ اس میں کسقدر تاثیر ہے :۔

"حضرت امیر نے فرمایا کہ بے تقصیر پر قصاص واجب نہیں۔ لیکن میرے تئیں جناب رسول صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ خبر پہنچی ہے کہ اس مہینے میں قبلہ مراد سے کوئی شخص تلوار تم پر مارے گا۔ پر اپنی مراد کو نہ پہنچیگا۔ یہ کہہ کر جناب حضرت ایسا روئے کہ محاسن شریف آنسوؤں سے بھیگ گئے۔ اور فرمایا کہ اے حاضرانِ مجلس جو شخص کہ یہاں حاضر نہیں ہیں انکو بھی یہ پیغام پہنچانا کہ جس وقت فرزندوں کو میرے شہید کریں اور خبر انکی شہادت کی تم کو پہنچے۔ ان کی مصیبت پر ماتم کرنا یہ[1]

یہ دوسرا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں واقعے کی دردناک تصویر کشی کتنی واضح ہے حضرت عباسؓ مشک لے کر پانی لینے جاتے ہیں۔ مشک پانی سے بھر چکی ہوتی ہے کہ :۔

"ناگاہ ایک تیر آن کر ایسا لگا کہ مشک کو (کذا) میں سوراخ کر کے جناب عباس علیہ السلام کے سینے کو چھیدا اور تمام پانی اس مشک کا بہہ گیا۔ حضرت عباس اس احوال کو دیکھ کر کمال مایوس ہوئے اور جی میں کہا کہ اے عباس اب تیرا مرنا ہی بہتر ہے۔ خالی ہاتھ جا کر کیا کرے گا اور سکینہ کو کس طرح منہ دکھلاویگا کیوں کہ وہ منتظر پانی ہی کھڑی ہوگی اور کہتی ہوگی کہ چچا کوئی دم میں پانی لے

---

[1] دہ مجلس (ق۔ن) ورق ۴۴۔

آتا ہے۔ یہی گفتگو اپنی دل ہی میں کرتے تھے کہ قوم اشقیانے اسے ہر چار طرف سے گھیر لیا اور وار کرنے لگے۔ حضرت عباس مارے زخموں کے چور ہو کر گھوڑے سے زمین پر گر پڑے اور پکارے کہ اے بھائی اپنے بھائی کی خبر لینا۔ جسوقت یہ آواز حضرت امام حسین علیہ السلام کے کان میں گئی معلوم کیا کہ کام عباس کا تمام ہوا۔ ایک آہ سوزناک ایسی بھری کہ جس کے سبب تمام زمین کربلا کانپ گئی اور نزدیک حضرت عباس کے جاکر دیکھا کہ قوم اعدا کے درمیان زخمی پڑا ہے۔ بے اختیار چشم مبارک سے اشک حسرت جاری کیئے اور کہا اے عباس اسوقت میری چشم تمنا ٹوٹی۔ یہ کہہ کر حضرت عباس کو اٹھا کر خیمے کے در پر لے آئے اور سر مبارک کو اس کے اپنے زانو پر رکھ کر دست مبارک سے خاک اس کے منھ کی پونچھتے تھے اور زار زار روتے تھے کہ حضرت عباس کی یہ خبر اہل حرم میں پہنچی۔ سب بی بیاں سر پیٹنے لگیں اور نوحہ وزاری کرنے لگیں[1]

دہ مجلس کے بیانات میں مستعمل مرثیئے بھی بڑے درد آمیز ہیں۔ حالانکہ یہ قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مرثیئے محمد بخش نے کہے یا ولّا نے پھر بھی ان سے بیانات کی فضا مکمل طور سے غم واندوہ میں ڈوب جاتی ہے۔ اس عہد کے نقطۂ نظر سے آسان اور سادہ زبان میں یہ مرثیئے مناسب ہی ہیں۔

مثلاً علی اکبر کے مرثیئے کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے ؎

علی اکبر علی اکبر کہاں ہے — توں کیوں بابا کی نظروں سے نہاں ہے
علی اکبر یہاں سے اب گیا تو — ہوئی میں زاد و بکیس جب گیا تو

---

[1] دہ مجلس (ق۔ن) ورق ۷۲، ۷۳۔

علی اکبر میں تجھ سے (کذا) ہوں قرباں — کروں قربان اپنا میں دل و جاں
ذرا تو حال عابد پر نظر کر — اور اس نور بصر کی بیکس (کذا) پر
علی اکبر سکینہ تیری خواہر — تصدق ہوتی ہے ہر آن تجھ پر
علی اکبر تو ہی تھا جان مادر — تو ہی تھا رونق بستان مادر
علی اکبر جو تجھ سے شاد تھی میں — غم و اندوہ سے آزاد تھی میں
علی اکبر پدر تجھ بن ہے مغموم — گل رخسار سے تیرے ہے محروم[1]

محمد بخش نے وہ مجلس میں آسان اور سلجھی ہوئی زبان استعمال کی ہے۔ انکا اسلوب عام فہم اور واقعات کی پوری اور صحیح تصویر پیش کرنے میں کامیاب ہے۔ انہوں نے درمیان میں تو آسان زبان لکھی ہے لیکن وہ ہر مجلس کے آغاز میں نو طرز مرصع" جیسی عبارت آرائی کرتے ہیں۔ مثلاً :۔

"راویان اخبار غم طراز و ناقلان جاں گدازیوں روایت کرتے ہیں......"[2]

"راویان اخبار جاں گداز و ناقلان آثار غم طرازیوں روایت کرتے ہیں......"[3]

لیکن عربی و فارسی الفاظ سے گراں بار عبارتیں وہ مجلس میں عام طور سے مفقود ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباسات سے ان کے اسلوب اور انداز کی نمایندگی ہوتی ہے۔

---

[1] [2] [3] وہ مجلس (ق. ن ۔ ورق ۵، ۹، ۴۴، ۵۲۔

۳۹

گل مغفرت

حیدر بخش حیدری

حیدری نے کاشفی کی "روضۃ الشہداء" کا ترجمہ اردو میں "گلشن شہیداں" کے نام سے کیا تھا۔

گلشن شہیداں اب نایاب ہے[1]۔ یہ ترجمہ حیدری نے کب کیا اسکا بھی علم نہیں ہے[2]۔

---

[1] قاموس الکتب (ص ۷۰۹، مطبوعہ کراچی) سے یہ سراغ ملتا ہے کہ گلشن شہیداں کا قلمی نسخہ مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کے کتب خانے میں موجود تھا جس کی تاریخ کتابت ۱۲۳۶ھ ہے۔ مؤلفین نے اس سلسلے میں مولوی صاحب کے کتب خانے کی فہرست کا حوالہ دیا ہے۔ (بحوالہ مقدمہ گل مغفرت از ناظر حسین زیدی، حاشیہ ص ۲۲)

[2] ناظر حسین زیدی نے گل مغفرت کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "گل مغفرت کے آغاز میں انہوں نے اسکے (گلشن شہیداں) متعلق جو کچھ لکھا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ کتاب ۱۸۱۲ء کے قریب عقیدت و دینداری کے جذبے کے تحت لکھی تھی۔" (ص ۲۲) لیکن گل مغفرت کے آغاز میں حیدری نے ایسی کوئی بات نہیں لکھی ہے جس سے گلشن شہیداں کے سن تالیف کے سلسلے میں ہلکا سا بھی اشارہ مل سکے۔

مذکورہ مقدمہ میں موصوف ایک جگہ اور لکھتے ہیں کہ کربل کتھا کی تالیف سے اسی سال بعد حیدر بخش حیدری نے .... روضۃ الشہداء کا مبسوط ترجمہ گلشن شہیداں کے نام سے کیا۔ (۲۱، ۲۲) موصوف نے کربل کتھا کا سن تالیف ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء تسلیم کیا ہے (ص ۱۹) یوں بقول ان کے گلشن شہیداں کے ترجمے کی تاریخ اسی سال بعد ۱۸۱۲ء قرار پائی۔ لیکن یہ تاریخ گل مغفرت کے انتخاب کی ہے نہ کہ گلشن شہیداں کے ترجمے کی۔

گلشن شہیداں کے بارے میں "گل مغفرت" کے دیباچے سے یہ علم ہوتا ہے کہ حیدری نے کبھی اسے زبان ریختہ میں ترجمہ کیا تھا۔ کالج کی تصانیف میں گلشن شہیداں کا سراغ نہیں ملتا۔

حیدری نے مذکورہ گلشن شہیداں کا انتخاب مولوی سید حسین علی صاحب جون پوری کی فرمائش پر "گل مغفرت" کے نام سے ۱۲۲۷ھ مطابق ۱۸۱۲ء میں کیا۔ یہ انتخاب ۱۸۱۲ء ہی میں ہندوستانی پریس سے شائع بھی ہوا[1]۔ حیدری گل مغفرت کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

"........... اس حیدر بخش حیدری نے کتاب گلشن شہیداں سے جسکو پہلے کتاب "روضۃ الشہدا" سے زبان ریختہ میں ترجمہ کیا تھا، اب شہر محرم الحرام کی بیسویں تاریخ سن بارہ سو ستائیس ہجری میں جناب فیض مآب .... مولوی سید حسین علی صاحب جون پوری زاد الطافہ کے ارشاد کرنیسے جن کی خدمت فیض درجت میں اس ہیچ مداں کو ایک رسوخ دلی و نیاز باطنی ہے، اس نسخۂ دہ مجلس کو انتخاب کیا۔ اور نام اسکا گل مغفرت رکھا۔ اس لئے کہ ہر ایک خاص و عام کی نظر اشرف سے گزرے۔ مقبول خاطر عاطر ہووے ...."[2]

گل مغفرت کا موضوع واقعات کربلا ہے۔ اس میں کل سولہ مجلسیں ہیں۔ بارہ مجلسوں میں حضرت محمدؐ کی وفات سے لے کر شہدائے کربلا تک کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ آخری چار مجلسیں محرم کے بعد فاتحہ کی مجلسوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

گل مغفرت میں حیدری کا اسلوب انکی دیگر تصانیف سے مختلف ہے۔ واقعات کے بیان میں

---

[1] Annals of the College of F. W. Appendix. P. 22

[2] دیباچہ گل مغفرت (مطبوعہ) حیدری ص ۲۔

تقریر کی شان نمایاں ہے جو موضوع کے لحاظ سے پرکشش بھی ہے۔ گل مغفرت کی زبان مجموعی طور سے سادہ اور آسان ہے لیکن لفظی آرائشوں سے بالکل پاک بھی نہیں۔ مثال ملاحظہ ہو:۔

"کہتے ہیں کہ حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام حلم و تحمل اس قدر رکھتے تھے کہ جس کا بیان نہیں کیا جاتا، چنانچہ ایک روز اسی جناب فیض مآب کا غلام پس پردہ کھڑا تھا، حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام نے اسے پکار کر ارشاد کیا کہ اے غلام! جلد آ۔ وہ یہ آواز سن کر نہ بولا اور نہ حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام کی خدمت فیض درجت میں حاضر ہوا۔ اسی طرح ستر بار اس شاہ دو جہاں اور اس امیر کون و مکاں نے پکار پکار کر بلایا، پر وہ ہرگز نہ آیا"[1]

واقعات کے درمیان میں حیدری نے جگہ جگہ ایسی ہی سادہ نگاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن کہیں کہیں وہ شعوری طور سے عبارت میں حسن پیدا کرنے کے لئے فارسی تراکیب اور تشبیہہ و استعارات کا استعمال کرتے ہیں۔

حیدری نے کثرت سے اشعار و ابیات کا استعمال بھی کیا ہے۔ چند ایک نظمیں بھی شامل کی ہیں لیکن یہ بے روح اور بے کیف ہیں۔ ان میں درد و غم کی کوئی تاثیر نہیں ملتی۔

[1] گل مغفرت (مطبوعہ) حیدری ص ۱۴۱، ۱۴۲۔

۴۰

گنج خوبی

میر امن

گنج خوبی ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف اخلاق محسن کا اردو ترجمہ ہے۔ اخلاق محسنی تاریخی نام ہے یہ تصنیف ۹۰۰ھ ۱۴۹۴ء میں مکمل ہوئی۔ میر امن نے گنج خوبی میں دیباچہ مؤلف (فارسی) کا بھی ترجمہ کر دیا ہے۔ جس سے سبب تالیف کا بھی علم ہوتا ہے:۔

"فقیر حقیر حسین واعظ کاشفی بھی قصد حضور پر نور (سلطان حسین) کا کر کے، جا پہنچا۔ اور سعادت دست بوسی کی حاصل کی اور بعد عرض کرنے دعا کے، دیکھا کہ فضل الٰہی نے خرمی اور بشاشت شاہزادے (شہزادہ ابو الحسن) کے چہرۂ مبارک سے ظاہر اور ہویدا ہے۔ یہ ارادہ کیا کہ دعا گویوں دولت خواہوں کی طرح تھوڑا سا احوال خوش خلقی اور نیک خصلتی اس ذات بابرکات کا لکھے تو ورق روزگار پر یادگار رہے اور دستور العمل بادشاہوں کی اولاد اور وارثان تخت و تاج کا ہو۔ اس واسطے اس رسالے کو کہ اخلاق محسنی نام رکھا لکھنا شروع کیا۔"[1]

اخلاق محسنی کے اخیر میں قطعۂ تاریخ بھی درج کیا گیا ہے ؎

به خامه گفتم اے کز سر ساختی قدم   وز مقدم تو چشم سخن یافت روشنی

---

[1] گنج خوبی (مطبوعہ مرتبہ خواجہ احمد فاروقی) میر امن ص ۱۰۔

اخلاق محسنی بہ تمامی نوشتہ شد   تاریخ ہم نویس زاخلاق محسنی[1]
۹۰۰ھ

اس قطعہ کو میر امن نے بڑی خوبی سے ترجمہ کر دیا ہے ؎

میں نے کہا قلم سے : کیا تو نے سر کو پانو   تیرے قدم سے چشم سخن کو ہے روشنی
اخلاق محسنی تو تمام اب لکھی گئی   تاریخ اس کی لکھ لے تو اخلاق محسنی[2]

لطف کی بات یہ ہے کہ اخلاق محسنی کے ساتھ اگر سرا ور پانو کے اعداد جوڑ دیئے جائیں تو ۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۴ء بر آمد ہوتی ہے ۔ جو میر امن کے ترجمے کے خاتمے کی تاریخ ہے ۔

میر امن نے یہ ترجمہ ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء میں شروع کیا تھا ۔ اور اس کے لئے گل کرسٹ نے ان سے سفارش کی تھی ۔ فرماتے ہیں :-

"جان گل کرسٹ صاحب نے .... اس بعید الوطن میر امن دلی والے کو لطف وعنایت سے فرمایا کہ اخلاق محسنی جو فارسی کتاب ہے اس کو اپنی زبان میں ترجمہ کرو تو صاحبان عالی شان کے درس کی خاطر مدرسے میں کام آوے ۔ بموجب حکم ان کے سر آنکھوں سے قبول کیا .... اور بہ امید صلے کے کہ حکم عام حضور کا ہوا ہے واسطے پرورش اطفال کے اس کثیر العیال نے سنہ ایک ہزار دو سو سترہ ہجری میں مطابق اٹھارہ سو دو عیسوی کے باغ و بہار کو تمام کر کے اس کو لکھنا شروع کیا ۔ از بسکہ جتنی خوبیاں انسان کو چاہئیں اور دنیا کی نیک نامی اور خوش معاشی کے لئے درکار ہیں سو سب اس میں بیان ہوئیں ۔

---

[1] میر امن دہلوی اور انکی نثری خدمات (غیر مطبوعہ) عبدالمنان ۔

[2] گنج خوبی (مطبوعہ ۱۸۴۶ء) میر امن ص ۴۰۶ ۔

اس واسطے اسکا نام بھی گنج خوبی رکھا۔[1]

گنج خوبی ۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۴ء میں مکمل ہوئی۔ میرامن نے ترجمے کے اخیر میں قطعۂ تاریخ بھی درج کیا ہے ؎

گنج خوبی جب کیا میں نے تمام ۔۔۔ تھی ایک تاریخ ہوئی مجھ کو ضرور

تب کہا دل سے کہ کر میری مدد ۔۔۔ وہ لگا کہنے بہ شادی و سرور

"گنج خوبی لطف سے معمور رہے" ۔۔۔ لیک کر "بدگو" کو اس مصرع سے دور"[2]

۱۲۵۱ ۔۔۔ ۳۲ = ۱۲۱۹ھ

گنج خوبی ۱۸۰۵ء میں ناگری رسم الخط میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔[3] اسکا اردو ایڈیشن کلکتہ ہی ۱۸۴۶ء میں شائع ہوا۔ حالانکہ گل کرسٹ نے اپنی ۱۹؍ اگست ۱۸۰۳ء والی فہرست میں اسے مطبو کتابوں کے ذیل میں شامل کیا ہے۔[4] لیکن اگست ۱۸۰۳ء مطابق ماہ ربیع الآخر ۱۲۱۸ھ قرار پاتا جبکہ گنج خوبی ۱۲۱۹ھ میں مکمل ہوئی۔ اس لئے اسکے طبع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس فہرست کے مطابق گل کرسٹ نے اس کتاب پر میرامن کو چار سو روپے انعام دیئے جانے کی سفا کی تھی۔ کالج کونسل نے اس پوری فہرست پر غور کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن میرامن کے ایک شاگرد جان رومر نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں محفوظ مخطوطے پر جسے میرامن نے جان رومر کے لئے لکھا تھا۔ انگریزی میں مندرجہ ذیل عبارت درج کی ہے:۔

"گنج خوبی کا یہ نسخہ میرامن کے ہاتھوں کا لکھا ہوا اور اس اصل کے مطابق ہے

---

[1] دیباچہ گنج خوبی (مطبوعہ ۱۸۴۶ء) میرامن ص ۵، ۶۔

[2] گنج خوبی (مطبوعہ) مرتبہ خواجہ احمد فاروقی ص ۳۲۰۔

[3] مقدمہ گنج خوبی (مطبوعہ) مرتبہ خواجہ احمد فاروقی ص ۔

[4] Proceedings of the College of F. W. Vol. 559 P. 278

جسے میر امن نے فورٹ ولیم کالج میں پیش کیا تھا اور پانچ سو (چار سو؟) روپے
کا انعام حاصل کیا تھا" جسے آز[1]

لیکن ۳۱ر اگست ۱۸۰۴ء کی کالج کونسل کی کاروائی سے یہ علم ہوتا ہے کہ میر امن کو ڈھائی سو روپیہ بطور انعام اس کتاب کے لئے حاصل ہوئے تھے[2]۔

گنج خوبی ضابطۂ حیات اور رموز اخلاق کا صحیفہ ہے۔ یہ اپنی اصل کے مطابق چالیس ابواب میں منقسم ہے۔ جن میں حکمت، اخلاق، سیرت اور عمل کے نکات بیان کئے گئے ہیں۔ جو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں۔ ان میں حیات انسانی کے تقریبًا تمام اخلاقی پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ہر باب میں وضاحت کے لئے مثال کے طور پر حکایات اور نقلیں درج ہیں۔ یہ مختصر بھی ہیں اور طویل بھی۔ یہ حکایتیں اسلامی روایتوں اور بادشاہوں کے حرکت و عمل پر مبنی ہیں۔ ان حکایتوں میں روح اخلاق جاری وساری ہے۔

میر امن نے اخلاق محسنی کا لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ مضامین کا مفہوم اخذ کر کے اسے اردوئے معلیٰ کی زبان و محاورہ میں بیان کیا ہے۔ کہیں کہیں یہ زبان اتنی فطری ہے کہ اس پر ترجمے کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ میر امن نے گنج خوبی کے دیباچے میں اس کی زبان و بیان پر یوں روشنی ڈالی ہے:۔

"لیکن فقط فارسی کے ہو بہو معنے کہنے میں کچھ لطف اور مزہ نہ دیکھا اس لئے

---

[1] مقدمہ گنج خوبی۔ مرتبہ خواجہ احمد فاروقی ص ۳۲۔

[2] Proceedings of the College of F.W. 31 St. Aug. 1804

بحوالہ مقدمہ گنج خوبی ص ۲۔

اصل کا مطلب لے کر اپنے محاورے میں سارا احوال بیان کیا اور جس طرح
شیخ سعدی شیرازی کی گلستاں بہ سبب پڑھ فارسی کے مکتب میں پہلے کام آتی ہے
ویسے ہی میں نے بھی اردوے معلا کی زبان کو بے پیچ ورکا و جسے بادشاہ سے لیکر
امرا و اوران کے ملازم بولتے ہیں بولا و الآنہ عربی و فارسی کی لغتیں اصطلاحیں
چاہتا تو بہت سی بھر دیتا لیکن یہ زبان کچھ کیفیت نہ پاتی بلکہ آمیزش پاکر
کچھ زبان اور کی ہو جاتی۔ اب یہ مبتدی کے واسطے فائدہ مند اور منتہی صاحب
دریافت کو پسند آوے گی کیا بے لگاو دریا کی مانند اس کی عبارت رواں
اور مثال گھوڑے بادپا کی کہ میدان ہموار اور صاف پاتا ہے رواں ہے۔"[1]

میرامن نے محولہ بالا اقتباس میں گنج خوبی کی زبان کی جو خوبیاں بیان کی ہیں وہ انکے ترجے میں
صاف نمایاں ہیں۔ مثال ملاحظہ ہو :۔

"عبداللہ طاہر نے ایک روز اپنے بیٹے کو کہا: کاشکے دولت
ہمارے گھرانے میں جوں کی توں رہے! لڑکے نے جواب دیا کہ جب تک فرش
عدل کا اور بچھونا انصاف کا اس محل میں بچھا رہے گا وہ بھی اپنا گھر جان کر
بسے گی۔ قطعہ ؎

جو بادشاہ تخت عدالت پہ ہو چڑھا　　سجتا ہے اس کے سر پہ چھتر شان و فر کا
انصاف کا لباس اتارے بدن سے جب　　لعنت کا طوق اسکے گلے میں لگے بھلا۔"[2]

لیکن پوری کتاب میں یہ انداز نہیں ملتا۔ بیشتر جگہوں پر ترجمہ پن نمایاں ہے۔

---

[1] دیباچہ گنج خوبی (مطبوعہ ۱۸۰۲ء)، ص ۷۔ [2] گنج خوبی (مطبوعہ) مرتبہ خواجہ احمد فاروقی ص ۴۹-۵۰۔

کاشفی نے اخلاق محسنی میں موضوع کے مطابق مختلف شعراء کے بہت سے اشعار نقل
میرامن نے انہیں بہت خوبی سے اردو میں نظم کیا ہے۔ اس سلسلے میں دیباچے میں لکھتے ہیں :۔

"اور قریب ہزار بیت استادوں کی جو مصنف نے تمام کتابوں سے چن چن کر
ہر ایک مضمون کی ہر مرقع پر تشنہ ڈالیں ہیں (کذا) انکو بھی اپنی سمجھ کے موافق
جوں کا توں ہندی میں نظم کیا" [1]

---

(۴۱)

منتخب الفوائد
خلیل علی خاں اشک

"منتخب الفوائد" محمد منصور سعید ابوالفرح خلیل کی فارسی تالیف "اوصاف الملوک
طرق خرد بہم" کا ترجمہ ہے۔ جسے محمد منصور نے سلطان التمش کے حکم سے ہزاروں کتابوں سے
کرکے تالیف کیا تھا۔ اشک نے یہ ترجمہ ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء میں مکمل کیا۔ اشک منتخب الفوائد کے
میں لکھتے ہیں :۔

"اس احقر العباد محمد خلیل خاں کہ تخلص جسکا اشک ہے سن
ہجری بارہ سے چھبیس کے درمیان مطابق اٹھارہ سو دس عیسوی کے وقت

---

[1] گنج خوبی (مطبوعہ ۱۸۳۶ء) ص ۷۸۔

میں محمد اکبر بادشاہ غازی خورشید فلک حکومت کے، اور عصر میں ....

لارڈ منٹو گورنر جنرل بہادر .... کے اور حکومت میں خداوند نعمت

کپتان ٹیلر صاحب دام حشمتہ کی، انتظام میں .... ڈاکٹر ولیم ہنٹر صاحب

دام دولتہ کے کتاب "اوصاف الملوک وطرق خرد ہیم" کو کہ سلطان شمس الدین

التمش کے حکم سے جسکو محمد منصور سعید ابو الفرج خلیل نے بمشقت تمام بڑی جد و

جہد سے ہزاروں کتابوں کا انتخاب کر کے تالیف کیا تھا، زبان اردو میں موافق

محاورے کے واسطے مدرسۂ عالیہ کے ترجمہ کیا۔ ازبسکہ بعضے بعضے علم وکسب جو

مؤلف نے بیان کئے ہیں اس کے مطلب کو قلم بند کر کے ان میں سے جس جس

فن میں ترجمہ کو بھی دخل تھا مطابق اپنے حوصلے کے تزائد کیا۔ لیکن اتمام اس

نسخے کا بارہ سو چھبیس ہجری میں ہوا۔ اس خاطر نام اسکا منتخب الفوائد رکھا

کیونکہ تاریخ اسکی بھی یہی پائی۔"[1]

باچے کے اخیر میں مترجم نے ایک رباعی درج کی ہے جس سے منتخب الفوائد کے ترجمے کی تاریخ

مد ہوتی ہے ؎

"آیا تھا خیال سن کے رنگین یہ کلام | تاریخ کا پہنچاتے اسکا انجام (کذا)

آداب کا پابڑھا کے ہاتف بولا | رکھ منتخب الفوائد اسکا تو نام"[2]

۱۲۲۴ + ۲ = ۱۲۲۶ھ

منتخب الفوائد طبع نہ ہوسکی۔ اس کا ۵۰۶ صفحات کو محیط قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی

ت بنگال (کلکتہ) میں بہت عمدہ حالت میں محفوظ ہے۔ اس پر کالج کی مہر بھی ثبت ہے۔ یہ

---

[1] دیباچہ منتخب الفوائد (ق.ن) خلیل علی خاں اشک ص ۳، ۴۔

نسخہ صاف ستھرا ہونیکے باوجود املے کی غلطیوں اور دیگر سہو وخطا سے پُر ہے۔ دیباچے میں "سن ہجری بارہ سے چھبیس کے درمیان اٹھارہ سو دس عیسوی" درج ہے۔ جو ممکن نہیں۔ تقویم کے مطابق بارہ سو چھبیس ہجری ۲۶ر جنوری ۱۸۱۱ء کو شروع ہوکر ۱۶ر جنوری ۱۸۱۲ء کو ختم ہوتی ہے۔ اشک نے ۱۲۲۵ھ لکھا ہوگا۔ آگے چل کر دیباچے میں درج ہے "ان میں سے جس جس فن میں ترجمہ کو بھی دخل تھا مطابق اپنے حوصلے کے تزائد کیا" یہاں ترجمہ کی جگہ مترجم ہونا چاہیئے۔ اس طرح یہ علم ہوتا ہے کہ اشک نے جہاں اصل ماخذ سے بیانات ترجمہ کئے ہیں وہاں اپنی عقل و دانش اور معلومات کے مطابق اضافے بھی کئے ہیں۔ نسخے میں درج مفصل بیانات، مختلف تصاویر سے انکی وضاحت یہ بات ثابت کر دیتی ہے کہ جس علم کا ذکر مترجم کر رہا ہے اس سے وہ خود بھی کسی نہ کسی حد تک واقف ہے۔ یہ بات کسی عام مترجم کے بس کی نہیں تھی۔

اس لحاظ سے منتخب الفوائد بے حد مفید کتاب ہے۔ اس میں اوّل اوّل بادشاہوں کے طور طریقوں، طرز زندگی اور اخلاق و کردار کی نشاندہی کی گئی ہے۔ چنانچہ بادشاہوں کے طور طریقوں، حکمت عملی اور نظام سلطنت سے متعلق نادر معلومات سامنے آتی ہیں۔ ان تمام نکات کو اسلامی روایات اور حکایات سے واضح کیا گیا ہے۔ چنانچہ بادشاہوں کے کرم و حلم اور عفو کے بیان میں یہ حکایت درج ہے:۔

"چنانچہ آیۂ کلام اللہ ہے کہ جسکا ترجمہ یوں ہے کہ اے کھانیوالے غصے کے اور بخشنے والے آدمیوں کے حق تعالیٰ دوست رکھتا ہے احسان کرنے والوں کو۔ یہ آیہ بہشت کے ایک دروازے پر لکھا ہوا ہے جو کوئی دنیا میں اس آیت پر عمل کرے گا قیامت کے دن اسی دروازے سے بہشت کے اندر جائیگا۔ روایت معتبر ہے کہ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو رسالت ہوئی۔ وحی نازل

ہونے لگی۔ جناب حکم ایزدی سے نماز پڑھنے اور عبادت کرنے کا آیا۔ پیغمبر علیہ السلام نے
لوگوں سے پوشیدہ نماز پڑھنی اور بندگی کرنی شروع کی۔"[1]

گھوڑوں سے متعلق آٹھواں باب بہت طویل اور معلوماتی ہے۔ اس میں گھوڑوں کی خلقت و فضیلت، اقسام اور تمام جزئیات کے علاوہ جملوں بیماریوں کا بھی ذکر ہے۔ پنسل کی فنکارانہ تصاویر کے ذریعے میدان جنگ میں انکی چال اور افراسیاب، خراسان اور اہل بلخ وغیرہ کے حوالوں سے ان کے انداز کی وضاحت کی گئی ہے۔ تصاویر کے ذریعے ہی گھوڑوں کی خصلت اور ظاہری شکل وصورت کی بنیاد پر مالکوں کے لئے ان کے نیک و بد ہونے کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ حکایتیں بھی مندرج ہیں۔

ہتھیاروں اور لشکر کشی سے متعلق باب بھی بہت معلوماتی ہے۔ اس میں بھی تصاویر کے ذریعے ہتھیاروں کی قسمیں بتائی گئی ہیں۔ اور بیان میں تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس باب سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے کون کس ہتھیاروں سے لڑتا تھا:۔

"شعیب علیہ السلام حکم سے جناب ایزدی کے تلوار سے لڑتے تھے۔ اور لشکر بنی اسرائیل کا سب ہتھیار ہے۔ اسمٰعیل علیہ السلام نیزے سے۔ اور موسیٰ علیہ السلام عصیٰ (کذا) سے داؤد علیہ السلام فلاخن سے لڑتے تھے۔"[2]

لشکر کشی اور جنگ کے ابواب میں تمام رموز و نکات، جزئیات، فرائض اور فضیلت کا ذکر ہے۔ یہ سارے بیانات بہت مفید ہیں۔ ان میں بھی لکیروں کے ذریعے قدیم بادشاہوں کی

---

[1] منتخب الفوائد (ق.ن) خلیل علی خاں اشک ص ۱۰۰۹۔

[2] " " " " " " ص ۳۸۲۔

لڑائی اور لشکر آراستہ کرنے کے انداز کو سمجھایا گیا ہے۔ یہاں بھی مختلف قسم کی حکایات درج ہیں۔ بعض حکایات خود مؤلف کی بیان کردہ ہیں۔ بیشتر حکایات کے پس منظر میں اسلام کی عہد آفریں ہستیاں اور واقعات ہیں۔

اپنے فارسی اصل کے مطابق منتخب الفوائد بھی چونتیس ابواب پر مشتمل ہے[1]۔ ان ابواب میں بیان کردہ حکایات و روایات نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ اخلاق اور عبرت و نصیحت سے پُر ہیں۔

اشک نے موضوع کے مطابق بہت آسان اور سلجھا ہوا انداز بیان اختیار کیا ہے۔ اسلوب قدرے شگفتہ ہے۔ عربی اور فارسی کے الفاظ بھی انھوں نے اتنی خوبصورتی سے استعمال کئے ہیں کہ عبارتیں گنجلک اور ثقیل نہیں محسوس ہوتیں۔ ان کا حسن برقرار رہتا ہے۔ حکایات کے مزاج کے مطابق اشک نے مناسب اور متوازن انداز بیان اپنایا ہے۔

منتخب الفوائد کے اسلوب کو اشک کے بیان کے مطابق "زبان اردو میں موافق محاورے کے" ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

۴۲

ترجمہ اخوان الصفاء

اکرام علی

اکرام علی نے جان ولیم ٹیلر کی فرمائش پر ۱۸۱۰ء / ۱۲۲۵ھ میں عربی رسالے "اخوان الصفاء" کا ترجمہ

---

[1] منتخب الفوائد (ق۔ن) خلیل علی خاں اشک ص ۶۔

اسی نام سے اردو میں کیا۔ اکرام علی دیباچے میں لکھتے ہیں :-

"بعد اس کے حامی سراپا معاصی اکرام علی یہ کہتا ہے کہ .... بعد چند روز کے

باستصواب جناب صاحب عالی شان زبدہ دانایان روزگار ....

مدرس ہندی کپتان جان ولیم ٹیلر صاحب بہادر دام دولتہم کے فرمایا کہ

رسالہ اخوان الصفار کہ انسان و بہائم کے مناظرے میں ہے تو اس کا زبان اردو

میں ترجمہ کر .... ترجمہ اس رسالے کا خلاصۂ امیران ذوی الاقتدار

.... گورنر جنرل لارڈ منٹو بہادر دام اقبالہ کے عہد حکومت میں کہ سن

ہجری بارہ سی پچیس اور عیسوی اٹھارہ سی دس ہیں مرتب ہوا"[1]

اخوان الصفار کا قلمی نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔ یہ ۱۸۱۰ء / ۱۲۲۵ھ میں ہی ہندوستانی پریس سے شائع ہوگئی تھی[2]۔ اس کا مذکورہ مطبوعہ نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے۔ تھامس روبک[3]، گریرسن[4] صاحب ارباب نثر اردو[5] اور حامد حسن قادری[6] نے ۱۸۱۱ء میں اس کی اولین اشاعت درج کی ہے لیکن یہ درست نہیں۔ اخوان الصفار شعبۂ ہندوستانی کے نصاب میں شامل تھی۔

---

[1] دیباچہ اخوان الصفار (مطبوعہ ۱۸۱۰ء) اکرام علی ص ۲، ۳، ۴، ۵، ۶۔

[2] سرورق اخوان الصفار مطبوعہ ۱۸۱۰ء۔

[3] Annals of the College of F. W. Appendix P. 26

[4] Linguistic Survey of India Vol IX Part I P. 34

[5] ارباب نثر اردو ص ۲۰۲۔

[6] داستان تاریخ اردو ص ۱۲۴۔

عربی رسالے اخوان الصفا کے مصنفین ابوسلمان، ابوالحسن اور ابواحمد وغیرہ کل دس آدمی تھے۔ یہ بصرہ میں رہا کرتے تھے۔ ان کا مشغلہ علم و دین کی تحقیق تھا۔ لہٰذا انہوں نے مختلف علوم پر اکیاون رسالے تصنیف کئے۔ انہیں رسائل میں سے ایک رسالہ اخوان الصفا ہے۔ اسکا موضوع انسان اور حیوان کا مناظرہ ہے۔ اس مناظرے میں انسان غالب ہوتا ہے۔ لیکن حیوانوں کے ذریعہ حقیقت و معرفت کے بہت باریک نکات بیان کئے گئے ہیں۔ اس تفصیل کو اکرام علی نے اخوان الصفا کے دیباچے میں بیان کیا ہے:۔

"مصنفین اس کے ابوسلمان، ابوالحسن، ابواحمد وغیرہ دس آدمی باتفاق یک دیگر بصرہ میں رہتے تھے۔ اور ہمیشہ علم و دین کی تحقیق میں اوقات اپنی بسر کرتے۔ چنانچہ اکیاون رسالے تصنیف کئے۔ بیشتر علوم عجیبہ و غریبہ ان میں لکھے۔ یہ ایک رسالہ ان میں سے انسانوں اور حیوانوں کے مناظرے میں ہے۔ طرفین کی دلائل عقلی و نقلی اس میں بخوبی بیان کیں۔ آخر بعد قیل و قال کے انسان کو غالب رکھا اور غرض انکو اس مناظرے سے فقط کمالات انسانی بیان کرنا ہے۔ چنانچہ اس رسالے کے آخر میں لکھا ہے کہ جن وصفوں میں انسان حیوان پر غالب آئے وہ علوم معارف الٰہی ہیں کہ ان کو ہم نے اکیاون رسالوں میں بیان کیا ہے اور اس رسالے میں مقصود یہی تھا کہ حقائق و معارف حیوانات کی زبانی بیان کیجئے تاکہ غافلوں کو اس کے دیکھنے سے کمالات حاصل کرنے کے واسطے رغبت ہووے"[1]

---

[1] دیباچہ اخوان الصفا (مطبوعہ ۱۸۱۰ء) اکرام علی ص ۴، ۵۔

اکرام علی نے عربی اخوان الصفا کا لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے اخوان الصفا کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ زیر نظر اخوان الصفا ۲۰ فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں بنی آدم کی پیدائش اور بادشاہ جن کے حضور میں ان کے مناظرے کا ذکر ہے۔ دوسری میں بادشاہ جن حیوان اور انسان کے بیچ قضیئے کا فیصلہ کرنے کے لئے متوجہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد حیوان اور انسان کے اختلافات اور مناظرے درج ہیں۔ یہ سارے مناظرے بہت دلچسپ ہیں۔ ان میں حیوانوں نے بہت عمدہ مکالمے بھی ادا کئے ہیں۔ یہ مثال ملاحظہ ہو:۔

"بادشاہ نے قاصد سے پوچھا کہ انسان حیوانوں سے کیا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ وے کہتے ہیں کہ سب حیوان ہمارے غلام اور ہم ان کے مالک ہیں۔ شیر نے پوچھا کہ انسان کس چیز سے فخر کرتے ہیں۔ اگر زور قوت شجاعت دلیری حملہ کرنا کودنا پھاندنا جنگل مارنا لڑنا بھڑنا ان میں کسی چیز سے فخر کرتے ہیں۔ میں ابھی اپنی فوج کو روانہ کروں کہ وہاں جا کر ایک حملے میں انہیں متفرق اور پراگندہ کر دے وے۔"[1]

گیان چند جین نے اخوان الصفا کو حیوانی رزمیہ (BEAST EPIC) قرار دیا ہے۔[2]

اکرام علی نے اخوان الصفا میں سادہ سلیس اور بامحاورہ زبان استعمال کی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اصل ماخذ کی بہت سی غیر ضروری اصطلاحات اور خطبوں کو خارج کر دیا ہے۔ وہ دیباچے میں واضح کرتے ہیں:۔

...........جانا ولیم ٹیلر صاحب بہادر، دام دولتہم کے فرمایا کہ رسالہ

---

[1] اخوان الصفا (مطبوعہ ۱۸۱۰ء) اکرام علی ص ۶۲۔ [2] اردو کی نثری داستانیں۔ گیان چند جین ص ۵۲۔

اخوان الصفاء کہ انسان و بہائم کے مناظرے میں ہے تو اس کا زبان اردو میں
ترجمہ کر لیکن نہایت سلیس کہ الفاظ مغلق اس میں نہ ہو ویں بلکہ اصطلاحات
علمی اور خطبے بھی اس کے کہ تکلف سے خالی نہیں ہیں قلم انداز کر۔ صرف خلاصہ
مضمون مناظرے کا چاہیئے۔ راقم نے بموجب فرمانے کے فقط حاصل مطلب کو
محاورۂ اردو میں لکھا۔ خطبوں کو نکال ڈالا اور اکثر اصطلاحات علمی کہ مناظرے
سے انکو علاقہ نہ تھا ترک کیں مگر بعض خطبے اور اصطلاحات ہندسے وغیرہ کہ
اصل مطلب سے متعلق تھے باقی رکھے۔"[1]

یہ اکرام علی کے اسلوب بیان کی خوبی ہے کہ انہوں نے ہر مناظرہ میں پوری کیفیت اور تصویر
کھینچ کر رکھ دی ہے۔ عبارت میں نہ کہیں الجھاؤ ہے اور نہ بے ربطی، وہ بڑی کامیابی سے ہر ذکر سے
گزرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ مثال ملاحظہ ہو:۔

"ان میں سے ایک شخص اعرابی نے کہا کہ ہم میں بہت سے فضیلتیں اور نیک
خصلتیں ہیں جن سے دعویٰ ہمارا ثابت ہوتا ہے۔ بادشاہ نے کہا انہیں
بیان کرو کہا کہ زندگی ہماری بہت عیش سے گزرتی ہے انواع و اقسام کی نعمتیں
کھانے پینے کی ہم کو میسر ہیں جیوانوں کو وے نظر بھی نہیں آتیں۔ میووں کا
مغز اور گودا ہمارے کھانے میں آتا ہے۔ پوست اور گٹھلی یے کھاتے ہیں۔ اسکے
سوا طرح طرح کے کھانے شیرمال باقرخانی گاؤ دیدہ گاؤزباں کلچے مطنجن
زیربریاں مزعفر شیر برنج کباب قورما بورانی برفی دودھ دہی گھی قسم قسم کی

---

[1] اخوان الصفاء (مطبوعہ ۱۸۱۰ء) اکرام علی ص ۳، ۴۔

مٹھائیاں حلوا سوہن جلیبی لڈو پیڑے برفی امرتی لوزیات وغیرہ کھاتے ہیں۔"[1]

اخوان الصفا کے بیانات اتنے رواں اور واضح ہیں کہ ان میں ترجمے کی کہیں سے جھلک بھی نظر نہیں آتی ہے۔ اس کی زبان پر تبصرہ کرتے ہوئے حامد حسن قادری لکھتے ہیں :۔

"مولوی اکرام علی نے نہایت خوبی سے ترجمہ کیا ہے۔ متروک الفاظ، قدیم محاورے، قواعد زبان سے اختلاف بہت کم ہے۔ تمثیل نگاری کا (جس کو انگریزی میں ایلیگری کہتے ہیں) نہایت نادر نمونہ ہے۔ اخوان الصفا میں شان بھی ہے اور دلچسپی ہر جگہ قائم رہتی ہے۔"[2]

یہ رائے بہت جامع اور درست ہے نیز مترجم کا یہ دعویٰ بھی غلط نہیں کہ :۔

"ہر ایک خطبہ اسکا معدن فصاحت ہے اور ہر فقرہ مخزن بلاغت۔"[3]

۴۳

ہدایت الاسلام

مولوی امانت اللہ شیدا

مولوی امانت اللہ نے شعبۂ ہندوستانی سے وابستہ ہونے کے بعد گل کرسٹ کے حکم سے

---

[1] اخوان الصفا۔ (مطبوعہ ۱۸۱۰ء) اکرام علی ص ۲۰۱، ۲۰۲۔ [2] داستان تاریخ اردو۔ حامد حسن قادری ص ۱۲۶۔
[3] " " " " " ص ۴۔

"ہدایت الاسلام" تالیف کی۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل تھی۔ پہلی جلد ۱۸۰۴ء میں دو حصوں میں ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی[1]۔ جو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔ دوسری جلد کا پتہ نہ چل سکا۔ تھامس روبک کے مطابق یہ (۱۸۱۹ء تک) طبع نہ ہو سکی تھی[2]۔

ہدایت الاسلام کی پہلی جلد میں گل کرسٹ کا انگریزی زبان میں دیباچہ ہے لیکن یہ ادھورا ہے۔ ہدایت الاسلام کے موضوع اور سبب تالیف کے ضمن میں شیدا کا بیان یوں ہے:۔

"مسٹر جان گل کرسٹ صاحب نے اس نا پرسان حال کو حضور پر نور میں بلوا زبان فصاحت بیان سے یوں ارشاد فرمایا کہ اکثر عوام دیار ہند کے جو اشغال دنیاوی کے سبب فقہہ عربی سے باز رہے اور وے خدا ترسی اور ایمانداری میں استوار اور اس کی بندگی میں مصروف ہیں۔ لیل ونہار ان کے لئے کچھ ایک احکام شرعی مثلاً چار کلمے وصفت ایمان اور نمازوں کی نیت وغیرہ ضروریات کا ترجمہ ریختے کی زبان میں کیا جاوے کہ اس سے انکے سمجھنے میں آسانی اور خطا وغلطی کا بچاو ہووے۔ تب یہ عاصی امانت اللہ اس امر کو تنبیہہ الغفلت سمجھ کر ان کا حکم بجالانیکے لئے اس نقل کو شاہد لایا......[3]"

ہدایت الاسلام میں شیدا نے یہ وضاحت بھی کی ہے:۔

"اے مومنین یقین جانو کہ صاحب معزالیہ کے حکم اور بڑی تحقیق سے اس رسالے کو

---

[1] سرورق (انگریزی) ہدایت الاسلام مطبوعہ ۱۸۰۴ء۔

[2] Annals of the College of F.W. Appendix P. 23

[3] ہدایت الاسلام (مطبوعہ) امانت اللہ شیدا ص ۳، ۴۔

اکثر مسائل ضروری کے ساتھ مختصر وقائع وکنزالدقائق وضرور المکلف سے انتخاب
کرکے ترتیب دیا، اور عبارت عربی کے نیچے اس کا ترجمہ لکھا اور نام اس کا
ہدایت الاسلام رکھا۔"[1]

ہدایت الاسلام کا موضوع احکام شرع کا بیان ہے۔ امانت اللہ نے ایمان مفصل ومجمل سے لیکر وضو کرنے کے طریقے مختلف مواقع کی نمازوں، خطبوں اور نیتوں کے ذکر کے علاوہ دیگر مسائل وقوانین کا ذکر کیا ہے۔ ہدایت الاسلام میں حضرت آدمؑ سے لیکر حضرت محمدؐ تک کا ذکر بھی موجود ہے۔ امانت اللہ کی یہ کتاب شرع اور احکام خداوندی پر ایک مختصر لیکن جامع تالیف ہے۔

امانت اللہ نے موضوع کے اعتبار سے ہر بیان اور ذکر کو بہت وضاحت سے اور سلجھے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے سنجیدہ اور عالمانہ انداز بیان اختیار کرنے کی بجائے بالعموم سادہ اور آسان زبان پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ زبان وبیان کا یہ انداز پوری کتاب میں جاری و ساری ہے۔ عربی عبارتوں کے ترجموں میں بھی سادہ اور آسان زبان کو کامیابی سے نباہ لے گئے ہیں۔ ہدایت الاسلام کی نثر کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"نماز میں سولہ چیزیں واجب ہیں۔ سورۂ فاتحہ کو ایک بار پڑھنا
اور اس کے ساتھ ایک سورے کو ملانا، ترتیب نگہ رکھنا، اور پہلی نشست کو اسے
قعدۂ اولیٰ کہتے ہیں کرنا اور دونوں نشستوں میں تشہد پڑھنا، سلام پھیر کر
نماز سے فراغت کرنا، وتر کی نماز میں دعا قنوت پڑھنا، پہلی دونوں رکعتوں
کو قرأت کے واسطے معین کرنا اور سورے کے ملانے پر سورۂ فاتحہ کو مقدم

---

[1] ہدایت الاسلام (مطبوعہ) امانت اللہ شیدا ص ۲۔

کرنا اور رکوع میں ٹھہرنا، یہاں تک کہ ایک بار سبحان ربی العظیم پڑھ سکے......[1]

امانت اللہ نے فارسی کی ابیات کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے سہ

اجل کے کوچے میں تیرا گزار ہووے گا ۔۔۔ ترا قرار بہ دار القرار ہووے گا

دھریں گے تجھکو جنازے میں تخت شاہی کے ۔۔۔ اگر خزانہ ولشکر ہزار ہووے گا

لحد کے گوشے میں تجھکو زمیں پہ سونا ہے ۔۔۔ بدن ترا خورش مور و مار ہووے گا[2]

---

(۴۴)

جامع الاخلاق

مولوی امانت اللہ شیدا

مولوی امانت اللہ نے CAPT. MOUNT کے حکم پر "اخلاق جلالی" کا ترجمہ "جامع الاخلاق" کے نام سے کیا۔ جامع الاخلاق کے دیباچے میں امانت اللہ نے وجہ تالیف یوں بیان کیا ہے:۔

"جب اس بندے نے نسخۂ ہدایت الاسلام کی جلد اوّل سے

فراغت حاصل کی اور صاحب معزالیہ کی خدمت میں اظہار کیا۔ ارشاد ہوا کہ

تو اخلاق جلالی کا ترجمہ زبان ریختے میں کر اگرچہ یہ کتاب بغایت مغلق اور

---

[1] ہدایت الاسلام (مطبوعہ) امانت اللہ شیدا ص ۱۹۲، ۱۹۳۔

[2] " " " " ص ۱۰۰، ۱۰۱۔

دقیق المضمون اوّل سے آخر تک تمام مسائل حکمی اور تدقیقات علمی سے مشحون
ہے اور ترجمہ کرنا اسکا مستلزم تجرید مادۂ جسمانی اور اسقاط قوائے انسانی کا ہے
لیکن بمقتضائے نمک خواری کے صورت انکار کی مناسب نہ دیکھی اور فضال
حقیقی پر توکل کرکے اس میں اقدام کیا۔ لیکن اس کے خطبے کے بدلے دوسرا خطبہ
علیحدہ کہہ کر ضمیمہ اس ترجمہ کا کرکے حکمت علمی کی تقسیم سے شروع کیا اور حتی المقدور
اس کے تسہیل کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔"[1]

جامع الاخلاق کا ۳۸۵ صفحات کو محیط قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود
ہے۔ یہ ناقص الآخر ہے۔ چنانچہ اس کے سنہ ترجمہ کا علم کہیں سے نہیں ہوتا۔ دیباچے میں بھی
امانت اللہ نے واضح طور سے سنہ درج نہیں کیا ہے۔ جاوید نہال نے اس وضاحت کیساتھ کہ جامع الاخلاق
کا مخطوطہ مکمل نہیں، مخطوطے کے ہی حوالے سے اختتام کا قطعہ اور عبارت درج کر دی ہے[2] لیکن
ایسی کوئی عبارت یا قطعہ اس نسخے میں نہیں ملتا۔ نسخے کے نامکمل ہونے کی وضاحت کے بعد یہ
اشتباہ بھی نہیں رہ جاتا کہ موصوف کے پیش نظر اس نسخے کے علاوہ کوئی دوسرا نسخہ رہا ہو جو
راقم السطور کی نظروں سے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں گزرا۔

البتہ صاحب ارباب نثر اردو نے جامع الاخلاق کے مطبوعہ نسخے (۱۸۴۶ء) سے خاتمے
کی عبارت نقل کی ہے۔ جس سے علم ہوتا ہے کہ اسے امانت اللہ نے ۱۸۰۵ء میں مکمل کیا تھا۔

"جولائی کی بیسویں دوشنبہ کے دن ۱۸۰۵ء م ۱۲۲۰ھ کے محنت وجانفشانی اور

---

[1] دیباچہ جامع الاخلاق (ق۔ن) مولوی امانت اللہ شیدا ورق ۲۔

[2] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب۔ جاوید نہال ص ۳۲۰۔

فضل یزدانی کی مدد اور صاحبان عالی شان کے اقبال کی برکت سے اس

ہیچ مداں نے کتاب لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق عرف اخلاق جلالی

کے ترجمے سے فراغت کی ہے[1]

آگے چل کر قطعۂ تاریخ بھی درج کیا گیا ہے ؎

ترجمہ سے جب ہوا فارغ | فکر تاریخ طبع پر تھی شاق

دور کر تیغ علم سے سرجہر) | بولا ہاتف تمامی اخلاق[2]

۱۲۲۰ھ = ۱۲۲۳ - ۳

جامع الاخلاق کا موضوع حکمت و اخلاق، تصوف و مذہب اور منطق و فلسفہ سے متعلق

ہے۔ امانت اللہ نے بعض جگہ قدیم مفکرین اور حکماء کے حوالے بھی دیئے ہیں۔

جیسا کہ امانت اللہ نے دیباچے میں لکھا ہے کہ:۔

"............ اگرچہ یہ کتاب بغایت مغلق اور دقیق المضمون اوّل سے

آخر تک تمام مسائل حکمی اور تدقیقات علمی سے مشحون ہے اور ترجمہ کرنا

اس کا مستلزم تجرید مادۂ جسمانی اور اسقاط قوائے انسانی کا ہے........"[3]

چنانچہ وہ دقیق مضمون کی وجہ سے تسہیل کی کوشش کے باوجود آسان اور سادہ انداز بیان

اختیار نہ کر سکے۔ اسلوب خشک اور بے کیف ہے۔ زبان و بیان میں عربی و فارسی کا اثر غالب

ہے۔ عبارتیں گنجلک اور پر تعقید ہیں۔ تقریباً پوری کتاب میں یہی انداز ہے۔ بعض جگہوں پر تو

انداز بیان اتنا مشکل اور عربی فارسی کے الفاظ سے اسقدر گراں بار ہے کہ معنی اور مفہوم

---

[1] [2] ارباب نثر اردو ۔ سید محمد ص ۱۸۰۔

[3] دیباچہ جامع الاخلاق (ق۔ن) امانت اللہ شیدا ورق ۲۔

سمجھ میں نہیں آتے۔ کہیں کہیں وہ نسبتاً آسان زبان بھی لکھ گئے ہیں۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"انسان کی خلافت کی تحقیق دو چیز پر موقوف ہے۔ ایک حکمت بالغہ جو عبارت ہے کمال علمی سے۔ دوسری قدرت فاضلہ کہ عبارت کمال عملی سے ہے لیکن یہ بات اس صورت میں۔ مبنی ہے کہ حکمت کی تعبیر اس طور سے کریں کہ وہ فقط علم ہے احوال موجودات کا اور عمل کو اسکی حقیقت سے خارج رکھیں۔ لیکن اس صورت پر جو تعریف اسکی کریں کہ وہ عبارت نفس ناطقہ کے پہنچنے سے اس کمال کو جو علم و عمل کی دونو جانب میں اسے ممکن ہے تو احتیاج دوسری کی قید نہیں اس لئے کہ اس صورت میں عمل حکمت کی حقیقت میں ہے اور یہی تفسیر بہتر ہے۔"[1]

امانت اللہ درمیان میں کہیں کہیں مصرعے اور اشعار بھی استعمال کرتے ہیں جو زیادہ تر موضوع کے مطابق ہیں۔

کالج کونسل نے جامع الاخلاق پر شیدا کو دو سو کا روپیہ بطور انعام دیا تھا۔[2]

---

[1] جامع الاخلاق (ق۔ن) امانت اللہ شیدا ورق ۲۲، ۲۳۔

[2] فورٹ ولیم کالج (ہندی)، ص ۴۰۔

(۴۵)

راج نیتی

للوجی لال کوی

راج نیتی ہتو پدیش کا برج بھاشا میں ترجمہ ہے۔ سنسکرت میں ہتو پدیش نرائن پنڈت[1] کی تالیف ہے۔ للوجی نے گل کرسٹ کے حکم پر سمبت ۱۸۵۹ (م ۱۸۰۲ء) میں ہتو پدیش کو برج بھاشا میں منتقل کیا اور راج نیتی نام رکھا۔ للوجی نے راج نیتی کے دیباچے میں یہ معلومات ان الفاظ میں فراہم کی ہیں :۔

"کاہو سمے شری نارائن پنڈت نے نیتی شاستر نتے کتھانی کو سنگرہ کری سنکرت میں ایک گرنتھ بنائے واکو نام ہتو پدیس دھریو سواب شری یت مہاراج دھیراج پرم سجان.........مارکوئس ولجلی گورنر جنرل مہابلی کے راج میں' او.........جان گل کرسٹ پرتاپی کی آگیا سوں سمبت ۱۸۵۹ میں شری للوجی لال کوی برہمن سہستراو دیچ آگرے وارے نے واکو آشئے لے برج بھاشا کری نام راج نیتی راکھیو۔ دوہا۔

پنڈت ہیں تے جانی ہیں کتھا پرسنگ پے وین مورکھ من میں مانی ہیں لال کہایہ کین

---

[1] گیان چند جین نرائن بھٹ لکھتے ہیں (اردو کی نثری داستانیں ص ۲۵۵)

اروسمبت ۱۸۶۵ ماہیں .... گل برٹ لارڈ منٹو تیجسوی کے راج مدھیہ
ارو .... کپتان جان ولیم ٹیلر نچھتری کی آگیا سوں او .... ڈاکٹر ولیم ہنٹر
سہایک کی سہایتا تیں ارو .... لپٹن ابراہیم لاکٹ ...... کے کہے سوں واہی کوی نے
راج نیتی گرنتھ چھپوایو پاٹھ شالا کے ودیارتھی صاحبن کے پڑھوے کوں"۔[1]

---

[1] دیباچہ راج نیتی (مطبوعہ ۱۸۰۹ء) للّو جی لال کوی ص ۱۱، ۲ ناگری رسم الخط۔

"काहू समें श्री नारायण पंडितने नीति शास्त्र नीते कथानि कौ संग्रह कौर संस्कृत
में एक ग्रंथ बनाय वाकौ नाम हितोपदेस धरयो। सो अब श्रीयुत महाराजधिराज
परम सुजान .... मारकुइस वलिजली गवरनर जनरल महाबली के राज में,
औ .... जान गिलकृस्त प्रतापी की आज्ञा सों सम्वत् १८५८ में श्री लल्लूजी
लाल कवी ब्रह्मन सहस्त्र अवदीच आगेर वारेने वाकौ आशय लै ब्रज भाषा करि
नाम राजनीति राख्यो । दोहा ।

पंडित हैं ते जानी हैं कथा प्रसंग प्रवीन
मूरख मन में मानी हैं लाल कहा यह कीन

अरु सम्वत १८६५ माहि .... गिलवर्ट लार्ड मिनटो तेजस्वी के राज मध्य
अरु .... कप्तान जान उलियम टेलर नक्षत्री की आज्ञा सों औ ....
डाकटर उलियम हंटर सहायक की सहायता तें अरु .... लिफ्टन अब्राहम
लाकट .... के कहे सों वाहि कवि ने राज नीति ग्रन्थ छपवायौ पाठशाला
के विद्यार्थी साहिबन के पढ़िबे कौं।"

گل کرسٹ کی ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں راج نیتی مطبوعہ کتابوں کے ذیل میں شامل تھی۔ گل کرسٹ نے اس پر تین سو روپے انعام کی سفارش کی تھی۔[1] لیکن اس فہرست کو کالج کونسل نے نامنظور کر دیا تھا۔ راج نیتی ۱۸۰۹ء میں بھی ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی تھی۔[2] ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں راج نیتی کا ناگری رسم الخط میں ۱۸۰۹ء کا مطبوعہ نسخہ محفوظ ہے۔ اس میں کل ۲۷۴ اوراق ہیں۔

راج نیتی کا موضوع اخلاقیات اور ہندوؤں کی جنگی و ملکی پالیسیوں کے رموز و نکات پر مبنی ہے۔ سرورق پر بھی اس کی وضاحت موجود ہے۔ یہ تمام نکات حکایتوں کے پردے میں بیان کئے گئے ہیں۔ راج نیتی پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ اول دوستی کے فوائد میں (مترلابھ मित्रलाभ) دوم ذکر دوستوں کے اختلاف کا (سوہردے بھید کتھا सुहृदय भेद कथा) سوم لڑائی کی کہانی (وگرہ کتھا विग्रह कथा) چہارم صلح کا ذکر (سندھی کتھا संधि कथा) پنجم لبدھ پرناش کتھا (लब्ध प्रनाश कथा) راج نیتی کی افادیت اور حکایتوں کو للو جی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

"یا راج نیتی کے پڑھے سنے تیں منش برج بھاشا میں نپن ہوئیں اور وجتیک سنسار کے ویوہار کی باتیں ہیں تن ماہیں پروین .... یا ہی تیں پانچ پرکار کی کتھا کری کہتو ہیں پہلی متر لابھ، کہیں پریت کرائے وے کی ریت، دوجی سوہردے بھید کہیں سنیہہ چھورائے وے کی بھانتی تیجی وگرہ کہیں یدھ

---

[1] Proceedings of the College of F.W. Vol. 559, P. 278

[2] Annals of the College of F.W. Appendix P. 28

کرائے دے کی چالی۔ چوتھی سندھی کہیں ملاپ کرائے وے کی یکت سنگرام تے پہلیں ہوتے کئے پاچھیں۔ پانچویں لبدھ پرناش کہیں ایک وستو پائے کری ہرائے دینی" [1]

راج نیتی کی حکایتوں کے بیشتر کردار جانور ہیں۔ لیکن اپنی فہم وذکاوت، دانش مندی اور حکمت عملی سے مثالی اور علامتی کردار کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

راج نیتی برج بھاشا میں ہے۔ کہیں کہیں سنسکرت کے الفاظ عبارت کو بوجھل اور ثقیل بنا دیتے ہیں۔ للوجی نے راج نیتی میں سادہ نگاری کا بھی نمونہ پیش کیا ہے۔ راج نیتی کے اسلوب کی مثال ملاحظہ ہو:-

"شری گنگا جو کے تیر ایک پٹنہ نام نگر × تہاں سوکن ندھان مہا جان پنیہ وان سدرسن نام راجا ہو بو وانے ایک دن کا ہو پنڈت تے چھے شلوک

---

[1] راج نیتی (مطبوعہ ۱۸۰۹ء) للوجی لال کوی ص ۳ - ۴۔ دیباچہ [illegible]

या राज नीति के पढ़ै सुनै तें मनुष ब्रज भाषा में निपुन होय और [illegible]

[illegible]

سنیں × تاکو ارتھ تیہے × کہ انیک انیک پرکار کے سندیہن کوں دوری کرے
ار و گوڑھ ارتھنی کوں پرکا شو × ؎

۴۶

پریم ساگر
للوجی لال کوی

للوجی کی پریم ساگر چتر بھوج مصر کے منظوم کارنامے کا نثری پیکر ہے۔ چتر بھوج مصر نے بیاس دیو کی "شری مد بھاگوت" کے دسویں باب کو دوہوں اور چوپائیوں میں بہ زبان برج بھاشا منتقل کیا تھا۔ اسی منظوم نسخے کو للوجی نے گل کرسٹ کے حکم سے سمبت ۱۸۶۰ (م ۱۸۰۳ء) میں دہلی اور آگرہ کی کھڑی بولیوں میں منتقل کر کے پریم ساگر نام رکھا۔ لیکن اس کی تکمیل سمبت ۱۸۶۶ء مطابق ۱۸۰۹ء میں ہوئی۔ ان تمام تفصیلات کے متعلق پریم ساگر کے دیباچے میں

؎ راج نیتی (مطبوعہ ۱۸۰۹ء) للوجی لال کوی ص ۵، ۶ ناگری رسم الخط۔

"श्री गंगा जू के तीर एक पटना नाम नगर × तहाँ सवगुननिधान
महाजान पुन्य वान सुदरसन नाम राजा हो × वाने एकदिन काहू
पंडित ते द्वै श्लोक सुने × ताको अर्थ यह है × कि अनेक अनेक
प्रकार के संदेहानी कौं दूरि करै अरु गूढ़ अर्थनि कौं प्रकाशै × ।"

للوجی کا بیان یوں ہے :۔

"ایک سمے بیاس دیوکرت شری مدبھاگوت کے دسم اکندھ کی کتھا چتربھوج مصرنے دوہے چوپائی میں برنج بھاکھا کیا۔ سو پاٹھ شالا کے لئے شری مہاراج ادھراج سکل گن ندھان پنیہ دان مہاجان مارکویس ویل جلی گورنر جنرل پرتاپی کے راج میں دوہا..............

اور شری جت گن گاہک گنین سکھ دایک جان گل کرسٹ کی اگیا سے سمبت ۱۸۶۰ میں شری للوجی کب برہمن گجراتی سہشرادویچ آگرہ والے نے اسکا سارے جامنی بھاکھا چھوڑ دہلی آگرہ کی کھڑی بولی میں کہہ کر نام پریم ساگر دھرا"[1]

اسوقت پریم ساگر طبع نہ ہوسکی۔ اس کے کچھ حصے شائع ہوئے تھے۔ بقیہ کی اشاعت ملتوی ہوگئی لیکن سمبت ۱۸۶۶ (۱۸۰۹ء) میں للوجی نے اس پر نظر ثانی کی اور پریم ساگر طباعت سے آراستہ ہوئی۔ اس سلسلے میں للوجی کا بیان درج ذیل ہے :۔

"..........پرنتو شری جت جان گل کرشٹ کے جانے سے بنا ادھ نیا چھپا ادھ چھپا رہ گیا تھا سو اب شری مہاراجیشرات کرپال دیال گل برٹ لارڈ منٹو پرتاپ وان کے راج میں اور شری گن کھان سکھدان کرپاندھان بھاگوان کپتان ویم ٹیلر پرتاپی کی اگیا سے اور شری جت پرم سجان دیا ساگر پرم اپکاری ویم ہنٹرن نپھتری کی سہایتا سے اور شری جت نیٹ پربین دیا جت

---

[1] دیباچہ پریم ساگر (مطبوعہ) للوجی لال کوی ص ۲۰۱۔

لیٹن اور اہم لاکٹ[1]........کے کہنے سے اسی کُب نے سمبت ۱۸۶۶ میں پورا کر
پاٹھ شالا کے بدیارتھیوں کے پڑھنے کو چھپوایا۔"[2]

پریم ساگر کا موضوع مذہب ہے۔ اس میں شری مدبھاگوت کے دسویں باب کا بیان مذکور ہے۔ یہ کل ۹۰ ادھیائے پر مشتمل ہے۔ ان میں شری کرشن کی حیات اور واقعات سے متعلق کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔

پریم ساگر میں للوجی نے آگرہ اور دہلی کی کھڑی بولی استعمال کی ہے۔ چنانچہ پریم ساگر میں کھڑی بولی کے بے حد رواں اور شگفتہ نمونے نظر آتے ہیں۔ زبان آسان ہے اور موضوع سے مطابقت رکھتی ہے۔ للوجی کے انداز تحریر نے پریم ساگر کے بیانات کو بے حد عمدہ اور نظم کی سی دلکشی عطا کی ہے۔ ہندی کے آسان الفاظ طبع لطیف پر گراں نہیں گزرتے۔ درمیان میں دوہے اور چوپائیاں بھی شامل ہیں۔ ہر ادھیائے پر عنوان قائم ہے۔ پریم ساگر کی زبان کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"سری سکھدیو جی بولے کہ مہاراج کاشی پوری میں ایک پونڈرک نام مہا بلی اور پرتاپی تھا۔ اس نے بشن کا بھیش کیا اور چھل بل کر سب کا من ہر لیا۔ سدان پیت بس بیجنتی مال، مکٹ مال، بن مال پہنے رہے۔ سنگھ چکر گدا پدم لئے دو ہاتھ کاٹھ کے ایک گھوڑے پر کاٹھ ہی کا گروڑ دھرے چڑھا پھرے۔ وہ باسدیو پونڈرک کہاوے اور سب سے آپکو پوجاوے جو راجہ اس کی اگیا نہ

---

[1] ابراہم لاکٹ۔

[2] دیباچہ پریم ساگر (مطبوعہ) للوجی لال کوی ص ۲۔

مانے اس پر چڑھ جاتے اور مار دھار کر اپنے بس میں رکھے ہیں[1]

پریم ساگر ناگری اور فارسی دونوں رسم الخط میں شائع ہوتی رہی۔ یہ ۱۸۰۳ء میں زیر طبع تھی۔ اس میں ۲۵۰ صفحات تھے۔ گل کرسٹ نے ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں پریم ساگر پر دو سو روپے انعام کی تجویز پیش کی تھی اور رائے کے کالم میں لکھا تھا:۔

"for the Hinduwee a most useful book and rated solow merely because he has 50 rs. a month and is doing nothing else."[2]

گریرسن نے اس کے مختلف ایڈیشنوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ پریم ساگر ۱۸۰۳ء، ۱۸۰۵ء، ۱۸۱۰ء اور ۱۸۲۵ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی[3]۔ شاردا دیوی کی اطلاع کے مطابق اس کا پہلا ایڈیشن جو نامکمل تھا اور صرف ۵۱ ابواب پر مشتمل تھا ۱۸۱۰ء میں ہندوستانی پریس سے شائع ہوا[4]۔ لیکن انڈیا آفس لائبریری میں جو نسخہ ہے اس پر ہندی میں ۱۸۰۳ء درج ہے[5]۔ اناس آف دی کالج آف فورٹ ولیم سے علم ہوتا ہے کہ پہلا مکمل ایڈیشن ۱۸۱۱ء میں سنسکرت پریس

---

[1] پریم ساگر (مطبوعہ) للوجی لال کوی ص ۲۰۳، ۲۰۴۔

[2] Proceedings of the College of F.W. Vol. 559, P. 277

[3] Linguistic Survey of India Vol. IX, Part I P. 35

[4] [5] The Development of Hindi Prose Literature in the Early Nineteenth Century P. 64

کلکتہ سے شائع ہوا[1]۔ ولیم پرائس نے پریم ساگر میں مستعمل الفاظ کی بنیاد پر ۱۸۱۴ء میں ہندوستانی پریس سے کھڑی بولی اور انگریزی میں ایک فرہنگ شائع کی تھی[2]۔

---

(۴۷)

اخلاق ہندی

میر بہادر علی حسینی

میر بہادر علی حسینی نے اخلاق ہندی کا ماخذ "مفرح القلوب" بتایا ہے۔ مفرح القلوب سنسکرت کی ہتوپدیش کا فارسی ترجمہ ہے۔ اسے شاہ نصیر الدین (والیٔ صوبہ بہار) کی فرمائش پر مفتی تاج الدین بن معین الدین الملکی[3] نے سلیس فارسی میں منتقل کیا تھا۔ حسینی نے مفرح القلوب کا اردو ترجمہ سنہ ۱۸۰۱ء میں کیا اور "اخلاق ہندی" نام رکھا۔ اس باب میں حسینی کا بیان یوں ہے:۔

"............اس کتاب کو ہند میں ہتوپدیش یعنی نصیحت مفید کہتے ہیں۔

............چنانچہ یہ کتاب سرکار دولت مدار میں ملک الملوک شاہ نصیر الدین کے جسکا تخت گاہ صوبۂ بہار تھا پہنچی۔ جب انہوں نے سنا اس میں قصے ازبسکہ دلچسپ ہیں اور نصیحت نہایت مرغوب اور باتیں بہت خوب اور

[1،2] Annals of the College of F. W. Appendix, P. 28

[3] اردو کی نثری داستانیں۔ گیان چند جین ص نمبر ۲۶۔

حکایتیں اکثر مفید تب اپنے ملازموں میں سے ایک کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ اس کو ترجمہ سلیس فارسی میں کرو تو میں اپنے مطالعہ میں رکھوں اور اس کے مضمون سے مستفید ہوؤں۔ تب انھیں میں سے ایک شخص نے ترجمہ فارسی کیا اور نام اس کا مفرح القلوب رکھا۔ بالفعل اس عاصی میر بہادر علی حسینی نے ۱۸۰۱ء اٹھارہ سو ایک عیسوی میں مطابق ۱۲۱۵ھ بارہ سی پندرہ ہجری کے فرمانے سے صاحب خداوند نعمت جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کے زبان فارسی سے ترجمہ سلیس رواجی ریختے میں جو اسے خاص و عام بولتے ہیں کیا اور نام اس کا اخلاق ہندی رکھا۔"[۲]

گل کرسٹ نے اپنی ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں اخلاق ہندی کا نام بھی شامل کیا ہے۔ جس پر ڈیڑھ سو روپے کے انعام کی سفارش کی تھی (اسوقت یہ چھپ

---

[۱] ڈاکٹر وحید قریشی کے مرتبہ مطبوعہ نسخے میں حسینی کا جو دیباچہ نقل ہے (ص ۲) اسمیں سن ترجمہ ۱۸۰۲ء مطابق ۱۲۱۶ھ درج ہے اور راقم الحروف کے زیر نظر جو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کا قلمی نسخہ ہے اسمیں ۱۸۰۱ء مطابق ۱۲۱۵ھ درج ہے۔ وحید قریشی والے نسخے کی تاریخ درست نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ ۱۲ جنوری ۱۸۰۲ء کو کالج کونسل کے سامنے گل کرسٹ نے کتابوں کی جو تفصیل پیش کی تھی اسمیں اخلاق ہندی بھی شامل ہے۔ اسوقت اس کی طباعت شروع ہو چکی تھی (P. F.W. VOL. 559, P. 75) ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال والے نسخے کا سن عیسوی درست ہے لیکن سن ہجری ۱۲۱۵ھ کی بجائے ۱۲۱۶ھ ہونا چاہیے۔ سنہ ہجری ۱۲۱۵ھ ۱۳ مئی ۱۸۰۱ء کو ختم ہو جاتا ہے۔ حسینی نے ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو کالج کی ملازمت اختیار کی۔ یہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ ۴ مئی اور ۱۳ مئی کے درمیان صرف نو دن میں حسینی سے گل کرسٹ نے فرمائش کی ہو اور حسینی نے مفرح القلوب کا ترجمہ مکمل کر دیا ہو۔ [۲] دیباچہ اخلاق ہندی (ق۔ن) بہادر علی حسینی ورق ۱، ۲۔

رہی تھی)[۱] لیکن کالج کونسل نے یہ پوری فہرست ہی مسترد کر دی تھی۔

اخلاق ہندی پہلی بار اردو میں ۱۸۰۳ء میں طبع ہوئی[۲]۔ اس سے قبل اس کے کچھ صفحات ناگری رسم الخط میں طبع ہو کر گل کرسٹ کی "ہندی مینول" کی زینت بن چکے تھے[۳]۔ اخلاق ہندی کا مذکورہ مطبوعہ نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔ اسکا تیس اوراق پر مشتمل قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں محفوظ ہے لیکن یہ ناتمام ہے۔ اسکا موجودہ مطبوعہ نسخہ مجلس ترقیٔ ادب لاہور نے شائع کیا ہے۔

اخلاق ہندی فورٹ سینٹ جارج کالج کے نصاب میں شامل تھی۔

ڈاکٹر گیان چند کے مطابق مفرح القلوب کے سنسکرت ماخذ ہتو پدیش (سنہ تالیف ۸۰۰ء سے ۹۰۰ء کے درمیان) کا مؤلف نرائن بھٹ تھا۔ اس نے کچھ کہانیاں پنچ تنتر سے اور کچھ کسی دوسرے ماخذ سے مستعار لے کر ہتو پدیش مرتب کیا[۴]۔

اخلاق ہندی کا موضوع اخلاقیات ہے۔ اسکی مختلف حکایتوں کے پردے میں کوئی نہ کوئی اخلاقی درس پنہاں ہے اور بقول حسینی :۔

".......... ایسے عجیب وغریب قصوں میں قصے لپٹے ہوئے ہیں جنکے دیکھنے اور سننے سے آدمی دنیا کے کاروبار میں بہت ہوشیار، نہایت چالاک ہو جائے، علاوہ اسکے بھلی بری حرکتیں ہر ایک کی نظر آویں"[۵]

۱۔ Proceedings of the College of F.W., Vol. 559 P. 277

۲۔ Linguistic Survey of India Vol. IX Part I P. 31.

۳۔ Annals of the College of F.W. Appendix ...

۴۔ ... ۔ ... اسانیں ص ۵۵۴۔ ۵۔ اخلاق ہندی (ق.ن) بہادر علی حسینی ورق ۲۔

اخلاق ہندی میں قصہ اور اسمار سنسکرت نسخے (ہتوپدیش) کے مطابق ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مفرح القلوب میں ہتوپدیش اپنی صحیح شکل و صورت میں ہی منتقل ہوئی ہے۔ اخلاق ہندی کل چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں "ذکر دوستی کا" دوسرے باب میں "دوستوں کی جدائی کا" تیسرے باب میں "لڑائی کی ایسی باتوں کا جو اپنی فتح ہو اور مخالف کی شکست" اور چوتھے میں کیفیت ملاپ کی خواہ لڑائی کے آگے ہو یا پیچھے" مذکور ہے۔[1] ان میں سے ہر باب کے ذیل میں کچھ اخلاقی حکایتیں درج ہیں۔ اخلاق ہندی کا بنیادی قصہ گنگا کے کنارے واقع شہر مانک پور کے راجہ چندر سین کے بے ادب اور بے عقل لڑکوں سے عبارت ہے۔ ان لڑکوں کی تعلیم و تربیت کے لئے بشن شرما نام کا ایک برہمن مقرر ہوتا ہے۔ وہ انہیں درس دینے کے لئے کچھ حکایتیں سناتا ہے۔ یہ حکایتیں محض بہترین اخلاقی درس کا ہی نمونہ نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں حکمت و سیاست اور طریق جنگ کے رموز بھی پنہاں ہیں۔

اخلاق ہندی کے بیشتر کردار حیوان ہیں۔ شیر، گیدڑ، ہرن، لومڑی، ہاتھی، سانپ، مینڈک، مچھلی، کوا، مرغابی اور سارس وغیرہ۔ یہ نہ صرف انسانی فطرت کی خوبیوں سے متصف ہیں بلکہ فہم و ذکاوت کا بھی مجموعہ ہیں اور اپنے عمل سے مثالی اور علامتی کردار کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:-

"ہندوستانی حکایات کی ایک یہ خصوصیت بتائی گئی ہے کہ ان میں جانور آدمیوں کے سے کام کرتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال کلیلہ و دمنہ ہے۔ شیر، بیل اور گیدڑ کی کہانی یا زاغ یا بوم کی لڑائی میں کون سی بات ہے جس سے ان کرداروں کا جانورپن ظاہر ہو۔ باقاعدہ دربار لگتا ہے۔ قاضی کے یہاں دارالقضاۃ ہے۔

---

[1] اخلاق ہندی (ق۔ن) بہادر علی حسینی ورق ۲۔

زنداں ہے، مقدمے ہوتے ہیں۔ مجلس شوریٰ منعقد کی جاتی ہے.........

مصنف کے دماغ میں انسانوں کی بستی۔ انسانوں کی حکومت ہے۔ اس لئے

کردار نگاری بھی پائی جاتی ہے"[1]

قدیم داستانوں کے نسوانی کرداروں کی طرح اخلاق ہندی کے نسوانی کردار بھی بدک

اور شہوانی بے راہ روی سے آلودہ ہیں۔

اخلاق ہندی کی زبان کے بارے میں حسینی کی یہ صراحت موجود ہے کہ:۔

"..........زبان فارسی سے ترجمہ سلیس رواجی ریختے میں جو اسے

خاص و عام بولتے ہیں کیا.........."[2]

چنانچہ حسینی کا اسلوب سادہ بھی ہے اور آسان بھی لیکن اس سادگی اور سلاست پر فارسیت

کا غلبہ ہے۔ ترکیبیں اور جملے فارسی سے متأثر ہیں۔ عربی اور فارسی کے نامانوس الفاظ کے ش

بشانہ ہندی کے نرم اور عام فہم الفاظ بھی نظر آجاتے ہیں۔ اخلاق ہندی میں کتنے ہی ایسے د

الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو آج بھی اسی شکل وصورت میں رائج ہیں۔ حسینی کے بعض بیانا

بے حد جاندار ہیں۔ مثلاً حسن صورت کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیے:۔

"..........ایسی خوبصورت کہ اس کے دیکھنے سے چاند سورج بیتاب ہوتے

اور بالوں کی سیاہی سے اس کے بھونرا شرمندہ ہوتا، اور چشم نرگس شہلا

اپنی سے خلقت کو فریفتہ کرتی اور جادو فریب کماں ابروانی سے لوگوں کو

---

[1] اردو کی نثری داستانیں۔ گیان چند جین ص ۲۸۵، ۲۸۶۔

[2] دیباچہ اخلاق ہندی (ق۔ن) بہادر علی حسینی ورق ۲۔

دیوانہ بناتی اور اپنے دانتوں کی چمک سے بادشاہی جواہرات کو جلا بخشتی ہے۔[1]

حسینی نے عجمی تشبیہوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تشبیہیں بھی استعمال کی ہیں تاہم حسینی کا اسلوب ادبیت کے حسن سے عاری ہے۔ اخلاق ہندی میں عام طور سے جو زبان رواں دواں ہے، وہ خشک اور بے مزہ ہے۔ عبارتیں مربوط اور واضح ہونے کے باوجود خوشگوار تاثر اور کیفیت پیدا کرنے سے معذور ہیں۔ بحیثیت مجموعی اخلاق ہندی کا اسلوب فورٹ ولیم کالج کی درسی ضرورت کا نمائندہ ہے۔

---

(۴۸)

باغ سخن (ترجمۂ بوستان)

مرزا مغل نشاں

مرزا مغل نے حج کے لئے زاد راہ مہیا کرنے کے لئے بوستان سعدی کا ترجمہ ۱۸۰۳ء/۱۲۱۸ھ میں "باغ سخن" کے نام سے کیا۔ اس کام میں انہوں نے میر غلام حسین کی شرح کے علاوہ دیگر شارحین سے بھی استفادہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں مرزا مغل کا بیان یوں ہے:-

"..........اور اصاف حمیدہ.......... مسٹر جان گل کرسٹ صاحب دام فضلہ کے سن کے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔

---

[1] اخلاق ہندی (ق۔ن) بہادر علی حسینی ص ۲۹، ۳۰۔

"............پس موافق انکی رائے اور اشتہار کے زاد راہ کی امید پر
عہد حکومت میں.......... مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل لارڈ مارنگٹن[1] بہادر

دام افضالہ کے ترجمہ بوستان سعدی کا زبان اردو میں کیا ہرچند بارہ برس

سے شعر و سخن ترک تھا اور تحصیل علوم دینی میں مصروف لیکن اہم جان کے

خواب و خور اپنے پر حرام کر کے جان لڑا کے ایک مہینے کے عرصہ میں موافق اس

شرح کے جو میر غلام حسین صاحب نے لکھی تھی اور سب شارحوں کے قول جمع

کر کے جسکو ترجیح دی تھی لکھا"[2]

خاتمے کی عبارت سے سنہ ترجمہ کا علم ہوتا ہے :۔

"..........فضل الٰہی سے یہ ترجمہ سعدی کی بوستاں کا عہد میں.........

مارکویس ولزلی گورنر جنرل لارڈ مارنگٹن......... شہر میں کلکتے کے سن بارہ

سو اٹھارہ ہجری جمادی الاول کے مہینے میں ساتویں تاریخ تمام ہوا"[3]

باغ سخن کا ۲۰۲ اوراق پر مشتمل قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں

موجود ہے۔ اس کے ہر ورق پر گیارہ سطور مندرج ہیں۔ گل کرسٹ کی ۱۹ راگست ۱۸۰۳ء کی انعام کیلئے

سفارشی فہرست میں یہ طباعت کیلئے تیار کتابوں کے ذیل میں شامل تھی۔ اس کے صفحات کی تعداد تین

سو تھی اور گل کرسٹ نے انعام کی رقم چار سو روپے تجویز کی تھی۔ انہوں نے رائے کے کالم میں لکھا تھا کہ۔

"A learned man and poet lately attract

to this metropolis by the fame of the College

---

[1] مارنگٹن۔ [2] [3] دیباچہ باغ سخن (ق۔ن) مرزا مغل نشاں ورق ۳، ۲۰۲۔

as an asylum for Oriental Literature"[1]

اس فہرست کی نامنظوری کے بعد گل کرسٹ نے ۹ ستمبر ۱۸۰۲ء کی فہرست میں بھی اسے شامل کیا تھا۔ ۱ اکتوبر ۱۸۰۲ء کی کالج کونسل کی کاروائی میں اس کتاب پر چار سو روپے انعام دینے کا فیصلہ کیا گیا[2]

باغ سخن کا موضوع اخلاقیات ہے۔ اس میں اخلاقی حکایات درج ہیں۔ باغ سخن کا آغاز خدا کی برتری، پیغمبر صلعم، اور صحابہ کرام پر درود و سلام سے ہوتا ہے۔ یہ حصہ بھی بوستان سعدی کا ترجمہ ہے۔ اس کے بعد مرزا مغل نے بوستان سعدی کے سبب تالیف کا ترجمہ کیا ہے:-

"............ اپنے دل سے میں نے کہا کہ مصر سے لوگ قند لاتے ہیں دوستوں کے لئے سوغات لے جاتے ہیں اگرچہ اس قند سے میرا ہاتھ خالی لیکن شیریں تر ہیں باتیں قند سے بھی نہ ایسا قند جو لوگ ظاہر میں کھاویں بلکہ صاحب معنی کاغذ میں لے جاویں یہ خانہ دولت جب تعمیر کیا میں نے دس دروازے اس میں تربیت (کذا) سے بنائے ہیں[3]

مذکورہ دس دروازے بطور دس ابواب کے ہیں۔ ان میں عدل و تدبر، عقل و احسان، عشق و مستی وسوز، تواضع، رضا، قناعت، تربیت، شکر اور توبہ کے مسائل کو حکایات کے ذریعے سمجھایا ہے۔ ان میں پند و نصیحت، عقل و دانش اور حکمت و عمل کے رموز پوشیدہ ہیں۔ اخیر میں مناجات درج ہے۔ سعدی نے بوستاں میں اپنے ہم عصر بادشاہ اتابک ابوبکر بن سعد زنگی کا ذکر اور اسکی تعریف

Proceedings of the College of F. W. Vol. 559. P. 277, 287 [1-2]

[3] باغ سخن (ق۔ ن) مرزا مغل نشاں ورق ۱۱۔

درج کی ہے۔ مرزا مغل نے اسکا بھی ترجمہ کر دیا ہے۔

عقل و دانش سے متعلق باب میں نکات سلطنت اور حکومت کرنے کے طریقے درج ہیں۔ مثلاً رعایا کے ساتھ کیسا سلوک رکھا جائے اور کیسے انتظام کرنا چاہیئے کہ حملہ نہ ہونے پائے اور بادشاہ کی ذمہ داری وغیرہ کا بھی ذکر ہے۔ اس باب میں حکایات کے ذریعے نوشیروان اور خسرو اپنے بیٹے کو جو نصیحت کرتے ہیں اسے درج کیا گیا ہے۔ یہ پوری نصیحت امور سلطنت سے متعلق ہے۔ اس میں طرح طرح کی دانائی اور دانش مندی کی باتیں ہیں۔ جن سے نظام حکومت میں مدد مل سکتی ہے۔ اس باب کی ایک حکایت مندرجہ ذیل ہے:۔

"دین کے بزرگوں سے نقل کرتے ہیں جو وہ عارف کامل تھے کہ ایک صاحب دل شیر پر سوار کوڑے کی جگہ سانپ ہاتھ میں اوسکو دوڑاے جاتا تھا۔ ایک شخص نے اسے کہا کہ اے مرد خدا جس راہ کہ تو جاتا ہے مجھے بھی دکھلا کیا عمل تو نے کیا جو درندہ تجھ سے ہل گیا اور نگین سعادت کا تیرے نام ہوا اوسنے کہا کہ اگر ہاتھی یا گینڈا ہو تو اچنبھا نہ کر۔ تو بھی خدا کی نافرمانی نہ کر۔ تیرے بھی حکم سے کوئی باہر نہ ہوگا۔ جب حاکم خدا کے کہنے پر چلے تو خدا اسکا رکھوالا اور یاور ہے۔ جب خدا تجھے دوست رکھے محال ہے دشمن کے ہاتھ تجھے چھوڑے "[1]

بعض حکایات اسلامی روایتوں پر مبنی ہیں۔ مثلاً:۔

"زلیخا جو شراب عشق میں مست ہوئی یوسف علیہ السلام کے دامن سے جالپٹی۔ ایسا دیو شہوت کا اس پر غالب آیا تھا کہ بھیڑیے کی طرح یوسف کو پھاڑنے کا ارادہ

---

[1] باغ سخن (ق۔ن) مرزا مغل نشاں ورق ۱۸۔

کیا تھا ایک بت تھا زلیخا کے ہاں کہ صبح و شام اس کی عبادت کیا کرتی جس وقت
حضرت یوسف علیہ السلام سے اس نے کچھ اور ارادہ کیا اس وقت ایسی
بت کے منہ پر پردا ڈال دیا کہ ایسا نہ ہو یہ بری بات وہ دیکھے"[1]

باغ سخن بوستان سعدی کا لفظ بہ لفظ ترجمہ ہے۔ لیکن زبان کو خلاف محاورہ ہونے سے بچانے کے لئے کہیں کہیں قطع و برید سے بھی کام لیا گیا ہے۔ مرزا مغل دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"جو کتاب کی سیر کرے گا اس پر کھلے گا کہ ترجمہ موافق اصل کے ہے اور مفہوم
بہت کم مگر جہاں جہاں محاورہ نہ بنتا تھا وہاں کچھ کچھ گھٹایا بڑھایا ہے"[2]

مرزا مغل نے باغ سخن میں اتنا رواں اور سلیس اسلوب اختیار کیا ہے کہ کہیں سے ترجمہ پن کی جھلک نہیں ملتی۔ جملے سادہ، لطیف اور با محاورہ ہیں۔ کہیں کہیں فارسی تراکیب اور تشبیہ و استعارے بھی نظر آ جاتے ہیں۔ ان سے حکایات و بیانات کی دلکشی اور تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ مثال ملاحظہ ہو:۔

"ایک شخص نیک چلن اور خوش خو تھا کہ بد سیرتوں کو نیک باتیں سمجھاتا تھا۔
جب وہ مر گیا ایک شخص نے اسے خواب میں دیکھا کہا سرگزشت اپنی بیان کر
برنگ گل نہاں۔ اور مثل بلبل خوش آوازی سے کہا کہ مجھ پر بہت سختی نہ کی کہ میں نے
کسی کے ساتھ سختی نہ کی تھی"[3]

۱۰ اکتوبر ۱۸۰۳ء کی کالج کونسل کی کاروائی میں باغ سخن کی زبان پر مندرجہ ذیل تبصرہ

---

[1] باغ سخن (ق۔ن) مرزا مغل نشاں ورق ۱۹۵۔

[2] دیباچہ باغ سخن (ق۔ن) مرزا مغل نشاں ورق ۳۔

[3] باغ سخن (") " " ورق ۱۳۰۔

پیش کیا گیا تھا :۔

"بوستاں کا ترجمہ۔ زبان عموماً اچھی ہے اور مصنّف حوصلہ افزائی کے قابل ہے۔ کام میں کچھ خامیاں ہیں جو پریس میں درست کی جائیں گی۔ انعام وہی جسکے لئے گل کرسٹ نے سفارش کی ہے۔"[1]

---

(۴۹)

باغ اردو (ترجمۂ گلستان سعدی)
میر شیر علی افسوس

افسوس نے شیخ سعدی شیرازی کی "گلستان" کا ترجمہ "باغ اردو" کے نام سے کیا تھا۔ انہوں نے یہ ترجمہ گل کرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۱ء / ۱۲۱۵ھ میں شروع کیا۔ افسوس باغ اردو کے دیباچے میں اس ترجمے کی روداد یوں بیان کرتے ہیں :۔

"..........ایک دن صاحب موصوف (گل کرسٹ) نے مہربانی سے فرمایا کہ تو گلستان سعدی کا زبان اردو میں ترجمہ کر میں نے دھیان کیا کہ عبارت اسکی بظاہر صاف و بباطن پیچ دار ہے۔ علاوہ اس کے عبارت کا اختلاف بیشمار ہے۔ اور رتبہ اپنی قوت تالیف کا اور شیخ مرحوم کی تصنیف کا جو خیال کیا تو

---

[1] Proceedings of the College of F.W. Vol. 559, P. 287

کسی طرح کی نسبت نہ پائی۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

ارادہ کیا کہ اس سے پہلو تہی کروں اور سر عجز آگے دھروں۔ پھر دل میں سوچ آیا کہ مبادا حاشیۂ خیال میں ان کے گزرے کہ اس نے ہمارا کہنا نہ انا اور اس بات کو سہل جانا، تب قصد کیا کہ ایک حکایت طولانی کہ نظم و نثر اس میں کثرت سے ہو اسے ترجمہ کروں۔ اگر بہ خوبی سرانجام ہوئی اور اہل معانی کی پسند پڑی تو فبہا والا صاحب ممدوح سے اس امر کی معافی چاہوں گا۔ لیکن قاضی ہمدان کی حکایت کا ترجمہ کیا اور وہ علماء عقلاء و چند شعراء کہ یہاں تھے، انکی پسند پڑا، تب اس ضعیف نے کمر ہمت بہ قوت باندھی اور سعی بلیغ کی۔ بارے فضل ایزدی اور لطف سرمدی سے تمام کتاب زبان اردو میں لکھی اور وہ مقبول خاص و عام کی ہوئی۔ نام اسکا باغ اردو رکھا۔ چنانچہ اس کے شروع کی تاریخ بھی اسی میں سے نکلتی ہے :۔

میں تاریخ اس کی جوں چاہا مع نام — کہوں دل چسپ با آئین نیکو
کہ اس میں ہاتف غیبی یہ بولا — ہے از آغاز اردی باغ اردو[1]
۱ + ۱۲۱۴ = ۱۲۱۵ھ

یہ ترجمہ ۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۲ء میں مکمل ہوا۔ چنانچہ خاتمے پر یہ عبارت درج ہے :۔

"............ اٹھارویں ماہ ذی الحجہ (کذا) کی روز پنج شنبہ کلکتے کے بیچ عہد سلطنت میں شاہ عالم بادشاہ کے حکومت میں......... مارکویس ولزلی گورنر جنرل

---

[1] دیباچہ باغ اردو (مطبوعہ) شیر علی افسوس ص ۲۲، ۲۳۔

............کے کہ سن ہجری بارہ سی سولہ ہیں اور عیسوی اٹھارہ سو دو

یہ ترجمہ کہ مسمیٰ باغ اردو ہے تمام ہوا۔

عون و توفیق رب سبحاں سے ترجمہ یہ کیا تمام میں جب
ختم کی اس کے پیر عقل سے کی میں نے تاریخ عیسوی جو طلب
ابتدائے بہار سے یہ کہا باغ اردو ہوئی گلستاں اب[1]

باغ اردو دو جلدوں میں ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی تھی۔ پہلی جلد دستیاب نہ ہو سکی۔ دوسری جلد مطبوعہ ۱۸۰۲ء پیش نظر ہے۔ باغ اردو مجلس ترقی ادب لاہور کی جانب سے بھی شائع ہو چکی ہے۔ گل کرسٹ نے ۱۹ر اگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں اس پر چار سو روپے انعام کی تجویز پیش کی تھی۔[2] لیکن کالج کونسل نے اُس فہرست کو نامنظور کر دیا تھا۔ باغ اردو کے اقتباسات گل کرسٹ کی "ہندی مینول" (HINDEE MANUAL) میں بھی شامل ہیں۔[3] باغ اردو کی جلد دوم میں جلد اوّل کے مشمولات کی فہرست شامل ہے۔ اس سے علم ہوتا ہے کہ جلد اوّل میں ایک اشتہار، احوال فارسی رسم الخط مترجم کا دیباچہ، شیخ سعدی کا دیباچہ اس کے بعد تین باب گلستاں کے ترجمے کے ہیں۔ اخیر میں غلط نامہ ہے۔ یوں یہ پہلی جلد کل ۲۸۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

باغ اردو کی دوسری جلد چوتھے باب سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں کل پانچ باب ہیں۔ یعنی یہ آٹھویں باب پر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ ابواب اپنے دامن میں مختصر حکایات کے موتی سمیٹے ہوئے ہیں۔

---

[1] باغ اردو (دوسری جلد۔ مطبوعہ ۱۸۰۲ء) ص ۲۰۲، ۲۰۳۔

[2] Proceedings of the College of F.W. Vol. 559, P. 276

[3] Annals of the College of F.W. Appendix, P. 23

بعض ابواب بہت طویل ہیں۔ یہ ساری حکایتیں مختلف النوع موضوعات کو محیط ہیں۔ اور نصیحت آمیز وسبق آموز ہیں۔ افسوس نے گلستاں کی محض حکایات کا ہی ترجمہ نہیں کیا بلکہ ابیات کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ انہوں نے نثری ترجمے میں کہیں کہیں کمی کی ہے اور کہیں صرف مفہوم درج کر دیا ہے۔ اس ضمن میں وہ دیباچے میں لکھتے ہیں :۔

"ارباب فطنت وصاحبان طبیعت پر ظاہر ہووے کہ فقیر نے اسکی نظم ونثر کا مطلب مع عربی موافق اپنے مقدور کے نہیں چھوڑا مگر زیادہ کمی کہیں کہیں کی ہے اور جس نظم ونثر میں اختلاف نسخ دیکھا ہے یا اختلاف معانی، بعضے جاگہ تو ہر ایک کا ترجمہ کیا ہے اور بعضے مقام میں جسکی ترجیح اپنے نزدیک ٹھہری ہے، اس کا کیا ہے اور مرجوع کو ترک۔ کسی مقام میں ہو بہو بھی کرنے میں آیا ہے۔ گو محاورے سے اندک تفاوت ہو گیا ہو پر اکثر رعایت محاورے ہی کی منظور رہی ہے۔"[1]

باغ اردو کی زبان بے کیف اور بے جان ہے۔ افسوس کا اسلوب سادہ اور آسان ہونے کے باوجود سادگی وسلاست کے آہنگ وترنم سے عاری ہے۔ عبارتوں اور جملوں سے ترجمہ پن صاف صاف نمایاں ہے۔ جس کی وجہ سے باغ اردو کی نثر بے مزہ ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ قواعد کی خامیاں بھی کثرت سے ہیں۔ مثال ملاحظہ ہو۔ یہ چوتھے باب کی دوسری حکایت ہے :۔

"ایک سوداگر کو ہزار دینار کا نقصان آیا۔ اپنے بیٹے سے کہا اس نے لائق نہیں ہے کہ ہر ایک سے یہ بات کہے تو۔ عرض کی اس نے کہ بموجب ارشاد نہ کہونگا میں لیکن مجھے اطلاع بخشئے کہ اس کے چھپانے میں کیا فائدہ ہے اور کیا

---

[1] دیباچہ باغ اردو (مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور) ص ۲۵۔

مصلحت۔ کہا اس نے تا ایک مصیبت دو نہ ہوں۔ یکے نقصان مایہ دِگر شماتت ہمسایہ۔

کچھ اپنا نہ کہہ دشمنوں سے کبھی ۔ کہ لاحول پڑھ کر کریں گے خوشی[1]

دوسری مثال چوتھے باب کی آٹھویں حکایت سے ہے:۔

"بندگان سلطان محمود سے کتنے شخصوں نے حسن میمندی سے پوچھا کہ بادشاہ نے آج تجھ سے فلانی مصلحت میں کیا کہا۔ کہا اس نے کہ تم پر بھی چھپا نہ رہے گا۔ بولے وے کہ تو وزیر ہے جو کچھ کہ تجھ سے کہیگا ہم سے نہ کہے گا۔ تب کہا اس نے اس اعتماد پر کہ کسی سے نہ کہوں گا پس کس واسطے پوچھتے ہو تم۔

ہر ایک بات سنی کب کہے ہے اہل تمیز ۔ وہ سِرِّ شاہ نہ کھولیگا جسکو سر ہے عزیز[2]

ہر حکایت کے اختتام پر ابیات درج ہے۔ لیکن افسوس کے ان ترجموں میں شاعرانہ حسن نہیں ہے۔ گلستان سعدی کی افادیت اور اہمیت کی طرح باغ اردو بھی زبان کی خامیوں کے باوجود مفید ہے۔ اس کی حکایتوں میں پوشیدہ نصیحتیں ہر دور میں نوع انسان کے لئے چراغ راہ ہیں۔ ہر چند اسکی زبان بلے کیف ہے مگر فارسی لفظ کا متبادل اردو میں کون سا لفظ ہوگا اُس کتاب سے اس کی گرہیں کھل جاتی ہیں۔ اس کتاب سے محاوروں کی فہرست مرتب نہیں ہوسکتی لیکن فرہنگ الفاظ کے لئے یہ کتاب بڑی مفید ہے۔ لفظی ترجموں سے ہمیشہ زبان کے اصل نقط تک رسائی ہو جاتی ہے۔

---

[1] باغ اردو (دوسری جلد مطبوعہ ۱۸۰۲ء) ص ۲، ۳۔

[2] " ") " " ") ص ۸۔

باغ اردو کی دوسری جلد میں مظہر علی خاں ولا کا شیخ سعدی کے پند نامہ کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ اخیر میں غلط نامہ بھی ہے۔

۵۰

گلشن اخلاق

سید علی

سید علی نے ۱۸۰۹ء مطابق ۱۲۲۴ھ میں گلشن اخلاق تالیف کر کے کپتان ٹیلر کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ سید علی دیباچے میں لکھتے ہیں :-

"...... سید علی ابن سید شیر علی افسوس جعفری...... یہ کہتا ہے کہ اس مجموعہ کو بہ عبارت شکستہ اکبر شاہ ظل اللہ کی بادشاہت میں عہد حکومت میں......... نواب گورنر جنرل لارڈ منٹو بہادر دام اقبالہ کی دسویں کو ماہِ مبارک رمضان کی شہر کلکتہ میں کہ بالفعل دار الحکومت ہے فضل الٰہی اور اس کے لطف سرمدی سے حسن اتمام کو پہونچایا اور چمنوں کو اس میں بنایا۔ نام بھی گلشن اخلاق رکھا۔ سن عیسوی اس وقت اٹھارہ ۱۸۰۹ سے نہ تھے اور ہجری بارہ سے چابیس ۱۲۲۴...... پھر نذر کو...... مدرس ہندی کپتان ٹیلر صاحب بہادر دام اقبالہ کی لایا اور اس کے چمنوں کی بہار کو انہیں دکھلایا۔ امید وار ہوں کہ اس کو وہ قبول فرمائیں اور سیر سے اس کے اکثر

خط اوٹھائیں ہیں[1]

گلشن اخلاق کا ۱۴۰ اوراق پر مشتمل قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔ اس کے آغاز اور اختتام پر کالج کی مہر ثبت ہے۔ کالج کونسل نے ۲۲ر مئی ۱۸۱۰ء کو گلشن اخلاق پر بیس روپے کا انعام دیا تھا[2]۔ جاوید نہال کا یہ بیان قطعی درست نہیں کہ ولیم ٹیلر کی سفارش کے باوجود گلشن اخلاق پر سید علی کو کوئی انعام نہیں ملا[3]۔

گلشن اخلاق کا موضوع اخلاقیات ہے۔ چنانچہ اس میں مختلف اخلاقی نکات کو حکایات اور مذہب کی روشنی میں سمجھایا گیا ہے۔

گلشن اخلاق چھ چمنوں پر مشتمل ہے۔ پہلا اور دوسرا چمن مختلف حصوں میں مُنقسِم ہے۔ گلشن اخلاق کے پہلے چمن میں بنی نوع انساں کے آپسی تعلقات اور فرائض کا ذکر ہے۔ دوسرے چمن میں اخلاق کا۔ چنانچہ حضرت آدمؑ، حضرت شیث بنی آدم، اسوس بن شیث، قنیان بن اسوس، مہلائیل بن قنیان اور حضرت ادریسؑ کے حوالے سے مختلف اصلاحی رموز و نکات بیان کئے گئے ہیں۔ اور انسان کو عقل و حکمت کی راہ بتا کر نصیحت کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ فیثا غورث، سقراط، افلاطون، ارسطو، بطلیموس، اور لقمان وغیرہ کے واقعات، وافکار بھی درج کئے گئے ہیں۔ اس دوسرے چمن میں ہی شجاعت، عفت، سخاوت، عفو، حلم، وفا، صدق اور عدالت کا ذکر ہے۔ تیسرا چمن نیک نامی چوتھا چمن آداب، پانچواں چمن عجائب اور چھٹا ثمرات سے متعلق

---

[1] دیباچہ گلشن اخلاق (ق۔ن) سید علی ورق ۲۔

[2] فورٹ ولیم کالج (ہندی) لکشمی ساگر وارشنے ص ۱۰۱۔

[3] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۱۱۔

اس آخری چمن میں چند اسلامی اور تاریخی واقعات بھی مختصراً درج کئے گئے ہیں۔

سید علی نے گلشن اخلاق کی حکایات میں آسان اور رواں انداز بیان اختیار کیا ہے۔ علم و حکمت کے بیان میں وہ عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں۔ لیکن ایسے موقعے اور ایسے موضوعات کم ہیں۔ گلشن اخلاق کا مجموعی انداز بیان یہ ہے :-

"......... حضرت نے فرمایا اس لڑکے کو تروار[1] سے دو ٹکڑے کر کے آدھا آدھا ان دونوں کو حوالہ کرو۔ یہ حکم سن کر ایک تو بیقرار ہوئی اور رو رو کر کہنے لگی حضرت میں اس حق سے اپنے درگزری اس کے تئیں کو نہ مارو اور دوسرے پر کچھ اثر درد کا نہ ہوا۔"[2]

۵۱

چشمۂ فیض
میر معین الدین فیض

"چشمۂ فیض" شیخ فریدالدین عطار کے "پند نامہ" کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔[3] یہ ترجمہ میر معین الدین فیض نے گل کرسٹ کی فرمائش پر کیا تھا۔ اس کا علم چشمۂ فیض کے آغاز میں درج مندرجہ ذیل

---

[1] تلوار۔ [2] گلشن اخلاق (ق۔ن) سید علی ورق ۸۲، ۸۳۔ [3] عتیق صدیقی نے گل کرسٹ کی ۱۹ اگست ۱۸۰۲ء کی فہرست میں اسے نثری تصنیف لکھا ہے (گل کرسٹ اور اسکا عہد ص ۱۰۴) جو غلط ہے۔

عبارت سے ہوتا ہے:۔

چشمۂ فیض

ترجمہ پند نامے شیخ فریدالدین عطار قدس سرہٗ نیشاپوری کا واسطے......

.......مارکوییس ویلزلی گورنر (کذا) جنرل بہادر دام افضالہٗ کے مسٹر جان

گل کرسٹ دام ثروتہ کی فرمائش سے کیا ہوا میر معین الدین فیض کا۔"[1]

دیباچے سے علم ہوتا ہے کہ میر معین الدین نے ۱۸۰۳ء مطابق ۱۲۱۸ھ میں پند نامہ کو زبان اردو میں نظم کرنا شروع کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"اس عاجز نے سن ہجری ۱۲۱۸ مطابق سن عیسوی ۱۸۰۳ میں بموجب حکم صاحب خداوند نعمت موصوف کے پند نامہ زبان اردو میں نظم ترجمہ کیا۔ اور چشمۂ فیض نام رکھا۔"[2]

خاتمے کی عبارت سے ہماری معلومات میں یہ اضافہ ہوتا ہے کہ چشمۂ فیض ۱۸۰۴ء میں مکمل ہوئی:۔

"ستائیسویں جمادی الاول ۱۲۱۹ھ ہجری مطابق ۱۸۰۴ عیسوی کو کلکتے میں دستخط سے میر معین الدین فیض کے یہ رسالہ ختم ہوا۔"[3]

جاوید نہال نے چشمۂ فیض کی تکمیل کا سنہ ۱۸۰۳ء ہی قرار دیا ہے اور انہوں نے ثبوت میں میر معین الدین کی اوّل الذکر عبارت پیش کی ہے[4] لیکن خاتمے کی مندرجہ بالا عبارت کی روشنی میں ۱۸۰۳ء آغاز کا سنہ ثابت ہوتا ہے۔

---

[1] سرورق چشمۂ فیض (ق۔ن) میر معین الدین فیض۔

[2] [3] چشمۂ فیض (") " " " " ورق ۵، ۳۶۔

[4] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب۔ جاوید نہال ص ۲۹۱۔

چشمۂ فیض غیر مطبوعہ ہے۔ اسکا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔ اس میں کل ۱۲۶ اوراق ہیں۔ اور کالج کی مہر بھی ثبت ہے۔ گل کرسٹ کی ۱۹ راگست ۱۸۰۲ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں چشمۂ فیض طباعت کے لئے درست کی جانے والی کتابوں کے ذیل میں شامل تھی اور گل کرسٹ نے اس پر ۱۵۰ روپلے انعام کی تجویز پیش کی تھی[1]۔ لیکن اس فہرست کو کالج کونسل نے نامنظور کر دیا تھا۔

چشمۂ فیض اپنے موضوع کے اعتبار سے ضابطۂ حیات اور اخلاق وعمل کا ایک صحیفہ ہے۔ اس میں نصیحت واخلاق اور انسانی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر ۴۹ بیانات نظم کئے گئے ہیں۔ چشمۂ فیض کا آغاز نثری حمد تعالیٰ، بادشاہ عصر اور گورنر جنرل ویلزلی کی مدح سے ہوتا ہے۔ اسکے بعد گل کرسٹ کی ستائش اور منظوم مدح درج ہے۔ میر معین الدین نے اپنا احوال تحریر کرنے کے بعد حضرت فریدالدین عطاؔر کا احوال اور منظوم مدح بھی شامل کی ہے۔ اس کے علاوہ نعت رسولؐ، مدح آل اطہار و اصحاب کبار، مناقب مجتہدان والا اقتدارؓ اور مناجات مندرج ہے۔

چشمۂ فیض کی پہلی نظم صبر کے فائدوں کے بیان میں ہے۔ چوتھے بیان میں ان چار خصلتوں کا ذکر ہے جو بادشاہوں کے لئے ضرر رساں ہیں ؎

چار خصلت ہیں جہاں میں سخت تر	رکھتی ہیں شاہوں کے حق میں یہ ضرر
گر ہنسے شہ بر ملا یا بے محل	ہو بلا شک اس کی ہیبت میں خلل
بعد ازاں ہم صحبتی با ہر فقیر	کرتی ہے شاہوں کو یہ حرکت حقیر
رنڈیوں سے جو بہت خلوت کرے	اپنے تئیں وہ شاہ بے حرکت کرے

---

[1] Proceedings of the College of F. W. Vol. 559, P. 279

جس کے دل میں ہے جہانداری کی فکر　　اسکو رہتے (کذا) ہے کم آزاری کی فکر

چاہیئے شاہوں میں عدل وداد ہو　　عدل سے تا ان کے عالم شاد ہو

ہو ستم کی خو اگر ور دِ پادشاہ　　کب وفاداری کرے اسے سپاہ

پادشہ عادل ہو گر اور نیک نام　　زیادہ تر ہو اس کی شاہی کو قیام

بخشے گر سلطان سپہ کو مال وزر　　سیکڑوں اس پہ فدا ہو جائیں بسر[1]

۲۵واں بیان قرآن شریف کے احکام کے ذیل میں ہے ؎

حکم قرآں چار ہیں اے نوجواں　　کان رکھ کر اسکو سن اے مہرباں

فرض حق میں گرم رکھنا آپ کو　　ویسے ہی رکھنا ہے خوش ماں باپ کو

تیسرے شیطان سے ہے حکم جہاد　　پھر کوئی ان سے جو ہیں نامراد[2]

چشمۂ فیض کے سارے بیانات کی خوبی ان کا سلجھا اور آسان انداز ہے۔ فیض نے بڑی خوبی اور صفائی سے پندنامے کے مضامین کو صاف اور سادہ اردو میں نظم کیا ہے۔ زبان کی سادگی اور صفائی کے باعث مضامین ذہن و دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔

---

[1] چشمۂ فیض (ق۔ن) میر معین الدین فیض ورق ۱۰۔

[2] " " (") " " " ورق ۲۰۔

۵۲

دی ہندی مورل پری سپٹر

(THE HINDEE MORL PRECEPTOR)

گل کرسٹ

گل کرسٹ کی ہندی مورل پری سپٹر (اتالیق ہندی) تاریخ ادب اردو کے مؤلفین کیلئے آج تک بڑی غلط فہمیوں کا سبب بنی ہوئی ہے۔ صاحب ارباب نثر اردو لکھتے ہیں:۔

"اس میں ایسے سلیس اور آسان مضامین کالج کے مختلف اہل قلم سے لکھوا کر جمع کئے گئے ہیں جن کے مطالعہ سے اردو نوشت وخواند آسانی سے سیکھ لی جا سکتی ہے اور اسکا مقصد فارسی سیکھنے والوں میں ابتدائی استعداد پیدا کرنا ہے۔ مضامین کے سلسلے میں فارسی صرف و نحو کے ابتدائی مسائل پر بھی بحث کی ہے اور فارسی کے بعض سلیس مضامین کے اردو ترجمے بھی شامل کئے گئے ہیں۔"[1]

حامد حسن قادری لکھتے ہیں:۔

"اتالیق ہندی فارسی کی کتاب ہے۔"[2]

---

[1] ارباب نثر اردو۔ سید محمد ص ۱۳۱۔ [2] داستان تاریخ اردو۔ حامد حسن قادری ص ۱۱۱۔

عتیق صدیقی نے لکھا ہے :-

"ہندوستانی شعبے کے منشیوں نے یہ کتاب ان لوگوں کی رہنمائی کیلئے لکھی تھی جو فارسی و ہندوستانی میں سے صرف ایک زبان جانتے تھے اور دونوں زبانیں جاننا چاہتے تھے۔ گل کرسٹ کی حیثیت صرف مرتب کی تھی"[1]

مندرجہ بالا تمام بیانات قیاس آرائیوں کے سوا اور کچھ نہیں۔

گل کرسٹ کی دی ہندی مورل پری سپٹر کا ایک نسخہ نیشنل لائبریری (کلکتہ) میں محفوظ ہے۔ اس میں گل کرسٹ کا ایک طویل دیباچہ بھی موجود ہے۔ جس سے علم ہوتا ہے کہ گل کرسٹ نے پندنامہ سعدی کا ترجمہ انگریزی نظم میں کیا تھا اور اس کتاب میں مسٹر گلیڈون (GLADWIN) کا کیا ہوا پندنامہ سعدی کا نثری ترجمہ بھی شامل کر دیا تھا۔ اس ترجمے کے لئے شعبے کے دوسرے منشیوں نے مترجمین کی مدد کی تھی۔ گل کرسٹ لکھتے ہیں :-

"............The reader will now be presented with Mr. Gladwin's faithful picture of Sadee, in the English dress including a paraphrase of the whole, in heroic verse by myself."[2]

آگے چل کر گل کرسٹ نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ انگریزی نظم میں ان سے پہلے کسی اور نے پندنامہ سعدی کا ترجمہ پیش نہیں کیا ہے۔ اس کتاب کے اخیر میں مظہر علی خاں ولا کا پندنامہ سعدی کا ترجمہ بھی شامل

---

[1] گل کرسٹ اور اسکا عہد ۔ عتیق صدیقی ص ۱۹۲۔

[2] Preface, The Hindee Moral Preceptor by Gilchrist, P 8,9

ہے۔ جس کے ایک جانب سعدی کے فارسی اشعار ہیں اور دوسری جانب ولا کے ترجمے کے اردو اشعار۔ یہ حصہ کتاب کے ۹۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ولا کا ترجمہ وہی ہے جو باغ اردو میں شامل ہے۔

جاوید نہال صاحب نے یہ کتاب دیکھی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ "اتالیق ہندی کا ترجمہ گل کرسٹ نے خود انگریزی اور ہندوستانی میں کیا تھا۔ اشعار اور قطعات کے ترجمے میں اسنے منشی مظہر علی خاں ولا سے مدد ضرور لی تھی۔ ولا کے علاوہ کالج کونسل کے دوسرے منشیوں نے بھی گل کرسٹ کی معاونت کی تھی"۔[1]

لیکن گل کرسٹ نے اس طرح کا کوئی دعویٰ نہیں کیا ہے۔ دیباچے میں وہ صرف انگریزی منظوم ترجمہ کرنے کا ذکر کرتا ہے۔ اردو نظم میں ولا نے ہی ترجمہ کیا ہے۔

تھامس روبک بھی تھوڑی بہت غلط فہمی کا شکار ہیں۔ انہوں نے ترجمہ، ترتیب اور تنظیم کا سہرا مکمل طور سے شعبۂ ہندوستانی کے منشیوں کے سر باندھ دیا ہے۔ گل کرسٹ کو صرف نگراں بتایا ہے۔[2]

یہ کتاب ۱۸۰۲ء میں کلکتے سے شائع ہوئی۔[3] انالس آف دی کالج آف فورٹ ولیم میں غالباً پرنٹ کی غلطی سے اتالیق ہندی کا سنہ طباعت ۱۸۰۳ء شائع ہو گیا ہے۔[4]

---

[1] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب۔ جاوید نہال ص ۔۔

[2] Annals of the College of F. W. Appendix II P. 21

[3] Linguistic Survey of India Vol. IX Part I, P. 17

[4] Annals of the College of F. W. Appendix II P. 21

۵۳

ترجمۂ پندنامۂ منظوم

مظہر علی خاں ولاؔ

مظہر علی خاں ولاؔ نے سعدیؔ کے پند نامہ کا ترجمہ ۱۸۰۲ء میں کیا اور یہی نام رکھا۔ انہوں نے یہ ترجمہ ہربرٹ ہارنگٹن کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے کیا تھا۔ چنانچہ وہ جہانگیر شاہی کے دیباچے میں لکھتے ہیں:-

"........... مسٹر ہارنگٹن دام حشمتہ کی نذر کے لئے پندنامہ سعدیؔ شیرازی کا ترجمہ زبان اردو میں شعر کا شعر کیا چنانچہ ہزار جلد اس کی چھاپی گئی۔ پانسی گلستان ہندی کے ساتھ اور پانسی علیحدہ"[۱]

ولاؔ کا یہ پندنامہ باغ اردو کی جلد دوم (مطبوعہ ۱۸۰۲ء) اور گلکرسٹ کی "اتالیق ہندی" (THE HINDEE MORAL PRECEPTOR) مطبوعہ ۱۸۰۳ء میں بھی شامل ہے۔ ترجمہ پندنامہ ۱۸۰۳ء میں علیحدہ بھی شائع ہوگئی تھی۔ اس میں ۵۳ صفحات تھے۔ گلکرسٹ کی ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں یہ شامل ہے اس پر سو روپے انعام کی تجویز تھی۔[۲]

---

۱ دیباچہ جہانگیر شاہی (ق۔ن) مظہر علی خاں ولاؔ ورق ۱۰، ۱۱ -

۲ Proceedings of the College of F. W. Vol. 559, P. 275

زیر نظر پند نامہ باغ اردو کے ساتھ شامل ہے جس کے اختتام پر مندرجہ ذیل قطعہ درج ہے۔ جس سے پند نامہ کا سنہ ترجمہ ۱۸۰۲ء برآمد ہوتا ہے ؎

کریما کا جب ترجمہ کر چکا — تو مجھ سے مری طبع نے یہ کہا

کہ تاریخ کہہ ’یادگارانہ طور‘ — سن عیسوی کے مطابق بغور

اسی فکر میں تھا کہ آئی ندا — ہوا ترجمہ نظم میں یہ ولا[1]
۱۸۰۲ء

ولا نے پند نامہ کا بڑا کامیاب ترجمہ کیا ہے۔ ان کی زبان بے حد سادہ، آسان اور رواں ہے۔ یہ مثال ملاحظہ ہو :-

مرے حال پر کر تو بخشش خدا — کہ ہوں میں گرفتار حرص و ہوا

نہیں ہے ہمیں دادرس تجھ سوا — تو ہی بخشدے عاصیوں کی خطا

گنہ سے مجھے باز رکھ اے خدا — گنہ بخش اور راہ نیکی دکھا

زباں کو دہن بیچ جب تک ہے جا — ہے مقبول دل کو نبی کی ثنا[2]

۵۴

رام چرت

سدل مشر

سدل مشر نے ۱۸۰۶ء میں سنسکرت کی ’ادھیاتم رامائن‘ کا ترجمہ ’رام چرت‘ کے نام سے

---

[1] [2] باغ اردو (دوسری جلد مطبوعہ ۱۹۶۳ء) مظہر علی خاں ولا ص ۵، ۲۲۲۔

کیا۔ یہ ترجمہ کھڑی بولی میں تھا۔ "رام چرت" سنہ ۱۸۱۱ء میں سنسکرت پریس میں طبع ہوئی۔[۱] اس کا مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔ سنہ ۱۸۱۳ء میں رام چرت کو بھی دیگر کتابوں کے ساتھ فورٹ سینٹ جارج کالج کے طلباء کے لئے بھیجا گیا تھا۔

رام چرت سات ابواب یا کانڈ پر مشتمل ہے۔ ہر باب چند ذیلی ابواب کا بھی حامل ہے۔ مثلاً بال کانڈ (نو ابواب)، ایودھیا کانڈ (نو ابواب)، سندر کانڈ (پانچ ابواب)، لنکا کانڈ (چھ ابواب) اور اتر کانڈ (آٹھ ابواب)۔[۲]

مندرجہ ذیل اقتباس سے رام چرت کے انداز بیان پر روشنی پڑتی ہے:۔

" اتنی کتھا کہہ پھر مہادیو بولے کہ نارد منی کے جاتے ہی راجہ دشرتھ ایکانت میں جو بیٹھے تھے۔ سو اپنے کل کے آچاریہ وششٹھ گرو کو بلا کر کہنے لگے مہاراج اس نگر کے لوگن سمیت بڑے بڑے مہاجن او وشیش میرے پراڑے منتری سب بار بار رام کی بہت بڑائی کرتے ہیں تس سے سب گرو بھرے کمل نین شری رام چندر کو میں راجیہ کا تلک دیا چاہتا ہوں "[۳]

سدل مشر کو ۱۷ مئی سنہ ۱۸۰۶ء کی کالج کونسل کی کارروائی میں اس ترجمے پر سو روپیہ دینا منظور کیا گیا

۱۔ Annals of the College of F. W. Appendix P. 29

۲۔ The Development of Hindi Prose Literature In The Early Nineteenth Century P. 74

۳۔ رام چرت۔ سدل مشر ص ۴۔ بحوالہ The Development of Hindi Prose Literature

" इतनी कथा कह फिर महादेव बोले कि नारद मुनि के जात ही

(بقیہ حاشیہ آگے صفحہ پر)

(۵۵)

پرش پریچھا

تارنی چرن متر

تارنی چرن متر نے سنسکرت کی "پرش، پریچھا" کا ترجمہ اسی نام سے ہندوستانی زبان میں کیا تھا۔ اس میں ہندوؤں کی اخلاقی کہانیاں مذکور تھیں۔ تارنی چرن متر یہ ترجمہ کالج کونسل کو پیش کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں ولیم ٹیلر نے کالج کونسل کے سکریٹری کے نام ایک خط بھی لکھا تھا کہ انہیں شعبۂ ہندوستانی کے لئے ایک درسی کتاب کی ضرورت ہے۔ ۲۵؍جون ۱۸۱۳ء کو گورنمنٹ نے تارنی چرن متر کی تجویز منظور کرلی۔[1] اور ۷؍مارچ ۱۸۱۵ء کو کالج کونسل نے پرش پریچھا کی سو کاپیوں کی خریداری کیلئے آٹھ سو نوے روپے آٹھ آنے کا بل بھی منظور کر دیا۔[2] غالباً اس وقت تک یہ چھپ نہ سکی تھی۔

राजा दशरथ ओकान्त में जो बैठे थे सो अपने कुल के आचार्य वशिष्ठ गुरु को बुलाकर कहने लगे महाराज इस नगर के लोगन समेत बड़े बड़े महाजन ओ विशेष मेरे पुराण मन्त्री सब बार बार राम को बहुत बड़ाई करते हैं तिस से सब गुण और कमल नयन श्री राम चन्द्र को कल में राज्य का तिलक दिया चाहता हूं।"

[1] [2] فورٹ ولیم کالج (ہندی)، لکشمی ساگر وارشنے ص ۱۰۵، ۱۰۹۔

پرش پریچھا کے متعلق تھامس روبک نے لکھا ہے :-

"پرش پریچھا۔ یا انسان کی پرکھ۔ جو ہندوؤں کے اخلاقی اصول پر مشتمل ہے۔ یہ سنسکرت کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ ہندوستانی زبان کی ایسی بولی میں ہے جو ہندوستان کے UPPER PROVINCES کے ہندوؤں میں عام طور پر بولی جاتی ہے۔ یہ ترجمہ شعبۂ ہندوستانی کے ہیڈ منشی تارنی چرن مترنے کیا ہے۔"[1]

اس کے بارے میں مزید تفصیلات دستیاب نہیں۔

۵۶

رسالہ کائنات جو

خلیل علی خاں اشک

اشک نے "رسالہ کائنات جو" اوّل اوّل گل کرسٹ کے ایما پر اپنے مربی ہربرٹ ہارنگٹن کے لئے ۱۸۰۲ء/۱۲۱۷ھ میں اردو میں تصنیف کیا۔ وہ دیباچے میں لکھتے ہیں :-

"احقر العباد خلیل علی خاں نے جسکا تخلص اشک مشہور ہے۔ عصر میں شاہ عالم بادشاہ خلد اللہ ملکہ کے اور وقت میں .... مارکوئس ولزلی بہادر گورنر جنرل .... کے" یہ رسالہ کائنات جو کا سن ہجری بارہ سے سترہ

---

[1] Annals of the College of F.W. Appendix A, P. 420

(۱۲۱۷ھ) میں مطابق اٹھارہ سو دو عیسوی (۱۸۰۲ء) کے زبان ریختے میں بموجب مسٹر جان گل کرسٹ صاحب دام دولتہ، کی مصلحت کے، واسطے اس نشان سخا کے کہ.......... مسٹر ہربرٹ ہارنگٹین صاحب عالی جاہ کہ ہر بلند اختر سے جسکا پاتے قدر عالی و برتر ہے، تصنیف کیا۔ اور اختصار کیا اسے دس فصل پر۔"[1]

اشک نے رسالۂ کائنات کی جانب "انتخاب سلطانیہ" کے دیباچے میں بھی اشارہ کیا ہے۔ "قصہ رضوان شاہ" کی طرح یہ رسالہ بھی اشک نے مارونٹ رکٹس کو پیش کیا تھا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں رسالہ کائنات کا جو نسخہ ملا ہے۔ اسے اشک نے ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء میں مارونٹ رکٹس کے لئے تیار کیا تھا۔ چنانچہ اس نسخے کے آغاز میں ایک صفحہ پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

"رسالۂ کائنات جو۔ تصنیف خلیل علی خاں اشک کا۔ مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ کے عصر میں مدرسۂ جدید کی خاطر لکھا گیا۔ واسطے صاحب والا ہمت عالی شان مارونٹ رکٹس صاحب دام دولتہٗ کے سنہ ہجری بارہ سے انیس[۱۲۱۹] میں مطابق اٹھارہ سو چار عیسوی کے۔ قطعہ

صاحب جود مارونٹ رکٹس فیض سے جسکے اک جہاں ہے شاد
کس طرح سے نہ رہے نہ زیر نگیں اس کے ہر ملک، دل سدا آباد"[2]

گل کرسٹ کی ۱۹ راگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست سے یہ علم ہوتا ہے کہ اسوقت رسالۂ کائنات طبع ہو چکا تھا اس میں کل سو صفحات تھے۔ گل کرسٹ نے ساٹھ روپے

---

[1] دیباچہ رسالۂ کائنات۔ (مطبوعہ) خلیل علی خاں اشک مرتبہ عبادت بریلوی ص ۲۵-۲۷۔ [2] رسالۂ کائنات (مطبوعہ) آغاز

انعام کی رقم تجویز کی تھی[1]۔ لیکن کالج کونسل نے اس فہرست پر غور کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ راقم الحروف کو رسالۂ کائنات کا کوئی قلمی یا اس زمانے کا مطبوعہ نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اسے مقدمے کے ساتھ ۱۹۶۵ء میں پاکستان سے شائع کر دیا ہے۔

اشکؔ کی یہ تصنیف اس لحاظ سے کافی اہمیت کی حامل ہے کہ غالبًا اردو میں سائنس کے موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے۔ دیباچۂ مصنف یا کسی اور ذریعے سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اشکؔ کی اس زبردست معلومات کا ماخذ کیا ہے۔ اشکؔ نے یہ رسالہ دس فصلوں پر منقسم کیا ہے۔ پہلی فصل میں وہ جَوّ اور کائنات جو کے بارے میں وضاحت کرتے ہیں:۔

"جو نام ہے بیچ کا زمین و آسمان کے یعنی یہ جو زمین سے آسمان تک وسعت ہے اسکو جو کہتے ہیں۔ اور کائنات جو اٹھارہ چیز ہے مثل ابر و باراں، برف و ژالہ، و میغ و شبنم و پشک و رعد و برق و صاعقہ۔ یہ سب کرۂ زمہریر سے حاصل ہوتے ہیں اور ریاحات و اعصار و قوس و قزح و ہالۂ ماہ اور تفاوہ آفتاب۔ یہ تمام طبقہ ہوائے گرم، وہ جو تلے ہے کرۂ زمہریر کے۔ اس سے اور شہاب ثاقب و ذوات الاذناب اور حریق طبقۂ ہوائی مجاور النار سے جو اوپر ہے، کرۂ زمہریر کے ظاہر ہوتے ہیں۔"[2]

چنانچہ دوسری فصل میں ابر و باراں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح بقیہ فصلوں میں تمام عناصر کائنات کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔

---

[1] Proceedings of the College of F.W. Vol. 559, P. 278

[2] رسالۂ کائنات (مطبوعہ) خلیل علی خاں اشکؔ ص ۲، ۲۸۔

رسالہ کائنات کی زبان نہایت عمدہ اور فصیح ہے۔ موضوع کے لحاظ سے انداز بیان عالمانہ ہے۔ بے پناہ اصطلاحوں کا استعمال اشک کی قابلیت اور زبان دانی کی تصدیق کرتا ہے۔ سائنس جیسے خالص علمی موضوع پر اس سے بہتر زبان کا استعمال شاید آج بھی ممکن نہیں۔

۵۷

خوان نعمت (خوان الوان)

سید حمید الدین بہاری

سید حمید الدین بہاری نے گل کرسٹ کی فرمائش پر کھانوں کے اقسام کی کتاب "خوان الوان" کا "خوان نعمت" کے نام سے ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ چوبیس خوانوں پر مشتمل ہے۔ اس سلسلے میں حمید الدین کا بیان یوں ہے:۔

"سید حمید الدین بہاری نے...... گل کرسٹ کے حکم سے خوان الوان نام کتاب کا کہ کھانوں کے اقسام میں ہے ترجمہ کیا۔ اس ترتیب سے کباب کی جگہ خوان نام لکھ کر چوبیس خوان مقرر کیے۔ اس تفصیل سے کہ لکھتا ہوں پہلا خوان روٹیوں کی بحث میں۔ دوسرا خوان آش کی بحث میں...... چوبیسواں خوان اصطلاحوں میں اور نام اسکا خوان نعمت رکھا۔"[1]

---

[1] دیباچہ خوان نعمت (ق.ن) سید حمید الدین بہاری ورق ۲۔

کالج کونسل کی کارروائیوں میں خوان نعمت کا نام "خوان الوان" ہی درج ہے۔ یہ ۱۸۰۲ء[1] میں طبع ہوگئی تھی۔ اس میں ۱۶۰ صفحات تھے[2]۔ جاوید نہال نے اسے غیر مطبوعہ قرار دیا ہے یہ درست نہیں[3]۔ خوان نعمت کا کوئی مطبوعہ نسخہ دستیاب نہ ہوسکا۔ اسکا نامکمل قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے۔ اس میں کل نوے (۹۰) صفحات ہیں۔ آغاز میں کالج کی مہر ثبت ہے۔ اور چوبیسویں خوان کے عنوان پر ہی یہ نسخہ ختم ہوجاتا ہے۔ گل کرسٹ نے ۱۹ اگست ۱۸۰۲ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں اس پر اسی روپے انعام کی سفارش کی تھی[3] لیکن کالج کونسل نے اس فہرست پر غور کرنے سے انکار کردیا تھا۔ عتیق صدیقی نے خوان نعمت پر انعام کی رقم سو روپے درج کی ہے جو غلط ہے[4]۔

خوان نعمت میں کھانوں کی مختلف قسموں کا ذکر ہے۔ اس میں خواص کے شان وشوکت اور اہتمام والے کھانے بھی ہیں۔ (مثلاً قلیہ، دم پخت، زیر بریاں، کباب اور حلوہ وغیرہ) اور روزمرہ کے عام لوگوں کے مزاج کے کھانے بھی (مثلاً بھرتہ، کھچڑی، کھجور، گلگلے اور رایتہ وغیرہ)۔ ان کھانوں کے نسخوں کی طوالت سے اندازہ ہوتا ہے کہ صاحبانِ حیثیت کس قدر اہتمام کیا کرتے تھے۔ مثلاً دم پخت پکانے کی ترتیب اس طرح درج کی گئی ہے:۔

"مرغ ایک عدد، گوشت پاؤ سیر، چاول سیر بھر، گھی تین پاؤ، دارچینی تین ماشا، لونگ اور الائچی تین ماشا، گول مرچ تین ماشا، زعفران ایک ماشا، دہی پاؤ سیر، پیاز پاؤ سیر،

---

[1] Proceedings of the College of F.W. Vol. 559, P. 278

[2] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب۔ ص ۲۵۷۔

[3] Proceedings of the College of F.W. Vol. 559, P. 278

[4] گل کرسٹ اور اسکا عہد۔ عتیق صدیقی ص ۱۷۱۔

ادرک ایک تولا، نمک تین تولا، دھنیاں ایک تولا، کشمش آدھ پاؤ۔ گوشت کا قیما
کرکے گھی پیاز بھونے ہوئے میں بگھارے۔ نمک اور دھنے کا شیرا دے کے بھونے
کے بعد اسکے قیما اور ادرک اور دھنیاں ملاکر مرغ کے پیٹ میں بھرے تاگے سے
باندھ کر دہی اور زعفران اور مصالا مل کے گھی میں پانی دے دے کر بریاں
کرے یہاں تک کہ گل جاوے۔ جب گھی پر رہے تب موقوف کرے۔ چاول کو دار چینی،
لونگ اور الائچی دے کر ابالے جب چوتھا (کذا) کا کچا رہے تب پساکر دوسرے
دیگچے میں تہ لگاکے دم دیوے۔[1]

خوان نعمت میں آخری ذکر ماش کی دال پکانے کا ہے۔

حمیدالدین نے کھانوں کی ترکیب کے اس ترجمے میں وضاحت سے کام لیا ہے۔ یہ کوئی ادبی یا
علمی کتاب تو تھی نہیں کہ وہ اس میں سادگی اور سلاست کے جوہر دکھاتے لیکن اپنے موضوع میں انہوں
نے جیسا انداز بیان اختیار کیا ہے وہ سادگی اور صفائی کے زمرے میں ہی آتا ہے۔ کہیں کہیں انہوں نے
پرانے الفاظ اور پرانا انداز اختیار کیا ہے۔

---

[1] خوان نعمت (ق۔ن) سید حمیدالدین بہاری ورق ۳۲۔

(ج)

تاریخ اور تذکرے

۵۸

انتخاب سُلطانیہ

خلیل علی خاں اشکؔ

اشکؔ نے ۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۵ء میں مسٹر مارونٹ رکٹس کی فرمائش پر انتخاب سلطانیہ تالیف کی تھی۔

انتخاب سلطانیہ تاریخی نام ہے۔ اشکؔ دیباچے میں لکھتے ہیں :-

"........اب سن ہجری بارہ سے انیس میں مطابق اٹھارہ (سو) پانچ عیسوی کے فرمایش سے............مسٹر مارونٹ رکٹس صاحب بلند اختر کے واسطے مدرسہ جدید کے اس تاریخ کو لکھا۔ چنانچہ صاحب عالی قدر کی یہ فرمائش تھی کہ ابتداے بنیاد دلی سے سن حال تک شاہ عالم کے شہر مذکور میں کتنے بادشاہ ہوئے اس احوال کو لکھو سو احقر نے یہ کتاب لکھی اور نام اسی طور پر اس کا انتخاب سلطانیہ رکھا کیوں کہ تاریخ بھی اسکی یہی پائی۔"[1]

انتخاب سلطانیہ غیر مطبوعہ ہے۔ اسکا ۱۵۲ اوراق کو محیط خستہ قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے۔ اسکے ہر صفحہ پر ۹ سطور مندرج ہیں۔ اور اختتام پر کالج کی مہر ثبت ہے۔ اشکؔ کو کالج کونسل نے قصہ رضوان شاہ اور انتخاب سلطانیہ پر کل ملا کر ستر روپیہ بطور انعام

---

[1] دیباچہ انتخاب سلطانیہ (ق۔ن) خلیل علی خاں اشک ورق ۱۸ تا ۲۰۔

عطا کیا تھا۔[1]

اشک کے بیان کے مطابق انتخاب سلطانیہ میں دلی کی بنیاد سے لے کر شاہ عالم بادشاہ تک کے شاہوں کا حال مذکور ہے۔ چنانچہ انتخاب سلطانیہ کا آغاز کرتے ہوئے دلی کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہیں:-

"ابتدائے مطلب اب احوال کو تاریخ کے لکھتا ہوں۔ اکبر نامے میں مرقوم ہے کہ دلی قدیم سے بڑی بستی ہے ابتدا میں نام اسکا اندرپت تھا بکرماجیت کے سن چار سو انتیس میں انیک پال راجا نے کہ قوم تونور سے تھا اپنی حکومت میں اسے آباد کیا اور دلی نام رکھا۔"[2]

اس ذکر کے بعد انتخاب سلطانیہ میں اڑتالیس جلوس مندرج ہیں۔ پہلا جلوس سلطان معزالدین شام کا ہے۔ اسکی ہندوستان میں آمد، فتح، نظم ونسق کی درستگی، غلام قطب الدین ایبک کو اپنا قائم مقام مقرر کرنا پھر اس کی غزنیں کو واپسی وغیرہ کے حالات بیان ہیں۔ دوسرا جلوس سلطان قطب الدین ایبک سے متعلق ہے۔ اس کے بعد غلام، خلجی، تغلق، لودھی، پٹھان اور مغل بادشاہوں کے تاریخی حالات و واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ اشک نے ان تمام بیانات میں تاریخی ترتیب کا لحاظ رکھا ہے۔ انہوں نے اکثر بادشاہوں کے ذکر میں سنہ بھی درج کئے ہیں۔ جو بیشتر درست ہیں۔ کہیں کہیں اشک نے تاریخ کی مشہور کتابوں کے حوالے سے بھی واقعات بیان کئے ہیں۔

انتخاب سلطانیہ ہندوستان کے بادشاہوں کی مختصر مگر جامع تاریخ ہے۔ اشک نے ہر بادشاہ کے ذیل میں اجمال سے اہم واقعات کو درج کیا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر چھوٹے چھوٹے واقعات، بادشاہو نکے

---

[1] فورٹ ولیم کالج (ہندی) لکشمی ساگر وارشنے ص ۵۰۔

[2] انتخاب سلطانیہ (ق ن) خلیل علی خاں اشک ورق ۲۱۔

عادات واطوار، سیاسی حکمت عملی، دانش مندی اور تدبر وغیرہ کی جانب بھی اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ سلطان محمد عادل مبارز خاں کے ذیل میں اسکی موسیقی سے واقفیت کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"یہ بادشاہ گانے اور بجانے میں کمال رکھتا تھا اور فن موسیقی میں میاں تان سین کا شاگرد تھا کہ اس علم کو اسے حاصل کیا تھا۔"[1]

اس کے کردار کے متعلق درج ہے کہ:۔

"........ چنانچہ سلطان محمد عادل کمال عیاش تھا اور امور سلطنت سے غفلت کرکے لہو لعب میں ہمیشہ رہتا تھا"[2]

دوسرے بادشاہوں کی بہ نسبت مغل حکمرانوں کے بیان میں تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔ اور اشک نے ان کے شایان شان انداز بیان بھی اختیار کیا ہے۔ جس سے انکی عظمت اور شوکت کے مرقعے نگاہوں میں پھر جاتے ہیں۔ انتخاب سلطانیہ کا سب سے آخری بیان شاہ عالم بادشاہ سے متعلق ہے۔ اور اس میں اشک نے اختصار سے کام لیا ہے:۔

"شاہ عالم بادشاہ سن ہجری گیارہ سی تہتر میں تخت سلطنت پر رونق افزا ہوئے۔ جیسے اب ملک انھی کی سلطنت ہے۔ احوال اس بادشاہ کا اس واسطے نہ لکھا کہ وضیع و شریف پر ظاہر ہے۔"[3]

انتخاب سلطانیہ اس لحاظ سے بھی کافی اہمیت کی حامل ہے کہ اس کے دیباچے میں مصنف اپنی زندگی کے حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ جس سے اسکے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں

---

[1] انتخاب سلطانیہ (ق۔ن) خلیل علی خاں اشک ورق ۹۶۔

[2،3] " " (") " " " ورق ۹۶، ۱۵۳۔

اس طرح محققین بہت سی بے جا قیاس آرائیوں سے نجات پا گئے۔

اشک نے انتخاب سلطانیہ میں سادہ اور رنگین دونوں طرح کے اسلوب کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ بعض بادشاہوں کے واقعات بہت ہی سادہ اور آسان انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اور بعض کے ذیل میں انہوں نے شوکت الفاظ اور مشکل تراکیب کا التزام کیا ہے۔ اکبر بادشاہ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"جس سال کہ یہ فرخندہ افعال تحت سلطنت پر بیٹھا۔ اسی سال میں دلی اور آگرے سے خبر پہنچی کہ ہیموں لشکر گران اور فوج بے حد اپنے ساتھ لئے ہوئے دلی میں داخل ہوا۔ چنانچہ سن ہجری نو سو چوسٹھ میں عاشورے کے دن نزدیک پانی پت کے جہان موکب عالی تھا آیا اور حضرت جہاں پناہ سے لڑا لیکن شکست فاش کھائی۔"[1]

انتخاب سلطانیہ کا عام اسلوب آسان اور سادہ ہے۔ اس اسلوب کی سب سے بڑی خوبی اس کی لطافت ہے۔

لیکن انتخاب سلطانیہ کے اسلوب میں روانی کا فقدان ہے۔ اس میں جا بجا قواعد کی خامیاں ہیں۔ اشک نے کہیں کہیں مقامی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ اور کہیں کہیں وہ واقعات کے درمیان میں فارسی کے اشعار بھی درج کرتے ہیں۔ یہ اشعار دوسرے شعراء کے ہیں۔

---

[1] انتخاب سلطانیہ (ق۔ن) خلیل علی خاں اشک ورق ۱۰۴۔

۵۹

کتاب واقعات اکبر

خلیل علی خاں اشک

خلیل علی خاں نے ابوالفضل بن مبارک کی فارسی تاریخ "اکبر نامہ" کا ترجمہ ۱۸۰۹ء مطابق ۱۲۲۴ھ میں "کتاب واقعات اکبر"[1] کے نام سے کیا۔ یہ اکبر نامہ کا ہو بہو ترجمہ نہیں ہے بلکہ اشک نے قطع و برید سے کام لیا ہے۔ "کتاب واقعات اکبر" کے دیباچے میں اشک بیان کرتے ہیں:۔

"محمد خلیل علی خاں نے جس کا تخلص اشک ہے سن ہجری بارہ سی چوبیس میں مطابق اٹھارہ سو نو عیسوی کے عصر میں سلطان محمد اکبر بادشاہ غازی....... کے اور وقت میں............ لارڈ منٹو گورنر جنرل.......... کے جن دنوں میں........... مسٹر کپتان ٹیلر صاحب دام ظلہ نے اپنے نسیم قدیم سے گلستان مدرسہ کو گلہائے معنی سے زینت دی اور........ حکومت میں .... ڈاکٹر ولیم ہنٹر دام اقبال کی اکبر نامہ جو تصنیف کیا ہوا ابوالفضل بن مبارک کا ہے زبان اردو میں موافق محاورے کے ترجمہ کیا۔ اور نام اس کا کتاب واقعات[2] اکبر رکھا کیوں کہ تاریخ بھی اس کی یہی ہے لیکن دیباچہ کو اسکے

---

[1] قلمی نسخے کے سرورق پر "واقعات اکبری" درج ہے۔ [2] "کتاب واقعات اکبر" سے ۱۲۲۴ھ برآمد ہوتا ہے۔

موقوف کرکے ابتدائے پیدائش سے جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کی لکھا۔ ازبسکہ

قید ترجمے کی بھی بہت سی کی ہے لیکن محاورے کو ہاتھ سے نہیں دیا اور بیشتر

اصطلاحیں اسکی رکھیں ہیں"۔[1]

کتاب واقعات اکبر غیر مطبوعہ ہے۔ ۴۸۱ اوراق کو محیط اسکا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف

بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے اور آغاز میں فورٹ ولیم کالج کی مہر ثبت ہے۔ کتاب واقعات اکبر

کے متعلق صاحب ارباب نثر اردو لکھتے ہیں :۔

"یہ بدقسمتی سے شائع نہیں ہوا۔ یورپ کے بڑے بڑے کتب خانوں میں بھی اسکے

قلمی نسخے یا مسودہ موجود نہیں ہیں اکبر نامہ جیسی مفید اور اہم کتاب ہے۔ اسکے

اظہار کی ضرورت نہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اشک کا یہ ترجمہ دست برد زمانہ سے

محفوظ ہے یا نہیں۔ اگر یہ کتاب دریافت وشائع ہو جائے تو ہماری تاریخ کے

سرمایہ میں ایک بیش قیمت اضافہ ہوگا"۔[2]

کتاب واقعات اکبر کا آغاز اکبر بادشاہ کی پیدائش کے ذکر سے ہوتا ہے۔ اسکے بعد مختلف

طرح کے زائچے کشیدہ ہیں اور انکی شرحیں بھی درج کی گئی ہیں۔ دیگر بیانات کے بعد حضرت آدمؑ

سے اکبر کے بزرگوں کا شجرہ درج کیا گیا ہے۔ اس کے بعد امیر تیمور، بابر اور ہمایوں کی حکومت، جنگی

مہموں اور فتوحات وغیرہ کا ذکر ہے۔ ہمایوں کے واقعات زیادہ تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ اسکی

ہر مہم اور غلبے کا ذکر موجود ہے۔ انہیں واقعات کے درمیان میں اکبر کے بعض واقعات اور (اکبر پر)

---

[1] دیباچہ کتاب واقعات اکبر (ق۔ن) خلیل علی خاں اشک ورق ۲،۳۔

[2] ارباب نثر اردو سید محمد ص ۲۶۷۔

ہمایوں کی بعض عنایات کا حال مندرج ہے۔ اس کے علاوہ اکبر کی غیبی توتوں کا بھی بیان ہے۔ ہمایوں کی وفات اور اکبر کی پنجاب کی مہم کے واقعات کے بعد کتاب واقعات اکبر کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

کتاب واقعات اکبر بادشاہ اکبر اور قبل کے بادشاہوں سے متعلق واقعات پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں تاریخ نویس نے جنگوں، سرکشیوں کے ہر بیان ہر واقعے اور جزئیات کو بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ کتاب واقعات اکبر سے صرف تاریخی حقائق ہی سامنے نہیں آتے بلکہ اس عہد کی سماجی اور سیاسی فضا و ماحول کا بھی علم ہوتا ہے۔ ہمایوں اور اکبر کے کردار و عادات و اطوار سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ مہموں اور جنگوں میں ان دونوں بادشاہوں کے تیور سے ان کی ثابت قدمی اور خود اعتمادی کا اندازہ ہوتا ہے۔

کتاب واقعات اکبر میں ترجمے پن کا انداز موجود ہے۔ حالانکہ اشک دیباچے میں لکھتے ہیں :۔

"زبان اردو میں موافق محاورے کے ترجمہ کیا.......... ازبسکہ قید ترجمے کی بھی بہت سی کی ہے لیکن محاورے کو ہاتھ سے نہیں دیا۔"[1]

لیکن واقعہ یہ ہے کہ کتاب واقعات اکبر کے اہم بیانات بے حد مرصع اور ثقیل انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ عربی و فارسی کے الفاظ سے گراں بار عبارتوں نے اصل واقعے کی صورت مسخ کر دی ہے۔ مثلاً اکبر کی پیدائش کا بیان ملاحظہ ہو :۔

"ذکر طالع ہونے کا سعد اکبر کے یعنے ولادت باسعادت کا حضرت شاہنشاہی ظل الہٰی کے.......... طالع ہونے کا نیّر اقبال کے مطلع سعادت سے یعنی نعت شاہنشاہی کے تولد کا ستہ مقدس حضرت عصمت قباب عفت نقاب پردہ نشین

---

[1] دیباچہ کتاب واقعات اکبر، ق. ن، خلیل علی خاں اشک، ورق ۳۔ ۲، کذا

سرادقات آسمانی حضرت مریم مکانی حمیدہ بانو بیگم ادام اللہ اقبالہ کے برکت ذات
سے پیشواے اولیاے کرام قطب الاقطاب عظام کمیت چالاک میدان ناسوت
شناور دریاے لاہوت کے"[1]

پوری کتاب میں جابجا ایسی عبارتیں بکھری پڑی ہیں۔ایک دوسرے بیان کا انداز ملاحظہ فرمائیں:۔

"ازبسکہ آثار بزرگی و فرمان روائی کے پیشانی نورانی سے اس نونہال نوبستان
سلطنت و گلدستہ بند حدیقۂ خلافت یعنے حضرت شاہنشاہی کی صغر سن
سے ہویدا تھی۔اس ایام سعادت فرجام میں سن شریف انحضرت کا دسویں
برس میں تھا"[2]

اشک نے اپنے بیان میں خود ہی لکھدیا ہےکہ "بیشتر اصطلاحیں اسکی رکھیں"۔ چنانچہ ان اصطلاحوں، ادق الفاظ اور ثقیل جملوں کی وجہ سے عبارت میں نہ تو روانی ہے اور نہ شگفتگی۔ خشک بے کیف اور ترجمے پن سے بوجھل اسلوب نے واقعات کی دلچسپی کو متاثر کیا ہے۔سادگی اور سلاست کے فقدان نے بیشتر بیانات کو بے روح بنادیا ہے۔جہاں جہاں اشک غیر شعوری طور پر ترجمہ کرنے کے احساس سے آزاد ہوگئے ہیں وہاں انھوں نے سادہ اور آسان انداز اپنایا ہے۔ان مقامات میں واقعات کی صحیح تصویر اجاگر ہوتی ہے۔یہ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"...........جبکہ سکندر خاں آگرے کی سرحد میں مستقل ہوا وہ بھی بہار اور
بنگالینگی[3] (کذا) طرف روانہ ہوا۔ اور خضر خاں بیٹا محمود خاں کا باپ کی جگہ

---

[1] کتاب واقعات اکبر (ق۔ن) خلیل علی خاں اشک ورق ۷۰ ب۔

[2] " " (") " " ورق ۲۲ ب۔ [3] غالباً بنگالے کی۔

قایم مقام ہوا۔ اور نام بزرگی کا اپنے اوپر مقرر کر کے سلطان جلال الدین مشہور ہوا۔ اور بند و بست بنگالے کا کرنے لگا۔ اور مبارز خاں وہیمو بنگالے کیطرف متوجہ ہو کر مخالفوں کے دفع کرنے میں مشغول ہوئے۔"[1]

زبان و بیان کا یہ انداز اگر پوری کتاب میں قائم رہتا تو کتاب واقعات اکبر زیادہ واضح اور دلچسپ ہو جاتی۔

---

(۶۰)

تاریخ نادری

حیدر بخش حیدری

تاریخ نادری منشی محمد مہدی کی فارسی تصنیف "تاریخ نادری" کا ترجمہ ہے۔ منشی محمد مہدی نادر شاہ کا وقائع نویس تھا۔ اس نے اپنی تاریخ کو "زبان فارسی و بعض ترکی لغات" سے تصنیف کیا تھا۔ حیدری نے ولیم ٹیلر کی فرمائش پر ۱۸۰۹ء مطابق ۱۲۲۴ھ میں اسی تاریخ نادری کو اردو میں منتقل کیا اور یہی نام برقرار رکھا۔ حیدری نے تاریخ نادری کے متعلق دیباچے میں یوں لکھا ہے:۔

"پس[2] معلوم کیا چاہیئے کہ منشی محمد مہدی جو نادر شاہ بادشاہ کے حضور پر نور سے خدمت وقایع نویسی رکھتا تھا اور تاریخ نادری کو اس نے زبان فارسی و بعض

---

[1] کتاب واقعات اکبر (ق۔ن) خلیل علی خاں اشک ورق ۵۲۳۔ [2] ص پس۔

لغات ترکی سے تصنیف کیا تھا اب اس کتاب کو سید حیدر بخش حیدری نے عہد حکومت

میں جناب عالی شان.......... لارڈ منٹو گورنر جنرل دام افضالہٗ اور فرمانے

سے........... ولیم ٹیلر صاحب دام اقبالہٗ کے سن بارہ سو چوبیس ہجری میں (۱۲۲۴)

مطابق اٹھارہ سو نو عیسوی کے زبان ہندی میں ترجمہ کیا۔ اور نام بھی اسکا وہی

رکھا چاہتا ہے کہ.......... جناب ولیم ہنٹر صاحب دام اقبالہٗ کے حضور فیض

گنجور میں لے جاوے۔ اسکی مہربانی و نوازش کے ابر نیسان درفشاں سے دامن

تمنا در و جواہر سے بھر لاوے"[۱]

حیدری کے اس ترجمے کو کھیم نرائن رند نے بہت پسند کیا تھا اور ایک قطعہ میں تعریف

ستائش کے علاوہ سن تاریخ کا شعر بھی شامل کیا تھا ؎

تاریخ نادری سے عدد نار کے نکال ہے سال اس کتاب کا تاریخ نادری[۲]

تاریخ نادری غیر مطبوعہ رہی۔ اسکا خوشخط اور ضخیم قلمی نسخہ ۵۹۴ اوراق پر مشتمل ہے۔

ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں محفوظ ہے۔ اس نسخے کے درمیان سے ۱۱۴ سے ۲۰۹ تک

کے اوراق غائب ہیں۔ جن میں ۲۷ بیانات شامل تھے۔ تاریخ نادری میں فہرست عنوانات شا

ہے۔ لیکن اس میں لاپرواہی کا ثبوت ملتا ہے۔ حیدری کو تاریخ نادری پر کالج کونسل نے تین

روپے بطور انعام عطا کئے تھے[۳]

تاریخ نادری کے آغاز میں بطور تمہید نادر شاہ کی تعریف و توصیف اور اسکے عہد حکومت

---

[۱] [۲] تاریخ نادری (ق-ن) حیدر بخش حیدری ورق ۳، ۴۶۴۔

[۳] فورٹ ولیم کالج (ہندی) لکشمی ساگر وارشنے ص ۱۰۴۔

قبل ایران اور اطراف و جوانب کے انتشار کا حال درج ہے۔ حیدری نے ان تمام عبارتوں کا جوں کا توں ترجمہ کر دیا ہے۔ چنانچہ ایران اور اطراف کا نقشہ خالص ادبی زبان میں اسطرح کھینچا گیا ہے :۔

"............ یہاں تک کہ ایراں کا سطح خاک جور و ستم کے خون سے گلگوں ہوگیا۔ عرصۂ دوراں میں ہر ایک سرکش اپنی سرکشی سے صاحب لوائی میں مشہور رہا چنانچہ کسی شاعر نے یہ شعر کہا ہے۔ شعر ؎

جفا و ظلم جب برہم زن ایراں ہوا پیدا | برائے انتقام افغان مظلوماں ہوا پیدا

تخت سروری پائمال دشمن ہوا۔ مخالفوں کی ظلم و ستم کی آتش سوزاں نے ہر ایک طرف کے تر و خشک کے خرمن کی ہستی کو شعلۂ جان ستاں سے جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ دہر میں ہر ایک جاگہ ہر ایک بادشاہ کہلایا۔ چنانچہ ہر ایک چھوٹے بڑے سے فتنہ و فساد وقوع میں آیا۔ قندھار سے لے کر اصفہان تک طایفۂ غلجۂ کا عمل ہوا" [1]

اس کے بعد آگے چل کر منشی محمد مہدی کی وضاحت کا ترجمہ بھی درج ہے :۔

"اس تخت و تاج کے زیب دینے والے اور فروغ بخشنے بارے کی شروع داستان کے پہلے جو کچھ کہ احوال واقع ہوا تھا اس میں سے قدرے قلیل واردات بیان کرنی ضرور تھی۔ اسلئے اس نادر نامے کا لکھنے والا اور تاریخ صدق حتات کا نقش بھرنے ہارا محمد مہدی جو حضور پر نور کے ملازموں میں سرفراز ہے اور وقایع نگاری میں بحال و ممتاز حضرت خاقان سعید شہید شاہ سلطان حسین کی سلطنت

---

[1] تاریخ نادری (ق۔ ن) حیدر بخش حیدری ورق ۴، ۵۔

وقت سے لیکر اس شاہنشاہ جم جاہ صاحب تائید کے شروع سن تک جو
واقع ہوا تھا من وعن اسکو ظاہر کرتا ہے اس واسطے کہ تمام عالم پر کھل جائے
کہ شہر ایران کیا مکان تھا اور وہ ممالک محروسہ کسقدر ویران ہو گیا تھا
جسے اس جناب فیض مآب نے اپنے عزم استوار کی معماری سے ویسے ویرانے
کو بات کرتے آباد کیا۔"[1]

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے جو کچھ نادرشاہ کے وقت سے پہلے گزرا تھا اس کے
بارے میں تفصیل سے پہلے سن جلوس تک نقل کر دیا ہے تاکہ کتاب پڑھنے والوں پر یہ واضح ہو جائے
کہ نادرشاہ نے کس قدر ویران سرزمین کو زیب و زینت سے آراستہ کیا۔

تاریخ نادری ایک سو تیرہ واقعات کے بیان پر مشتمل ہے۔ آغاز پہلی بار اعتدالی گرگین خاں
کی شورشت سے ہوتا ہے۔ درمیان میں ترتیب سے ساری شورشوں، جنگوں اور واقعات و
حالات کا مفصل بیان ہے۔ ان واقعات و حالات کا اہم حصہ نادرشاہ کا ذکر ہے۔ چنانچہ اس سے
متعلق ہر واقعے کو وقائع نویس نے ترتیب وار بیان کیا ہے۔ ان واقعات سے اس عہد کے ایران کی
سماجی اور معاشی تصویر بھی نمایاں ہوتی ہے۔

تاریخ نادری نادرشاہ کے حالات اور اس عہد کے ایران کی بہت مفصل اور ضخیم تاریخ ہے
اس میں نادرشاہ کی پیدائش، عقد، اولاد، تخت نشینی، جہانبانی، مبارزات، مہموں اور عادات و
اطوار وغیرہ کا ذکر بہت تفصیل سے ملتا ہے۔ تاریخ نادری سے اس زمانے کے ایران کی جو تصویر سامنے
آتی ہے اس سے علم ہوتا ہے کہ ایران میں سکون و اطمینان کا فقدان تھا۔ حکومت اور اقتدار کے لئے

---

[1] تاریخ نادری (ق.ن) حیدر بخش حیدری ورق ۶۔

سیاسی کشمکش عروج پر تھی۔ ارباب حل وعقد سازشوں اور طرح طرح کی ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔ ناآسودگی اور طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ اندرونی اور بیرونی طاقتیں سرکشی پر آمادہ تھیں۔ منشی محمد مہدی نے نادر شاہ کی بے انتہا تعریف وتوصیف کی ہے جس سے جانب داری کی بو آتی ہے۔ نادر شاہ ظالم جابر اور مطلق العنان حکمراں تھا لیکن مصنف نے بادشاہ کی کمزوریوں اور خامیوں پر پردہ ڈالنے یا اسکے بہیمانہ سلوک کے اثر کو کم کرنے کیلئے طرح طرح کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وقائع نویس نے نادر شاہ کے ظلم وستم کا حال اتنی خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ وہ اپنی تاثیر میں ظلم وبربریت کا کوئی ہولناک منظر پیش نہیں کرتے۔ ایک بیان ملاحظہ ہو:۔

"..........یہاں تک کہ حضرت ظل الٰہی کے ضمیر منیر میں عدل وانصاف کا نام ونشان نہ رہا۔ بے رحمی وبے مروتی نے گھر کیا۔ غرض ایسی ایسی باتیں، حرکتیں جو طبیعت انسان سے خارج ہوں حضرت ظل الٰہی سے وقوع میں آنے لگیں۔ مہر ومروت کے در بند کر کے باب الابواب کھولے یعنی ہر ایک غریب وغربا، ادنیٰ اعلیٰ سے حق وناحق پیسا طلب کیا اس طور سے کہ اپنے ممالک محروسہ کے حاکموں عاملوں کو محکمۂ حساب میں طلب فرماتے اور روز حساب سے نڈر ہوکر انکی عملداری واخذ وخیر کے ایام کا مواخذہ کرتے بدون اس بات کہ وہ غریب کچھ تقریر کرے یا کوئی دلیل قاطع گزرانے یا اپنے صدق وصفا کے لئے کوئی حجت لادے اُس کے پہلے سزا کو پہنچاتے بلکہ ان لوگوں کو بھی جو حضرت ظل الٰہی کے ممالک محروسہ میں دست وپا نہ رکھتے تھے اپنی جاگہ سے ہل بھی نہ سکتے تھے ہزاروں طرح کے عذاب وعقاب سے مارتے۔ گوشت سے ناخن جدا کرڈالتے۔ یہاں تک کہ

وہ سب بے گناہ بے دست وپا ہو کر دس دس بیس بیس ہزار کہ از روے حساب
ایک ہزار کے پانچ ہزار تومان ہوتے ہیں اپنے دست شکستہ سے لکھدیتے"[1]

دہلی پر نادر شاہ کے حملے اور اسکی لوٹ وغارت گری سے تاریخ کے صفحات پر ہیں لیکن منشی محمد مہدی
کتنی سہولت اور آسانی سے دہلی کی دولت لوٹنے کا حال بیان کرتے ہیں :-

"تمام زر وجواہر مال وخزانۂ بادشاہی اس دفینے سمیت جو سلف کے بادشاہوں
سلاطینوں کے وقت کا تھا تفصیل وار قلم بند کر کے حضور پر نور میں گزرانا. آئین نذر و
نیاز بخوبی تمام ادا کیا اگرچہ اس خدیو بے ہمال کی ہمت گان خاصیت بحر نوال کی
نظر اعتبار اس مال واموال پر کہ یہ تمام روے زمین کے بادشاہوں سلاطینوں کے
خزانے اور دفینے اسکے عشر عشیر کو نہ پہنچتے تھے نہ پڑی. لیکن اس بادشاہ والا
جاہ کی منت وسماجت سے اس نقش کی صورت آئینہ قبول میں نظر آئی کہ ارکانِ
دولت اس مال واسباب کے ضبط کرنے اور خزانے دفینے کے حیطۂ تصرف میں
لانے کی خاطر مقرر ہوئے"[2]

آخر کار نادر شاہ تمام جنگوں، مہموں، تباہی وبربادی کے بعد اپنے ہی محافظوں کے ہاتھوں قتل
کر دیا گیا. اس ذکر میں بھی مصنف کا ذاتی جذبہ نمایاں ہے.

تاریخ نادری میں حیدری نے زبان وبیان پر زیادہ توجہ نہیں کی ہے بلکہ انھوں نے فارسی
عبارتوں کا ویسے ہی ترجمہ کر دیا ہے. اس لئے بیشتر مقامات پر ترجمے کا رنگ اتنا گہرا ہے کہ اُردو

---

[1] تاریخ نادری (ق.ن) حیدر بخش حیدری ورق ۴۵۳، ۴۵۴-

[2] " " " (") " " ورق ۳۵۲-

اسلوب نگارش کی بجائے فارسی عبارت کا دھوکہ ہوتا ہے۔ زبان اتنی پیچیدہ، دقیق اور مشکل ہیکہ معنی و مطلب بھی آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے۔ جملے عبارت آرائیوں اور تراکیب سے بوجھل ہیں۔ فارسی اور عربی کے ادق الفاظ کی کثرت سے عبارتیں گنجلک ہوگئی ہیں۔ فارسی اسلوب کی تقلید میں جملے بہت لمبے ہوگئے ہیں۔ جن میں فاعل اور فعل کے درمیان عموماً بہت فاصلہ ہوتا ہے۔ ان میں نہ کوئی حسن ہے اور نہ کوئی خوبصورتی۔ درمیان میں کہیں کہیں حیدری نے سادہ زبان بھی استعمال کی ہے۔ جہاں یہ حصے نظر آتے ہیں وہاں واقعات میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن ایسی مثالیں کم ہیں۔ ورنہ بے کیف اور دقیق الفاظ سے گراں بار عبارتوں نے واقعات کی دلچسپی ختم کر ڈالی ہے۔ خاص طور سے نادرشاہ کی تعریف و توصیف والے حصوں میں زبان و بیان کا بے حد مشکل انداز سامنے آتا ہے۔

واقعات کے درمیان میں ابیات اور فرد وغیرہ بھی شامل ہیں۔ لیکن یہ بے ضرورت ہیں۔ ان سے عبارت میں کوئی حسن بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اخیر میں ترکی الفاظ کی فرہنگ شامل کی گئی ہے۔

۶۱

ترجمہ تاریخ شیر شاہی

مظہر علی خاں ولا

ولاؔ نے CAPT. MOUNT کی فرمائش پر عباس خاں لکھو رسروانی کی فارسی تاریخ تحفۂ اکبرشاہی کے تیسرے طبقہ کا ترجمہ "تاریخ شیر شاہی" کے نام سے اردو میں کیا۔ عباس خاں نے فارسی میں یہ تاریخ اکبر بادشاہ کی فرمائش پر لکھی تھی اور تیسرے طبقے میں ہمایوں بادشاہ اور

شیر شاہ وغیرہ کے حالات بیان کئے تھے۔ ولاؔ تاریخ شیر شاہی کے دیباچے میں سبب ترجمہ درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"مظہر علی خاں ولاؔ سبب ترجمہ بیان کرتا ہے کہ اس احقر کو......

.........کپتان جیمس موبٹ صاحب دام دولتہٗ نے ازراہ نوازش یوں ارشاد کیا کہ شیر شاہی کا ترجمہ زبان اردو میں کر جس طرح عباس خاں لکھو رسے وانی (کذا) نے بموجب حکم اشرف......... جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی کے کتاب تاریخ احوال میں حضرت ہمایوں بادشاہ........... اور شیر شاہ وغیرہ کے فارسی میں لکھی اس ہیچ مداں نے ترجمہ اسکا حسب الحکم صاحب ممدوح کے عصر میں........... مارکویس ولزلی گورنر جنرل........... کے شروع کیا لیکن ابتدائے عہد میں نواب والا جناب........... مارکویس کارنوالس گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ کے حسن انصرام کو پہنچایا۔"[1]

تاریخ شیر شاہی کے خاتمے کی عبارت سے علم ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ ۱۲۲۰ھ؍۱۸۰۵ء میں مکمل ہوا تھا:۔

"ترجمہ شیر شاہی کا پانچویں تاریخ جمادی الاول بعد از نماز جمعہ سن بارہ سے بیس ہجری مطابق دوسری ماہ اگست سنہ اٹھارہ سو پانچ عیسوی میں سرانجام ہوا بہ تمام"[2]

تاریخ شیر شاہی کا ۱۶۶ اوراق پر مشتمل خوشخط اور قدرے کرم خوردہ قلمی نسخہ ایشیاٹک

---

[1] دیباچہ تاریخ شیر شاہی (ق۔ن) مظہر علی خاں ولاؔ ورق ۲۔

[2] تاریخ شیر شاہی (") " " ورق ۱۶۶۔

سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔ اسکے خاتمے پر فورٹ ولیم کالج کی مہر ثبت ہے۔

تاریخ شیر شاہی میں ولا نے اصل مؤلف عباس کے دیباچے کا ترجمہ بھی درج کیا ہے جس سے علم ہوتا ہے کہ یہ تاریخ بہت ایماندارانہ طور پر عینی مشاہدوں کے بیانات پر مشتمل ہے۔ عباس لکھتا ہے:-

"تحفۂ اکبر شاہی کا تیسرا طبقہ گروہ سور کی سلطنت کے احوال میں
کہ وہ لودی پٹھان کی قوم میں سے تھا مفصل تین باب میں ہے۔ پہلا باب (کذا)
شیر خاں سور کی سلطنت کے بیان میں دوسرا باب شیر خاں کے بیٹے اسلام خاں
کی بادشاہت میں تیسرا باب۔ انھ بادشاہوں کے احوال میں جو شیر خاں کے
رشتہ داروں اور علاقہ مندوں میں تھے۔ جنھوں نے اسلام خاں کے بعد سلطنت کا
دعوی کر کے خطبہ و سکہ اپنے نام کا پڑھوایا اور جاری کیا اور اس کے بیٹے کو معزول
کیا بعد اسکے یہ احقر الناس مسمی عباس ولد شیخ علی سروانی ....عرض
کرتا ہے بموجب فرمانے حضرت جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے..........جو
کچھ ان معتمد پٹھانوں کی زبانی جو تواریخ اور سخندانی میں کمال مہارت رکھتے تھے۔
اور ابتداے دولت وانتہاے سلطنت سے ہمراہ ان کے تھے اور خاص خدمت سے
سرفراز تھے سنا تھا اور غیروں سے بھی جو کچھ تحقیق کیا تھا اسکو لکھا جو برخلاف اسکے
سنا اور تحقیق کی کسوٹی پر کھرا نہ پایا اس سے درگزرا"[1]

تاریخ شیر شاہی شیر شاہ کے عہد حکومت کی تاریخ ہے۔ اسکا آغاز سلطان بہلول کی دہلی پر تخت نشینی سے ہوتا ہے۔ اسی میں روہ کے پٹھانوں پر اس کے الطاف و نوازشات کا بھی بیان ہے۔

---

[1] تاریخ شیر شاہی (ق۔ن) مظہر علی خاں ولا ورق ۲۔

اس کے بعد شیر شاہ کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی ابتدائی زندگی کے حالات مندرج ہیں۔ اسکی تحصیل علم، سیاسی میدان میں آمد اور سلطنت وغیرہ کا ذکر ہے۔

شیر شاہ کے سیاسی حالات ہی اصل اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں سیاسی سوجھ بوجھ، حکمت عملی، دانشمندی، مبارزات، غلبوں، کامیابیوں اور عادات واطوار وغیرہ کا ذکر بہت تفصیل سے ملتا ہے۔ شیر شاہ کے حالات کے علاوہ درمیان میں وقوع پذیر دیگر واقعات اور حالات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ اس عہد کی معاشی اور معاشرتی حالات پر بھی ہلکی ہلکی روشنی پڑتی ہے۔

شیر شاہ صرف سلطنت کے حصول اور فروغ کے لئے ہی کوشاں نہیں رہتا تھا بلکہ وہ بہترین منتظم بھی تھا۔ اس کی حکومت میں ہر ایک شخص محفوظ اور مطمئن تھا۔ یہ شیر شاہ کے نظم سلطنت اور ایڈ منسٹریشن کا کتنا صاف بیان ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:۔

"اگر کسی ہی بڑھیا زر و زیورا پنے سر پر راہ میں لئے جاتی تو کوئی چور یا کتوال (کذا) کا پیادہ شیر خاں کے ڈر سے اس کے دامن کے گرد نہ پھر سکتا۔ کیاسایہ عالم میں اس طور پر + کہ رستم سے بڑھیا بھی ہیگی نڈر اور شیر خاں کے عہد میں پٹھانوں کے گروہ سے روہ اور ہند میں نزاع وخصومت اور لڑائی بھڑائی ان کی طینت سے بالکل دور کی تھی۔ شیر خاں عقل وکاروائی میں یکتا تا زمانہ تھا۔"[1]

شیر شاہ نے بہار پر عمل ودخل حاصل ہونیکے بعد بڑی حکمت علی اور تدبر سے اس علاقے کو اپنے قبضے میں رکھنے کی تدابیر شروع کیں۔ اسے علم تھا کہ بہار کا حصول اس کے دشمنوں کو پھر جنگ پر آمادہ کرے گا۔ لہٰذا وہ چوکنا ہوگیا۔ ان حالات کا بیان ملاحظہ ہو:۔

"جب شیر خاں نے سنا کہ بہار کا ملک میرے ہاتھ آیا اور مجھے یقین تھا کہ بنگالے کے

---

[1] تاریخ شیر شاہی (ق۔ن) مظہر علی خاں ولا ورق ۱۶۶۔

بادشاہ کا لشکر ملک بہار کے لینے کو البتہ آوے گا جلال خاں کے لشکر میں میرے
اور نوحانیوں کے (کذا) مخالفت تھی۔ اس واسطے ڈرتا تھا کہ دشمن کی فتح ہو گی بڑا
اسباب ہزیمت کا ہمارے لشکر میں آپس کی مخالفت ہے۔ اب کسو طرح کا نفاق
ہمارے لشکر میں نہ رہا جب پٹھانوں کے لشکر میں خصومت نہ رہی تو لڑائی کے دن
بنگالی کیا ہمیں ملک مغل بھی برابری نہیں کر سکتے۔ جس وقت میں نے پادشاہ
بنگالے کے لشکر کو شکست دی۔ اگر میں جیتا ہوں تو دیکھو گے کہ مغلوں کو کس طرح
ہندوستان سے نکال (ر) ہا ہوں بعد اس کے شیر خاں نے سر نو سے نگہداشت
شروع کی۔[1]

شیر شاہ کی شہادت پر یہ تاریخ ختم ہو جاتی ہے۔

ولا نے تاریخ شیر شاہی کے دیباچے میں اس ترجمے کے متعلق یہ وضاحت بھی درج کی ہے:۔

"جس کتاب سے کہ اسکا ترجمہ ہوا ہے کوئی لفظ اسے چھوڑ نہیں دیا ہے اگر دیکھیں
اسکی فارسی کو تو بخوبی معلوم ہو کہ اصل کتاب میں بندش الفاظ و ترکیب معنی کس
رنگ تھی اور لفظ باللفظ کس طرح یہ تمام کتاب ترجمہ ہوئی شکر خدا کہ کہیں مطلب
نہیں چھوٹا۔ ناوں گاوں ٹھاوں فروگذاشت نہیں کیا۔"[2]

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ ولا نے لفظ بہ لفظ ترجمہ کیا ہے۔ لیکن خوبی یہ ہے کہ انداز بیان سے
ترجمہ پن نہیں جھلکتا۔ وہ بڑی روانی اور سادگی سے واقعات کو بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ نہ تو جملے

---

[1] تاریخ شیر شاہی (ق۔ن) مظہر علی خاں ولا ورق ۹۵۔

[2] دیباچہ تاریخ شیر شاہی (ق۔ن) مظہر علی خاں ولا ورق ۳۔

فارسیت سے متاثر ہیں۔ اور نہ اسلوب پر فارسی کا رنگ چڑھا ہے۔ ولاؔ نے تمام تاریخی واقعات اتنی وضاحت سے درج کئے ہیں کہ ذہن کو بڑی کاوش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انہوں نے د۔ میان میں ابیات کا بھی استعمال کیا ہے لیکن یہ بے ضرورت ہیں۔

---

(۶۲)

جہاں گیر شاہی

مظہر علی خاں ولاؔ

جہاں گیر شاہی فارسی تاریخ "اقبال نامۂ جہاں گیری" کا ترجمہ ہے۔ ولاؔ نے یہ ترجمہ "تاریخ شیر شاہی" کو مکمل کرنے کے بعد شروع کیا تھا۔ جہاں گیر شاہی ۱۲۲۴ھ / ۱۸۰۹ء میں مکمل ہوئی۔ اور ولاؔ نے اسے ولیم کے ذریعے کالج کونسل میں پیش کیا۔ ولاؔ جہاں گیر شاہی کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

"........ بعد اسکے (ترجمۂ شیر شاہی کے) صاحب عالی شان ....
ڈاکٹر ولیم ہنٹر صاحب دام ثروتہ کی ابتدائے رُشد میں اقبال نامہ جہاں گیری کا
ترجمہ شروع کیا۔ اور بارہ سی چوبیس ہجری مطابق سن اٹھارہ سو نو عیسوی میں
نواب معلی القاب عدل گستر.......... لارڈ منٹو گورنر جنرل.......... کے
عہد دولت میں اس طرح اتمام کو پہنچایا کہ بالکل لفظاً بالالفظ ترجمہ کیا مگر بعضی جگہ
رعایت محاورہ کے لئے اسکا مدعا لیا اور جہاں گیر شاہی اسکا نام رکھا اور اس کو
صاحب والا مناقب.......... کپتان ٹیلر صاحب دام دولتہ کہ بالفعل

مدرس مدرسہ ہندی کے ہیں انکی وساطت سے حضور والا میں گزرانا۔[1]

جہاں گیر شاہی کے خاتمے پر قطعہ تاریخ درج ہے:۔

"........جمادی الثانی[2] کی ساتویں تاریخ مطابق اکیسویں جولائی کی جمعے کے روز جہاں گیر شاہی اتمام وانصرام کو پہنچی۔ اور اس کی تاریخ بھی اسطرح لکھنے میں آئی:۔

اتمام کو جب پہنچا یہ ترجمہ تب وہیں — تاریخ کی خوش ہو کر کی فکر ولا میں نے

یوں روئے ہدایت سے ہاتف نے کہا مجھ کو — تاریخ جہاں گیری ہے سال مسیحی تے[3]

ولا کے اس ترجمے کو کاظم علی جواں نے بھی دیکھا تھا چنانچہ انھوں نے اسے بہت پسند کیا اور قطعۂ تاریخ بھی موزوں کیا۔ خاتمے پر یہ قطعہ بھی درج ہے ؎

جہاں گیر کا ہے جو اقبال نامہ — بار دو زباں ترجمے دل کے مرغوب

کیا لفظ لفظ اے جواں جب ولا نے — ہوئی طبع کو میری تاریخ مطلوب

سن عیسوی کا زباں سے یہ نکلا — ہوا اے ولا ترجمہ تجھ سے یہ خوب[4]
۱۸۰۹ء

جہاں گیر شاہی غیر مطبوعہ رہی۔ اس کا ۳۹۳ اوراق کو محیط خستہ اور کرم خوردہ قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی میں محفوظ ہے۔ اس کے ہر ورق پر ۱۳ سطور مندرج ہیں۔ آغاز میں فورٹ ولیم کالج کی مہر ثبت ہے۔

---

[1] دیباچہ جہاں گیر شاہی (ق۔ن) مظہر علی خاں ولا ورق ۱۱، ۱۲۔

[2] تقویم کے مطابق جولائی کی اکیسویں کو جمعہ کا دن تھا لیکن جمادی الاوّل کی ساتویں تاریخ تھی۔

[3] جہاں گیر شاہی (ق۔ن) مظہر علی خاں ولا ورق ۳۹۳۔

جہاں گیر شاہی میں بادشاہ جہاں گیر کے عروج واقبال کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس تاریخ کا آغاز بادشاہ جہاں گیر کی تخت نشینی، ارکان حکومت اور دیگر امراء ورؤساء کے عہدوں کی تقسیم وترقی کے ذکر سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد جہان گیر نے رانا کے استیصال کے واسطے شاہ پرویز کو بھیجا تھا اس مہم کا بھی ذکر ہے۔ جلوس کے سال اوّل کے واقعات میں خسرو کا اکبرآباد سے پنجاب بھاگنا اور جہاں گیر کے تعاقب کا حال درج کیا گیا ہے۔ دوسرے سال جلوس میں جہاں گیر کابل کی مہم پر روانہ ہوتا ہے۔ اس ذیل میں تاریخی واقعات کے علاوہ کابل کی آب وہوا، وہاں کے سماجی اور معاشی حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

جہاں گیر نے بائیس ۲۲ سال حکومت کی تھی۔ یہ تاریخ اسکے پورے عہد حکومت کا احاطہ کرتی ہے۔ اس تاریخ میں عنوانات قائم کرکے ترتیب وار اس کی فتوحات اور مبارزات کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بادشاہ کی عادتیں، اس کی شجاعت، بہادری اور دریا دلی کے بیانات بھی ملتے ہیں۔ ان بیانات میں بادشاہ کے کردار کی خوبیوں کو بڑی خوبی کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے۔ لیکن خامیوں کو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس کے عہد حکومت کی تعریف وتوصیف میں حد درجہ مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ یوں تاریخ جہاں گیر شاہی تصویر کا ایک ہی رخ پیش کرتی ہے۔

جہاں گیر شاہی میں محض تاریخی حالات ہی نہیں بیان کئے گئے ہیں بلکہ اس کے مطالعے سے اس عہد کے سماجی، معاشی، ثقافتی اور معاشرتی حالات کا بھی علم ہوتا ہے۔ رعایا کے رہن سہن، طور طریقے اور دیگر معلوماتی باتیں بھی اس میں درج ہیں۔ مختلف علاقوں کے ذکر میں وہاں کے ماحول، آب وہوا اور رعایا کی عادات واطوار، کاروبار وتجارت اور دیگر شعبوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ بیان ملاحظہ ہو:۔

"کابل کے باغ شہرارا میں مرزائی نام ایک درخت تھا کہ بہتر اسے کھانے میں نہیں آیا۔

اور کشمیر میں کتنے ایک درخت پادشاہی باغوں میں ہیں ناشپاتی ایسی قسم اول
ہوتی ہے کہ کابل و بدخشاں سے بہتر مگر سمرقند کی ناشپاتی سے کچھ مناسبت
رکھتی ہے اور کشمیر کا سیب بخوبی مشہور ہے"[1]

جہاں گیر کی موت پر جہاں گیر شاہی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

ولاؔ نے جہاں گیر شاہی کے دیباچے میں لکھا ہے:۔

"بالکل لفظاً باللفظ ترجمہ کیا مگر بعض جگہ رعایت محاورہ کیلئے اسکا [illegible]"

چنانچہ جہاں گیر شاہی اکثر و بیشتر اپنے ترجمے کا عکس معلوم ہوتی ہے لیکن [illegible]
بھی نمایاں ہے۔ جن مقامات پر وہ فارسی کے زیر اثر ہے وہاں انھوں نے [illegible]
سہارے رنگین بیانی کا ثقیل مظاہرہ کیا ہے اور ان بیانات سے واقعات [illegible]
کے سامنے نہیں آتی۔ بلکہ ذہن الفاظ کے گرداب میں الجھ کے رہ جاتا ہے [illegible] ملاحظہ ہو:۔

"ماہ ذی قعدہ کی گیارہویں تاریخ سن ہجری ایک ہزار چودہ میں جب نیر اعظم نے
ساعت نیک میں حمل سے آبیت الشرف میں تحویل کی ابتدا سال [illegible]
میمنت و خوشی و خرمی سے شروع ہوئی۔ اور زمانے کے [illegible] دل
سرگرم نشاط ہوئے"[2]

جہاں ولاؔ نے رعایت محاورہ کا لحاظ کرتے ہوئے "مدعا لیا ہے وہاں [illegible] زبان و بیان کا انداز
سادہ اور آسان ہے۔ درحقیقت تاریخی واقعات کو بیان کرنے کے لئے یہی انداز موزوں ہے۔ یہاں

---

[1] جہانگیر شاہی (ق۔ن) مظہر علی خاں ولاؔ ورق ۲۱۲، ۱۳۰
[2] " " " (") " " ورق ۲۰۔

ان کے اسلوب میں شگفتگی بھی ہے اور روانی بھی۔ لیکن ولاؔ کا یہ اسلوب واقعات کے درمیان میں ہی نظر آتا ہے۔ ہر جلوس کے آغاز میں وہ رنگینیٔ عبارت کا اہتمام کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل مثال سے جہاں گیر شاہی کے عام انداز بیان کا اندازہ ہوتا ہے:۔

"........... اور جو ملک کہ اسکے باپ دادا کے تصرف میں تھا لشکر اقبال نشان کے ہاتھ آیا۔ اور اس آوارہ دشت ادبار نے حال تباہ سے ٹیلوں کی پناہ لے خاک مذلت وخواری اپنے سر پر ڈالی اور راجہ بکرماجیت نے اس کے ملک کو پشت پر دے اسکا پیچھا کیا اور جس وقت اس فتح کی نوید سمع مبارک میں پہنچی بدلے میں اس خدمت نمایاں کے خلعت اور نقارہ راجہ کو مرحمت ہوا"[1]

جہاں گیر شاہی کی عبارتوں میں کہیں کہیں رعایت لفظی کا بھی التزام کیا گیا ہے۔ ولاؔ نے جزئیات نگاری کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ اور وہ رزم وبزم کا بہت عمدہ نقشہ پیش کرتے ہیں۔

---

(۶۳)

آرائشِ محفل

میر شیر علی افسوسؔ

افسوسؔ نے مسٹر ہارنگٹن اور کالج کونسل کی فرمائش پر "خلاصۃ التواریخ" کے ایک حصے کا

---

[1] جہاں گیر شاہی (ق ن) مظہر علی خاں ولاؔ ورق ۱۷۵۔

ترجمہ "آرائش محفل" کے نام سے کیا۔ یہ خلاصۃ التواریخ کا لفظ بہ لفظ ترجمہ نہیں ہے بلکہ افسوس نے اسکے مفہوم کو اردو میں بیان کیا ہے۔ آرائش محفل کے دیباچے میں لکھتے ہیں :۔

"......... تب صاحبان عالی شان عادل زمان مسٹر ہارنگٹن بہادر دام دولتہ نے ترجمہ کرنا خلاصۃ التواریخ کا تجویز کیا بلکہ فرمایا کہ صاحبان کونسل کا بھی حکم یہی ہے فقیر نے اس امر کو مقتضائے حال کے جو موافق دیکھا برغبت تمام اسکے مطالب زبان اردو میں لکھنے لگا پر بطور تالیف"۔[1]

خلاصۃ التواریخ (۱۱۰۷ھ ۱۶۹۵ء) منشی سجان رائے بھنڈاری کی تاریخ ہے۔ منشی سجان رائے نے خلاصۃ التواریخ کی تالیف میں اس عہد کی تمام مستند تاریخی کتابوں سے استفادہ کیا تھا۔[2] اسمیں ہندوستان کے خصوصی ذکر کے علاوہ اٹھارہ صوبوں کے احوال اور سلاطین ہنود و مسلمین کے تذکرے بھی شامل ہیں۔ افسوس نے آرائش محفل میں ہندوستان اور اسکے اٹھارہ صوبوں کے ساتھ صرف سلاطین ہنود کا بیان کیا ہے اور یہ کام وہ ۱۸۰۵ء مطابق ۱۲۲۰ھ میں انجام دے چکے تھے۔ افسوس خلاصۃ التواریخ کے مطابق مسلمان بادشاہوں کا حال بھی بیان کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ آگے چل کر دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"............ اگرچہ شروع اسکا نواب فلک جناب گورنر جنرل مارکویس لارڈ ولزلی......... کے سال آخر عہد حکومت میں ہوا سن ہجری اس وقت بارہ سو انیس تھے اور عیسوی اٹھارہ سی چار لیکن احوال سلاطین ہنود کا......... گورنر جنرل جارج بلر وبارلو بارنٹ دام اقبالہ کی ابتداء ریاست میں کہ سن عیسوی

---

[1] دیباچہ آرائش محفل (ق۔ن) شیر علی افسوس ورق ۴۔

[2] خلاصۃ التواریخ۔ منشی سجان رائے بھنڈاری ص ۶ تا ۸۔

اٹھارہ سی پانچ تھے اور ہجری بارہ سی بیس تمام ہوا......... احوال سلاطین مسلمین

بھی اسی طرح انصرام ہووے تا اس ہیچ مداں کی ایک یادگاری کتاب خانۂ دہر میں

باقی رہے اور طلبا اردو کو فایدہ کامل پہنچے۔ نام آرائش محفل رکھا۔"[1]

لیکن سلاطین مسلمین سے متلق حصے کے ترجمے کا سراغ نہیں ملتا۔ غالباً اسے افسوس نے لکھا ہی نہیں۔ آرائش محفل کے اختتام پر عالم و فاضل مولوی محمد اسلم کا قطعۂ تاریخ درج ہے۔ جس کے آخری شعر نقل کیے جاتے ہیں ؎

شدہ از محفل آرائیش نام آرائش محفل ۔۔۔ سواد روشنش ساز دعیون ناظران اکحل

رقم زد سال تاریخش برائے یادگار اسلم ۔۔۔ بحمداللہ بہ تکمیل آمدہ آرایش اول[2]

افسوس نے یوں تو آرائش محفل کو ۱۸۰۵ء میں تمام کر دیا تھا لیکن اس کے بیانات میں ۱۸۰۸ء/۱۲۲۳ھ تک کے اضافے ملتے ہیں۔ ان تمام مقامات کی کلب علی خاں فائق نے نشاندہی کی ہے[3]۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ افسوس ۱۸۰۸ء تک اس میں اضافے کرتے رہے۔ اور اسکے بعد یہ ۱۸۰۸ء میں ہی ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی[4]۔ آرائش محفل کا ۲۲۷ اوراق پر مشتمل قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں محفوظ ہے۔

آرائش محفل کا موضوع تاریخ ہے۔ یہ اپنے ماخذ کا لفظی ترجمہ نہیں ہے۔ افسوس نے نہ صرف

---

[1] دیباچہ آرائش محفل (ق۔ن) شیر علی افسوس ورق ۴، ۵۔

[2] آرائش محفل (مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور) ص ۴۸۲۔

[3] مقدمہ آرائش محفل (مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور) کلب علی خاں فائق ص ۳۷۔

[4] Annals of the College of F. W. Appendix P. 22

اس کے مفہوم کو اخذ کر کے اردو میں بیان کیا ہے بلکہ حذف و اضافے سے بھی کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آرائش محفل کو اپنی تالیف کہتے ہیں۔ وہ دیباچے میں مزید لکھتے ہیں :۔

"راقم نے خلاصۃ التواریخ کا ترجمہ نہیں کیا ہاں مضمون اس کا اس زبان میں لکھا ہے اور کمی زیادتی بھی جہاں موقع دیکھا ہے وہاں کی ہے لیکن صوبے اور سرکاروں کی (کے) حالات میں اکثر اور قلعوں کے احوال میں کم تر۔ سبب اسکا تغیر و تبدل ہے۔ خواہ آبادی کی جہت سے ہو خواہ ویرانی و خرابی کے باعث اور بعضے شہر و قصبے کا اسی نہج پر رہنے دیا۔ یہاں تک کہ صیغے بھی عبارت میں حال ہی کے لکھے۔ ہر چند اس عہد میں وہ اس رنگ پر نہیں بلکہ کہیں سے کہیں تفاوت ہو گیا ہے مگر آمدنی ہر ایک صوبے کی موافق جو عالمگیر کی سلطنت میں تھی وہی لکھی کیونکہ مطابق اس دور کے دریافت کر کے لکھنا محال تھا"[1]

اسکے بعد وہ یہ وضاحت بھی کرتے ہیں :۔

"اور بعضے صوفیہ کی کرامت و خرق عادت اور انکی درگاہوں کے حالات و تصرفات جو ثبت کئے فقط کتاب مذکور کی مطابقت کے لئے بلکہ اسی لحاظ سے ہنود کے فقراء و معابد کا بھی اوصاف و احوال کہ خلاف عقل و عقیدہ تھا لکھنے میں آیا نہ ازراہ اعتقاد"[2]

افسوس نے اصل ماخذ کے مطابق آرائش محفل میں اول اول ہندوستان کی تعریف و توصیف بیان کی ہے۔ اس میں ہندوستان کی آب و ہوا اور جغرافیائی خصوصیات سے لیکر میووں، پھولوں، جانوروں

---

[1]، [2] دیباچہ آرائش محفل (ق ن) شیر علی افسوس ورق ۴۔

علم وکمال، رسم ورواج اور فقیر فقرا تک کا ذکر موجود ہے۔ افسوس نے ان تمام بیانات میں خاصا اضافہ کیا ہے۔ یہ اضافے نثر کے علاوہ نظم وابیات میں بھی کثرت سے ہیں۔ واقعات کے اضافوں میں وہ اپنے ذاتی واقعات بھی بیان کر جاتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے یہ واقعہ درج کیا ہے:-

"چنانچہ راقم نے اپنے والد مرحوم سے یہ نقل سنی ہے کہ محمد شاہ فردوس آرام گاہ کے عہد میں پیش از نادر شاہی ہمارے دل کے مشفقوں میں حسن ذکی خاں نام ایک سید بہرائچ کے رہنے والے نواب عمدۃ الملک امیر خاں بہادر مرحوم کے رفیق تھے۔"[1]

ہندوستان کے صوبوں کے ذکر میں افسوس نے بہت سی ایسی جگہوں کا ذکر کیا ہے جو خلاصۃ التواریخ میں موجود نہیں۔ مثلاً نارنول، مرزاپور، مرشد آباد، بندر ہوگلی، کلکتہ اور چندن نگر وغیرہ یہ اضافے افسوس کی اپنی معلومات پر مبنی ہیں۔ ان میں انہوں نے کسی تاریخ سے استفادہ نہیں کیا ہے بلکہ درمیان میں جہاں جہاں افسوس نے طویل اضافے کئے ہیں ان میں سے بعض مقامات کے متعلق کلب علی خاں فائق کا خیال ہے کہ افسوس نے "آئین اکبری" کو بھی پیش نظر رکھا تھا چنانچہ جہاں پر افسوس نے خلاصۃ التواریخ سے انحراف کیا ہے وہاں وہ آئین اکبری کا تتبع کرتے ہیں۔ کہیں کہیں افسوس کے بیان میں سنہ وسال کا بھی فرق پایا جاتا ہے۔

سلاطین ہنود کے ذیل میں راجہ جدشٹر سے لے کر راجہ پرتھوی راج (پتھورا) تک کا احوال مذکور ہے۔ ان بیانات میں افسوس نے اصل نسخے کی پاسداری کی ہے۔ بیشتر جگہ لفظ بہ لفظ ترجمہ کیا ہے اور کہیں کہیں صرف مفہوم ادا کیا ہے۔ افسوس نے خلاصۃ التواریخ میں درج فارسی اشعار اور فارسی

---

[1] آرائش محفل (مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور) شیر علی افسوس ص ۶۲۔

نظموں کا مفہوم بھی اُردُو میں نظم کیا ہے اور بعض جگہ نسبتاً کم شعروں میں بہت خوبصورتی اور معنویت کے ساتھ ادا کیا ہے۔

افسوس نے آرائش محفل میں مختلف احوال کے ذیل میں جابجا اپنی ذات سے متعلق جو واقعات درج کئے ہیں۔ یہ واقعات نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ انکے سوانحی حالات۔ مرتب کرنے میں بھی معاون ثابت ہوسکتے ہیں۔ مثلاً:۔

"راقم ایک مرتبہ ہمراہ نواب آصف الدولہ مرحوم کے حسن رضا خاں بہادر مغفور کی رفاقت میں نانک متے تلک گیا ہے۔ لیکن پہاڑ کی گھاٹی میں اتفاق جانے کا نہیں ہوا بلکہ کوئی شخص لشکر کا وہاں نہیں جا سکا۔"[1]

افسوس اکثر مقامات پر خلاف عقل رسوم و عقائد پر تبصرہ بھی کر جاتے ہیں یا اس جانب بطور اشارہ دو چار جملے لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً:۔

"اکثر سیاحوں کی زبانی سننے میں یوں آیا ہے کہ گنگا کے کنارے پر ابتدا سے انتہا تلک بیشتر ٹھگ مرد چور، مفسد، راہزن بستے ہیں۔ وجہ اس کی لطف سے صاحب خلاصۃ التواریخ نے یہ لکھی ہے کہ از بسکہ اس میں نہانے سے گناہ لوگوں کے جسم سے دور ہوتے ہیں۔ اغلب کہ وے ہی بطور تناسخ پیکر انسانی میں جنم لے کر خلق کو یہاں اذیت دیتے ہیں۔"[2]

آرائش محفل میں افسوس نے بعض جگہ ترجمے کی غلطیاں کی ہیں جس کی وجہ سے باتیں اپنے

---

[1] آرائش محفل (مطبوعہ لاہور) شیر علی افسوس ص ۱۰۰۔

[2] .... ص ۱۰۸، ۱۰۹۔

مفہوم ہیں مزاحیہ ہوگئی ہیں۔ اس کے علاوہ افسوس نے صوبہ جات اور آمدنی میں بھی اصل ماخذ سے اختلاف کیا ہے۔ بیشتر مقامات پر انہوں نے اعداد نقل کرنے میں بھی غلطیاں کی ہیں۔

آرائش محفل اپنی زبان و بیان کے لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ افسوس نے تاریخی بیانات کو بے حد دلکش پیرایے میں بیان کیا ہے۔ آرائش محفل میں ہم ایک نئے انداز نگارش سے متعارف ہوتے ہیں۔ یہاں خالص عربی اور فارسی کے الفاظ سے مرکب اسلوب کم نظر آتا ہے بلکہ افسوس نے اردو اور ہندی کے بے حد آسان اور روزمرہ کے الفاظ کے امتزاج سے اپنا انداز بیان اختراع کیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ عربی اور فارسی کے الفاظ آرائش محفل میں مفقود ہوں لیکن یہ ثقیل اور ادق نہیں۔ خوبی تو یہ ہے کہ یہ ہندی کے آسان الفاظ کے پہلو بہ پہلو یوں کھڑے ہیں کہ اسی رنگ میں رنگ گئے ہیں۔ افسوس نے روزمرہ کے الفاظ سے بڑے لطف و کمال کے ساتھ قافیہ بندی کی ہے۔

آرائش محفل کے بعض بیانات پڑھکر اندازہ ہوتا ہے کہ افسوس کا نہ صرف مطالعہ بلکہ مشاہدہ بھی بہت تیز اور وسیع تھا۔ اس مشاہدے کو وہ اپنی قوت بیانیہ کے سہارے بخوبی بروئے کار لائے ہیں۔ آرائش محفل کے آغاز میں جہاں وہ ہندوستان کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں وہاں انکے مشاہدات کی باریکی الفاظ کے پیکر میں یوں ڈھل گئی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ انہوں نے قوت بیانیہ سے ایسی دلآویز تصویر کشی کی ہے کہ پورا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ تصویر کشی صرف موسم و فضا کی ہی نہیں بلکہ شہر و محلات اور دیگر تفصیلات کے ذیل میں بھی مل جائیگی۔ موسم برسات کی یہ تصویر کشی ملاحظہ ہو۔ یہاں افسوس کا مشاہدہ زبان و بیان پر قدرت اور قافیہ پیمائی نمایاں ہے۔ نرم و نازک الفاظ منظر کشی میں کس قدر معاون ثابت ہوئے ہیں :-

"آسمان پر رنگ بہ رنگ کی گھٹا، چاروں طرف خوش آیند ہوا، زمین یک لخت سبزہ زار، ہر ایک پہاڑ مثل گلزار اور گلزار سراپا بہار۔ پھول طرح بہ طرح کے

چمنوں میں کھلے ہوتے، درخت ہرے ہرے گنجان آپس میں ملے ہوتے۔ نہروں کی لب ریزی کا طور ہی جدا، سبزے کی نوخیزی کا عالم ہی علاحدہ، ہر ایک ندی نالا دریا و چڑھا ہوا، ڈھرا ڈھرا تالاب پانی سے بھرا ہوا۔ سبزے کی لہک، بیر بہٹی کی دمک، بجلی کی چمک، بادل کی کڑک ایک عالم دکھاتی ہے۔ بگلوں کی ڈار مینہ کی پھوار، موروں کی جھنکار، پپیہوں کی پکار دلوں کو لبھاتی ہے۔ تھم جابجا گڑے ہوئے، جھولے پڑے ہوتے، ہنڈولے کھڑے ہوتے ان میں رنگ بہ رنگ کی پوشاکیں پہنے ہوئے سینکڑوں پری پیکریں جھولتیاں ہیں کوئی پینگ چڑھا رہی ہے کوئی ہنڈولا گا رہی ہے۔[1]

افسوس نے کہیں کہیں شہروں کی وجہ تسمیہ بیان کی ہے۔ انہوں نے مختلف ذاتوں اور جگہوں کی تہذیب و معاشرت پر بھی پر لطف انداز میں لکھا ہے۔

آرائش محفل کی زبان سادہ اور آسان نثر کی بہترین مثال ہے۔ جن مقامات پر افسوس نے روزمرہ کی بجائے فارسی اور عربی کے الفاظ کا استعمال کیا ہے وہ بیانات با قاعدہ ادبی شان رکھتے ہیں۔ آرائش محفل میں یہ دونوں ہی اسلوب جابجا نظر آتے ہیں۔ اکثر بیشتر تشبیہات و استعارات ہمارے گرد و پیش کے ماحول سے اخذ کردہ ہیں۔ یہاں مرصع اور مسجع اسلوب نظر نہیں آتا بلکہ کہیں کہیں سادگی اور سلاست کے اتنے عمدہ بیانات نظر آتے ہیں کہ نثر میں شعر کا سا لطف آ جاتا ہے۔ ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ جو بیانات ہندوؤں کے زیر اثر ہیں وہاں افسوس نے اسی لحاظ سے ہندی الفاظ کا استعمال کیا ہے اور جو بیانات مسلمانوں سے متعلق ہیں وہاں اردو اور فارسی کے الفاظ نظر آتے ہیں۔ آرائش محفل میں جتنے

---

[1] آرائش محفل (مطبوعہ لاہور) شیر علی افسوس ص ۱۴۰۔

متروک کلمات مستعمل ہیں۔لیکن یہ ناگوار نہیں گزرتے۔ان میں آہنگ موجود ہے۔

مجموعی طور سے افسوس نے آرائش محفل میں زبان و بیان کا بہت عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے بیشتر ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جو ہمارے گرد و پیش سے اخذ کردہ ہیں۔ان میں ترنم بھی ہے اور موسیقیت بھی۔آرائش محفل اپنی زبان و بیان کی بنا پر موجودہ دور کی نثر کا مقابلہ کرتی ہے۔

---

(۶۴)

تاریخ آشام

بہادر علی حسینی

بہادر علی حسینی نے ۱۸۰۵ء مطابق سنہ ۱۲۲۰ھ میں ولی احمد شہاب الدین طالش کی فارسی تاریخ کا ترجمہ "تاریخ آشام"[۱] کے نام سے کیا۔بہادر علی دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"سید بہادر علی حسینی نے اشام کی تاریخ کا جو محمد اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ کی سلطنت میں نواب عمدۃ الملک میر محمد سعید اردستانی کے رفیق ولی احمدؔ شہاب الدین طالش نے لکھی تھی۔سنہ اٹھارہ سی پانچ عیسوی مطابق بارہ سی بیس ہجری میں خداوند نعمت ہربرٹ ہارنٹین صاحب اور ...... کول برک صاحب بہادر وام دولتہا کی فرمائش سے ...... مارکوس ولزلی گورنر بہادر

---

[۱] آشام۔

دام اقبالہ کے عہد اور پادری برن اور پادری بکانن صاحب کی تولیت میں........

ہندی زبان میں ترجمہ کیا"۔[1]

تاریخ آشام کا ۱۰۹ اوراق کو محیط خوش خط، قدرے خستہ اور کرم خوردہ قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔[2]

ولی احمد شہاب الدین نے نواب عمدۃ الملک میر محمد سعید کی آشام (آسام) کی مہم میں رفاقت اختیار کی تھی۔ چنانچہ انہوں نے نواب صاحب کے سفر کے آغاز سے لے کر وہاں درپیش واقعات۔ وحالات اور انکی وفات تک کے واقعات ایک کتاب میں قلم بند کئے۔ اس کی کتاب کا نام فتحیہ عبریۃ تھا۔ یہ ایک مقدمے اور دو مقالوں پر مشتمل ہے۔ چنانچہ لالش نے اپنی تاریخ میں اسکا ذکر کیا ہے۔ جس کا ترجمہ حسینی نے یوں کیا ہے:۔

"اس کتاب کی عبارت سے جو فتح اور عبرت کا احوال ظاہر ہوتا ہے اسی واسطے اسکا نام فتحیہ عبریہ رکھا گیا۔ ایک مقدمے اور دو مقالے پر ترتیب دی گئی"۔[3]

(جاوید نہال نے تاریخ آشام میں چار مقالوں کا ذکر کیا ہے[4]۔ جو غلط ہے۔)

ولی احمد کے بیانات پر یقین کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ وہ ان تمام واقعات کا عینی شاہد تھا۔ وہ لکھتا ہے:۔

"ظاہر کرنا اس احوال کا علانیہ اور خفیہ رکھنا اس روداد کا نواب ہمت بلند کی

---

[1] دیباچہ تاریخ آشام (ق۔ ن) بہادر علی حسینی ورق ۱، ۲۔ [2] سید مقیت الحسن کی اطلاع کے مطابق تاریخ آشام ۱۸۰۵ء میں ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی۔ (ا، د مطالع ص ۶۷) [3] تاریخ آشام (ق۔ ن) ورق ۲۔
[4] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب۔ جاوید نہال ص ۸۹۔

طبیعت مشکل پسند کی مرضی کے نہ تھا کیوں کہ انکو یقین تھا کہ یہ ماجرا جیساکہ ہے اور جیسا

... واقعہ نویسوں کی فردوں اور دوستوں کے خطوں میں جو ہندوستان

جنت نشاں کو لکھے جاتے ہیں لکھا گیا ہوگا سو سچ نہ ٹھہرا۔ اس لئے اس ناچیز نے

جو اس سفر پرخطر کے حاضروں میں سے ہے اور آشام کے ابتدا سے نواب مبارک قدم

کے پھر کر بہشت کو سدھارنے تک خاص رات دن کی مجلس کے آنے جانے والوں میں

شامل رہا ساتھ اس افراتفری اور نبرد تین دسا کے تھوڑا سا ان سخت حالتوں میں سے

جو لشکر پر سے گزریں اور کچھ ایک ان بڑے دکھوں میں سے جو فوج پر بیتے اور کچھ اس

دیس روگی کی ریت رسموں میں سے جو دیکھنے میں آئیں اور بعضے لچھنوں کو ان کو کرمی

اشامیوں کے اور اس جگہ کے پہاڑیوں کے جو ظاہر ہوئے۔ نواب مرحوم کے مرنے

کے پیچھے راست گو قلم کی زبان سے ترت پھرت لکھا۔[1]

نالش نے یہ تاریخ ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۲ء میں مکمل کی تھی[2]

حسینی نے اپنے ماخذ کا مکمل ترجمہ کیا۔ چنانچہ تاریخ آشام کی ایک مقدمے اور دو مقالوں پر مشتمل

ہے۔ مقدمے میں بادشاہی لشکر کے کوچ بہار اور آشام کو لینے کے لئے روانہ ہونے کا ذکر ہے۔ لہٰذا ان تمام

واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن کی بنا پر یہ مہم شروع ہوئی اس سلسلے میں کوچ بہار اور آسام کے راجاؤں کی

خودسری کا حال بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ مقدمے کے اخیر میں لکھا ہے: ۔

"کوچ بہار دلیس کے آنے جانے کی راہ دہی مشہور تھی لینا اسکا جمعیت سے خالی نہ تھا

---

[1] تاریخ آشام (ق. ن) بہادر علی حسینی ورق ۲، ۵

[2] " " " " ورق ۱۳۹۔

بلکہ بڑا کٹھن تھا سوائے اس کے اوپر سے برسات بھی آن پہنچی کہ تدبیر نہ بن پڑی تب (
نواب نے یہ چاہا کہ آپ اپنے ساتھ لشکر لے کر آشام اور کوچ بہار کے راجوں کو
بدعملی کی سزا دیوے یا[1] "

پہلے مقالے میں نواب میر سعید کی کوچ بہار کے لئے روانگی اور راجہ بھیم نرائن کی بیخ کنی اور فتح
کی روداد بیان کی گئی ہے۔ اس مقالے میں کوچ بہار کے علاقے کی پوری جغرافیائی خصوصیات کا بھی ذکر
کیا گیا ہے۔ جس سے وہاں کی آب وہوا، پھلوں پھولوں اور پیڑ پودوں وغیرہ کا حال معلوم ہوتا ہے۔
اسکے علاوہ طرز معاشرت، قومی رسم ورواج اور رہن سہن کا بھی علم ہوتا ہے۔

دوسرا مقالہ آسام کی فتح کے لئے لشکر کے کوچ کرنے اور رانا بادشاہ کی مدد سے فتح حاصل
ہونے سے متعلق ہے۔ اس مہم میں لشکر کو پیش آنے والی تمام دشواریوں اور آب وہوا کی ناموافقت کا
ذکر ہے۔ سیاسی نشیب و فراز، آپسی معاملات اور مبارزات کا بھی حال درج کیا گیا ہے چنانچہ ان تمام
منصوبوں اور حکمت عملی کا علم ہوتا ہے جن کی بنا پر آسام میں فتح حاصل ہوئی۔ اس مہم میں درپیش تمام چھوٹے
بڑے واقعات کے علاوہ آسام کی جغرافیائی خصوصیات اور دیگر معلومات بھی درج کی گئی ہیں چنانچہ آسام کا
حدود اربعہ، آب وہوا، دریاؤں کی تعریف، پھولوں پھلوں اور باغات وغیرہ کا ذکر اس کے علاوہ وہاں
دیگر خوبیاں اور خامیاں بھی بیان کی گئی ہیں۔ اس باب سے آسامیوں کی عجیب وغریب خصوصیات ان کے
رہن سہن، رسم ورواج، سماجی اور سیاسی حالات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

نواب میر سعید کے انتقال پر یہ تاریخ ختم ہو جاتی ہے

تاریخ آشام مختصر تاریخی کتاب نہیں بلکہ اس میں آسام کے سیاسی، سماجی اور معاشی

---

[1] تاریخ آشام، ق.ن، بہادر علی حسینی ورق ۹.

حالات پر مکمل دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے اس میں درج تمام واقعات میں تاریخوں اور سنین کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ تاریخ آشام میں اس عہد کے امراء، وزراء اور نوابین کی سیاسی مصلحتوں، چپقلشوں، سیاسی جنگوں، اور رعایا کے ساتھ ان کے سلوک کا حال بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

حسینی نے تاریخ آشام میں عموماً رواں اور بامحاورہ زبان استعمال کی ہے لیکن کہیں کہیں انکے بیانات بڑے بے روح اور بے کیف ہیں۔ جملوں میں الجھاؤ اور پیچیدگی ہے جس کی وجہ سے عبارتیں گنجلک ہو جاتی ہیں۔ حسینی نے مقامی الفاظ و محاوروں کا بھی استعمال کیا ہے۔ ہندی کے الفاظ بھی کثرت سے نظر آتے ہیں بلکہ تاریخ آشام کے شروع میں جہاں سے وہ اصل کتاب کے ترجمے کا آغاز کرتے ہیں اس حصے میں ہندی کے الفاظ غالب نظر آتے ہیں لیکن اس میں شعوری کوشش کا دخل ہے ہندی کے الفاظ طبع لطیف پر گراں گزرتے ہیں۔ اسکا موضوع ان بھدے الفاظ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"حمد کے انگنت کٹک اس بیچوں نرنکار کی مملکت کے دوار سیوک ہیں کہ جس نے شریعت و حقیقت کی لڑائی کے دل تھنب سورسا دنتوں اور طریقت و ملت کی مہا بھارت کے ریخت بیر بلونتوں کو۔ ان سب پر سلام ہو جیو، مشرک اور بھٹکے ہوؤں کے ہیوں کے ملک ۔کے سر کرنے کے واسطے۔ کافر اور بہکے ہوؤں کے ہردوں کے جگ جیتنے کے لئے ہدایت و رہنمائی کی فوج سمیت بھیجا۔"[1]

تاریخ آشام میں عربی کے جملے بھی کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں۔ لیکن حسینی نے انکا ترجمہ کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ واقعات کے درمیان میں اردو ابیات درج ہیں۔

---

[1] تاریخ آشام (ق ن) بہادر علی حسینی ورق ۲۔

بحیثیت مجموعی تاریخ آشام کی زبان عموماً سادہ اور رواں ہے۔ لیکن کہیں کہیں پر تعقید اور گنجلک عبارتیں بھی ملتی ہیں۔

۶۵

شاہ نامۂ ہند (شہنامۂ ہندی)

محمد علی

شہنامۂ ہندی فارسی کتاب "شمشیر خانی" کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ محمد علی نے کالج کونسل سے انعام حاصل کرنے کی غرض سے "صاحبان عالی شان" کے حکم پر ۱۸۱۰ء میں مکمل کیا تھا۔ سبب تالیف بیان کرتے ہوئے محمد علی لکھتے ہیں:۔

"..........اس عاصی نے دیکھا کہ بعضے احباً ترجمۂ کتب کے وسیلے سے کمپنی انگریز بہادر کی سرکار معدلت آثار سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ اس ہیچ مدان نے بھی حوصلہ کیا اور بموجب حکم جہان مطاع صاحبان عالی شان کونسل کے کتاب شمشیر خانی کہ منتخب شاہنامہ ہے باوجود مشاغل نوکری و ہیجان تفکرات دینوی اردوئے معلی کی زبان میں ترجمہ کی۔ اور شہنامۂ ہندی اسکا نام رکھا۔"[1]

---

[1] دیباچہ شاہنامۂ ہند (ق۔ن) محمد علی ورق ۲۔

محمد علی نے خاتمے پر اپنے ترجمے کی تکمیل کا قطعۂ تاریخ بھی درج کیا ہے ؎

ہوا ترجمہ سے مجھے جب فراغ ملا دو ہیں تاریخ کا بھی سراغ

کیا میں نے پیر خرد سے سوال ہے تاریخ ہجری کا مجھ کو خیال

سر و رد کر دور بولا پکاہ (کذا) ملخص ہے یہ شاہنامے کا واہ
۱۲۳۰ - ۴ = ۱۲۲۶ھ

کیا پھر جو میں عیسوی کا سوال دہیں اس نے بھی کر کے فکر و خیال

کہا اس سے کد دور کر تو صریح میاں ہے یہ مقبول حضرت مسیح[1]
۱۸۳۵ - ۲۴ = ۱۸۱۱ء

شہنامۂ ہندی میں محمد علی نے شمشیر خانی کے مؤلف توکل بیگ کے بیان کا اردو ترجمہ پیش کیا ہے۔ جس سے علم ہوتا ہے کہ حاکم غزنین شمشیر خاں کسی ایسی کتاب کا خواہش مند تھا جس سے شاہان سلف کے بارے میں اجمال سے علم ہو سکے۔ اسے شاہنامۂ فردوسی اپنی طوالت اور شاعرانہ خصوصیات کی وجہ سے ناپسند تھی۔ اسکا خیال تھا کہ اہل حکومت اپنی عدیم الفرصتی کے باعث اس کتاب سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ وہ چاہتا تھا کہ شاہنامۂ فردوسی کی تلخیص فارسی نثر میں کی جائے تاکہ زیادہ مفید ثابت ہو۔ ایک شناسا نے شمشیر خاں کی اس خواہش کا اظہار توکل بیگ سے کیا اور توکل بیگ نے شاہنامۂ فردوسی کو فارسی نثر میں اختصار کے ساتھ بیان کیا۔ اور اسے ۱۰۶۳ھ / ۱۶۵۲ء میں مکمل کیا۔ یہی کتاب شمشیر خانی کے نام سے مشہور ہوئی۔ جسکا ترجمہ بزبان اردو محمد علی نے کیا۔ اور شہنامۂ ہندی نام رکھا۔ شہنامہ کی ابتدا میں محمد علی نے فردوسی کی منظوم مدح کا بھی شعری ترجمہ کیا ہے۔ یہ مدح فردوسی نے سلطان محمود کی شان میں کی تھی۔

---

[1] شاہنامۂ ہند (ق۔ن) محمد علی ورق ۱۸۰، ۱۸۱۔

شہنامہ ہندی طبع نہ ہوسکی۔ اسکا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ ۱۸۱۳ اوراق کو محیط ہے۔

شاہنامہ ہند کا باقاعدہ آغاز کیومرث کے ذکر سے ہوتا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ:۔

"داستان کہتے ہیں کہ پہلے جس شخص نے تخت اور تاج پادشاہی کا آئین جہاں میں نکالا کیومرث تھا پہاڑ میں رہتا اور اپنی قوم سمیت حیوانوں کے چمڑے کا لباس پہنتا۔ اس کے ایک بیٹا تھا سیامک نام........." [1]

اس کے بعد سیامک اور اس کے بیٹے ہوشنگ، کا ذکر ہے۔ ہوشنگ کے ذیل میں درج ہے:۔

"کہتے ہیں کہ آگ پتھر سے ہوشنگ ہی نے نکالی اور آئین آتش پرستی کا اسنے ایجاد کیا۔ کہا آگ نورالہٰی ہے پوجنا اسکا بہتر ہے" [2]

شاہنامہ شاہان سلف کی مکمل تاریخ ہے۔ چنانچہ اس میں ہوشنگ کے بعد طہورث، جمشید، مرتاس تازی، ضحاک، فریدوں اور اس کی اولادوں۔ ایراج، منوچہر، سام بن نریمان، افراسیاب، گرشاسپ، کاؤس، ہفت خوانی رستم، سیاوش، کیخسرو اور اسفندیار وغیرہ کا بہت تفصیل سے اور بہت دلچسپ انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ آخری بیان میں ساسانیوں کی سلطنت اور نصیر کا قصہ ہے۔ ان اہم بیانات کے علاوہ درمیان میں واقعاتی تواتر سے اور بھی بہت سے بیانات و واقعات ہیں۔ ان تمام واقعات کے درمیان میں کثرت سے ابیات درج ہیں۔

شاہان سلف کے بیان میں ان کے کارناموں، طریقہ حکومت، سیاسی چشمک، آپس کے روابط، شجاعت، بہادری اور جہانبانی وغیرہ کا ذکر ہے۔ شاہنامہ ہند بے حد معلوماتی دستاویز ہے۔

---

[1] شاہنامۂ ہند (ق۔ن) محمد علی ورق ۶، ۷۔ [2] شاہنامۂ ہند (ق۔ن) محمد علی ورق ۶، ۷۔

محمد علی نے شاہنامہ کے اختتام پر فردوسی کی بادشاہ (سلطان محمود) سے ناراضگی، بادشاہ کی بے زاری اور حاسدوں کے کہنے میں آجانے کا ذکر بھی نظم و نثر میں کیا ہے۔ فردوسی نے سلطان محمود کی ہجو بھی لکھی تھی۔ محمد علی نے اسکا بھی منظوم ترجمہ کر دیا ہے۔ اس ہجو کے آخری اشعار مندرجہ ذیل ہیں ؎

کہ فردوسی نے نامۂ بے بہا — نہ محمود کے نام پر ہے کہا

گئی عمر ستر کے نزدیک اب — ہوئی .... (کرم خوردہ)

بھرا دل مرا اس دغل سنج سے — خدایا چھڑا مجھ کو تو رنج سے

کرے گا جو عقبیٰ میں مجھ کو نہال — نہیں مجھ کو درکار دنیا کا مال[1]

محمد علی کا یہ ترجمہ خاصا سادہ اور رواں ہے۔ شمشیر خانی کا ترجمہ مشکل اور دقت طلب تھا۔ لیکن محمد علی اس مرحلے سے بہت کامیابی سے بزد آزما ہوتے ہیں۔ یہ مثال ملاحظہ ہو:۔

"سکندر نے خضر سے کہا میرے پاس دو لعل ہیں۔ ایک کی یہ خاصیت ہے کہ سانپ بچھو اور جو کوئی جانور کاٹنے والا ہوئے اس لعل کی دہشت سے آدمی کے گرد نہیں آتا۔ اور دوسرا لعل شب چراغ ہے۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ چراغ کی طرح روشنی دیتا ہے۔ ایک لعل میرے پاس ہے ایک تیرے پاس رہے۔ خضر لعل شب کو لئے ہوئے سکندر کے آگے آگے جاتے تھے۔ دو رات دن راہ چلے۔ تیسرے دن دوراہے میں پڑے۔ خضر نے ہر چند پکارا سکندر کے لشکر نے نہ سنا۔"[2]

---

[1] شاہنامۂ ہند (ق۔ن) محمد علی ورق ۳۸۰۔

[2] " " " " ورق ۲۶۰۔

پوری کتاب میں سادہ نگاری کا یہی انداز ہے۔ ہر واقعہ ہر بیان وہ کہانی کہنے کے انداز میں بیان کرتے جاتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی نقص ہے تو ابیات کی کثرت کا۔ ابیات کی یہ زیادتی اکثر طبیعت پر گراں گزرنے لگتی ہے۔ منظوم ترجمے کا انداز یوں ہے سے

تو کپڑے کو کر دین یزداں شمار	کہ کھینچیں گے اپنی طرف مرد چار
ہر یک چاہے گا لیوے ثانی سے چھین	عدو ہوویں گے چاروں وے بہر دین[1]

---

(۶۶)

اقبال نامہ
سید بخشش علی

سید بخشش علی نے منشی غلام حسین کی فارسی تاریخ "سیر المتاخرین" کے ایک حصے کا ترجمہ اقبال نامہ کے نام سے کیا تھا۔ یہ ترجمہ انہوں نے ولیم ٹیلر اور مارٹن کی فرمائش پر کیا تھا۔ یہ غیر مطبوعہ ہے۔ اسکا ۱۸۰ اوراق پر مشتمل خستہ اور کرم خوردہ قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔ آغاز میں کالج کی مہر ثبت ہے۔

سید بخشش علی نے اقبال نامہ میں انگریزوں کی ابتدائے حکومت، شجاعت و بہادری اور عدل و انصاف کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"معلوم ہوا کہ سید بخشش علی فیض آبادی نے ترجمہ سیر المتاخرین کا جس میں

---

[1] شاہنامہ ہند اق۔ ن: محمد علی، ورق ۳۶۰، ۳۵۰۔

صاحبان عالی شان کی ابتدائے ریاست شجاعت وعدالت کا بیان مفصل لکھا

ہے مدرسان ہندی جناب ٹیلر صاحب بہادر اور جناب مارٹن صاحب بہادر

دام ظلہما کی فرمایش بموجب......... معلمان[۱] کالج کے واسطے لکھا بس کہ

اس کتاب میں صاحبان عالی شان کی شجاعت اور تدبیر کا حال مفصّل

بے کم و کاست لکھا ہے۔"[۲]

اقبال نامہ کا آغاز سراج الدولہ کے ذکر سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کی کلکتہ پر چڑھائی اور دیگر جنگی حالات بیان کئے گئے ہیں۔ ان بیانات میں انگریزوں کی حکمت عملی اور فہم و ذکاوت کی تعریف ہے۔ شوکت جنگ کے سیاسی حالات میں اصل مصنف (منشی غلام حسین) نے اپنے ذاتی حالات و واقعات بھی بیان کر دیئے ہیں۔ بخشش علیؔ نے ان حصوں کا بھی من وعن ترجمہ کر دیا ہے۔ شوکت جنگ سراج الدولہ کی دیگر جنگی کارروائیوں کے علاوہ سیاسی چشمکوں کا ذکر بھی موجود ہے۔ یہ سارے بیانات کافی طویل اور مفصّل ہیں۔ ان میں انگریزوں کی مدح سرائی بھی شامل ہے۔ انگریزوں کے مقابلے میں سراج الدولہ کی ہزیمت اور بنگالے کی نظامت پر میر جعفر خاں کی مسند نشینی کا بھی ذکر مذکور ہے۔ جنگی واقعات کے بیانات میں بہت وضاحت اور طوالت سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے بعد میر جعفر خاں کی تینوں صوبوں پر مسند نشینی اور سراج الدّولہ کی قید اور قتل کے ہولناک واقعات بھی مندرج ہیں۔

ان واقعات کے علاوہ میر قاسم پر انگریزوں کی فتح، میر قاسم کا ذکر، شجاع الدّولہ کی انگریزوں سے جنگ، اور صلح و عہد و پیمان، نجم الدّولہ کی بنگالے پر مسند نشینی، انگریزوں کی مداخلت

---

[۱] متعلمان۔ [۲] اقبال نامہ (ق۔ن) سید بخشش علی ورق ۲۔

اور تینوں صوبوں کی مسندوں کی کمپنی بہادر کے نام منتقلی، نجم الدولہ کی موت، سیف الدولہ کی مسند نشینی، انگریزوں کی مہمات اور سیف الدّولہ کی موت وغیرہ کا ذکر بہت تفصیل سے کیا گیا ہے۔

اقبال نامہ کے آخری عنوانات ملاحظہ ہوں :۔

"موقوف ہو جانا کونسل کا ضلع عظیم آباد سے اور آنا اس ضلع کا مہاراجہ کلیان سنگھ اور راجہ خیالی رام کے قبضے میں حسن تقریر و کوشش سے راجہ خیالی رام کی اور خالق ارض و سما کی تائید سے "[1]

اور :۔

"مبارک الدّولہ و مظفر جنگ، منی بیگم و ببو بیگم کی خوخصلتوں کا بیان "[2]

اقبال نامہ کے تاریخی واقعات میں تسلسل ہے۔ اہم تاریخی ہستیوں کے ذکر کے علاوہ درمیان میں جو بھی چھوٹے چھوٹے واقعات رونما ہوتے اور جو جو تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئیں ان سب کا ذکر موجود ہے۔ سیاسی اور جنگی کاروائیوں، مبارزات اور سیاسی چشمکوں وغیرہ کا حال بہت دلچسپ اور آسان زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ نوابوں کی سیرتوں اور عادات و اطوار پر بھی تبصرہ ملتا ہے۔ بنگال کے تاریخی واقعات پر ایک آسان اور عمدہ دستاویز ہے۔ یوں اقبال نامہ خاص خصوصیت کا حامل ہے۔

اقبال نامہ کا انداز بیان دلچسپ اور آسان ہے۔ اس کے علاوہ اس میں گفتگو کا سا انداز ملتا ہے۔ نہ کہیں تعقید کا عیب ہے اور نہ گنجلک عبارتیں ہیں۔ خال خال ترجمہ پن کی نمایاں جھلک مل جاتی ہے۔

---

[1] و [2] اقبال نامہ (ق۔ن) سید بخش علی ورق ۳۹۲۔

بخشش علی آسان اور عام فہم انداز میں تاریخی واقعات لطف سے بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ مثال ملاحظہ ہو :۔

"راجہ خیالی رام اس واقعہ سے مطلع ہو پیادہ پا دوڑا یتیموں کے گھر میں جا انکی تسلی کی اور اس لاش کی بطور اسلام کے تجہیز و تکفین کروا اپنی ملک کی زمین میں مدفون کروایا اور اس جگہ کو وقف کر دیا تا مسکین و محتاج لوگ اپنے مردے اس میں دفن کریں۔ بے وارثے لڑکوں کو گھر لے آ اپنے لڑکوں کیطرح انکی پرورش و سرپرستی کرنے لگا۔ معلم نوکر خادم انکے واسطے معین کر دیئے آجتک وے طفل اسکے سایۂ تربیت میں خوشی سے رہتے ہیں۔"[1]

اقبال نامہ کو سکریٹری رڈیل نے ولیم پرائس کے پاس تبصرے کے لئے بھیجا تھا۔ ۲۵ مارچ ۱۸۲۵ء کو انھوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا :۔

"......... اگر ہندوستانی کی شکل میں اردو کی تعلیم جاری رہتی تو میر بخشش علی کا ترجمہ بہت مفید ثابت ہوتا۔ لیکن حال ہی میں میرے شعبے میں اردو کی جگہ پر ہندی کی تعلیم کا آغاز ہو جانے کی بنا پر اس قسم کے ترجموں کی ضرورت نہیں ہے۔ اب ایسی کتابوں کی بجائے نئی قسم کی کتابونکی ضرورت ہوگی۔"[2]

لیکن ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود قلمی نسخے کے سرورق پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :۔

"تاریخ ۳۱ ماہ اپریل ۱۸۲۵ء در کمپنی سرکار داخل۔"

---

[1] اقبال نامہ (ق۔ن) سید بخشش علی ورق ۲۹۶۔

[2] بحوالہ فورٹ ولیم کالج (ہندی) لکشمی ساگر وارشنے ص ۱۲۳۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعد میں کالج کونسل نے اسے منظور کر لیا تھا۔

۶۷

حسن اختلاط

میر ابوالقاسم خاں

میر ابوالقاسم خاں نے حسن اختلاط کو ۱۸۰۳ء میں تالیف کیا تھا۔ وہ خاتمے پر لکھتے ہیں:

"مارکوئیس ولزلی بہادر گورنر کے عہد میں یہ کہانی موسوم بہ حسن اختلاط اٹھارہ سو تین سال انگریزی چوتھی مئی بدھ کے دن چشم بدور کلکتہ میں حسن انجام کو پہنچی"[1]

حسن اختلاط ۱۸۰۳ء میں طبع ہو گئی تھی۔ لیکن اسکا مطبوعہ نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔ اسکا ۱۴۰ اوراق پر مشتمل قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔ حسن اختلاط کا ایک قلمی نسخہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدرآباد (آندھرا پردیش) اور دوسرا نواب سالار جنگ کے کتب خانے میں بھی موجود ہے۔

گل کرسٹ کی ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں حسن اختلاط مطبوعہ کتابوں کے ذیل میں شامل تھی۔ اس پر گل کرسٹ نے پچاس روپے انعام کی تجویز پیش

---

[1] حسن اختلاط (ق۔ن) میر ابوالقاسم خاں ورق ۳۰۔

کی تھی[1]۔ لیکن کالج کونسل نے اس فہرست کو نامنظور کر دیا تھا۔ چنانچہ ۹ ستمبر ۱۸۰۳ء میں گل کرسٹ نے ایک دوسری فہرست پیش کی۔ اس میں بھی حسن اختلاط شامل تھی۔ رائے کے کالم میں گل کرسٹ نے لکھا تھا :-

"A native gentleman in Calcutta who has written this miscellaneous work with great spirit rather as a specimen of what we may expect from him if couraged than as a perfect work."[2]

لیکن ۱۰ اکتوبر ۱۸۰۳ء کی کارروائی میں مندرجہ ذیل تبصرے کے ساتھ کوئی انعام نہ دینے کا فیصلہ کیا گیا :-

"زبان تو مناسب ہے لیکن اسلوب مناسب نہیں۔ موضوع سے ناواقفیت کی بنا پر اس چھوٹی سی تصنیف میں اس قدر سہو ہوا ہے کہ مصنف کسی بھی طرح کے انعام کا مستحق نہیں ہو سکتا۔"[3]

حسن اختلاط کا موضوع تاریخ ہے۔ یہ بہت مختصر سی کتاب ہے۔ آغاز میں کرسپ اور گل کرسٹ کی مدح درج ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کی وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہے :-

"ایہا الشائقین اب سنو اس کہانی کو کہ اگلی زمانے کی لوگوں کی تحریر سے جو کچھ کہ احوال مملکت ہند کا جھوٹا سچا اپنے سننے میں آیا ہے اسے بحسن اختلاط

---

[1] [2] [3] Proceedings of the College of F.W. Vol. 559. P. 278, 285, 288

کہہ سنانا ہوں کہ اگر کان دھر کر سنئے تو آگے کو کان ہوں اور یہ وہ مسل (کذا) ہے کہ نادان بات کہئے اور دانا قیاس کرے چنانچہ وجہ تسمیہ ہندوستان کا یہ ہے کہ یہ مملکت قدیم سے ہندوؤں کی تھی اور وے اپنی اصطلاح میں صاحب تخت و تاج کو راجہ کہتے تھے اور دلی دارالخلافت بھی وہیں کی مقرر ہوئی ہے"[1]

اس کے بعد راجہ بکرماجیت اور تورانیوں کے ہند پر غلبے کو اختصار سے بیان کیا گیا ہے۔ محمد شاہ کے عہد اور نادر شاہ کے حملے کا بھی ذکر مذکور ہے۔ اس کے علاوہ بنگال اور عظیم آباد (پٹنہ) کے واقعات بھی مختصراً درج کئے گئے ہیں۔ ان تاریخی واقعات کو بیان کرنے کے بعد انگریزوں کے عہد کا ذکر اور اس عہد کے واقعات و حالات کا بیان ہے۔ اس حصے میں مصنف نے انگریزوں کی خوب تعریف کی ہے۔

مرتب فہرست مخطوطات اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدرآباد نے حسن اختلاط کو مرشدآباد کی تباہی کی مختصر تاریخ لکھا ہے جس میں وہاں کی تباہی کا حال اور چشم دید واقعات کو بطور افسانہ لکھا گیا ہے۔[2]

حسن اختلاط کی زبان میں اکثر و بیشتر فارسی اور عربی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اسکا اسلوب بے کیف ہے۔ جس کی وجہ سے واقعات میں دلچسپی کی فضا پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے حسن اختلاط کے اسلوب کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے:۔

"جب سے اللہ تعالیٰ نے اس ملک ہند کا زمام اختیار صاحبان انگریز بہادر کے ہاتھ میں دیا تب سے ہر طرح کی امنیت بعدل و انصاف بڑھتی ہی چلی آئی جو

---

[1] حسن اختلاط: ق۔ ن: میر ابوالقاسم خاں ورق ۹۔

[2] سلسلۂ اشاعت خواتین دکن انسٹی ٹیوٹ کتب خانۂ آصفیہ جلد اول ص ۲۲۵، ۲۲۶۔

سردار گردوں وقار کی آیا اپنے سابق سے ملک کو زیادہ انتظام دیا اور جو لوگ
کہ خواص اس ملک کے تھے ونہیں سے جیسے جیسے لائق سمجھا اوسے ویساہی سلوک
کیا اور جنھیں ناقص جانا ونسے کچھ کام نہ رکھا۔"[1]

حسن اختلاط میں فارسی تراکیب کا استعمال بکثرت نظر آتا ہے۔ نسخے میں املے کی غلطیاں
بھی موجود ہیں۔

۶۸

انالس آف دی کالج آف فورٹ ولیم

(ANNALS OF THE COLLEGE OF FORT WILLIAM)*

تھامس روبک

یہ فورٹ ولیم کالج کے آغاز سے لے کر ۱۸۱۹ء تک کی تاریخ ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے سیاق و
سباق میں یہ کتاب بہت اہم ہے۔ اس میں تھامس روبک نے مختلف سالوں میں منعقد
PUBLIC DISPUTATION کو درج کیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف شعبوں میں کام
کرنے والے منشیوں کا تقرر اور کالج کی ادبی خدمات وغیرہ کا ذکر بھی بہت تفصیل سے کیا گیا ہے۔
تھامس روبک چونکہ خود کالج سے وابستہ تھے اور انہوں نے اس کتاب کو اپنی ملازمت کے

---

[1] حسن اختلاط (ق۔ن) میر ابوالقاسم خاں ورق ۲۸۔

دوران ہی ترتیب دیا تھا اس لحاظ سے انکے بیانات قابل اعتبار ہیں لیکن کہیں کہیں اس کتاب میں پرنٹ کی غلطیاں بھی موجود ہیں۔

انالس آف دی کالج آف فورٹ ولیم ۱۸۱۹ء میں ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی تھی۔[۱] اس کے نسخے نیشنل آرکائیوز آف انڈیا (دہلی)، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) اور نیشنل لائبریری (کلکتہ) میں موجود ہیں۔ لیکن ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا ہے کہ اس کے نسخے صرف برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں موجود ہیں[۲]

۶۹

چھتر پرکاش
للوجی لال کوی

"چھتر پرکاش" چھترسال کی منظوم تاریخ ہے۔ اس میں بندیل کھنڈ کے علاوہ دیگر تاریخی واقعات اور افراد کا بھی ذکر ہے۔ یہ ایک سو انچاس [۱۴۹] صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں چھبیس ابواب ہیں۔ چھتر پرکاش ناگری رسم الخط میں ہے۔

چھتر پرکاش کو ولیم پرائس نے ۱۸۲۹ء میں فورٹ ولیم کالج سے شائع کیا تھا[۳] زیر نظر نسخہ ۱۹۰۳ء کا ناگری پرچارنی سبھا بنارس سے شائع شدہ ہے اس پر شیام سندر داس نے مقدمہ لکھا ہے۔

---

[۱] سرورق انالس آف دی کالج آف فورٹ ولیم۔ [۲] مقدمہ گلزار دانش۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۱۱۔

[۳] مقدمہ چھتر پرکاش (مطبوعہ ۱۹۰۳) شیام سندر داس ص ۲۔

چھتر پرکاش کی زبان اودھی اور برج کا مرکب ہے۔ یہ زبان بے حد رواں اور شگفتہ ہے
نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔ چھترسال کا لڑکپن ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ؎

پرگٹ پاسنی میں چھبی چھائی — بھوبھر سہت کرپان اٹھائی
تادن کبی، نہ کبنت بنائے — دیے دان تن کوں من بھاتے
گھٹون چلت گھونگھرو باجے — سنجت سُنت ہنس ہیہ لاجے
گہی پلکا کی پاٹی ڈولے — کلکی، کلکی دسنن ڈ تی کھولے
بہنست اٹھت بھور ہی جاگے — نرکھت کو نہ ہیئے انو را گے
کھیلت لیت کھلونا آچھے — دھاوت کلکی چھا ہنہ کے پاچھے
روچی سوں تکت ترگ جے نیکے — بہنس لیت مجرا سب ہی کے
دن دن بڑھے بڑھائی انندا — جیسے سُکل پچھ کو چندا[1]

---

[1] چھتر پرکاش (مطبوعہ ۱۹۰۳ء) للوجی لال کوی ص ۲۰۔

प्रगट पासनी में छबि छाई। भुवभरसहि कृपान उढाइ।।
ता दिन कबि न कबित्त बनाये। दिये दान तिन कौं मन भाये।।
घुटुनन चलत घुंघरु बाजै। सिंजित सुनत हंस हिय लाजै।।
गहि पलका की पाटी डोलै। किलिकि किलिकि दसनिन ढुलि रवोलै।।
बिहंसत उठत भोर ही जागै। निरखत को न हिये अनुरागै।।
खेलत लेत खिलौना आछे। धावत किलिकि छाह के पाछे।।
रुचि सों तकत तुरग जे नीके। बिहंस लत मुजरा सब ही के।।
दिन दिन बढ़ै बढ़ाई अनंदा। जैसे सुकल पक्ष को चंदा।।

چھتر پرکاش کے سارے بیانات بہت عمدہ ہیں۔ ان سے واقعات کی پوری تصویر نگاہوں میں آجاتی ہے۔

---

(۷۰)

دستور ہند (بارہ ماسہ)

کاظم علی جواں

کاظم علی جواں نے شعبۂ ہندوستانی کے لئے ایک بارہ ماسہ نظم کیا تھا جسکا نام انہوں نے "دستور ہند" رکھا۔ یہ بارہ ماسہ ۱۲۱۸ھ (مطابق ۱۸۰۳ء) میں مکمل ہوا۔ اور ۱۸۱۲ء میں ہندوستانی پریس سے شائع ہوا۔[۱] ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں یہ طباعت کیلئے تیار شدہ کتابوں میں شامل تھا۔ گل کرسٹ نے اس بارہ ماسہ پر دو سو روپے انعام کی سفارش کی تھی۔ اور رائے کے کالم میں لکھا تھا:۔

"بارہ ماسہ ایک طبع زاد نظم ہے جو ہر طرح کی ہمت افزائی کی مستحق ہے"۔[۲]

لیکن کالج کونسل نے یہ پوری فہرست ہی نامنظور کردی تھی۔ اس لئے کہ کالج کونسل ان مصنفین کو انعام دینے کے حق میں نہیں تھی جو کالج کے باتنخواہ منشی تھے۔ اس کے بعد گل کرسٹ نے

---

[۱] سرورق بارہ ماسہ مطبوعہ ۱۸۱۲ء۔

[۲] Proceedings of the College of F. W. Vol. 559 P. 277

کالج کونسل کے اس فیصلے پر احتجاج کرتے ہوئے ایک دوسری فہرست پیش کی جس میں اور دوسری کتابوں کے ساتھ بارہ ماسہ کا نام بھی خارج کر دیا گیا۔ البتہ بعد میں کالج کونسل نے بارہ ماسہ کی سو کاپیاں لی تھی اور اس کے لئے جوآں کو چار سو پچیس[۴۲۵] روپلے دیئے گئے تھے۔[۱]

جوآں نے بارہ ماسہ کے اختتام پر قطعۂ تاریخ درج کیا ہے ؎

ہزار احساں و شکر حق ہے اب تو | کہ حسب الحکم تھا صاحب کا جو جو
ہوا آئین نیکو سے سر انجام | رہے گا اس میں برسوں تک مرا نام
حساب آغاز سے انجام تک جو | کیا ہے میں نے مہینوں کا تو جھ کو
کہا ہر ایک نے یہ مثنوی سب | ہوئی ہے چھ مہینے میں مرتب
ہوئی ہاتف کی جو تائید مجھ پر | کہ میری ہے طبیعت کا وہ رہبر
وو ہیں یہ مژدۂ تاریخ پہونچا | یہی تو ہند کا دستور ہے گا۔[۲]

۱۲۱۷ھ

جوآں نے بارہ ماسہ گل کرسٹ کی فرمائش پر نظم کیا تھا۔ اور گل کرسٹ ہی نے موضوع سے متعلق انکو ہدایت دی تھی۔ ورنہ بارہ ماسے کے تقاضے تو کچھ اور ہوتے ہیں۔ گل کرسٹ نے موضوع کے بارے میں جو ہدایات دی تھیں۔ جوآں نے سبب تالیف میں انہیں تفصیل سے لکھدیا ہے ؎

چنانچہ تھا یہی ارشاد ان کا | کہ منظوم ایک تو لکھ بارہ ماسا
کیا میں نے قبول ان کا یہ ارشاد | وو ہیں سے اس کی ڈالی پہلے بنیاد
سنائے بعد چندے کتنے اشعار | پسند انکی ہوئے اور کی یہ گفتار

۱۔ فورٹ ولیم کالج (ہندی) لکشمی ساگر وارشنے ص ۱۰۴۔

۲۔ بارہ ماسہ (مطبوعہ ۱۸۱۲ء) کاظم علی جوآں ص ۱۰۵۔

اجازت تجھ کو یہ دیتے ہیں اب ہم — بہ خاطر جمع مضموں کر ضـرا ہم
تو اپنے بیٹھ کر گھر میں کر اتمام — سپرد اب ہم نے تیرے یہ کیا کام
ولے چھوٹے نہ اس میں کوئی تہوار — موافق مہر و مہ کے کیجئو اظہار
اور اس میں رسمیں جو گبر و مسلمان — بجا لاتے ہیں، لکھیو اس کے عنواں

بعد کے اشعار میں جواںؔ نے اپنی دشواریوں کا ذکر کر دیا ہے ؎

بروج اور کواکب اور رہروت کا احوال — لکھا میں نے بہ تفصیل و باجمال
رکھے اہل فراست بات یہ یاد — کرے اس پر نہ کوئی تاکہ ایراد
مہینا جو ہے شمسی اور ہلالی — ہر ایک کی گردشیں ہیں گی نرالی
یہی اب اپنے دل میں کیجئے غور — برابر مہر و مہ کا کیوں کہ ہو دور
کرے جن برجوں کو وہ سال میں طے — مہینے میں یہ سیران کی کرے ہے
تطابق دے لکھا ہے میں نے باہم — اگرچہ یہ موافق ہوتے ہیں کم
نہیں لازم کہ ہو ہر سال اسی طور — بہم شمس و قمر کا دھـر میں دور
برس انتیس جب یونہی گزر جائیں — جو یہ ایام اب ہیں پھر نظـر آئیں
ولے دونوں کا باہم جمع کرنا — بنا تہوار کی جـا اک پہ دھرنا
کہ ہندو اور مسلماں کی ہے جو رسم — کرے ہیں اپنے اپنے دیں کی وہ رسم
تطابق میں نہ دیتا گر انھوں کو — تو یکجا جمع ہوتے بیے یار و (کذا)
ہلالی اور شمسی کر کے لازم — لکھا ہے جو نہیں ہوتا وہ دایم
یہاں یہ بس ہے کہ عاقل کو اشارہ — کنایہ اسکا پھـر ہوگا دوبارہ[۱]

---

[۱] بارہ ماسہ (مطبوعہ ۱۸۱۲ء) کاظم علی جواںؔ ص ۵، ۶۔

اس طرح جواں نے یہ بارہ ماسہ گل کرسٹ کی ہدایت کے مطابق ایک خاص نہج پر نظم کیا تھا جو اسے بارہ ماسہ کی مروجہ روایتوں سے الگ کرتا ہے۔

بارہ ماسہ کی صنف خالص ہندوستانی طرز معاشرت کی پیداوار ہے۔ اس میں ایک عورت کے فراق و ہجر کی داستان نظم کی جاتی ہے۔ محبوب یا شوہر سے جدائی کے عالم میں ہجر نصیب عورت ملنے کی آس لگائے صبح و شام کا شمار کرتی رہتی ہے۔ مختلف موسم آتے ہیں اور اس کی بے چینی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ مختلف تہواروں اور میلوں ٹھیلوں میں وہ اپنی سکھی سہیلیوں کو خوش اور بے فکر دیکھتی ہے تو جدائی کی آنچ اور تیز ہو جاتی ہے۔ ان تمام کیفیات کا بیان بارہ ماسہ کی روح ہے موسم اور اس سے متعلقہ تہواروں کا بیان تو محض پس منظر کا کام کرتا ہے۔

سنسکرت میں بارہ ماسہ کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ "شش رتو ورتن" کا تعلق بارہ ماسہ سے کسی طور بھی جوڑا نہیں جا سکتا۔ ہندی میں ملا داؤد کی "چنداین" میں بارہ ماسہ اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں کبیر کے ایک بارہ ماسے کا ذکر کیا ہے۔ اور مسعود سعد سلیمان کی "غزلیات مشہوریہ" بھی قدیم بارہ ماسے کا نمونہ ہے۔ اردو میں مکمل بارہ ماسہ افضل کی "بکٹ کہانی" کی شکل میں نظر آتا ہے اس سے قبل بارہ ماسے قصوں کے اجزا کی شکل میں ملتے ہیں۔ لیکن ایک مکمل تصنیف کی حیثیت سے غالباً یہ پہلا بارہ ماسہ ہے جو دستیاب ہے۔

جواں کا بارہ ماسہ "دستور ہند" بارہ ماسہ کم اور دستور ہند زیادہ ہے۔ دراصل گل کرسٹ کو بارہ ماسہ کی روایتوں اور اجزائے ترکیبی کا نہ تو علم تھا اور نہ ہی ضرورت تھی۔ انہیں تو کسی ایسی نظم کی ضرورت تھی جس سے ہندوستان کے مختلف تہواروں، میلوں، ٹھیلوں اور رسم و عقائد سے متعلق معلومات فراہم ہو سکے۔ انکی اپنی پالیسی کے مطابق فورٹ ولیم کالج کے طالب علموں کو

ان تمام باتوں کا علم ہونا ضروری تھا۔ اس لئے انہوں نے جوآں کو حکم دیا تھا ؎

ولے چھوٹے نہ اس میں کوئی تہوار موافق مہر و مہ کے کیجیو اظہار

اور اس میں رسمیں جو گبر و مسلماں بجالاتے ہیں، لکھیو اس کے عنواں

چنانچہ جوآں نے اپنے بارہ ماسہ دستور ہند میں ہندوستان کے موسموں، فصلوں، مہینوں، رسم و رواج، کھیل تماشوں اور ہندو مسلمان کے تہواروں انکے مذہبی عقائد اور توہمات کو اسطرح نظم کیا ہے کہ یہ بارہ ماسہ ایک تہذیبی دستاویز کی اہمیت کا حامل ہوگیا ہے۔

بارہ ماسہ ۴۴ بیانات پر مشتمل ہے۔ یہ بیانات بے حد جاندار ہیں اور تصویر کشی کے بے حد عمدہ مرقعے پیش کرتے ہیں۔ بارہ ماسہ کا اہم حصہ موسموں اور تہواروں سے متعلق ہے۔ تہواروں میں وہ ایک جانب ناگ پنچی، جنم اشٹمی، دسہرہ، دیبی پوجا، تیج، دیوالی اور نہان وغیرہ کا ذکر بہت خوبصورتی سے نظم کرتے ہیں۔ تو دوسری جانب بہرائچ کے میلے کا ذکر، شعبان کے چاند کا بیان، رمضان المبارک اور صفر کے چاند کا تذکرہ بھی خوبی سے کرتے ہیں۔ موسموں میں جوآں نے ہندی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ مثلاً گریکھم رُت، پاوس رُت، سرت رُت، ہیمنت رُت اور سسر رُت وغیرہ۔ موسموں کے یہ منظوم بیانات بے حد دلکش ہیں۔ جوآں نے ہر رُت کی فضا و ماحول، مخصوص تہواروں، میلوں، ٹھیلوں اور رسم و عقائد کا ذکر بہت دل لگا کر کیا ہے۔ ان میں طوالت بھی ہے اور اجمال بھی۔ موسم اور اس کی جزئیات کا ذکر فارسی شاعری کی روایتوں سے متاثر ہے۔

بارہ ماسہ کا باقاعدہ آغاز بسنت رُت کے ذکر سے ہوتا ہے۔ جوآں نے بسنت رُت کی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ مثال ملاحظہ ہو ؎

درخت میوہ دار ایسے ہیں پھولے کہ بلبل دیکھ کر گل بن کو بھولے

گئے ہیں ایسے ہی سب پھول یکبار　　نہیں ہے برگ غیر از گل نمودار

شگوفہ ہر طرف پھولا ہے اس رنگ　　ہوا ہے نخل مرجاں دیکھ کر دنگ

یہ جوش گل سے ہے رنگ گلستاں　　ہے نخل ارغواں پھولوں کی چھڑیاں

لدے پھولوں سے ہیں ایسے ہی پودے　　کہ جیسے کوئی گلدستہ بنا دے

گلوں پر کیوں نہ گل طرہ کرے ناز　　یہ کی ہے صانع قدرت نے پرواز

چنبیلی زرد بھی ایسی کھلی ہے　　کہ جس کو چشم عالم تک رہی ہے

کروں تعریف اسکی کیا عیاں ہے　　کہ ہر یک شاخ شاخ زعفراں ہے[1]

جواںؔ نے بارہ ماسہ میں اپنی شعری صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے، موسموں، فصلوں، تہواروں اور کھیل تماشوں وغیرہ کے ذکر میں انھوں نے منظر نگاری اور جزئیات نگاری کا بہترین کمال دکھایا ہے۔ ہر واقعہ اور ہر تصویر کو انھوں نے اتنے خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے کہ ایک ایک نقش نگاہ کے روبرو ابھر آتا ہے۔ ان تمام خوبیوں کا دارومدار جواںؔ کی زبان پر ہے۔ انہوں نے ان تمام بیانات کو بے حد آسان اور عام فہم انداز میں نظم کیا ہے۔ روزمرہ کے الفاظ اور مثالیں بڑی خوبی سے استعمال کی گئی ہیں۔ ذہن کو نہ کسی کاوش کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ غور و فکر کی۔ جواںؔ نے ہندی کے نرم الفاظ کا بہت برمحل استعمال کیا ہے۔ خال خال فارسی کے الفاظ بھی نظر آجاتے ہیں۔ لیکن ان سے سریع الفہمی اور سادگی کی فضا متاثر نہیں ہوتی۔ جواںؔ کا انداز بہت رواں اور واضح ہے۔ بنگال کی چرخ پوجا کے میلے کی تصویر دیکھئے۔ جواںؔ نے کتنی سادگی سے کس قدر مکمل تصویر پیش کی ہے ؎

جو بنگالے میں آکر ہم نے دیکھا　　لگے ہے چرخ پوجا کا یہ میلا

---

[1] بارہ ماسہ (مطبوعہ ۱۸۱۲ء) کاظم علی جواںؔ ص ۱۰۔

کہ تل دھرنے کو جا ملتی نہیں ہے ۔۔۔ بکثرت یہ تماشا ہر کہیں ہے
اور اس کی بیسویں سے ابتدا ہے ۔۔۔ مہینا تا ہو آخر انتہا ہے
سراپا تن بدن چھدوا کے اپنا ۔۔۔ دکھاتے ہیں یہ بنگالی تماشا
کہ ہر ایک چاک میں ڈلوا کے ڈورے ۔۔۔ ہوا کی طرح لیتے ہیں جھکورے
بجے ہیں باجن ان کے ساتھ اور دو ۔۔۔ ہر ایک سو ناچتے پھرتے ہیں خوش ہو
بدن میں کانٹے اور سُیاں چبھو کر ۔۔۔ اچھلتے کودتے ہیں شاد ہو کر
زباں کے پار کر کے برچھی اور سانگ ۔۔۔ دکھاتے کو بکو پھرتے ہیں یہ سوانگ[1]

کھیل تماشوں کے ذیل میں کبوتر بازی اور مرغ بازی کے بیانات خوب ہیں۔ مثلاً مرغ بازی کا بیان ملاحظہ ہو ؎

جہاں ہوتی ہے پالی لوگ اس جا ۔۔۔ ہزاروں دیکھتے ہیں آ تماشا
ہمیشہ مرغوں کی ہوتی ہے پالی ۔۔۔ لڑاتے ہیں وہ جو ہیں لاوبالی
شجاعت ان کی ہے عالم میں مشہور ۔۔۔ لڑائی کا کروں کیا ان کی مذکور
وہ لڑتے لڑتے اکثر جاتے ہیں مر ۔۔۔ لکھا میں نے یہ خوب امتحاں کر[2]

صفر کے مہینے کا ذکر وضاحت کے ساتھ اسطرح پیش کیا ہے ؎

صفر اس چاند کو کہتا ہے ہر ایک ۔۔۔ نحوست اس کی ہے گی تیرھویں تک
کہیں ہیں تیرہ تیزی جو کہ و مہ ۔۔۔ سبب اسکا اگر پوچھو تو ہے یہ

---

[1] بارہ ماسہ (مطبوعہ ۱۸۱۲ء) کاظم علی جواں ص ۱۸۰۔

[2] " " " " " ص ۸۴۔

جہاں میں بات یہ ہر جا ہے مشہور | حبیب حق ہوتے تھے اس میں رنجور
مرض کی ان پہ شدت تیرہویں تک | رہی تھی یہ سبب ہے گا کہ ہر یک
بری سمجھے ہیں یہ تاریخیں ساری | ہوا پھر ان کے اوپر فضل باری
یہ ہے دستور اس کی تیرہویں کو | کرے ہے فاتحہ کی رسم جو جو
چنے کی اور گیہوں کی...... ذکرم خودنی | پیمبر کی نیاز اوّل وہ دے کر
بطور حصہ بانٹے ہے ہر ایک جا | چلن جو کچھ کہ تھا سو میں نے لکھا[1]

مذکورہ بالا مثالوں سے علم ہوتا ہے کہ جوآں بارہ ماسہ میں اپنی شعری صلاحیتوں کو بخوبی بروئے کار لائے ہیں۔ موضوع کی وسعت اور تنوع کی بنا پر انہوں نے مختلف طرح کا انداز بیان اختیار کیا ہے۔ یوں تو بارہ ماسہ کی زبان شعوری طور پر سادہ اور آسان رکھی گئی ہے لیکن بعض جگہ انہوں نے معیاری شاعری کی روایتوں کو مدنظر رکھا ہے۔ زبان و بیان کی یہ رنگا رنگی بے حد دلکش ہے۔

بارہ ماسہ کی پوری فضا پر ہندوستانیت غالب ہے۔ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی مکمل تصویریں پوری کتاب میں بکھری ہوئی ہیں۔ یہ ہمارے تہذیبی ورثے کی ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

---

[1] بارہ ماسہ (مطبوعہ ۱۲۲۸ھ/۱۸۱۲ء) کاظم علی جوآں ص ۱۰۳، ۱۰۴۔

۷۱

گلشن ہند

مرزا علی لطف

مرزا علی لطف جب کلکتہ آئے تو انکی ملاقات گل کرسٹ سے ہوئی۔ گل کرسٹ کے ذہن میں بہت پہلے ہی سے "تذکرۂ گلزار ابراہیم کو اردو میں منتقل کرانے کا خیال موجود تھا۔ لطف سے ملاقات کے بعد انہوں نے اپنی فرمائش پیش کردی۔ اور لطف نے تذکرۂ گلزار ابراہیم کے[1] ۶۹ شعرا کا حال ترجمہ کر دیا۔ لیکن انہوں نے محض ترجمہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ شعراء کے حال میں اپنی معلومات کے مطابق اضافہ بھی کیا۔ مطبوعہ گلشن ہند (مع تذکرۂ گلزار ابراہیم) میں ان اضافوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ لطف نے یہ ترجمہ ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں کیا۔ گل کرسٹ کی فرمائش کا ذکر لطف ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

> "علی ابراہیم خاں مرحوم نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا عبارت فارسی میں لکھا ہے اور نام اسکا گلزار ابراہیم رکھا ہے۔ سنہ ۱۱۹۸ گیارہ سو اٹھانوے ہجری اور

---

[1] مقدمہ بر تذکرۂ گلزار ابراہیم مشمولہ مطبوعہ گلشن ہند (مع گلزار ابراہیم) میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور لکھتے ہیں کہ لطف نے اپنے ترجمے کے پہلے حصے کے لئے گلزار ابراہیم سے ۶۸ شاعروں کا انتخاب کیا تھا (ص ۱۴) لیکن زیر نظر مطبوعہ نسخے میں ۶۹ شعراء کا ذکر ہے لطف کا اپنا ذکر ان کے علاوہ ہے۔

ایک ہزار ساٹ سو چوراسی عیسوی (۱۷۸۴ء) میں وہ تذکرہ تمام ہوا۔ مشہور یوں ہے کہ بارہ برس میں سرانجام ہوا۔ رفتہ رفتہ جب...... مسٹر گل کرسٹ صاحب کی نظر مبارک سے گزرا از بسکہ شاعروں کا احوال اس میں مجمل لکھا تھا، ایک مدت سے صاحب عالی حوصلہ کو خیال اس بات کا تھا کہ اگر بیان اسکا مفصل زبان ریختہ میں کیا جائے تو خوب ہو اور ہر ایک شاعر کی پوری غزل اپنا جلوہ دکھلائے تو نہایت طبع کو مرغوب ہو۔ مبتدی اس سے بڑا مزہ پائیں گے اور نومشق کیفیت بہت اٹھائیں گے۔

چنانچہ اس خیر خواہ خفی و جلی، میرزا علی کو، کہ لطف تخلص کرتا ہے نہایت محبت و اخلاص سے فرمایا کہ تو اگر تندہی اس مقدمے میں کرے تو ہم اس تذکرے کو اپنی طرز پر لکھیں۔"[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ علم ہوتا ہے کہ جو اضافے لطف نے کئے ہیں وہ اپنی مرضی سے نہیں کئے۔ بلکہ گل کرسٹ کی خواہش کے پیش نظر کئے ہیں۔ گلزار ابراہیم میں تین سو بیس شعراء کا ذکر ہے۔[2] لطف نے گلزار ابراہیم کا ترجمہ دو جلدوں میں کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ پہلی جلد میں گلزار ابراہیم کے ۹۷ شعراے صاحب وقار اور خود اپنا ذکر شامل کیا ہے۔ گلشن ہند کے متعلق گارسن دی تاسی کہتا ہے:۔

"اس کتاب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قومیت کا خیال لوگوں میں ترقی کر رہا ہے

---

[1] دیباچہ گلشن ہند مشمولہ گل کرسٹ اور اسکا عہد (عتیق صدیقی) ص ۲۲۶۔

[2] اکبر علی بیگ نے لکھا ہے کہ تذکرہ گلزار ابراہیم میں ۳۱۹ شعراء کے حالات زندگی اور نمونہ کلام موجود ہے (لطف حیات اور کارنامے ص ۱۳۴) لیکن گلشن ہند (مع گلزار ابراہیم) میں گلزار ابراہیم میں شامل ۳۲۰ شعراء کا ذکر موجود ہے

کیوں کہ جہاں تک مجھے علم ہے یہ پہلا تذکرہ ہے جو بخلاف دوسرے تذکروں کے جو اس سے قبل لکھے گئے ہیں فارسی میں نہیں بلکہ اسلامی ہندوستانی یعنی اردو میں لکھا گیا ہے۔ اس تذکرے میں جو گلشن ہند کے نام سے موسوم ہے ۶۸ شاعروں کا ذکر ہے لیکن ہر ایک کے حال کے ساتھ کثرت سے اس کے کلام کا انتخاب دیا ہے۔ مثلاً خود مؤلف تذکرہ کے حالات، کے بعد اس کی غزلیات کا پورا دیوان درج ہے.........."[1]

لیکن مولوی عبدالحق نے تحشیہ میں یہ واضح کیا ہے کہ حیدر آباد میں جو نسخہ مرتب ہوا اور لاہور سے شائع ہوا اس میں ۶۹ شعراء کا ذکر ہے۔

بقیہ شعراء کے حال کا ترجمہ لطف دوسری جلد میں کرنا چاہتے تھے لیکن دوسری جلد کا سراغ نہیں ملتا شاید لکھی ہی نہیں گئی۔ اس سلسلے میں لطف کا بیان یوں ہے :-

گلگشت کرنے والوں سے چمنستان نازک خیالی کے پوشیدہ نہ رہے کہ مخلص ہیچ بے استعدادی نے حسب الارشاد صاحب عالی شان مرقوم الصدر کے گلشن ہند کی دو جلدیں کی ہیں۔ جلد اول جو تحریر کی جاتی ہے اس میں عرش پرواز یان سلاطین نامدار کی اور گوہر باریاں امرائے عالی مقدار کی۔ اور سخن تراشیاں شعرائے صاحب وقار کی، جو کہ نام آور صاحب دیوان تھے۔ بیان کی گئی ہیں اور جلد دوم میں مذکور کئے گئے ہیں شعرائے گم نام غیر مشہور۔ یا وہ نو مشق ابھی نہیں تمام کر چکے ہیں، کہانی شمع و پروانہ اور گل و بلبل کی۔"[2]

---

[1] خطبات گارساں دی تاسی مرتبہ مولوی عبدالحق ص ۱۳۔ [2] دیباچہ گلشن ہند بحوالہ گل کرسٹ اور اسکا عہد عتیق صدیقی ص ۲۲۸، ۲۲۹۔

گویا لطفؔ کے نزدیک سراجؔ اورنگ آبادی گمنام اور غیر مشہور شاعر تھے۔ انہوں نے جلد اول میں انکا ذکر نہیں کیا ہے۔ لطفؔ نے دیباچے میں قطعۂ تاریخ بھی درج کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"اس ہیچ مداں نے یہ تذکرہ لکھا اور نام اس کا بموجب ارشاد اسی صاحب ممدوح کے گلشن ہند رکھا.......... تاریخ نظم اسکی اس طور پر لکھی گئی ؎

ہر ایک گل ہمیشہ بہار اس حدیقہ کا — کہتا ہے یوں خزاں سے کہ "تو کیا پلشت ہے"
حیران پھرے ہیں لے سروپا بہمن ودے — تاریخ اسکی جب سے "رشک۔ بہشت ہے"[1]

۱۲ = ۱۰ + ۲ — ۱۲۲۷ - ۱۲ = ۱۲۱۵ھ

لطفؔ کا تذکرہ، گلشن ہند اگرچہ ۱۸۰۱ء میں مرتب ہو چکا تھا لیکن بد قسمتی سے اسے اشاعت نصیب نہ ہو سکی۔ اور ایک طویل عرصے تک اس کے خطی نسخے بھی گوشۂ گمنامی میں پڑے رہے۔ اس کی بازیابی کی داستان بھی حیرت انگیز ہے۔ ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲ء میں حیدر آباد دکن کی ندی میں سیلاب آیا۔ اس سیلاب میں کسی آفت زدہ کا کتب خانہ بھی بہہ نکلا جس میں گلشن ہند کا نسخہ بھی شامل تھا۔ جو مولوی غلام محمد کے ہاتھ لگا۔ انہوں نے علامہ شبلی کو دکھایا۔ جنھوں نے اس نسخے کی تصحیح کی اور کچھ نوٹ بھی لگایا جس کو عبداللہ خاں نے ۱۹۰۶ء میں رفاہ عام پریس لاہور سے چھپوا کر حیدر آباد دکن سے شائع کیا۔ اس میں مولوی عبدالحق کا عالمانہ مقدمہ بھی شامل ہے۔ یوں ایک صدی کے بعد گلشن ہند کو پہلی بار طباعت نصیب ہوئی۔ بعد میں اسے تذکرہ گلزار ابراہیم کے ساتھ بھی شامل کیا گیا لیکن دوسری اشاعت میں لطفؔ کا دیباچہ خارج کر دیا گیا اور لطفؔ کا خود اپنا بیان بھی نکال دیا گیا۔ اور بہت سے اضافے بھی کئے گئے۔ تا حال گلشن ہند کے بارہ قلمی نسخے دریافت ہو چکے ہیں[2]

---

[1] دیباچہ گلشن ہند بحوالہ گل کرسٹ اور اسکا عہد۔ عتیق صدیقی ص ۲۲۸۔

[2] لطف حیات اور کارنامے۔ مرزا اکبر علی بیگ ص ۱۳۰۔

سید محمد محی الدین قادری زور نے گلزار ابراہیم کے مقدمہ[1] میں گلشن ہند سے سرسری تقابلی
مطالعہ کرتے ہوئے چند ایسے نکات بیان کئے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لطف نے جو اضافے کئے
ہیں وہ کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ مثلاً لطف نے شاہ عالم آفتاب ابوالحسن تانا شاہ، آصف الدولہ
آصف، عمدۃ الملک امیر خاں انجام، قزلباش خاں امید اور سراج الدین علی خاں آرزو کے ذکر میں
بہت زیادہ اور بہت مفید تاریخی حالات کا اضافہ کیا ہے۔ فقیر اور قائم سے متعلق بھی قابل قدر اضافہ
کیا گیا ہے۔ قائم کی وفات کا ذکر بھی لطف کا اضافہ ہے۔ لیکن اکثر موقعوں پر اصل مصنف کے ذاتی
خیالات اور اس کی پسند کو لطف نے حذف کر دیا ہے۔ اکثر جگہ انہوں نے اپنے مذہبی عقائد کی تبلیغ
بھی کی ہے۔

زبان و بیان کے لحاظ سے گلشن ہند فورٹ ولیم کالج کے خاص معیار سے ذرا مختلف نظر
آتی ہے یعنی اس میں "بول چال" کی زبان کا استعمال بہت کم ہوا ہے۔ حالانکہ یہ ترجمہ بھی گل کرسٹ نے
"صاحبان نوآموز" کے لئے ترتیب دلوایا تھا اور یہ بات لطف پر بھی واضح تھی۔ خود فرماتے ہیں:-

"مدعائے دل اس صاحب عالی تدبیر کا یہ معلوم ہوا کہ ان فارسی کتابوں کے ہندی
نثر کرنے سے مراد ہمیں یہ ہے کہ صاحبان انگریز تازہ ولایت سے جو آتے ہیں ہم
انکی ترتیب کے لئے سارا یہ خون جگر کھاتے ہیں تا کہ ان کے ذہن میں آسانی سے
یہ عبارت آوے اور انکی طبیعت اس سے کوئی مزہ اٹھا دے تو بس لازم ہے کہ
اس عبارت میں لفظ عربی اگر آوے تو ایسا جس کو مبتدی دیکھ کر کہیں سبحان اللہ
اور لفظ فارسی جگہ پاوے تو ویسا جس کو نو مشق پڑھ کر کہیں واہ واہ"[2]

---

[1] مقدمہ گلزار ابراہیم مشمولہ گلشن ہند (مع گلزار ابراہیم) ص ۹ تا ۵۷۔ [2] دیباچہ گلشن ہند، از لطف ص ۱۲، اسلامیہ پریس ص ۱۸۸۲ء (?)

لیکن لطفؔ نے عام طور سے رنگین بیانی سے کام لیا ہے۔ سادہ اور سلیس نثر کی بجائے مسجع اور مقفیٰ عبارتوں کا اہتمام کیا ہے۔ کہیں کہیں تو یہ اہتمام بہت گراں گزرتا ہے۔ ایک نمونہ درج کیا جاتا ہے:۔

"اس مدبر نے زخمی ہو کر حوضی میں لپٹ جانے کو غنیمت جانا اور تختوں کی آڑ کو وسیلہ زندگانی کا گردانا۔ غرض لڑائی بگڑ گئی بہت سے لوگ رام نرائن کے ساتھ مارے گئے اور کچھ تھوڑے سے لوگ بھاگ بھی بچا رے گئے۔"[۱]

لطفؔ نے گلشن ہند میں جگہ جگہ اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ وہ اردو نثر کے مزاج سے ناواقف ہیں۔ انہوں نے جملوں میں فارسی اسلوب اختیار کیا ہے جس سے تعقید کا نقص بھی آگیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"از بسکہ رسم کہن ہے کہ بادشاہ اور وزیر واسطے نام کے، عہد حکومت اپنے میں، نئے شہر کے آباد کرنے کی تلاش کرتے ہیں۔"[۲]

چنانچہ سید عبداللہ خاں اور سید حسین علی خاں نے مع اپنے بھانجے بھتیجوں اور رفیقوں کے، حسن بیگ خاں صف شکن اور زین الدین خاں بہادر خاں کے بیٹے کو مع ان کے رفیقوں کے شریک کر کے ہلا جو کیا تو زنجیر سے توپ خانے کے گھوڑوں کو کُدا کُدا کے مقابل ذوالفقار خاں کے کہ بیٹا اسد خاں وزیر کا تھا، جا پہنچے[۳]

دراصل لطفؔ کے سامنے سادہ اور سلیس اردو کا کوئی نمونہ موجود نہ تھا۔ اس زمانے میں

---

[۱] [۲] گلشن ہند (مع گلزار ابراہیم) ص ۱۰۰۶-

[۳] " " (") ص ۱۵، ۱۶،

فارسی انشاء نگاری سکۂ رائج الوقت کا درجہ رکھتی تھی۔ لطف نے بھی طرز فارسی کی پیروی میں اپنی ساری صلاحیتیں صرف کی ہیں۔ انکے جملوں کی ساخت اور ہیئت فارسی سے مختلف نہیں۔ نمونہ ملاحظہ فرمائیں:۔

"علم نجوم میں بھی دخل بھلا چنگا رکھتے ہیں۔ اور فقر و درویشی میں تو آدھا لکھنؤ معتقد رکھتے ہیں" [1]

لطف نے آصف الدولہ کے انتقال پر قطعۂ تاریخ بھی کہا تھا جو گلشن ہند میں شامل ہے۔ یہ قطعہ کسی کسی نسخے میں یوں ملتا ہے (آخری شعر) ؎

بولے یوں دور کر کے جیب عناد ۱۲۸ — آج گل ہند کا چراغ ہوا
۱۲۱۲ھ = ۱۲۸ - ۱۳۵۰

لیکن زیر نظر مطبوعہ نسخے میں یہ شعر یوں درج ہے ؎

بولے یوں دور کر کے پائے عناد ۱۲۸ — آج گل ہند کا چراغ ہوا [2]
۱۲۱۲ = ۱۲۸-۱۳۵۰

مرزا اکبر علی لطف کی تاریخ گوئی کی تعریف کرتے ہوتے لکھتے ہیں کہ:۔

"لطف کو تاریخ گوئی میں بھی کمال حاصل تھا۔ چنانچہ آصف الدولہ کے انتقال پر جو قطعہ تاریخ کہا ہے وہ یادگار ہے۔ مادۂ تاریخ کے مصرعے (آج گل ہند کا چراغ ہوا) سے "پائے عناد" یعنی (چار) عدد کا تخرجہ کیا ہے" [2]

لیکن مرزا اکبر علی کا بیان درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ مصرع "آج گل ہند کا چراغ ہوا" سے ۱۳۵۰ برآمد ہوتے ہیں ۴ کا تخرجہ کرنے سے ۱۳۴۶ آئے گا جو درست نہیں ہے۔ لطف نے "پائے عناد" کا تخرجہ کیا ہے "پائے عناد" سے ۱۲۸ نکلتے ہیں۔ ۱۳۵۰ میں سے ۱۲۸ کا تخرجہ کرنے سے ۱۲۱۲ ہجری برآمد ہوتا ہے۔ جو درست ہے۔

---

[1] گلشن ہند (مع گلزار ابراہیم) ص ۱۱۵۔ ۱۲

[2] لطف حیات اور کارنامے۔ مرزا اکبر علی بیگ ص ۲۲۲۔

۴۲

دیوانِ جہاں

بینی نرائن جہاں

"دیوانِ جہاں" بینی نرائن جہاں کا دیوان نہیں ہے اس میں حمد، سببِ تالیف اور تھامس رد بک کی مدح کے علاوہ جہاں کی کوئی منظوم تخلیق شامل نہیں ہے۔ یہ شعراء کا ایک تذکرہ ہے۔

جہاں نے تھامس روبک کی فرمائش پر ۱۸۱۲ء میں "دیوانِ جہاں" مرتب کیا تھا۔[1]

گارسن دی تاسی، کریم الدین، محمد یحییٰ تنہا، حامد حسن قادری، سید محمد اور سید رفیق مارہروی نے اس کا سنہ تالیف ۱۲۳۳ھ قرار دیا ہے[2] جو درست نہیں۔

دیوانِ جہاں میں جہاں نے جو سببِ تالیف بیان کیا ہے اس سے علم ہوتا ہے کہ تھامس روبک نے ان کو حکم دیا تھا کہ وہ شعر و غزل کو یکجا کریں۔ چنانچہ جہاں نے اپنے ہمعصر اور دیگر مشہور شعراء کی غزلوں اور اشعار کو جمع کیا اور اسی کا نام دیوانِ جہاں رکھا۔ وہ کہتے ہیں ؎

کیا ارشاد یوں اس نے کرم سے ۔۔۔ تجھے جو لطف کی ہے چشم ہم سے

---

[1] دیوانِ جہاں (غ۔ م) بینی نرائن جہاں ص ۱۷۔ [2] تاریخ ادب ہندوی و ہندوستانی (فرانسیسی) ص ۱۱۶ بحوالہ مقدمہ بہارِ گلشن ص ۷، طبقات شعرائے ہند (طبقہ سوم) ص ۳۶۳، سیر المصنفین ص ۱۴۲، داستان تاریخ اردو ص ۱۲۹، اربابِ نثرِ اردو ص ۲۹۰، ہندوؤں میں اردو حصہ اول، دربارہ نظم ص ۱۹۷۔

تو کر شعر و غزل کتنے فراہم	کریں اس کے صلے کا فکر تا ہم
ہوا یہ بات سنتے ہی میں دلشاد	بجا لایا کیا جو کچھ ارشاد (کذا)
تلاش و سعی تب کر کے فراواں	جو ہیں اس عصر میں باہم سخنداں
انھوں کے جمع کر اشعار یکسر	سواان کے جو تھے نامی سخن ور
انہوں کے بھی غزل اور شعر لکھے	بہ ترتیب و بآئیں جمع کر کے
خدا کے فضل سے دے اس کو انجام	میں دیوان جہاں اسکا رکھا نام[1]

بظاہر دیوان جہاں کو تذکرہ کہنے کا کوئی جواز تو نہیں لیکن یہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے قدیم طرز تذکرہ سے بہت قریب ہے۔ قدما نے جو تذکرے مرتب کئے ان میں بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ ان میں نہ تو شعراء کے حالات پر ہی روشنی پڑتی ہے اور نہ انکی شعری تخلیقات پر ہی ناقدانہ رائے دی گئی ہے۔ بلکہ صرف مختصر تعارف کے بعد نمونہ کلام درج کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ جہاںؔ نے شعراء کا انتخاب کرنے میں جو انداز اختیار کیا وہ قدیم طرز تذکرہ سے ہم آہنگ ہو گیا۔ جہاںؔ نے بھی مختلف شعراء کے تعارف میں چند ہی الفاظ درج کئے ہیں۔ اس کے بعد نمونہ کلام پیش کر دیا ہے۔ ہاں نمونہ کلام میں انہوں نے فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے۔

فورٹ ولیم کالج سے وابستہ اور ہم عصر شاعروں کے سلسلے میں یہ اختصار مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً جہاںؔ افسوس کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

> افسوس تخلص۔ نام شیر علی۔ میر علی مظفر خاں کے بیٹے۔ پہلے تھوڑے دنوں میر سوز سے اصلاح لی۔ بعد اس کے شاگرد ہوئے میر حیدر علی حیراں کے۔ نادرالکے

---

[1] دیوان جہاں (ق۔ ن) بینی نرائن جہاںؔ۔ ق۔ ۔ ۔

رہنے والے کلکتے میں رحلت کی ہے[1]

جواںؔ کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"جواں تخلص ، نام میرزا کاظم علی ، دلی کے رہنے والے ، کلکتہ میں تشریف رکھتے ہیں اور اس فقیر کو بھی انکی خدمت عالی میں نہایت بندگی ہے"[2]

چونکہ جہاںؔ کا مقصد صرف شعراء کا کلام یکجا کرنا تھا اس لئے شعرا کے ذیل میں انہوں نے جو کچھ درج کیا وہی بہت ہے۔

دیوان جہاں کی افادیت اس معنی میں بہت زیادہ ہے کہ اس میں ایسے شعراء کا بھی نمونہ کلام درج ہے جو غیر مقبول وغیر معروف ہیں۔ جہاںؔ قابل ستائش ہیں کہ انہوں نے دیوان جہاں مرتب کرتے وقت اپنے عہد کے شعراء کو اولیت دی۔ ان میں سے بہت سے شعراء تو ایسے ہیں کہ جن سے ہم دیوان جہاں کے توسط سے ہی متعارف ہوتے ہیں۔

دیوان جہاں ۱۲۶ شعراء کے کلام کا انتخاب ہے۔ جہاںؔ نے حروف تہجی کے اعتبار سے شعراء کو جگہ دی ہے۔ چنانچہ اول اول آفتاب (شاہ عالم بادشاہ ابن عالمگیر ثانی) کا ذکر ہے۔ اسکے بعد آصف الدولہ کا۔ ان کے علاوہ مشہور شعراء میں آبروؔ، اثرؔ، احسنؔ، آشفتہؔ، ممنونؔ، جراتؔ، یقینؔ، اور مصحفیؔ کا کلام شامل ہے۔ دیوان جہاں میں مختلف شعراء کے مطلعات، رباعیات اور فردیات کے عنوان قائم کئے گئے ہیں۔ رُباعیات کے ذیل میں جہاںؔ کو سہو ہوا ہے۔ انہوں نے بیشتر قطعات اور غزلوں کے اشعار کو رباعی سمجھا ہے۔ دیوان جہاں کے اختتام پر ۲۵ جولائی ۱۸۱۲ء کو کلکتہ میں منعقد مشاعرے کی غزلیں بھی شامل ہیں جہاںؔ نے دیوان جہاں میں حمد، سبب تالیف اور مدح کے علاوہ اپنی کوئی غزل یا شعر درج

---

[1] [2] دیوان جہاں (مطبوعہ) بینی نرائن جہاں ص ۴۴، ۶۲۔

نہیں کیا ہے۔ مطلعات، رباعیات اور فردیات میں اگر انکا کوئی شعر شامل بھی ہوگا تو اس کی نشاندہی کسی طرح نہیں ہوتی۔ مورخین ادب نے دیوان جہاں میں جہاں کے مشمولات کا ذکر کیا ہے۔ کریم الدین لکھتے ہیں :۔

"اس کتاب میں تین چیزیں ہیں۔ اوّل مناجات اور دیباچہ نظم میں دوسرے اشعار منتخب، تیسرے چند شعر خود مصنف کے"[1]

حامد حسن قادری رقم طراز ہیں :۔

"........ بینی نرائن جہاں نے اپنا کلام تقریباً سب کا سب درج کر دیا ہے۔ گویا یہی تذکرہ دیوان جہاں بھی ہے"[2]

صاحب ارباب نثر اردو لکھتے ہیں :۔

"مولف نے اس میں اپنا بہت سا کلام شریک کر دیا ہے۔ اور کتاب کے آخیر میں اپنی رباعیوں، مطلعوں اور ابیات کا مجموعہ بھی داخل کر کے اسکا حجم بڑھا دیا ہے۔ گویا یہ انکا دیوان بھی ہے۔ اور شعرائے اردو کا تذکرہ بھی۔ اور غالباً اسی مناسبت سے اسکا نام دیوان جہاں رکھا گیا ہے"[3]

یہ سارے بیانات کن نسخوں کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ اسکا علم نہیں ہوتا۔ راقم الحروف کے زیر نظر کلیم الدین کا مرتبہ مطبوعہ نسخہ ہے۔ اسکے علاوہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں اس کا قلمی نسخہ

---

[1] طبقات شعرائے ہند، طبقہ سوم۔ کریم الدین ص ۶۳۔

[2] داستان تاریخ اردو۔ حامد حسن قادری ص ۱۲۹۔

[3] ارباب نثر اردو۔ سید محمد ص ۲۹۳۔

بھی دیکھا ہے جو ۱۸۶ صفحات پر مشتمل ہے اس میں جہاں کا کوئی کلام نظر نہیں آیا۔

دیوان جہاں میں فدوی، درد، سودا، اماتی اور ہوس کی رباعیاں درج ہیں۔ دیگر شعرا کی بھی ہوں تو عجب نہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ رباعیاں بینی نرائن کی بھی ہوں لیکن انکی نشاندہی نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح مطلعوں اور مختلف اشعار کے بارے میں بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بینی نرائن کے ہیں۔ بلکہ یہ بھی مختلف شاعروں کے کلام سے ماخوذ ہیں۔

دیوان جہاں شعرا۔ کا خوبصورت انتخاب ہے۔ اسے کالج کونسل نے بہت پسند کیا تھا اور اس پر جہاں کو انعام دیا گیا تھا[1]۔ جاوید نہال نے "انالس آف دی کالج آف فورٹ ولیم" (ص ۴۲۵) کے حوالے سے انعام کی رقم پانچ سو روپیہ درج کی ہے[2]۔ لیکن مذکورہ صفحے پر انعام کی رقم درج نہیں ہے۔

---
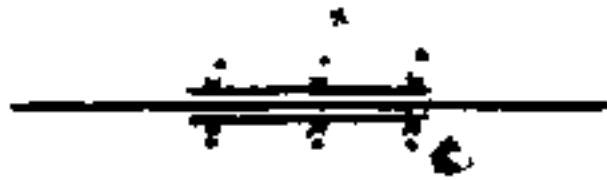
[1] Annals of the College of F.W. Appendix A P. 425

[2] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۶۳۔

(د)

دواوین اور انتخاب

۷۳

دیوان افسوس

میر شیر علی افسوس

افسوس نے سالار جنگ کے بیٹے مرزا نوازش علی خاں کے ایام مصاحبت (۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء تا ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء) میں ہی اپنا دیوان مرتب کر لیا تھا۔ وہ باغ اردو کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

جب تک مرشد زادۂ آفاق صاحب عالم جہاں دار شاہ جنت آرام گاہ رونق افزا لکھنؤ کے ہوئے، تب تلک اسی سرکار[۱] میں بہ عہدۂ مصاحبت سرفراز تھا۔ ان دنوں بھی فکر سخن تھی لیکن تحصیل علوم عربیہ میں نہایت مصروف تھا۔ مشق سخن اس خام طبع کی اہل سخن کے نزدیک پختگی کو پہنچ چکی تھی اور دیوان بھی مرتب ہو چکا تھا۔[۲]

فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کے دوران افسوس نے کالج کے متعلقین کی مدح اور کالج کی تعریف میں ایک طویل نظم شامل کر کے اپنا دیوان کالج کو پیش کیا۔ اسکا ۱۰۲ اوراق پر مشتمل خستہ قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے۔ اسکے آغاز میں کالج کی مہر ثبت ہے۔

دیوان کے آغاز میں فارسی زبان میں دیباچہ درج تھا لیکن اب یہ پھٹ چکا ہے۔ افسوس کے اس دیوان میں قصائد، غزلیات، قطعات/رباعیات، مرثیے اور حمد و سلام وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب

۱؎ سالار جنگ۔ ۲؎ دیباچہ باغ اردو (مطبوعہ)، شیر علی افسوس ص ۲۱، ۲۲۔

حمد و نعت کے بعد خزاں کا بیان کرتے ہیں ۔ پھر مختلف مضامین نظم کرنے کے بعد ایک طویل نظم فورٹ ولیم کالج کے وصف میں درج کی ہے ؎

اس مرتبہ دیکھا جو مجھے سوچ میں ڈوبے	تب دل نے کہا سن کے ذرا کان ادھر کر
اک سرور ہا جود و خرد مند والوالعزم	مصروف ہوا ہے طلب علم کے اوپر
ڈالی ہے بنا مدرسے کی اس لئے اسنے	تا اخذ کریں فن لغت کہتر و مہتر
ہو جائیں زبانوں سے ہر ایک قوم کی آگاہ	صحت سے تلفظ کریں الفاظ کو اکثر
تعلیم و تعلم کا یہ چرچا ہو کہ جاہل	کوئی شرفا میں نہ رہے دہر کے اندر
باعث یہی ان لوگوں کی عزت کا ہوا ہے	....
اب مدرسے کی وصف میں بیتیں وہ کہوں ہیں	رنگت میں جو ہوں خانۂ یاقوت سے خوشتر
ہے ساخت عمارات کی اسکی یہ خوش اسلوب	قربان کیا خانہ دل ایسے مکاں پر
دلچسپ ہے ایسا کوئی جاتا ہے جو اسمیں	جی اس کا نہیں چاہتا پھر آئیے باہر[1]

افسوس نے کالج کے متعلقین میں صاحبان عالی شان، لارڈ ویلزلی، انگریزوں کے عہد اور مسٹر بارلو کی مدح کی ہے۔ دیوان کے اختتام پر بھی لارڈ گورنر، مسٹر بارلو، ایڈمانسٹن، کرنل اسکاٹ، گل کرسٹ اور ہارنگٹن وغیرہ کی مدح درج کی ہے۔ انکے علاوہ کچھ قصائد افسوس کے دوسرے محسنوں سے متعلق ہیں۔ افسوس کے قصائد انکے دلی جذبات اور خلوص کے مظہر ہیں۔

دیوان افسوس میں غزلوں کی تعداد تقریباً ۲۰۰ ہے۔ یہ غزلیں اپنے عہد کے مزاج و معیار سے مطابقت رکھتی ہیں۔ افسوس کا زیادہ تر کلام عاشقانہ ہے۔ چنانچہ اس میں ایک مخصوص طرح کے درد و غم کی

---

[1] دیوان افسوس (ق۔ن) ورق ۱۸۔

فضا پائی جاتی ہے۔ لیکن یہاں سوز وگداز کی شدت نہیں ملتی۔ یہ مثال ملاحظہ ہو ؎

تیری وحشت کی باتوں سے میرے جی میں ہے یہ کھٹکا
کہیں افسوس تیرا ان دنوں میں دل نہ ہو اٹکا
کہیں اس بے وفا کی گرم جوشی پر نہ بھولے دل
جہاں دل لے چکا پھر دیکھ لیجو تو کہ وہ سٹکا
تمہارے بن میں کل کی رات کاٹی اس طرح پیارے
کبھی سر سنگ پر مارا کبھی دیوار پر پٹکا
مری سب عمر سرگرداں ہی پھرتے ہو گئی آخر
نہ پہنچا منزل مقصود کو افسوس میں بھٹکا[1]

افسوس کی بعض غزلیں میر کی طرح چھوٹی بحروں میں بھی ہیں ؎

اس کے کوچے میں جو گیا ہوگا	جیتے جی وہ کہاں پھرا ہوگا
جس کو تیرِ نگہ لگا ہوگا	ایک دم میں وہ مر گیا ہوگا
اس کے اٹھتے ہی جی پر آن بنی	دیکھئے آگے آگے کیا ہوگا

دیوان افسوس میں شامل مرثیے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ مرثیے بہت عمدہ اور پر اثر ہیں۔ ان میں درد و غم کی پوری کیفیت اور سوز و گداز نہاں ہے۔ ان میں منظر کشی بھی ہے ان کے مرثیے کی خاص بات یہ ہے کہ اسکے ہر بند کا آخری شعر زبان فارسی میں ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

آمادۂ سفر ہوئے جب حضرت حسینؑ	ہونے لگا مدینے میں ہر سمت شور و شین

---

[1] دیوان افسوس (ق۔ن) ورق ۴۴، ۴۸۔

خورد کلاں تمام لگے کرنے غم سے بین　　صغرا نے پدر سے کہا بھر کے غم سے نین

از تو نماند تاب جدائی دگر مرا
بہر خدا مرو بسفر یا ببر مرا[1]

اصغر کے حلق پر جو لگا تیر ناگہاں　　لگتے ہی اس کے تن سے گئی جان ناتواں

آخر وہ نونہال ہوا خاک میں نہاں　　یہ حال سن کے رو کے لگی کہنے اسکی ماں

من چوں زیم کہ سینہ من چاک کردہ اند
لخت جگر بریدہ تہہ خاک کردہ اند[2]

دیوان افسوس کے قطعات اور رباعیات مختلف موضوعات کو محیط ہیں۔ اکثر رباعیات تہنیتی ہیں۔ دیوان افسوس کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ افسوس میں بے پناہ شاعرانہ صلاحیتیں تھیں اور زبان و بیان پر انہیں بے حد قدرت حاصل تھی۔

---

(۴۷)

دیوان ولا
مظہر علی خاں ولا

ولا نے گل کرسٹ کی فرمائش پر اپنا دیوان مرتب کرنا شروع کیا۔ لیکن ابھی مکمل نہ ہوسکا تھا کہ

---

[1] [2] دیوان افسوس (ق۔ ان) ورق ۷۷، ۷۸۔

گل کرسٹ نے لندن کا سفر اختیار کیا چنانچہ گل کرسٹ کے قائم مقام CAPT. MOUNT نے اس کام کو انجام دینے کا حکم دیا۔ لیکن دیوان ہنوز نامکمل تھا کہ وہ بھی لندن روانہ ہوگئے۔ لہذا تدوین کا یہ کام پھر رک گیا۔ جب ولیم ہنٹر اور ٹیلر کا عہد آیا تو ولاؔ نے انکے حکم سے اسے ۱۸۱۰ء مطابق ۱۲۲۵ھ میں مکمل کیا۔ اور کالج کونسل میں پیش کیا۔ اس تمام تفصیل کو ولاؔ نے دیوان کے فارسی دیباچے میں اسطرح بیان کیا ہے:۔

بایمای صاحب والا مناقب مدرس مدرسۂ ہندی مسٹر جان گل کرسٹ دام ثروتہ بتدویں پرداختم۔ ہنوز باتمام نرسیدہ بود۔ کہ صاحب معزالیہ عازم ولایت شدند۔ بعد ازاں صاحب عالی مراتب والا مناصب کپتان جیمس موٹ صاحب دام دولتہ کہ در مدرسۂ ہندی قایم مقام صاحب مفخر الیہ شدند و فقیر را ممنون و مرہون انواع الطاف و قدردانی، ساختہ مجدداً باتمام آں امر فرمودند۔ تا فقیر حسب ارشاد صاحب معزالیہ در انصرام آن مشغول بود کہ عزیمت صاحب ممدوح بطرف ولایت ہم گشت لہذا چندے در پردۂ توقف و تعویق ماند۔ آخر الامر صاحب عالی شان .... ڈاکٹر ولیم ہنٹر صاحب دام حشمتہ حقیر را بہ تنظیم و تتمیم آن امر فرمودند۔ فقیر امتثال امر لازم دانستہ باز در اتمام کمر سعی چست بستہ کہ صاحب والا مناقب .... ٹیلر صاحب دام دولتہ کہ قایم مقام کپتان جیمس مویٹ صاحب اند نیز باختتام دکنداں تاکید فرمودند نفقیہ سعی بلیغ بکار بردہ بتاریخ ہفتم ماہ اگست ۱۸۱۰ء عیسوی مطابق پنجم شہر رجب المرجب ۱۲۲۵ھ بروز سہ شنبہ باتمام رسانیدہ بحضور فیض معمور .... لارڈ منٹو گورنر جنرل بہادر ناظم ممالک محروسہ سرکار کمپنی انگریز بہادر متعلق کشور ہند

بہ وساطت صاحبان ذی شان .... صاحبان کونسل دام حشمتہم
مے گزارند[1]

دیوان ولا کا خوشخط قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے۔ یہ ۲۰۶ اوراق کو محیط ہے۔ آغاز میں فورٹ ولیم کالج کی مہر ثبت ہے۔

دیوان وؔلا کے آغاز میں وؔلا کا وہ دیباچہ جو "جہانگیر شاہی" میں شامل ہے، فارسی زبان میں درج ہے۔ اس کے بعد حمد ونعت، شہدائے کربلا اور اماموں کی منقبت ہے۔ پھر مرزا سلیمان شکوہ، آصف الدولہ، نواب سرفراز الدولہ، حسن رضا خاں اور میر کاظم علی جیسے وؔلا کے شفیقوں، محسنوں اور مربیوں کی شان میں قصائد درج ہیں، اس کے بعد وؔلا نے فارسی میں ہی اپنے دیوان کا دیباچہ لکھا ہے۔ یہیں سے دیوان کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔

دیوان ولا کے دیباچے میں وؔلا نے اپنی شاعری کے متعلق یہ معلومات فراہم کی ہیں کہ انہوں نے اپنی عمر کا ایک خاصا حصّہ شعر و شاعری میں صرف کیا ہے۔ اپنے اشعار وہ ماہر سخندان فن کو سنایا کرتے تھے اور داد تحسین بھی وصول کرتے تھے۔ انہوں نے شاعری کی تقریبًا جملہ اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ وؔلا کے الفاظ یوں ہیں :۔

"امابعد احقر العباد مظہر علی خاں عرف مرزا لطف علی متخلص بہ وؔلا بعرجوھر
سناسان گوہر سخن و.............. مضامین نو وکہن پرساند کہ ذرہ اتفر مدتہا
عمر عزیز را درفن ریختہ گوئی صرف نمودہ خذف پارہ ہائے اشعار خود را درنظر
جوہریان بازار سخندانی و ماہران مضامین ومعانی گزرانیدہ بجلبہ تحسین و

---

[1] دیباچہ دیوان وؔلا (ق۔ن)، ورق ۷۔

افریں زیور قبول یافت۔ اگرچہ از مہارت این فن چنانچہ باید بہرہ ندارد بلکہ
محض ہیچ مداں است۔ اما چوں اکثر اوقات غواص فکر لالی ابدار قصیدہ و غزل و
رباعی و قطعہ از بحر طبع بساحل زبان می آورد در فتہ رفتہ مسودات۔ یافت تدوین
بہم رسانیدہ بود[1]

حمد و نعت اور منقبت کے بعد ولا کی غزلوں کا آغاز ہوتا ہے۔ مجموعی طور سے غزلوں کی تعداد
کم و بیش ۲۶۰ ہے۔ ان میں بعض غزلیں طویل ہیں اور بعض مختصر۔ بعض فارسی کی غزلیں بھی شامل
ہیں یہ غزلیں مختلف موضوعات کو محیط ہیں۔ ان میں رجائیت اور رعنائیت بھی ہے نالہ و فریاد بھی۔
انکے عاشقانہ اشعار میں بے باکی اصرار اور تکرار ہے۔ بعض غزلوں پر تصوف کی چھوٹ سی پڑ گئی ہے
ولا کی غزلوں میں انکے عہد کے انتشار و خلفشار کی مختلف تصویریں بھی نظر آجاتی ہیں۔ جن میں تاثیر بھی
ہے اور درد بھی۔ ولا نے تشبیہات و استعارات کا بہترین استعمال کیا ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو ـ

دل کا مرے اے لالہ رخاں حال زبوں ہے — سرتا بقدم داغ ہے اور غرق بخوں ہے
خنجر ہے مژہ تیغ نگہ غمزہ ہے جادو — کاکل ہے بلا زلف تری سحر و فسوں ہے
بیتابی دل نے تو کیا اتنا ہی مضطر — نے خواب و خور اس بن مجھے نے صبر و سکوں ہے
گلشن میں یہی شور نغما (کذا) کرتی ہے بلبل — ہے جوش و خروش ان دنوں (ز) تازہ جنوں ہے
تو بحر (کذا) شگوں باندھ لے فتراک سے ظالم — گو صید یہ لاغر ہے دگر زشت و زبوں ہے

پھڑکے ہے ولا باز و تو لیتے ہے دو تیر آنکھ
گر آن ملے یار تو اچھا یہ شگوں ہے[2]

---

[1] دیوان ولا (ق۔ن) ورق ۱۰،۱۵۸۔

ولاؔ نے بعض غزلیں میرؔ کی طرح چھوٹی بحروں میں کہی ہیں ؎

جی اس پہ کروں نثار اپنا ۔۔۔ ہووے جو وہ ہمکنار اپنا
مانند حباب کوئی دم ہیں ۔۔۔ جینا ہے یہ مستعار اپنا
جانے سے ترے برنگ سیماب ۔۔۔ جاتا ہی رہا قرار اپنا
ہے تیری ہی جستجو شب و روز ۔۔۔ بتلاؤں میں کیا شعار اپنا[1]

---

(۷۵)

گلدستۂ حیدری

حیدر بخش حیدری

حیدریؔ نے گلدستۂ حیدری ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء میں ترتیب دیا تھا۔ اس میں انکی کچھ مختصر کہانیاں، دیوان، دیباچۂ لیلیٰ مجنوں اور تذکرہ گلشن ہند شامل ہے۔ حیدریؔ گلدستۂ حیدری کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

"......... حاصل کلام اس گفتگو سے یہ ہے کہ خدمت گزاری سے بزرگوں اور فرمانبرداری سے دوستوں کی اس فقیر کو فرصت اتنی نہ ملی کہ جو کچھ واہیات بکا تھا اسے جمع کرتا۔ اب بارہ سو پندرہ ہجری میں عنایات و تفضلات سے صاحبان عالی شان والا خاندان مسٹر جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کے ایک صورت اطمینان کی ہے اور مفارقت میں یاران قدیم اور دوستان صمیم کے اوقات یوں ہی گزرتی ہے۔ اس واسطے چند قصے زبان ریختہ ہندی میں موافق

[1] دیوان ولا، ق (۱) ، ق (۲۹)

اردوئے معلیٰ کے نثر کئے گئے۔ جیسے قصہ حاتم طائی اور مہر و ماہ کا قصہ اور طوطی نامہ نخشبی اور قصہ لیلیٰ مجنوں کہ جو حضرت امیر خسرو دہلوی مرید حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اپنے خمسے میں لکھا ہے، لکھے گئے۔ اور چند اشعار پریشان اور کئی مخمس وچند قطعہ جو اس ہیچ مداں نے تصنیف کئے سوا حاطہ تحریر میں آئے اور اس مجموعہ بے سر رشتہ و بے محاورہ کو جو اس بے سر و پا نے جمع کیا ہے نام اس اوراق پریشان کا گلدستۂ حیدری رکھا ہے"[1]

گلدستۂ حیدری کے متعلق گارسن دی تاسی نے کہا ہے:۔

"اس کے مؤلف حیدر بخش حیدری ہیں جو اس صدی کی ابتدا میں بہت بڑے مصنف گزرے ہیں۔ اس گلدستے میں علاوہ قصوں اور لطیفوں کے ایک دیوان اور ہندوستانی شعرا کا ایک تذکرہ ہے"[2]

گلدستہ حیدری ۱۸۰۳ء میں طبع ہو گیا تھا۔ اس میں تین سو صفحات تھے۔ ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں گل کرسٹ نے اس پر دو سو روپے کے انعام کی تجویز پیش کی تھی[3]۔ لیکن اس فہرست کو کالج کونسل نے نامنظور کر دیا تھا[4]۔

---

[1] دیباچہ گلدستہ حیدری (ق۔ن) برٹش میوزیم لندن ص ۷ بحوالہ مقدمہ دیوان حیدری (مطبوعہ) ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۱۳۔ [2] خطبات گارسن دی تاسی مرتبہ مولوی عبدالحق ص ۱۰۱۔

[3] Proceedings of the College of F.W. Vol. 559 P. 278

[4] ڈاکٹر عبادت بریلوی نے گلزار دانش کے مقدمے (ص ۲۳) میں عتیق صدیقی (گل کرسٹ اور اسکا عہد) کے حوالے سے گلدستہ حیدری کیلئے دو سو روپیہ کا انعام ملنے کا ذکر کیا ہے لیکن نہ تو حیدری کو یہ انعام ملا تھا اور نہ ہی عتیق صدیقی نے ایسی کوئی بات لکھی ہے۔

گلدستۂ حیدری کا کوئی قلمی یا مطبوعہ نسخہ راقم الحروف کو نہ مل سکا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کو اسکا قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آکسفورڈ کے کتب خانوں میں دستیاب ہوا۔ چنانچہ انہوں نے گلدستۂ حیدری کی کہانیوں کو "مختصر کہانیاں" کے نام سے۔ دیوان کو "دیوان حیدری" اور تذکرہ گلشن ہند کو "تذکرۂ حیدری" کے نام سے تین کتابوں کی شکل میں مقدمے کے ساتھ پاکستان سے شائع کر دیا ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کو حیدری کی کل ایک سو اسّی کہانیاں دستیاب ہوئی تھیں لیکن مگر ان میں سے بعض کو انہوں نے بربنائے کثافت حذف کر دیا۔ چنانچہ مطبوعہ "مختصر کہانیاں" ایک سو چوہتر چھوٹی بڑی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ یہ کہانیاں اپنی ساخت اور خد وخال میں مختصر افسانے اور حکایات سے مشابہ ہیں۔ ان میں مختلف موضوعات کو بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ حیات انسانی کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کہانیوں سے اس عہد کے فکری اور تہذیبی سرشتوں کا بھی علم ہوتا ہے۔ یہ بے حد دلچسپ اور مزاحیہ ہیں۔ بعض کہانیاں حضرت پیغمبر صلعم، حضرت علیؓ، جناب حسنینؓ، حضرت زین العابدین، امام باقر اور امام جعفر صادق وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

حیدری کی یہ کہانیاں زبان اور اسلوب بیان کا بہت عمدہ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ دو تین سطروں سے لیکر تین صفحات کو محیط ان کہانیوں میں حیدری نے واقعات کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ انکی زبان آسان اور سادہ ہے کہیں کہیں وہ محاوروں اور ضرب الامثال کا استعمال بھی بڑے سلیقے سے کرتے ہیں۔ انہوں نے اکثر محاوروں کو نظم بھی کیا ہے۔ بعض کہانیوں کے مکالمے اور بیانات سے گفتگو کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ حیدری نے اکثر و بیشتر روزمرہ کے الفاظ کو بھی اسی لب ولہجے میں استعمال کیا ہے۔ مندرجہ ذیل مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ان سے کہانیوں کی زبان وبیان کی خصوصیات واضح ہو جاتی ہیں:۔

"سنا ہے کہ ایک آزاد کسی مسجد میں بیٹھا ہوا بھنگ رگڑتا تھا۔ ایک حبشی نے اپنی کھڑکی سے

دیکھ کر کہا کہ "اے بے وحدت! یہ خانۂ خدا ہے یہاں سر جھکاتے ہیں اور ما تھا رگڑتے ہیں تو سبزی گھونٹتا ہے"۔ اس نے سر اٹھا کر کہا کہ "ذرا آئینہ دیکھ! انہیں خوشامدوں سے منھ کالا ہوا ہے"۔[1]

"سنا ہے کہ دو چار شخص عقلمند ایک عورت بے وقوف کو اپنے ساتھ لیکر کسی شہر چلے۔ اور ایک دریا میں مع اسباب غرق ہوتے۔ بعد ایک ساعت کے وہ سب خالی ہاتھ نکلے اور اپنے مال کو کنارے بیٹھ کر رونے لگے پھر جو کچھ ان کے جی میں آیا تو اس دریا میں کود ے اور اپنا اپنا اسباب نکال لائے۔ جب ایک مرد نے اس عورت سے کہا کہ "بی بی! تو بھی اپنی چیزیں نکال تب اس نے کہا کہ تم نے نہیں سنا ہے

جن ڈھونڈا تن پائیاں گہرے پانی بیٹھ

میں باوری ڈوبن ڈری رہی کنارے بیٹھ"[1]

حیدری کی بعض کہانیاں کسی قدر اختلاف و مماثلت سے "نقلیات" (THE HINDEE STORY TELLER) میں بھی ملتی ہے۔

حیدری صرف بہترین نثار ہی نہیں بلکہ اعلیٰ پایہ کے شاعر بھی تھے۔ انکی شاعری انکے ذاتی جذبات و احساسات کی آئینہ دار ہے۔ چنانچہ اس میں جو نالۂ دل۔ سوز و گداز۔ کسک اور جلن نمایاں ہے وہ فرضی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ حیدری نے دیوان حیدری میں اس واقعے کا ذکر کیا ہے جس کی وجہ سے وہ اشعار کی زبان میں اپنا درد و غم بیان کرنے پر مجبور ہو گئے۔ حیدری لکھتے ہیں :۔

"موشگافان شاہد معانی اور غواصان بحر سخن دانی پر روشن ہو کہ یہ ضعیف خیف

---

[1] مختصر کہانیاں۔ حیدری مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۲۸۳، ۲۱۸۔

ہیچ مداں، آمادۂ بے ہنری، حیدر بخش متخلص بہ حیدری ابتدائے جوانی سے ایک نازنین مہ جبین، دل آرام، نازک اندام، گل عذار، پری دیدار کے دام میں پھنسا۔ بیت........... اسی حالت میں بلبل قفسی کی مانند نالہائے حزیں موزون کرنے لگا آخر چند روز کے عرصے میں ایک مجموعہ اشعار کا بنا۔ تب چند فقرے نثر کے بھی بطور تالیف و تصنیف کے اس سے الحاق کر کے صاحبان عالی طبیعت کے آگے بطریق ہدایہ و نذر کے رکھدیا۔ امیدوار اس بات کا ہے کہ اسکو چشم لطف سے ملاحظہ فرمائیں اور اس کے رطب و یابس پر نہ جائیں۔ کیوں کہ کلام کسی بشر کا بلندی و پستی سے خالی نہیں پھر مجھ سے بشر کے سخن میں اگر عیب ہوں تو کیا تعجب ہے۔ میں نے شعر گوئی میں کچھ کمال نہیں پیدا کیا۔ بلکہ عروض اور قافیے کو بھی بخوبی نہیں دیکھا۔"[1]

دیوان حیدری غزلیات، قطعات، مخمس، اشتیاق نامہ اور قصائد و مدح پر مشتمل ہے۔ بعض قطعات اور مخمس جو غیر اہم تھے اور بعض قطعات جو فحش تھے انہیں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے حذف کر دیا ہے۔ دیوان حیدری کے مطالعے سے حیدری کی زندگی کے بہت سے گوشے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ انکی شاعری فنی نقطۂ نظر سے خواہ زیادہ بلند نہ ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ بعض جگہ حیدری نے بڑی قادر الکلامی کا مظاہرہ کیا ہے "تعریف بنارس" اور "در تعریف سراپائے جاناں" اور "اشتیاق نامہ" میں وہ پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ حیدری کی غزلوں کے مضامین میں تنوع نہیں ہے۔ یہ عاشقانہ جذبات کے زیر اثر ہیں۔ لیکن اس پر اس لئے گرفت نہیں کی جا سکتی کہ انکی شاعری کا محرک ہی

---

[1] دیوان حیدری (ق۔ن)، باڈلین آکسفورڈ ص ۲۸۲ بحوالہ پیش لفظ دیوان حیدری ص ۳، ۴۔

واقعۂ عشق ہے۔ اور حیدری نے شاعری کو اپنے جذبات واحساسات کے اظہار کے وسیلے کے طور پر اختیار کیا تھا۔ حیدری نے بڑی سادگی اور دلکشی سے اپنے احساسات کو بیان کیا ہے۔ ان میں گہرائی، گیرائی اور تاثیر کی کمی ضرور ہے۔ لیکن انداز بیان بہت شیریں ہے۔ مثال ملاحظہ ہو ؎

کب اسے بھاتی ہے یارو! بوئے گل اور سیر باغ
نکہت گل سے پریشاں جسکا ہوتا ہے دماغ

اس طرح روشن ہے داغ ہجر سینے میں مرے
جس طرح اجڑے نگر میں آہ! جلتا ہے چراغ

اب خدا جانے ہوا گم زلف میں کس کی یہ دل
شام سے لے صبح تک ڈھونڈا نہ پایا کچھ سراغ

کیا ہی دکھلاتا ہوں اپنی اس کو میں بدمستیاں
ساقیا! بھر دے مجھے گر اس گھڑی مے کا ایاغ

سامنے جس کے فرشتہ بھی نہ کر سکتا ہو بات
حیدری مشکل ہے واں پیغام کا تیرے بلاغ[1]

حیدری کی بعض غزلیں چھوٹی اور بعض طویل بحروں میں بھی ہیں۔ انہوں نے گل کرسٹ کا قصیدہ بھی درج کیا ہے۔ حیدری کے قطعات اگرچہ اعلیٰ فن کے نمائندے نہیں ہیں لیکن اثر سے خالی نہیں ہیں۔ مثلاً ؎

یہی پیغام اے صبا! جاکر اس تغافل شعار سے کہدے

---

[1] دیوان حیدری ص ۹۶، ۹۷۔

جاں بلب ہوں میں تیری فرقت میں ‏ ‏ ‏ ‏ تو ہی میری طرف سے غافل ہے[1]

حیدری نے تذکرۂ گلشن ہند ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۸۰۰ء میں ترتیب دیا تھا۔ خاتمے کے قطعہ سے سنہ تکمیل کا علم ہوتا ہے۔ قطعہ۔

مرتب کر چکا جب تذکرہ میں ‏ ‏ ‏ ‏ زروئے حق یہ بولے شیخ اور رند

کہی تاریخ اس کی حیدری خوب ‏ ‏ ‏ ‏ اسے کہتا ہے ہر ایک گلشن ہند[2]

حیدری نے تذکرۂ گلشن ہند پر نظر ثانی کا کام ۱۸۰۱ء میں شروع کیا تھا۔ مگر یہ مکمل نہ ہو سکا ۱۸۰۲ء میں پھر نظر ثانی کا کام شروع کیا اور بعض جگہ سنین میں بھی تبدیلی کی[3]۔ حیدری "گلشن ہند" کے دیباچے میں سبب تالیف بیان کرتے ہیں :-

"بعد اس کے صاحبان طبیعت پر معلوم ہو کہ سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری

---

[1] دیوان حیدری ص ۱۴۹۔

[2] تذکرۂ حیدری ص ۱۲۴۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی اور مرزا اکبر علی مذکورہ تذکرے کا سنہ تکمیل ۱۲۱۵ھ تسلیم کرتے ہیں اور مندرجہ بالا قطعہ کا حوالہ دیتے ہیں لیکن تذکرۂ حیدری مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی میں آخری مصرع "اسے کہتا ہے ہر ایک گلشن ہند" اور "مرزا لطف حیات و کارنامے" (مرزا اکبر علی) میں "اسے کہتا ہے ہر اک گلشن ہند" چھپ گیا ہے۔ راقم الحروف نے مذکورہ بالا قطعہ تذکرۂ حیدری مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی سے نقل کیا ہے اس لئے جوں کا توں لکھ دیا ورنہ مصرع یوں ہونا چاہیئے ؎

"اسے کہتا ہے ہر یک گلشن ہند + زروئے حق

۱۲۰۶ + ۸ = ۱۲۱۴ھ

[3] مرزا علی لطف حیات اور کارنامے ص ۱۱۵۔

خلف سید ابوالحسن نجفی ساکن دلی، شاگرد و قبلہ کونین مولوی غلام حسین غازیپوری تعلیم یافتہ مجلس نواب ابراہیم علی خاں بہادر مرحوم سنہ بارہ سو چودہ ہجری میں اکیسویں رجب کو تری کی راہ میں بنارس سے مرشد آباد کی طرف روانہ ہوا بعد قطع منزل غازیپور کے قریب پہنچا۔ وہاں مرزا محمد علی مرزا محمد فاضل کے بیٹے، دلی کے رہنے والے سے، کہ وہ بھی ایک کشتی میں سوار ہوئے اسی سمت کو آتے تھے، ملاقات ہوئی۔ صاحب سلامت پیدا کی۔ یہاں تک کہ اکثر اوقات ان کے پاس جا کر بیٹھا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بھی مہربانی فرماتے تھے اور طبع بھی موزوں رکھتے تھے اسی سبب سے ذکر شعر و سخن بہم ہوا کرتا تھا۔

ایک دن وہ کہنے لگے کہ میرے پاس ہندی کے دیوان متعدد ہیں۔ انکی سیر کرو اور اچھے اشعار ان میں سے انتخاب کرکے ترتیب دو جو تمہاری یادگاری رہے۔

اگرچہ طبیعت اس فقیر کی صعوبات سفر اور تکالیف زمانہ سے ہر آن میں متوش رہتی تھی لیکن انکی خاطر از بسکہ عزیز تھی، وے دیوان دیکھے موافق اپنے حوصلے کے اشعار چنے اور نام انکے مصنفوں کے بہ قدر تحقیقات کے احاطۂ تحریر میں لاکر اس تذکرے کا نام گلشن ہندی رکھا۔[1]

گلدستۂ حیدری میں درج شدہ ایک بیان میں حیدری تذکرۂ گلشن ہند کا ذکر یوں کرتے ہیں:۔

"اس احقر نے موافق اپنی محنت و مشقت کے چھ سات برس میں ان بزرگوں کے

---

[1] تذکرۂ حیدری مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۴۱، ۴۲۔

نام مع اشعار و تخلص کے جمع کئے اور گئی جز بخوبی تمام لکھے۔ افسوس یہ ہے کہ دو جز حرف شین سے لیکر تا حرف ی خدا جانے کیا ہوئے اسواسطے نوبت تحریر حرف یا تک نہ پہنچی۔ انشاء اللہ تعالیٰ اگر زمانہ اسی صورت سے قدرے رفاقت کرتا ہے تو یہ خاکسار پھر نئے سر سے احوال ان شعراؤں کا خاطر خواہ لکھتا ہے ــــ اور یہ جلد دو چار جز کی کلام واہیات سے تیار ہوئی سو دستگیری سے منشی میر بہادر علی صاحب قبلہ دام اقبالہ کی ...."[1]

ڈاکٹر اکبر علی حیدری کے ان دونوں بیانات کو دروغ گوئی سے تعبیر کرتے ہوئے گلشن ہند کو تذکرۂ ابراہیم کا ترجمہ و تلخیص قرار دیتے ہیں[2]۔ اور ان دونوں تذکروں کے تقابلی مطالعے سے اسے ثابت بھی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر مختار الدین آرزو نے تذکرۂ گلشن ہند (حیدری) میں حیدری کی بعض غلطیوں کی نشاندہی تو کی ہے لیکن اس نکتے کی جانب غالباً انہوں نے توجہ نہ کی۔

تذکرۂ گلشن ہند سے مثال ملاحظہ ہو :۔

"انجام تخلص دہلوی، مخاطب بہ عمدۃ الملک امیر خاں، جلالت خاندان کہ بیچ پہلی اور مکرنی و ٹھٹھائی و فارسی و ریختہ کے ثانی اپنا نہ رکھتے تھے۔ محمد شاہ بادشاہ فردوس آرام گاہ کے وقت میں کٹاری لگی اور طوطی روح ان کی باغ رضوان کو پرواز کر گئی۔ یہ تصنیف خاص ہے ؎

ٹک تو فرصت دے کہ رخصت ہو چلیں صیاد ہم   مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آباد ہم

---

[1] گلدستۂ حیدری (ق۔ن) برٹش میوزیم لندن و بارڈلین آکسفورڈ ص ۲۲۳ بحوالہ مقدمہ تذکرۂ حیدری۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۲۴۔ [2] مرزا علی لطف حیات اور کارنامے۔ ڈاکٹر اکبر علی ص ۱۱۷، ۱۱۸۔

کیوں بلایا پھر میں کیا مجھے نادانی ہوئی (کذا) دختر رز بزم میں آ شرم سے پانی ہوئی [1]

۷۶

سبھا بلاس

للوجی لال کوی

"سبھا بلاس" برج بھاشا میں مختلف شعرا کی پسندیدہ نظموں کا انتخاب ہے۔ اسے للوجی نے
[illegible]یب دیا تھا۔ وہ خاتمے پر لکھتے ہیں ؎

سنگرہ کری کوی لال نے رچیو کا دیہ رس راس
دھریو نام یا گرنتھ کو یا تیں سبھا بلاس [2]

سبھا بلاس ۱۸۱۵ء میں طبع ہوئی۔ [3] صاحب ارباب نثر اردو نے اسکا سنہ طباعت ۱۸۱۰ء درج
[illegible] یہ درست نہیں۔ ۱۶ جنوری ۱۸۱۵ء کو تھامس روبک نے ولیم پرائس سے سبھا بلاس پر رائے

---

[1] [illegible]رۂ حیدری (گلشن ہند) مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۲۲۔

[2] [illegible]ابلاس (مطبوعہ) ورق ۲۔

संग्रह करि कवि लाल ने रच्यौ काव्य रस रास।
[illegible] बिलास ॥

[3] [illegible] ولیم کالج جنتری، بگشتی ساگر، ارشنے ۱۸۱۰ [illegible]

مانگی تھی۔ ولیم پرائس نے اسی دن جواب میں لکھا:۔

"انتخاب کار نے میرے کہنے سے ہی آپ سے درخواست کی ہے۔ برج
بھاشا کی بیشتر نظمیں فحش ہونیکی وجہ سے طلبار کو پڑھانے کے قابل نہیں ہیں۔ یہ
صرف منتخب نظموں کا مجموعہ ہے۔ فحش نظمیں اس میں نہیں رکھی گئیں۔ اسلئے نصابی
کتاب کی شکل میں یہ مفید تالیف ہے۔"[1]

سبھا بلاس کا ۱۳۰ اوراق پر مشتمل خستہ کرم خوردہ، مطبوعہ ناقص نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی
آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔ یہ ناگری رسم الخط میں ہے۔ زیر نظر نسخے سے سنہ طباعت کا علم نہیں ہوتا
للو جی اور ولیم پرائس نے سبھا بلاس کو ترتیب دے کر ۱۸۲۸ء میں بھی کلکتہ سے شائع کیا تھا۔[2]

---

[1] فورٹ ولیم کالج (ہندی) الکشی ساگر وارشنے ص ۱۰۶۔
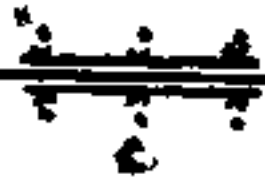
[2] Linguistic Survey of India Vol. IX Part-I P. 27

(۵)

لُغت اور قواعد

(۸۸)

رسالہ گل کرسٹ

گل کرسٹ نے اپنے سلسلۂ لسانیات ہندوستان کے تحت "ہندوستانی زبان کے قواعد" (A Grammar of Hindoostanee Language) تالیف کی جو کرانیکل پریس کلکتہ سے ۱۷۹۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں تھی اور فورٹ ولیم کالج کے نصاب میں بھی شامل تھی۔ "رسالۂ گل کرسٹ" اسی کتاب کی اردو زبان میں تلخیص ہے۔ رسالۂ گل کرسٹ اپنے مؤلف کے سلسلے میں شکوک وشبہات کا شکار ہے۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ کسی بھی نسخے کے سرورق پر مؤلف یا ملخص کا کوئی نام درج نہیں ہے۔ اور دیباچہ بھی سرے سے ندارد ہے۔

گریرسن نے اس رسالہ کو گل کرسٹ کی گرامر کی تلخیص بتایا ہے۔ جسے بہادر علی حسینی نے انجام دیا۔ اور ۱۸۲۰ء میں پہلی بار کلکتہ سے شائع ہوئی[1]

خلیل الرحمن داؤدی نے مولوی کریم الدین کے حوالے سے اسے بہادر علی حسینی کا ہی کارنامہ تسلیم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

"یہ کتاب دراصل دراصل ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی ضخیم الحجم کتاب ہندوستانی زبان کے قواعد مطبوعہ ۱۷۹۶ء کی اردو زبان میں تلخیص ہے۔"[2]

---

[1] Linguistic Survey of India Vol. IX Part I, P. 19

[2] مقدمہ رسالۂ گل کرسٹ از خلیل الرحمن داؤدی ص ۸-۹

ڈاکٹر نیّر اقبال نے لکھا ہے :۔

"گل کرسٹ کی قواعد اور حسینی کی قواعد دونوں بالکل الگ الگ طریقوں پر لکھی ہوئی دو الگ تصنیفیں ہیں جن کو ایک دوسرے کا ماخذ و تلخیص کہنا کسی اعتبار سے بھی جائز نہیں ہے۔"[1]

محمد انصار اللہ نظر نے اس رسالے کو مکمل طور پر گل کرسٹ کا ہی کارنامہ قرار دیا ہے۔[2]

عجیب بات ہے ڈاکٹر نیّر اقبال نے گریرسن کی اس بات کو تو تسلیم کیا ہے کہ یہ رسالہ بہادر علی حسینی سے متعلق ہے لیکن یہ تسلیم نہیں کیا کہ یہ گل کرسٹ کی قواعد کی تلخیص ہے۔ جب گریرسن نے صاف لفظوں میں اسے:۔

"AN ABSTRACT OF GILCHRISTS' GRAMMAR"

لکھا ہے۔ ڈاکٹر نیّر اقبال صرف اتنا ماننے کے لئے تیار ہیں کہ حسینی کے سامنے گل کرسٹ کی قواعد موجود تھی اور اس نے مثالوں کے لئے الفاظ کا بڑا ذخیرہ اسی سے فراہم کیا ہے۔ لیکن انکو برتا اپنے طور پر ہے۔ لیکن نیّر اقبال صاحب کی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر بہادر علی حسینی گل کرسٹ سے الگ قواعد کی کوئی کتاب تالیف کرنا چاہتے تھے تو کیا ضروری تھا کہ نہ صرف الفاظ گل کرسٹ سے مستعار لیتے بلکہ مکمل جملے انہیں کے انداز میں لکھتے۔ انصار اللہ نظر صاحب نے اس جانب توجہ دلائی ہے :۔

"اس کتاب میں جگہ جگہ ایسے جملے نظر آئیں گے :۔

کیا تھا میں۔

دیا میں زید کو روپیہ۔

---

[1] ہفتہ وار ہماری زبان۔ علی گڑھ ۸ر مئی ۱۹۷۲ء۔

[2] قاعدہ ہندی ریختہ تصحیح و تحشیہ ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر ص ۲۱ تا ۲۲۔

ہم کل وہاں گیا ہوں۔

ظاہراً اس قسم کے جملے ایک زبان داں کے قلم سے نکلے ہوئے نہیں معلوم ہوتے۔"[1]

اور اگر یہ کتاب حسینی نے تالیف کی تھی تو اسکا نام رسالۂ گل کرسٹ لکھنے کی بدعت کب ایجاد ہوئی۔

نیرّ اقبال نے انصار اللہ نظر کے اس نظریہ کی تردید (کہ یہ رسالۂ گل کرسٹ کی تالیف ہے) بہت واضح طور سے اپنے ایک دوسرے مضمون میں کر دی ہے[2]۔ خصوصاً فرانسیسی زبان کی وہ ببلوگرافی قابل توجہ ہے جو ۱۸۳۸ء میں گل کرسٹ کی زندگی ہی میں پیرس سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں اس وقت تک شائع ہونے والی گل کرسٹ کی تمام کتابوں کے نام درج ہیں لیکن رسالۂ گل کرسٹ کا نام نہیں ہے جب کہ رسالۂ گل کرسٹ ۱۸۲۰ء میں چھپ چکا تھا۔

انصار اللہ نظر صاحب مولوی کریم الدین کی کسی بات کو قابل اعتبار نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک چونکہ کریم الدین سے حسینی کو شاعر لکھنے کی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا بھی جائز ہے کہ انہوں نے غلطی سے رسالۂ گل کرسٹ کو بھی حسینی سے منسوب کر دیا ہے۔[3]

یہ ایک طفلانہ طرز استدلال ہے۔ ضروری نہیں کہ مولوی کریم الدین کا ہر بیان صرف اسلئے غلط سمجھا جائے کہ انہوں نے حسینی کو شاعر لکھ دیا ہے

انصار اللہ نظر صاحب اپنے دعوے کی دلیل میں مزید لکھتے ہیں:۔

"اس کے قدیم مطبوعہ نسخے اب بھی نایاب نہیں ہیں ان نسخوں کے سرورق پر پوری

---

[1] مقدمہ قاعدۂ ہندی ریختہ معہ رسالۂ گل کرسٹ از انصار اللہ نظر ص ۲۳۔

[2] مشمولہ ہماری زبان ۱۵ر جولائی ۱۹۷۳ء ص ۴۔

[3] مقدمہ قاعدۂ ہندی ریختہ و رسالۂ گل کرسٹ از انصار اللہ نظر ص ۲۱۔

صراحت کے ساتھ گل کرسٹ کا نام اردو اور انگریزی دونوں زبان میں چھپا ہوا ہے۔[1]

"یہ قدیم مطبوعہ نسخے" راقم الحروف کی نظروں سے بھی گزرے ہیں لیکن انکے سرورق پر تو اتنا ہی چھپا ہوا ہے :-

قواعدِ زبان اُردو

مشہور بہ

رسالۂ گل کرسٹ

اس سرورق پر کہیں مرتبہ یا مؤلفہ گل کرسٹ نہیں لکھا ہے۔ اس لئے یہ بات بھی ممکن ہے کہ حسینی نے یا ناشر نے محض اپنی کتاب کی اہمیت کو بڑھانے کے لئے گل کرسٹ کے نام سے فائدہ اٹھایا ہو۔ گل کرسٹ کی مذکورہ "ہندوستانی زبان کے قواعد" (انگریزی) ۱۷۹۶ء میں چھپ چکی تھی۔ اور بہت مشہور ہوئی تھی چونکہ رسالۂ گل کرسٹ بہت بعد میں چھپا اور اسی انگریزی کتاب کی تلخیص تھا اس لئے ماخذ تک رہنمائی کرنے یا شہرت سے فائدہ اٹھانے کے خیال سے گل کرسٹ کا نام لکھنا ضروری سمجھا گیا ہو۔ آج بھی اردو کی قدیم داستانوں کی تلخیص کی جاتی ہے لیکن اصل مصنف کا نام تبدیل نہیں کیا جاتا۔ فسانۂ عجائب اور طلسم ہوش ربا کی ایسی تلخیص آج بھی بازار میں دستیاب ہیں۔

ان حالات میں جب تک دوسرے دستاویزی ثبوت حاصل نہیں ہو جاتے ہمیں گریرسن اور کریم الدین کی اطلاعات پر شک کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ یہ رسالۂ گل کرسٹ کی گرامر کی تلخیص ہے جسے بہادر علی حسینی نے ترتیب دیا۔

---

[1] مقدمہ قاعدۂ ہندی ریختہ عرف رسالۂ گل کرسٹ از انصاراللہ نظر ص ۲۱۔

رسالہ گل کرسٹ ۱۸۲۰ء میں پہلی بار کلکتہ سے شائع ہوا۔ رام بابو سکسینہ[1]، حامد حسن قادری[2] اور محمد یحییٰ تنہا[3] نے اس کی اشاعت کا سنہ ۱۸۱۶ء درج کیا ہے۔ لیکن راقم الحروف کو کسی ایسے مطبوعہ نسخے کا سُراغ نہیں ملا جو ۱۸۲۰ء سے پہلے کا ہو۔

رسالہ گل کرسٹ میں اردو زبان کی قواعد کے صرفی و نحوی اصولوں کے رموز و نکات بیان کئے گئے ہیں۔ یہ دو مقالوں پر مشتمل ہے۔ مقالہ اوّل میں مفردات کا بیان ہے۔ چنانچہ اس میں علم صرف کے تمام مسائل کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس مقالے کے ذیل میں تین بحثیں ہیں۔ بحث اوّل اسم کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس میں چار باب ہیں:-

باب اوّل:- تقسیم میں اسم کی باعتبار اشتقاق اور عدم اشتقاق کے۔

باب دوم:- اسمار بہ اعتبار تعین اور عدم تعین معنی کے۔

باب سوم:- تقسیم میں اسم کی باعتبار دلالت کرنے کے معنی اسمی اور صفتی پر۔

باب چہارم:- تبدیل و عدم تبدیل و تذکیر و تانیث اور اسمار کی حالات اور وحدت و جمعیت کے بیان میں۔

باب چہارم پانچ فصلوں میں منقسم ہے۔ بحث دوم میں فعل کا بیان ہے اس میں دو باب ہیں:-

باب اوّل:- بیان میں بنائے افعال اور اسکی تصریف یعنی گردان کے۔

باب دوم:- اس میں چار فصلیں ہیں۔

بحث سوم میں حروف کا بیان ہے۔ اسی بحث پر مقالہ اوّل ختم ہو جاتا ہے۔ یہ حصہ مقالہ دوم کی بہ نسبت زیادہ طویل ہے۔ اس میں قواعد کے صرفی اصولوں کو بڑی وضاحت اور دلالت سے بیان کیا گیا ہے۔ تذکیر و تانیث کے حصے سے بھی مؤلف کی محنت و کاوش نمایاں ہے۔ بحث دوم کے باب اوّل میں مذکور گردان

---

[1] تاریخ ادب اردو ص ۹۔ [2] داستان تاریخ اردو ص ۱۱۰۔ [3] سیر المصنفین ص ۱۰۱۔

بہت مفید ہے۔ مقالۂ اوّل میں وضاحت کے لئے جا بجا اساتذہ کے اشعار بھی درج کئے گئے ہیں۔

مقالۂ دوم میں مرکبات کا بیان ہے۔ اس میں مرکب تام اور مرکب ناقص کی تمام قسموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ دو بحثوں پر مشتمل ہے۔

بحث اوّل میں مرکب غیر کلامی کا ذکر ہے۔ اور بحث دوم میں کلام و جملہ کا بیان ہے۔

خاتمے پر چار فصلیں ہیں۔ حال، تمیز، نوع اور بعضے فوائد میں۔

رسالۂ گل کرسٹ، اپنے موضوع کے اعتبار سے آج بھی، مفید اور قابل قدر ہے۔ اس میں صرفی و نحوی اصولوں کو اس قدر آسان اور عمدہ طریقے سے بیان کیا گیا ہے کہ نوآموزان بغیر کسی دقت کے مستفیض ہو سکتے ہیں۔ رسالۂ گل کرسٹ میں عام فہم اور آسان انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:۔

"مرکب وہ ہے کہ دو لفظ یا زیادہ سے حاصل ہووے، اس طرح کہ جزو لفظ جزو معنی پر دلالت کرے مثلاً زید کا گھوڑا، جیسے زید دلالت کرتا ہے اپنے معنی پر، اور گھوڑا اپنے معنی پر"[1]

---

(۷۸)

صرفِ اُردو (منظوم)
مولوی امانت اللہ شیدا

شیدا نے "صرف اردو" میں قواعد کے صرفی و نحوی اصولوں کو نظم کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔

---

[1] قواعد زبان اردو ۔ مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی ص ۷۹۔

یہ قواعد ۱۸۰۶ء مطابق ۱۲۲۱ھ میں مکمل ہوئی۔ اس ضمن میں شیدا کا منظوم بیان درج کیا جاتا ہے ؎

الغرض اب خدا کے فضل اوپر — کر توکل میں اس پہ بادھی (کذا) کمر
کہہ وہی فاتح ہدایت ہے — اور وہی خاتم نہایت ہے
یہ رسالہ ہو فضل حق سے تمام — صرف اردو رکھا میں اس کا نام
سن تھے بارہ سی بیت و یک اے یار — کہ یہ کان گہر ہوئی طیار[1]

"صرف اردو" ۱۸۱۰ء میں شائع ہوئی۔ مطبوعہ نسخے کے سرورق پر یہ وضاحت موجود ہے :۔

"
صرفِ اُردو

تصنیف کی ہوئی مولوی امانت اللہ کی، واسطے فوائد کثیر طالبان زبان اردو کے،

عہد حکومت میں............ گورنر جنرل لارڈ منٹو بہادر دام اقبالہ کے نوازش و

اعانت سے صاحبان کالج کونسل کی چھاپی ہوئی ہندوستانی چھاپے خانے میں سنہ ۱۲۲۵ھ

مطابق سنہ ۱۸۱۰ عیسوی"[2]

"صرف اردو" میں منظوم حمد کے بعد صاحبان عالی شان کے قصائد درج ہیں۔ اسکے بعد سبب تالیف

بیان کرتے ہوئے شیدا کہتے ہیں ؎

قاعدے ہر زباں کے ہیں دو دو — صرف اور نحو کہتے ہیں جن کو
ہیں نے (کذا) دونوں اصول قانون کے — اور فروع ان کے ماورا جتنے
صرف ان دونوں میں سے اقدم ہے — لفظ کا مبنیٰ جس سے محکم ہے

---

[1] صرف اردو مطبوعہ ۱۸۱۰ء امانت اللہ شیدا ص ۸۔

[2] سرورق صرف اردو مطبوعہ ۱۸۱۰ء۔

گر......اس قاعدے کا تو احو ط | ہو وے پس گفتگو تری ہی غلط
اپنے رتبے میں گو ھر ایک زباں | حسن ترتیب سے رکھے ہے شاں
ان میں سے پر زبان اُردُو کی | ہے لطافت میں معدن خوبی
کی نظر میں نے جو تامل سے | مشتمل قاعدہ پہ پایا اسے
تب سے خاطر میں میری تھا غلیان | طالبوں کو بتاؤں اس کا نشاں
جب سے تھی صرف اسمیں اکثر و ثابت | نحو سے اس کی میں ہوا ساکت
دوستوں نے مجھے یہ دی تکلیف | صرف کو نظم میں کروں تصنیف[1]

شیدا نے صرف اردو کا آغاز اسم سے کیا ہے۔ اس کے بعد دیگر صرفی و نحوی قاعدوں کا بیان ہے۔ صرف اردو کی فہرست سے علم ہوتا ہے کہ انکی تعداد ۹۸ ہے۔

شیدا نے قواعد جیسے خشک موضوع کو آسان اور عام فہم انداز میں بڑی خوبصورتی سے نظم کیا ہے اور درمیان میں مختلف مثالوں سے وضاحت کی بہت عمدہ کوشش کی ہے۔ انہوں نے مشکل اور ادق الفاظ کی بجائے مناسب اور متوازن الفاظ کا استعمال کیا ہے جو موضوع کے لحاظ سے بہت مشکل کام تھا جس کی بنا پر صرف اردو بہت دلچسپ ہو گئی ہے۔ مثال ملاحظہ ہو ؂

کبھی کرتے ہیں حرف کی تکرار | یاد رکھیو اسے بھی تو دلدار
ایک ہی جنس یا کہ دو میں سے | حرف لا دیں مکرر اے پیارے
شام سے لے کے تا سحر جیسے | محفل رقص میں تھے ہم بیٹھے
یا کہ گھر میں سے جب کہیں نکلا | دو قدم جاتے گھوڑے پر سے گرا

---

[1] صرف اردو (مطبوعہ ۱۸۱۱ء) ص ۷، ۸۔

یا کہے اس کتیں کو مارا کیوں   لا مکر اگر تو چاہے لسیوں[1]

ولیم ٹیلر نے اپنے ایک خط میں کالج کونسل کو لکھا تھا کہ "صرف اردو" ابتدائی درجات میں محاورے اور قواعد کی آسان منظوم شکل میں تعلیم دینے کے لئے خاص طور سے مفید ہوگی۔[2]

---

(۷۹)

HINDEE AND HINDOOSTANEE SELECTIONS,

WHICH ARE PREFIXED, THE RUDIMENTS

OF HINDOOSTANEE AND BRUJ BHAKHA

GRAMMAR, VOL. I

(WILLIAM PRICE) ولیم پرائس

یہ کتاب ولیم پرائس نے بنگال آرمی کے ترجمانوں اور خصوصاً جونیر فوجی ملازمین کی سہولت کیلئے تالیف کی تھی۔ اس تالیف میں تارنی چرن متر کی مدد بھی شامل تھی۔[3] ولیم پرائس نے دیباچے میں لکھا ہے:-

"The following Selection have been made to facilitate, chiefly to the junior members

---

[1] صرف اردو (مطبوعہ ۱۸۱۰ء) ص ۹۹۔ [2] فورٹ ولیم کالج (ہندی) لکشمی ساگر وارشنے ص ۲۰۳۔

[3] Introduction, Hindee and Hindoostanee Selections, P. 11

of the Military Service the acquisition of the prevailing language of Hindoostan." [1]

ولیم پرائس کی یہ تالیف دو جلدوں میں ہے۔ اس کی جلد اوّل ۱۸۲۷ء میں ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی[2]۔ راقم الحروف کو جلد اوّل ہی نیشنل لائبریری کلکتہ میں دستیاب ہوئی۔ اس کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج کی مہر ثبت ہے۔ اس میں بے حد بے ترتیبی سے اوراق لگے ہوئے ہیں۔

کتاب کا آغاز قواعد سے ہوتا ہے۔ چنانچہ اس میں فارسی کی قواعد سے متعلق تمام اصولوں کو بڑی وضاحت اور مثالوں سے سمجھایا گیا ہے۔ ضمیمے میں دیوناگری کے قاعدے اور قوانین کا ذکر ہے۔ اس کتاب میں اسلحوں کی فہرست اور فوجی اصطلاحیں بھی درج ہیں۔

قواعد کے علاوہ "HINDEE EXTRACTS" کے عنوان کے تحت دیوناگری رسم الخط میں پوری "بیتال پچیسی" نقل کی گئی ہے۔ کبیر کے ریختے[3] اور تلسی داس کی رامائن سے بھی اشعار منتخب کئے گے ہیں۔ مزاحیہ کہانیوں میں چھوٹی چھوٹی نقلیں ہیں۔ اس کی بعض نقلیں "نقلیات ہندی" میں بھی ملتی ہیں۔ یہ سب کچھ ناگری رسم الخط میں ہی ہے۔

اس کے علاوہ "سادھارن ہندی گان" میں برج بھاشا کے کچھ گانے درج ہیں۔ یہ پورا حصہ دیوناگری رسم الخط میں ہے۔

اخیر میں ہندوؤں کے مشہور مذہبی تہواروں کی بھی فہرست ہے۔

---

[1] Introduction, Hindee and Hindoostanee Selections. P. 7

[2] Coverpage, Hindee and Hindoostanee Selections.

(٨٠)

AN ENGLISH AND HINDOOSTANEE

NAVAL DICTIONARY.

تھامس روبک

یہ لغت ۱۸۱۱ء میں ہندوستانی پریس سے شائع ہوا[1]۔ اسے تھامس روبک نے گل کرسٹ کے نام معنون کیا ہے۔ اس میں کل ۔۔۔۱۱ اوراق ہیں۔ اسکا ایک مطبوعہ نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔

لغت کے آغاز میں روبک نے پیش لفظ لکھا ہے۔ اس کے آغاز میں وہ لکھتا ہے کہ ہم بہت سے مقامی ملازموں کو اپنے جہازوں پر نوکری دیتے ہیں لیکن ہمارے افسران ان سے خاطر خواہ کام نہیں لے پاتے اس لئے کہ وہ اپنے احکامات ان ملازموں کو سمجھانے میں ناکام رہتے ہیں اسی مقصد سے یہ لغت مرتب کی گئی ہے۔ اسے زیادہ مفید بنانے کے لئے نہ صرف یہ کہ میں نے ان تمام الفاظ کو جمع کر کے ان کا ترجمہ کروایا ہے۔ بلکہ میں نے خود ذاتی مشاہدے کی بنا پر جو الفاظ یا محاورے عام طور پر جہازی ملازمین استعمال کرتے دیکھا ہے انہیں بھی یکجا کیا ہے اور ان تمام اصطلاحوں کو جمع کیا ہے۔ جو جہاز کے علاوہ بھی چلتے ہوتی ہیں۔ اس کام کے لئے میں نے جہاز کے بڑے بڑے [illegible] سے رابطہ قائم کیا ہے۔ اور ان سے

---

[1] Cover page. An English and Hindoostanee Naval Dictionary.

مدد لی ہے۔[1]

اس کے بعد ہندوستانی گرامر سے لغت کا آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ اس میں بہت تفصیل سے ہندوستانی زبان کے قواعد کے رموز و نکات کو واضح کیا گیا ہے اور مثالوں سے بھی سمجھایا گیا ہے۔ قواعد کی مثالیں رومن اور انگریزی میں درج ہیں۔ اس کے علاوہ دنوں، عربی مہینوں اور مزید معلومات کے لئے دیگر چیزوں کے نام بھی درج کئے گئے ہیں۔

قواعد کے بعد جہازی لغت کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ لغت بہت مفید ہے۔ اس میں کثیر تعداد میں الفاظ یکجا کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد احکامات جاری کرنے کے الفاظ اور جہازوں پر استعمال کئے جانے والے محاورے بھی درج ہیں۔

۸۱

STRANGERS EAST INDIAN GUIDE TO THE

EAST INDIAN GUIDE HINDOOSTANEE

گل کرسٹ

گل کرسٹ کی یہ کتاب ۱۸۰۲ء میں چھپی تھی۔ اسکا دوسرا ایڈیشن ہندوستانی پریس سے ۱۸۰۸ء میں چھپا۔[2]

---

[1] Preface, An English and Hindoostanee Naval Dictionary, P1, 2

[2] Coverpage, Strangers East Indian Guide

گل کرسٹ نے یہ کتاب بڑی محنت سے نو وارد انگریز ملازمین کے لئے ترتیب دی تھی، تاکہ وہ ہندوستانی تلفظ اور الفاظ سے واقفیت حاصل کر سکیں۔ اس کے آغاز میں ہندوستانی زبان کے قواعد درج ہیں۔ اس میں ہندوستانی الفاظ کے لئے بھی رومن طرز استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے بعد کچھ گنتیاں وغیرہ درج ہیں۔ پھر دنوں کے نام ہیں۔ اس کے بعد کچھ انگریزی الفاظ اور ان کے ہندوستانی معنی لکھے گئے ہیں جیسے :-

KEY — KUNJEE – KILEED — CHABI

پھر فوجی اصطلاحیں درج ہیں۔ اس کے بعد مختلف فقرے ہیں اور ان کا انگریزی ترجمہ دیا گیا ہے۔ پھر عبارتیں اور انکا انگریزی ترجمہ ہے۔ اس کے بعد میر امن لطفؔ، مرزا کاظم علی جوانؔ اور مرزا علی لطفؔ کی غزلیں اور ان کا انگریزی ترجمہ درج ہے۔ ولیؔ اور حافظؔ کی فارسی غزلیں اور ان کا ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔

غرض یہ کتاب ہندوستانی زبان کے بیشتر نکات کی وضاحت کرتی ہے اور نو وارد انگریزوں کے لئے یہ ایک بیش قیمت تحفے کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۹)

مُتفرّقات

(۸۲)

ENGLISH AND HINDOOSTANEE EXERCISES

تھامس روبک

اسے تھامس روبک نے ۱۸۱۲ء میں ترتیب دیا تھا۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل تھی[۱]۔ اس کا کوئی نسخہ راقم السطور کو دستیاب نہ ہو سکا۔

---

(۸۳)

HINDEE, EXERCISES

(ہندی کی آسان مشقیں)

گل کرسٹ

اسے گل کرسٹ نے فورٹ ولیم کالج (شعبۂ ہندوستانی) کے پہلے اور دوسرے امتحانات کے لئے ترتیب دیا تھا۔ یہ ۱۸۰۱ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی[۲]۔ اسکا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔

---

[۱] فورٹ ولیم کالج (ہندی) لکشمی ساگر وارشنے ص ۱۰۸۔

[۲] Linguistic Survey of India Vol. IX. Part I, P. 17

(۸۴)

NEW THEORY OF PERSIAN VERBS, WITH THEIR HINDOOSTANEE SYNONYMS IN PERSIAN AND ENGLISH

(نوایجاد یعنی نقشۂ افعال فارسی مع مصدرات آں و مترادفات ہندوستانی در فارسی وَ انگریزی) ———— گل کرسٹ

یہ کتاب سنہ ۱۸۰۱ء میں شائع ہوئی۔ اسکا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہوسکا۔

---

(۸۵)

PRACTICAL OUTLINES OR A SKETCH OF HINDOOSTANEE ORTHEOPY IN THE ROMAN CHARACTER

گل کرسٹ

یہ کتاب گل کرسٹ نے تارنی چرن متر کی مدد سے ترتیب دی تھی۔ یہ سنہ ۱۸۰۲ء میں شائع ہوئی۔[۱] راقم الحروف کا اسکا کوئی نسخہ دستیاب ہوسکا۔

---

(۸۶)

TABLES AND PRINCIPLES

گل کرسٹ

گل کرسٹ نے یہ کتاب ۶ر جون سنہ ۱۸۰۲ء کو اشاعت کی اجازت حاصل کرنے کے لئے کالج کونسل کو

---

[۱] Linguistic Survey of India. Vol. IX, Part I, P. 17

پاس بھیجی تھی لیکن ۱۴ر جون کی کاروائی میں کالج کونسل نے اسے شائع کرنے کی اجازت نہیں دی[1]۔ اس کتاب کے متعلق مزید معلومات دستیاب نہ ہو سکی۔

---

(۸۷)

HINDEE ARABIC MIRROR

(ہندی عربی آئینہ)

گل کرسٹ

یہ کتاب ۱۸۰۲ء میں طبع ہوئی[2]۔ گریرسن کے مطابق اس میں ان عربی الفاظ کی فہرست ہے جو ہندوستانی زبان سے واقفیت کے لئے ضروری ہیں[3]۔ مزید معلومات دستیاب نہ ہو سکی۔

---

(۸۸)

ہندوستانی انگریزی لغت

ولیم ہنٹر

کیپٹن جوزف ٹیلر نے ذاتی استعمال کے لئے ایک ہندوستانی انگریزی لغت مرتب کیا تھا۔ جسے ولیم ہنٹر نے کالج کے فاضل منشیوں کی مدد سے نظر ثانی کے بعد ترتیب دیا۔ یہ لغت دو

---

[1] فورٹ ولیم کالج (ہندی) لکشی ساگر وارشنے ص ۵۲، ۵۳۔

[3] Linguistic Survey of India. Vol. IX Part I P. 17

جلدوں میں ہندوستانی پریس سے ۱۸۰۸ء میں طبع ہوا۔[۱]

---

(۸۹)

کھڑی بولی اور انگلش کا لغت

ولیم پرائس

اسے ولیم پرائس نے ترتیب دیا تھا۔ ۲ مارچ ۱۸۱۵ء کو اسے فورٹ ولیم کالج کے لئے منظور کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کی سو جلدیں کالج کی لائبریری میں آگئی تھیں۔[۲]

---

(۹۰)

پریم ساگر (کھڑی بولی یا ہندوی میں) کا لغت

ولیم پرائس

اسے بھی ولیم پرائس نے ترتیب دیا تھا۔ لیفٹیننٹ کرنل جے مارے نے ۳۰ اپریل ۱۸۲۳ء کو کچھ کتابیں کالج سے مانگی تھیں۔ ان میں پریم ساگر کا لغت بھی شامل تھا۔[۳] یہ لغت ۱۸۲۳ء میں ہندوستانی پریس سے شائع ہوا۔[۴]

۱۔ Annals of the College of F.W. Appendix, P. 22

۲۔ فورٹ ولیم کالج (ہندی) لکشمی ساگر وارشنے ص ۱۰۹۔

۳۔ " " (") " ص ۱۱۰۔

۴۔ Annals of the College of F.W Appendix P. 28

(۹۱)

COLLECTION OF ORIENTAL PROVERBS

تھامس .بک

اسے تھامس روبک نے ترتیب دیا تھا یہ ۱۸۲۴ء میں ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی[۱] اس کے بارے میں کوئی معلومات دستیاب نہ ہو سکی۔

---

(۹۲)

A COMPLETE HINDOOSTANEE AND ENGLISH DICTIONARY

تھامس روبک

اسے تھامس روبک نے مرتب کیا تھا۔ یہ ۱۰ مئی ۱۹۱۷ء تک طبع : ہو سکی تھی لیکن طباعت شروع ہونے ہی والی تھی[۲]۔ اس کے متعلق مزید معلومات دستیاب نہ ہو سکی۔

---

(۹۳)

قصہ دل و حسن

غلام شاہ بھیک

گل کرسٹ کی ۱۹ اگست ۱۸۰۲ء کی انعام کے لئے سفارشی [illegible] کی جانیوالی دیگر کتابوں کے ذیل میں شامل تھی۔ اس کے صفحات کی تعداد ساٹھ تھی۔ گل کرسٹ نے [illegible]

---

[۱] کلکتہ کے قدیم اردو مطابع ص ۱۵۴۔ [۲] فورٹ ولیم کالج (ہندی) ص ۱۰۸۔

روپے انعام کی تجویز پیش کی تھی[1] لیکن کالج کونسل نے گل کرسٹ کی مذکورہ فہرست کو نامنظور کر دیا تھا۔

---

(۹۴)

برج بھاشا کے قواعد

للوجی لال کوی

اس قواعد میں برج بھاشا کی گردان، تصرف اور دیگر رموز و نکات بیان کئے گئے ہیں۔ اسے للوجی نے طلبار کے لئے مرتب کیا تھا۔ یہ ۱۸۱۱ء میں انڈیا گزٹ پریس سے شائع ہوئی[2]۔

---

(۹۵)

ہندی فارسی لغت

HINDI PERSIAN VOGABULARY

سدل مشر

سدل مشر نے ۱۸۰۹ء میں یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔ ۲۰ رمئی ۱۸۰۹ء کی کالج کونسل کی کاروائی میں اس لغت پر سدل مشر کو پچاس روپے بطور انعام دیئے گئے[3]۔ مزید تفصیلات دستیاب نہیں۔

---

[1] Proceedings of the College F. W. Vol. 559 P. 277

[2] Annals of the College of F. W. Appendix P. 28

[3] فورٹ ولیم کالج (ہندی) لکشمی وارشنے ص ۹۹۔

۹۶

قصۂ فرعون

محمد بخش

گل کرسٹ کی ۱۹ راگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں "قصۂ فرعون" کا نام ملتا ہے۔ اسوقت یہ کتاب طباعت کے لئے درست کی جارہی تھی۔ اس پر گل کرسٹ نے پچاس روپے انعام کی سفارش کی تھی[۱]۔ اس فہرست کی نامنظوری کے بعد گل کرسٹ نے ۹ ستمبر ۱۸۰۳ء میں جو دوسری فہرست پیش کی اس میں قصۂ فرعون کا نام شامل نہیں ہے۔

قصۂ فرعون کے متعلق مزید معلومات دستیاب نہ ہوسکی اور نہ ہی اسکا کوئی نسخہ دستیاب ہوا۔

۹۷

تاریخ بہمنی

کاظم علی جواںؔ

جواںؔ نے ۱۸۰۰ء میں تاریخ فرشتہؔ سے سلاطین بہمنی سے متعلق حصے کا ترجمہ کیا تھا۔ اسکا علم ۳ر مارچ ۱۸۰۲ء کے PUBLIC DISPUTATION میں بلرو بارلو کی تقریر سے ہوتا ہے[۲]۔

مزید معلومات دستیاب نہ ہوسکیں۔

---

[۱] Proceedings of the College of F. W. Vol. 559. P. 279

[۲] Annals of the College of F. W. P. 159

(۹۸)

کلاکام

کندن لال

کلاکام کے لئے گل کرسٹ نے ۱۹ راگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں سو روپے کا انعام تجویز کیا تھا۔ اسوقت تک یہ طبع ہوچکی تھی[1]۔ اس فہرست کی نامنظوری کے بعد کلاکام ہو رستمبر ۱۸۰۳ء کی فہرست میں بھی شامل تھی۔ گل کرسٹ نئے رائے کے کالم میں لکھا تھا:۔

"بارہ ساٹ میں ہیڈ منشی ہیں۔ انکی کتاب مجوزہ انعام پانے کے لائق ہے"[2]

۱۰ راکتوبر ۱۸۰۳ء کی کالج کونسل کی کاروائی میں مندرجہ ذیل تبصرے کے ساتھ سو روپے انعام کی رقم منظور کرلی گئی:۔

"زبان موزوں ہے اور کتاب خوبصورت انداز میں لکھی گئی ہے۔ انعام مسٹر گل کرسٹ کی تجویز کے مطابق دیا جاسکتا ہے"[3]

---

(۹۹)

THE ANTI JARGONIST

گل کرسٹ

یہ ہندوستانی زبان کا مختصر تعارف ہے جس میں بات چیت میں کام آنے والے انگریزی الفا

---

[1] Proceedings of the College of F. W. Vol. 559, P. 278

[2] " " " " " " " " " P. 285

[3] " " " " " " " " " P. 287

کے متبادل ہندوستانی الفاظ اور ہندوستانی الفاظ کے متبادل انگریزی الفاظ درج ہیں۔ اینٹی جارگونسٹ
دراصل اورینٹل لنگوسٹ کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ کلکتہ سے ۱۸۰۰ء میں طبع ہوئی[1]

---

(۱۰۰)

حکایات نصیحت آموز

تارنی چرن متر

حکایات نصیحت آموز کا ذکر گیان چند جین نے کیا ہے۔ یہ بنگالی سے ترجمہ کی گئی ہے۔ ان کے
بیان کے مطابق یہ ۱۸۱۹ء میں شائع ہوگئی تھی[2]۔ مزید معلومات دستیاب نہ ہو سکی۔

---

(۱۰۱)

لال چندر کا

للوجی لال کوی

للوجی نے ہندی کے شاعر بہاری کی "ست سئی" کی شرح لال چندر کا کے نام سے لکھی تھی[3]۔
اس کی زبان ہندی ہے۔ یہ ۱۸۱۸ء کا کارنامہ ہے۔ اسکے بارے میں مزید تفصیلات کا علم نہ ہو سکا

Linguistic Survey of India vol IX Part I P. 17
اردو کی نثری داستانیں ص ۲۰۰۔
تاریخ ادبیات ہندی ۱۸۱۰ء ایف۔ اے کی بحوالہ ابا جے نثر اردو ص ۲۰۱۔

(۱۰۲)

تفریح طبع

بینی نرائن جہاںؔ

بینی نرائن نے ۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء اور ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء کی درمیانی مدت میں تفریح طبع نام کی ایک کتاب ترتیب دی تھی۔ یہ نقلوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں بینی نرائن کا دیباچہ بھی شامل ہے۔ نوبہار کے دیباچے میں تفریح طبع کا ذکر ان الفاظ میں درج ہے:-

"اس کے بعد (دیوان جہاںؔ) کتنی نقلیں ہندی جمع کیں اور بقیہ دیباچہ درست کرکے تفریح طبع نام رکھا۔ نقلیں اس کی جابجا پھیل گئیں۔"[1]

تفریح طبع کا کوئی قلمی یا مطبوعہ نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔ اور مزید کوئی معلومات بھی حاصل نہ ہوسک

---

(۱۰۳)

مادھو بلاس

للّوجی لال کوی

للّوجی نے "مہادیو بلاس" کو سنہ ۱۸۱۷ء[2] میں سنسکرت سے ہندی نظم میں منتقل کیا[3]۔ اس میں مہادیو اور سلوچنا کی عاشقانہ داستان بیان کی گئی ہے۔ بقول شاردا دیوی ویدالنکار یہ نظم اور نثر میں یک

---

[1] دیباچہ نوبہار بحوالہ مضمون قاضی عبدالودود مشمولہ نیا دور جولائی ۱۹۵۹ء ص ۴۔

[2] Linguistic Survey of India Vol. IX Part I P. 36

[3] ارباب نثر اردو۔ سید محمد ص ۳۰۷۔

وقت بیان کی گئی ہے۔[1]

اسکا کوئی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخہ دستیاب نہ ہوسکا۔

---

(۱۰۴)

جامع القوانین

حیدر بخش حیدری

حیدری نے "جامع القوانین" کو شعبۂ ہندوستانی کے لئے تصنیف کیا تھا۔ گل کرسٹ کی ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں جامع القوانین طباعت کے لئے درست کی جانے والی کتابوں کے ذیل میں شامل ہے۔ اس کے صفحات کی تعداد دو سو اور انعام کی رقم سو روپے تھی۔[2] مذکورہ فہرست کو کالج کونسل نے نامنظور کر دیا تھا۔ اس کے بارے میں مزید معلومات دستیاب نہ ہوسکی۔

The Development of Hindi Prose Literature P. 53

Proceedings of the College of F. W. Vol. 559. P. 279

مقدمہ گلزار دانش میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے گل کرسٹ اور اسکا عہد کے حوالے سے لکھا ہے کہ جامع القوانین پر حیدری کو سو روپے کا انعام دیا گیا تھا (ص ۴۳) لیکن یہ اطلاع درست نہیں ہے۔ گل کرسٹ اور اسکا عہد میں ایسی کوئی بات درج نہیں ہے۔

(۱۰۵) کلیاتِ میرؔ کی ترتیب

کاظم علی جواںؔ، تارنی چرن متر، مرزا جان طپشؔ، مولوی اسلم اور غلام اکبر نے مشترکہ تعاون سے کلیات میر تقی میرؔ مرتب کیا تھا۔ کپتان ٹیلر اس کے نگراں تھے۔ یہ کلیات ہندوستانی پریس سے ۱۸۱۱ء میں شائع ہوا[1]۔ کلیات میرؔ کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔ یہ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ اور چاروں جلدوں پر کالج کی مہر ثبت ہے۔ اس کے علاوہ دیوان میرؔ کا بھی ایک قلمی نسخہ مذکورہ لائبریری میں موجود ہے جس پر کالج کی مہر لگی ہوئی ہے۔ یہ نسخہ ۱۰۷ اوراق کو محیط ہے۔

---

(۱۰۶) چھتر سال کی ترتیب

ولیم پرائس نے لالو جی لال کوی کی چھتر سال کی ترتیب کی تھی جو ۱۸۲۱ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی[2]۔

---

(۱۰۷) باغ و بہار کی ترتیب

تھامس روبک نے ۱۸۱۳ء میں باغ و بہار کا نیا ایڈیشن ترتیب دیا تھا۔

---

[1] سرورق کلیات میر مطبوعہ ہندوستانی پریس ۱۸۱۱ء۔

[2] Linguistic Survey of India Vol. IX Part I, P. 19

۱۰۸

خرد افروز کی ترتیب

تھامس روبک نے غلام اکبر، مرزا قلی بیگ، غلام قادر اور مولوی سید کاظم علی کے تعاون سے خرد افروز کو دو جلدوں میں مرتب کیا تھا۔ یہ ہندوستانی پریس سے دو جلدوں میں ہی ۱۸۱۵ء میں طبع ہوئی۔[1]

۱۰۹

گل بکاؤلی (مذہب عشق) کی ترتیب

تھامس روبک نے طلباء کے مفاد کے پیش نظر ۱۸۱۵ء میں گل بکاؤلی (مذہب عشق) کو مرتب کیا تھا۔

۱۱۰

نیا عہد نامہ

(NEW TESTAMENT)

اسے شعبۂ ہندوستانی کے منشیوں نے ہندوستانی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ اس ترجمے کو ولیم ہنٹر نے اصل گریک نسخے سے موازنہ کر کے نظر ثانی کر کے ۱۸۰۵ء میں کلکتہ سے شائع کیا۔[2]

---

[1] Annals of the College of F. W. Appendix P. 26

[2] Linguistic Survey of India Vol. IX Part I P. 40

۱۱۱

دیوان میر سوز کی ترتیب

دیوان میر سوز کا ۱۲۱۶ھ مطابق ۱۸۰۱ء کا ترتیب شدہ قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ ۱۰۰ اوراق کو محیط ہے۔ اس کے آغاز میں کالج کی مہر ثبت ہے۔ ہندوستانی زبان کے طلبار کے لئے دیوان میر سوز کا ایک نسخہ ۱۸۱۰ء میں طبع ہوا۔[۱]

۱۱۲

دیوان سودا کی ترتیب

دیوان سودا کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔ اس کے اختتام پر کالج کی مہر لگی ہوئی ہے۔

ہندوستانی کے کلاس کے لئے جوآن اور مولوی محمد اسلم نے "انتخاب سودا" مرتب کیا تھا جو ۱۸۱۰ء میں شائع ہوا۔[۲] افسوس نے کلیات سودا کی تصحیح کی تھی۔

---

[۱] [۲] ...nals of the College of F. W. Appendix P. 26, 27

(۱۱۳)
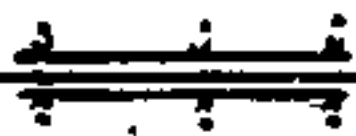
The Hindee Roman Orthoepigraphical Ultimatum Or A Systematic Discriminative View Of Oriental And Accidental Visible Sounds, Or Fixed and Practical Principles For the Languages of the East, Explified in the Popular Story of Sukoon lala Natak

گل کرسٹ

اس کتاب پر گل کرسٹ نے انگریزی میں پیش لفظ لکھا ہے۔ اس کے بعد رومن میں "سکنتلا ناٹک" شامل کی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۸۰۴ء میں ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی۔ اسکا مطبوعہ نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) اور نیشنل لائبریری (کلکتہ) میں موجود ہے۔

---

(۱۱۴)

ضرب الامثال

اس کے مرتب کا نام اور سنہ ترتیب کا علم نہ ہو سکا۔ ضرب الامثال کا چونسٹھ اوراق کو نیط... خط لیکن نامکمل قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔ اس کے آغاز ... کا ئع کی مہر ثبت ہے۔

Coverpage, The Hindee Roman Orthoepigraphical Ultimatum

اس کتاب میں اردو، فارسی اور عربی کی ضرب الامثال درج ہیں۔ اردو میں ان کے

معنی بھی درج ہیں۔ وضاحت کے لئے انہیں جملوں میں استعمال بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً۔

"انکہ عیاں است چہ حاجت بہ بیاں جو کہ ظاہر ہے اس کے بیان کرنے کی حاجت

نہیں۔ کیا پہروں سے تکرار کر رہا ہے بھائی مطلب تو صاف معلوم ہوتا ہے

انکہ عیاں است چہ حاجت بہ بیاں"[1]

---

(۱۱۵)

تواریخ بنگالہ

غلام اکبر

گل کرسٹ کی ۱۹ راگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں "تواریخ بنگالہ"

طباعت کے لئے تیار شدہ کتابوں کے ذیل میں شامل تھی۔ اسکے صفحات کی تعداد تین سو اور انعام کی

مجوزہ رقم بھی تین سو روپے تھی۔ رائے کے کالم میں گل کرسٹ نے لکھا تھا:۔

"یہ اور مندرجہ ذیل تین دیگر تاریخیں[2] ہندوستانی (زبان کے)

کلاس کے لئے بے حد مفید ثابت ہوں گی"[3]

لیکن کالج کونسل نے اس فہرست کو نامنظور کر دیا تھا۔

---

[1] ضرب الامثال (ق۔ن) ورق ۱۔

[2] تواریخ السلاطین، تواریخ عالم گیری، تواریخ تیموری۔

[3] Proceedings of the College of F. W. Vol. 559, P. 277

(۱۱۶)

تواریخ السلاطین

غلام شاہ بھیک

گل کرسٹ کی ۱۹ راگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں یہ طباعت کے لئے درست کی جانے والی دیگر کتابوں کے ساتھ شامل تھی۔ اس کے صفحات کی تعداد تین سو تھی۔ اسپر گل کرسٹ نے تین سو روپے انعام کی سفارش کی تھی۔[۱] عتیق صدیقی نے مذکورہ رقم پانچ سو روپے درج کی ہے جو درست نہیں۔[۲]

گل کرسٹ کی مذکورہ فہرست کو کالج کونسل نے نامنظور کر دیا تھا۔ تواریخ السلاطین کا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔

---

(۱۱۷)

تواریخ عالم گیری

محمد عمر

گل کرسٹ کی ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں تواریخ عالم گیری طباعت کیلئے [در]ست کی جانیوالی کتابوں کے تحت شامل تھی۔ یہ تین سو صفحات پر مشتمل تھی۔ گل کرسٹ نے اس پر [تین س]و روپے انعام کی تجویز پیش کی تھی۔[۳] لیکن کالج کونسل نے اس فہرست پر کسی قسم کا کوئی انعام

Proceedings of the College of F.W. Vol. 559, P. 279

[گل]کرسٹ اور اسکا عہد ص ۱۶۲

Proceedings of the College of F.W. Vol. 559, 279

دینے سے انکار کر دیا تھا۔

تواریخ عالم گیری کا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔

---

(۱۱۸)

تواریخ تیموری

تصدق حسین

گل کرسٹ کی ۱۹ اراگست ۱۸۰۲ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں یہ طباعت کے لئے درست کی جانے والی کتابوں میں شامل تھی۔ تواریخ تیموری چار سو ساٹھ صفحات کو محیط تھی۔ گل کرسٹ نے اس تالیف پر چار سو روپے انعام کی تجویز پیش کی تھی[۱] لیکن مذکورہ فہرست کی نامنظوری کے بعد نہ تو یہ کتاب ہی طبع ہو سکی اور نہ ہی تصدق حسین کو کوئی انعام ملا۔

مزید معلومات راقم السطور کو دستیاب نہ ہو سکی۔

---

(۱۱۹)

الف لیلےٰ

شاکر علی

گل کرسٹ کی ۱۹ اراگست ۱۸۰۲ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں "الف لیلےٰ طباعت کیلئے درست کی جانے والی کتابوں کے ذیل میں شامل تھی۔ اس کے صفحات کی تعداد تین سو تھی

---

۱ [P]roceedings of the College of F.W. Vol. 559, P.279,

گل کرسٹ نے چار سو روپے انعام کی سفارش کی تھی[1] لیکن کالج کونسل سے مذکورہ فہرست کی نامنظوری کے بعد گل کرسٹ نے ۹ ستمبر ۱۸۰۳ء میں ایک دوسری فہرست تیار کی۔ "الف لیلےٰ" اس میں بھی شامل تھی۔ چار سو روپے انعام کی تجویز کے ساتھ گل کرسٹ نے رائے کے کالم میں لکھا تھا:-

"مشہور عربین نائٹس۔ اس تالیف کے ذریعے ہندوستانی (زبان) سے واقفیت حاصل کرنے میں بہت مدد ملنے کی توقع ہے"[2]

۹ ستمبر ۱۸۰۳ء کی فہرست پر کالج کونسل نے غور کیا تھا اور بیشتر کتابوں کو انعام سے نوازا بھی گیا۔ لیکن جن کتابوں پر انعام کی رقم منظور ہوئی ان میں "الف لیلےٰ" کا نام نظر نہیں آتا۔

اسکا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔

---

(۱۲۰)

اخلاق النبیؐ

غلام اشرف

گل کرسٹ کی ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں "اخلاق النبیؐ" طباعت کے لئے درست کی جانے والی کتابوں کے ساتھ شامل تھی۔ اس کے صفحات کی تعداد تین سو اور انعام کی مجوزہ رقم چار سو روپے تھی[3] لیکن کالج کونسل نے اس پوری فہرست کو نامنظور کر دیا تھا۔

---

[1] Proceedings of the college of F.W. vol. 559, P. 279

[2] " " " P. 285

(۱۲۱)

درمجالس

غلام سبحان

گل کرسٹ کی ۱۹ر اگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں یہ طباعت کے لئے درست کی جانیوالی کتابوں کے ذیل میں شامل تھی۔ یہ ۲۵۰ صفحات پر مشتمل تھی۔ گل کرسٹ نے ایک سو پچاس روپے انعام کی سفارش کی تھی[۵]۔ لیکن کالج کونسل نے جب گل کرسٹ کی مذکورہ فہرست کو نامنظور کر دیا تو اسکے بعد "درمجالس" شائع ہی نہ ہو سکی۔ غلام سبحان کو کوئی انعام بھی نہ ملا۔

---

(۱۲۲)

مرثیۂ مسکین نثر میں

میر جعفر

گل کرسٹ کی ۱۲ر جنوری ۱۸۰۳ء کی فہرست سے علم ہوتا ہے کہ "مرثیۂ مسکین" ہرکارہ پریس میں ناگری رسم الخط میں طبع ہو گیا تھا[۲]۔ گل کرسٹ کی ہی ۱۹ر اگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لئے سفارشی فہرست میں "مرثیۂ مسکین" (نثر میں) مطبوعہ کتابوں کے ذیل میں شامل تھا۔ اس کے صفحات کی تعداد بیس تھی۔ اور گل کرسٹ نے محض بیس روپے انعام کی سفارش بھی کی تھی[۳]۔ لیکن کالج کونسل نے اس فہرست پر غور کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اسکا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔

ایضاً Proceedings of the College of F.W. vol. 559, P. 279

باب چہارم

فورٹ ولیم کالج کی نثر کا اسلوب

گورمونٹ کا کہنا ہے کہ اسلوب کی تعریف متعین کرنا ایک انگشتانے سے آٹے کی بوری گزارنے کی کوشش کرنا ہے[1]۔ لوکاس کہتا ہے کہ "اسلوب کے متعلق جتنے مباحث ہیں وہ مجھے الٹے پلٹے دکھائی دیتے ہیں"[2]۔ پروفیسر مڈلٹن مرے کے خیال میں "اسلوب کی بحث کے لئے اگر سائنسی تحقیقات میں صرف ہونے والی قوت کا ایک جزو بھی استعمال کیا جائے تو یہ بحث تمام ادبی جمالیات اور اصول انتقادیات کا احاطہ کرلے۔ اور اس صورت میں چھ لیکچر کی جگہ چھ کتابیں بھی ناکافی ہوں گی"[3]۔

ادب کے ضمن میں اسلوب کی بحث نئی نہیں ہے۔ مغربی علمائے ادب نقادوں اور ادیبوں میں یونان سے لیکر پروفیسر مرے تک اور کارلائل سے لے کر امرسن تک سبھی نے اسلوب (اسٹائل) کی تعریف متعین کرنے کی سعی مشکور کی ہے۔ اردو ادب میں یہ بحث زیادہ پرانی نہیں۔ محی الدین قادری زور، آل احمد سرور، عابد علی عابد، ڈاکٹر محمد حسن، عنوان چشتی، اطہر پرویز، نثار احمد فاروقی، سلمان اختر جاوید، امیر اللہ شاہین وغیرہ نے اپنے طور پر اسلوب کے افہام و تفہیم کی کوشش کی ہے۔ لیکن ابھی تک اسلوب کی کوئی مکمل اور جامع تعریف متعین نہیں ہو سکی ہے۔

انگریزی لفظ اسٹائل لاطینی زبان کے لفظ اسٹیلس یا اسٹائلس سے ماخوذ ہے۔ روم میں عہد قدیم میں لوہے کے قلم سے موم چڑھی پٹیوں پر لکھا جاتا تھا۔ اس آلے کو اسٹیلس یا اسٹائلس کہا جاتا تھا اور اسی

---

[1] A Dictionary of Literary Terms P. 647

[2] بحوالہ اسلوب۔ عابد علی عابد ص ۵۔

[3] Problem of Style P. 3

رعایت سے ادب کے ضمن میں اسٹائل (STYLE) کا لفظ لکھنے کے فن سے وابستہ ہوگیا۔ مغربی علما
ادب میں اسٹائل کے سلسلے میں بوفان (LEAN LOEIS LECLERE BUFFON) کا نام
انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اس نے اسلوب کو شخصیت کا اظہار قرار دیا ہے[1]۔ باسل ورس فولڈ BASIL
(WORS FOLD) کے نزدیک فرد کے لئے جو اہمیت سلیقے کی ہے وہی ایک مصنف کے لئے اسلوب کی
ہے[2]۔ آرتھر کوئلر کوچ کا بھی یہی کہنا ہے کہ تصنیف میں جو مقام اسلوب کا ہے ٹھیک وہی مقام انسانی رشتوں
میں سلیقے کو حاصل ہے۔ کوچ مزید کہتا ہے کہ چونکہ ادب ایک زندہ فن ہے۔ اس لئے اسے انفرادی
ہونا چاہیئے، مگر اس میں تنوع بھی ضروری ہے[3]۔ پروفیسر مرے کا کہنا ہے کہ اسلوب زبان کی وہ خصوصیت ہے
جو اختصار کے ساتھ مصنف کے جذبات اور خیالات کے نظام کی ترسیل کرتی ہے[4]۔ پروفیسر مرے یہ بھی
کہتا ہے کہ اسلوب فطری طور سے مصنف کے مخصوص مزاج (IDIOSYNCRASY) کے لئے
استعمال ہوتا ہے کیوں کہ اسلوب فرد کے محسوسات کا براہ راست اظہار ہے[5]۔ والٹر ریلے WALTER
(RALIEGH) کے نزدیک اسلوب خاص انفرادی وصف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر کوئی اسلوب کا
درس دینے کا دعوے کرتا ہے تو اس شخص کی مثال جھوٹے اور انسانیت کے دشمن کی سی ہے[6]

---

[1] Discours Sur le Style' بحوالہ. Encyclopaedia Britannica Volume XXII, P 332

[2] Judgement in Literature P. 92

[3] On the Art of writing by Arther Quiller Coach P.203, 212, 210

[4] Problem of Style P. 65

[5] Problem of Style P. 17

[6] Style P. 125

وپ (POPE) نے اسے خیال کا لباس کہا ہے۔ لیکن کارلائل کا کہنا ہے کہ اسلوب کسی انسان کا
باس نہیں بلکہ اس کی جلد ہے[۲]۔ ہڈسن (HUDSON) کے نزدیک اسلوب شخصیت کا اشاریہ ہے[۳]۔
غرض کہ تقریباً تمام علمائے ادب نقادوں اور ادیبوں کے نزدیک اسلوب میں فنکار کی شخصیت
و ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس کے علاوہ اسکے عہد، ماحول اور ادبی روایات کا بھی فنکار کے اسلوب
ر خاصا اثر پڑتا ہے۔ ڈکشنری آف لٹریری ٹرمس میں درج ہے کہ اسلوب دراصل مصنف کا لہجہ
ور آواز ہے، جو اتنا ہی منفرد ہو سکتا ہے جتنی کہ اس کی ہنسی، اس کے چلنے کا انداز، اس کی تحریر
(HAND WRITING)، اس کے چہرے کے تاثرات۔ مذکورہ ڈکشنری میں اسلوب کی تقسیم
ار حیثیتوں سے کی گئی ہے۔

ر عہد کے مطابق:۔ جیسے METAPHYSICAL، AUGUSTAN یا GEORGIAN۔

ر مصنفین کے مطابق:۔ جیسے چاسرین، ملٹانک، گبانین یا جیمسٹین۔

۔ درجے کے مطابق:۔ اعلیٰ، درمیانی، ادنیٰ اور سادہ۔

۔ زبان کے مطابق:۔ سائنٹفک، تشریحی، شاعرانہ، حوالہ جاتی، جذباتی، صحافتی[۴]

اسلوب کے سلسلے میں مغربی اور مشرقی علمائے ادب، نقادوں اور ادیبوں نے جن خیالات
اظہار کیا ہے انکی روشنی میں اسلوب کا جو خاکہ ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلوب موضوع کے اظہار کا
سیلہ ہے، جس میں مصنف کی شخصیت اس کے دور کی ادبی روایتیں اور موضوع کا تقاضا بہ جال

An Introduction to the study of Literature P.27,30 ...
Dictionary of Literary Terms P.647

شامل ہوتا ہے۔ یہ شعوری بھی ہوسکتا ہے اور غیر شعوری بھی، یہ مصنوعی بھی ہوسکتا ہے اور فطری بھی، کبھی یہ خیال کا لباس بن جاتا ہے اور کبھی اظہار کا زیور، کبھی یہ موضوع سے پیوست ہو جاتا ہے اور کبھی مصنف کی شخصیت کا عکس بن جاتا ہے۔

۲

مندرجہ بالا مباحث کی روشنی میں اگر فورٹ ولیم کالج کی تصانیف پر نظر ڈالی جائے تو سب سے پہلے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کا سارا ادب ایک مخصوص پالیسی کے تحت عالم وجود میں آیا۔ یہ سارا ادب کالج کے اغراض و مقاصد کا پابند رہا ہے اس لئے کالج کے اغراض و مقاصد کے تناظر میں ہی اس ادب کے اسلوب کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کا بنیادی مقصد زبان و ادب کی خدمت نہیں تھا۔ نہ تو وہاں کے منتظمین اس رخ پر کام کر رہے تھے اور نہ ہی مصنفین۔ سب کے سامنے انکا اپنا مفاد اور اپنی ضرورتیں تھیں۔ یہ مفاد سیاسی بھی تھا اور معاشی بھی۔ سیاسی مفاد کے تحت کس طرح ادب کی تخلیق یا ادب کی ترویج و ترقی ہوتی ہے۔ فورٹ ولیم کالج اور وہاں کا ادب اسکی نمایاں مثال ہے۔ باب اوّل میں کالج کے قیام کے اغراض و مقاصد سے تفصیلی بحث کی جاچکی ہے۔ کالج کے ذمہ داران اس کالج سے سیاسی مفاد کے حصول کا کام لینا چاہتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے جو ملازمین انگلستان سے ہندوستان آتے تھے وہ نہ تو یہاں کی تہذیب و تمدن سے واقف ہوتے تھے اور نہ تو انہیں ہندوستانی عوام کے ذہن و فکر کا اندازہ ہوتا تھا۔ یہ ملازمین حکراں طبقے سے تعلق رکھتے تھے لیکن اپنے محکومین کی زبان تک سے ناآشنا تھے۔ انگریز ایک ترقی یافتہ قوم تھی۔ ان میں سے اہل نظر حضرات نے وقت کے مطالبے کا اندازہ کرلیا تھا۔ وہ جان گئے تھے کہ انکی حکومت کو اس وقت تک استحکام حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ انکے کارندوں اور عوام میں

بلا واسطہ تعلق قائم نہیں ہوتا۔ عوام کی زبان سے ناواقفیت اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ اسی کمی کو دور کرنے کے لئے فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا تھا۔ لیکن اسوقت تک ایسی کتابیں موجود نہیں تھیں جو اس مقصد میں معاون ثابت ہوتیں چنانچہ فورٹ ولیم کالج کے ذمہ داروں نے اپنے "مقصد کی زبان" میں تصنیف وتالیف کا کام شروع کیا۔ کالج کے ارباب حل وعقد کا مقصد نووارد انگریز ملازمین کو زبان کے علاوہ ہندوستانی تہذیب وثقافت سے بھی روشناس کرنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ہندوستانی زبان میں ترجمے کے لئے فارسی، سنسکرت اور برج بھاشا کی ایسی کتابوں کا انتخاب کیا جو ہندوستان میں رہنے والی اقوام کی تہذیب وتمدن کی نمائندگی کرتی تھیں۔ لیکن فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات کی اہمیت موضوع سے زیادہ اسلوب بیان میں مضمر ہے۔

باب سوم میں فورٹ ولیم کالج کی تصانیف اور انکے اسلوب پر تفصیلی بحث کیجا چکی ہے۔ جس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ تقریباً ہر مصنف کو "صاحبان عالی شان" اور خصوصاً گلکرسٹ نے یہ واضح ہدایت دے رکھی تھی کہ تصانیف یا ترجموں کی زبان سادہ سلیس اور عام بول چال کی زبان کے موافق ہو۔ چنانچہ کالج کے مصنفین نے تصنیف اور تالیف کرتے وقت شعوری طور پر ان ساری پابندیوں اور حد بندیوں کا خیال ولحاظ رکھا تاکہ صاحبان نوآموز کو ہندوستانی زبان سے واقفیت حاصل کرنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ ہو۔

ایسا نہیں ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے سارے مصنفین غیر واضح شخصیتوں کے مالک تھے۔ یا ان میں کوئی صاحب طرز اہل قلم نہیں تھا لیکن اس خاص اسلوب کے سلسلے میں جسے فورٹ ولیم کالج کا نمائندہ اسلوب کہا جائے گا وہ تمام مصنفین ایک ہی پالیسی کے تابع تھے۔ ان میں سے بعض اس اسلوب نگارش میں زیادہ کامیاب ہوئے اور بعض کم جن مصنفین کے اسلوب سے "صاحبان عالی شان" کے حکم وہدایت کی ترجمانی ہوتی ہے ان میں میر امن، حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس، خلیل علی خاں اشک، مظہر علی

خاں ولا، کاظم علی جواں اور بہادر علی حسینی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان مصنفین میں فطری طور سے بھی تصنیف وتالیف کی بہترین صلاحیتیں تھیں۔ چنانچہ ان کا اسلوب بڑی حد تک ان کی ذاتی صلاحیتوں کا بھی مظہر ہے۔

حالانکہ یہ درست ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین ایک مخصوص پالیسی کے تحت تصنیف وتالیف میں معروف تھے لیکن اسکے باوجود سادگی سلاست اور عام بول چال کا جو اسلوب داستانوں، قصوں کہانیوں اور حکایتوں میں نظر آتا ہے۔ وہ دوسرے موضوعات میں نظر نہیں آتا۔

فورٹ ولیم کالج کی نثری پالیسی کی بہترین نمائندگی "باغ وبہار" کرتی ہے۔ یہ داستان میر امن نے "اس محاورے سے لکھی ہے جیسے کوئی باتیں کرتا ہے"۔ میر امن نے اپنے مربی اور سرپرست جان گل کرسٹ کے مشورے کے مطابق بول چال کی زبان ضرور استعمال کی لیکن اپنی شخصیت کے رچاؤ اور ادبی شعور کے امتزاج سے ایک ایسا اسلوب اختراع کیا جو نہ صرف اپنے زمانے میں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے زندہ جاوید ہوگیا۔

میر امن کی زبان کی "سادگی اور پرکاری" کسی خاص حصے یا کسی خاص "سیر" میں جلوہ گر نہیں بلکہ شروع سے اخیر تک جاری وساری ہے۔ انکی دسترس میں سہل اور عام فہم الفاظ و روزمرہ کا ایک وسیع ذخیرہ ہے۔ جس کے سہارے وہ ہر واقعے کی مکمل اور بھرپور تصویریں پیش کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مترنم جملے ہیں جن میں نہ کہیں بناوٹ ہے اور نہ کہیں مصنوعیت۔ یہ نظر سے گزر کر ذہن پر نقش ہوجاتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں شعوری کوشش کی جھلک تک نہیں ملتی۔ بلکہ فطری، جاندار اور رواں اسلوب ملتا ہے۔ یہاں سادگی اور سلاست کا جو انداز ملتا ہے اس میں کسی پابندی کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ اپنے عہد اور ادبی روایات کے برعکس میر امن نے جو کارنامہ انجام دیا وہ انتہائی دشوار تھا۔ اسی لئے باغ وبہار جیسی نثر اور کسی تصنیف میں نظر نہیں آتی۔

فورٹ ولیم کالج کی بیشتر تصانیف سنسکرت، عربی، فارسی اور برج بھاشا سے اردو میں منتقل
کی گئی ہیں چنانچہ اصل ماخذ کا بھی اسلوب پر اثر پڑا ہے۔ اور یہ کسی حد تک فطری بات ہے۔ لیکن یہ تو مترجم
یا مؤلف کی صلاحیت پر منحصر ہے کہ وہ کس حد تک اپنے ماخذ کے اسلوب سے جدا ہو کر کے ذاتی صلاحیتوں
کو بروئے کار لاتا ہے۔ باغ و بہار کا اسلوب اسکی زندہ مثال ہے۔ حیدر بخش حیدری کی توتا کہانی بھی حیدری
کی ذاتی صلاحیتوں کی مظہر ہے۔ انہوں نے "توتا کہانی" کو فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے لیکن داستان
کے ایک بڑے حصے میں انکی زبان دانی کے جوہر نمایاں ہیں جن میں ترجمہ پن کی جھلک بھی نہیں ملتی۔
پھر بھی کہیں کہیں توتا کہانی کا اسلوب فارسی طرز نثر سے متاثر ہوا ہے۔ توتا کہانی کی ۳۵ کہانیوں میں
ہر کہانی کا ابتدائیہ فارسی اسلوب کا انداز پیش کرتا ہے۔

حیدری نے توتا کہانی کو گل کرسٹ کے حکم کے مطابق "زبان ہندی میں موافق محاورۂ اردوئے معلّی
کے نثر میں عبارت سلیس و خوب و الفاظ رنگین و مرغوب سے ترجمہ کیا"۔ اس میں گفتگو کا سا لطف ملتا ہے۔
نہ کہیں ابہام ہے اور نہ بے جا اختصار۔ اس کی نثر ٹھہری ہوئی اور متوازن سی ہے۔ نہ تصنع ہے اور نہ
الفاظ کی شعبدہ گری۔ حیدری نے فارسی اور ہندی الفاظ کے درمیان بڑا خوشگوار توازن قائم کیا ہے۔
لیکن اسلوب کا یہ خوبصورت انداز حیدری کی دوسری داستان "آرائش محفل" (قصہ حاتم طائی) میں نہیں
نظر آتا۔ حیدری نے آرائش محفل میں بھی سادگی اور سلاست کا اہتمام کیا ہے۔ لیکن اس میں گفتگو کا سا
وہ انداز نہیں پایا جاتا جو "توتا کہانی" کے اسلوب کی خصوصیت ہے۔ یہاں اسلوب بیان کی روانی لڑکھڑاتی
ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ حیدری نے داستان کی ابتدا میں سادہ نگاری کی جو فضا قائم کی تھی اسے اخیر
تک کامیابی سے نباہ نہیں سکے۔ ترنم اور آہنگ کے فقدان کے ساتھ ساتھ اکثر جملے فرسودگی کا لبادہ
اوڑھے نظر آتے ہیں۔ یہ ترجمہ مصنف کے فطری اسلوب سے عاری ہے۔ اور اسکا سادہ و سلیس انداز
بیان مصنوعی سا لگتا ہے۔ پھر بھی حیدری نے نثر کو بطور خالص نثر کے ہی برتا ہے۔ نثر کے پردے میں

شاعری نہیں کی ہے۔ موقع اور محل کے لحاظ سے اسلوب کی موزونیت کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ نفس مطلب کی ادائیگی بھی صداقت اور تاثیر سے یکسر خالی نہیں۔ حیدری نے "گلزار دانش" کے نام سے فارسی داستان "بہار دانش" کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ اس داستان میں حیدری کا قلم سادگی اور سلاست کا وہ جادو نہ جگا سکا جسکا بہترین نمونہ "توتا کہانی" اور اسکے بعد کسی حد تک "آرائش محفل" میں نظر آتا ہے۔ یہاں ان کا اسلوب اپنے ماخذ سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہے۔ زبان بے حد گنجلک اور پر تعقید ہے۔ لمبی لمبی تراکیب اور نامانوس تشبیہات کی کثرت سے قصّے کا سارا حسن برباد ہوگیا ہے۔ زبان و بیان میں دقت پسندی اور بے جا رنگینی کسی خاص حصے تک محدود نہیں بلکہ پوری داستان میں بکھری ہوئی ہے۔ حسن کا بیان ہو کہ عشق کا۔ ادق اسلوب کے باعث نہ تو کوئی تصویر ابھرتی ہے اور نہ ہی کوئی تاثر پیدا ہوتا ہے۔

حیدری کی ان تینوں داستانوں کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین صاحبان عالیشان کے حکم کے مطابق سادہ، سلیس اور عام بول چال کا اسلوب اختیار کرنے کی بے انتہا کوشش کر رہے تھے لیکن اکثر اوقات وہ اپنی کوششوں میں بری طرح لڑکھڑا جاتے اور اپنے دور کی روایت کے بموجب فارسی اسالیب بیان سے چھٹکارا حاصل نہ کرپاتے۔

خلیل علی خاں اشک نے زبان و بیان پر قدرت کے کئی نمونے پیش کئے ہیں۔ لیکن وہ فطری طور پر داستان گو تھے اس لئے فارسی طرز داستان گوئی سے خود کو الگ نہ کرسکے "داستان امیر حمزہ" اور "قصہ رضوان شاہ" میں سادہ نگاری کی شعوری کوشش کے باوجود مرصع نگاری کا انداز نمایاں ہے۔

"داستان امیر حمزہ" "نو آموزان ہندی کے واسطے اردوئے معلّی کی زبان میں" لکھی گئی "تاکہ صاحبان مبتدیوں کے پڑھنے کو آسان ہووے"۔ لیکن اس کی تمام عبارتوں میں ربط، توازن اور اعتدال کی کمی عام طور پر محسوس ہوتی ہے۔ فقروں اور جملوں میں نہ تو ترنم ہے اور نہ نغمگی۔ تشبیہات و استعارات کے استعمال میں انہوں نے جگہ جگہ دھوکے کھائے ہیں۔ اس کے برعکس "قصہ رضوان شاہ" میں کہیں کہیں رنگینی اور پرکاری نے اسلوب میں

تازگی اور شگفتگی پیدا کر دی ہے۔ سادگی اور روانی کے حسن سے بھی اسکا اسلوب یکسر عاری نہیں۔

افسوس کی "آرائش محفل" فارسی کی "خلاصۃ التواریخ" کا ترجمہ ہے۔ لیکن یہ ترجمہ افسوس نے اس خوبی سے اور فطری انداز میں کیا ہے کہ اسے انکی تصنیف کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ "آرائش محفل" کا موضوع تاریخ ہے لیکن انداز بیان کی خوبی کی بدولت یہ قصے کہانیوں کا سا لطف دیتی ہے۔ "آرائش محفل" میں ہم فطری اور ایک نئے طرز نگارش سے متعارف ہوتے ہیں۔ افسوس نے اردو اور ہندی کے بے حد آسان الفاظ اور روزمرہ کے امتزاج سے اپنا اسلوب اختراع کیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ عربی اور فارسی کے الفاظ "آرائش محفل" میں مفقود ہوں۔ لیکن یہ ثقیل اور ادق نہیں ہیں اور ہندی کے نرم الفاظ کے پہلو بہ پہلو اس طرح جڑے گئے ہیں کہ اسی رنگ میں رنگ گئے ہیں۔ "آرائش محفل" کی زبان سادہ اور آسان نثر کی بہترین مثال ہے۔ اور اسکے بعض حصے باقاعدہ ادبی شان کے حامل ہیں۔ افسوس کے مشاہدات کی باریکی اور قوت بیانیہ پر قدرت الفاظ کے پیکر میں یوں ڈھل گئی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی تصانیف میں قصے کہانیوں اور داستانوں کے سلسلے کی ایک کڑی برج بھاشا سے ترجموں کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ کاظم علی جواں کی "سنگھاسن بتیسی" اور "سکنتلا ناٹک" مظہر علی خاں ولا کا "قصہ مادھونل اور کام کندلا" اور "بیتال پچیسی" اس کی بہترین نمائندگی کرتی ہیں۔ ان چاروں کے اسلوب میں بڑی حد تک یکسانیت ہے۔ یہ تصانیف اردو الفاظ کے ساتھ برج بھاشا اور سنسکرت الفاظ کے امتزاج سے ایک بالکل نیا اسلوب پیش کرتی ہیں۔ شاید اسوقت تک اردو دنیا اپنی ہی زبان کے اس وصف سے واقف نہ تھی۔

"سکنتلا ناٹک" کے لئے جواں کو "اپنی زبان کے موافق" ترجمہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا لیکن ماخذ اور موضوع کے تقاضے نے "سکنتلا ناٹک" کے اسلوب کو ریختہ اور برج بھاشا کی آمیزش کا خوبصورت نمونہ بنا دیا اور یہ آمیزش مصنوعی نہیں لگتی بلکہ فطری محسوس ہوتی ہے۔ جملوں کا تناسب، آہنگ، [illegible]

بے حد مسحور کن ہے۔"کام کندلا گل کرسٹ کی فرمائش کے بموجب "زبان اردو" میں لکھی گئی ہے۔ لیکن ولاؔ نے ہندی کے آسان اور شیریں الفاظ کے استعمال سے ایک ایک جملے اور عبارت کو نہایت نفیس اسلوب عطا کیا ہے۔ فارسی اور ہندی الفاظ کے امتزاج کا اتنا رواں اور سلیس انداز اردو ادب میں آج بھی نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ عبارتوں سے ایک ایسا ترنم اور ایسی دھیمی لَے پیدا ہوتی ہے جو قاری کو قصّے کے ساتھ بہالے جاتی ہے۔ ولاؔ نے ہندی اور فارسی تشبیہات سے بھی جگہ جگہ حسن وخوبصورتی کے نادر پیکر تراشے ہیں۔

اس کے برعکس بہادر علی حسینی کی "اخلاق ہندی" کا اسلوب خشک اور بے مزہ ہے۔ انہوں نے "اخلاق ہندی" کو "زبان فارسی سے سلیس رواجی ریختے میں جو خاص وعام بولتے ہیں" منتقل کیا۔ لیکن اسلوب کی سادگی اور سلاست پر فارسیت کا غلبہ ہے۔ حسینی نے ہندی کے عام فہم اور نرم الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ لیکن انکے دوش بدوش فارسی اور عربی کے نامانوس اور ثقیل الفاظ عبارتوں کے ربط اور آہنگ میں مانع ہوتے ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کی تصانیف میں اکثر موضوع کا تقاضا بھی متعین کردہ اسلوب کی راہ میں رکاوٹ کا سبب ثابت ہوا ہے۔ مثلاً میر امن کا "گنج خوبی" صحیفۂ اخلاق ہونیکی وجہ سے وہ اسلوب پیش نہ کرسکا جو "باغ وبہار" میں ملتا ہے۔ یہی بات افسوس کے "باغ اردو" کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ یہاں بھی اسلوب کی سادگی بے کیف اور بے جان ہے۔ ترجمہ کی بندشیں عبارتوں کی روانی میں جابجا رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں۔ تاریخ اور مذہب کے موضوع پر جتنی کتابیں ترجمہ یا تالیف کی گئیں ان میں بھی سلیس، رواں، سادہ اور بے تکلف نثر کے اچھے نمونے سامنے نہیں آتے۔ دراصل تاریخ کی بیشتر کتابیں اپنے ماخذ کا محض ترجمہ ہیں، چنانچہ ان میں اصل کے اسلوب کی جھلک پائی جاتی ہے۔ بعض جگہ تو اس قدر الجھا ہوا انداز بیان ملتا ہے کہ نفسِ مضمون واضح ہی نہیں ہوتا۔ حیدری کی "تاریخ نادری" ایسے ہی اسلوب کی

کرتی ہے۔ اشک کی کتاب "واقعات اکبر" کے اہم بیانات بے حد مرصع اور ثقیل انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں عربی اور فارسی کے ادق الفاظ سے گراں بار عبارتیں ذہن پر بوجھ بن جاتی ہیں۔ حسینی بھی "تاریخ آشام" میں سادگی اور سلاست کا جادو نہ جگا سکے۔ اسلوب کسی حد تک آسان اور بامحاورہ ہونیکے باوجود بیانات کی بے کیفی کا شکار رہا ہے۔ جملوں میں الجھاؤ ہے۔ عبارتیں گنجلک اور پُر تعقید ہیں۔ ہندی کے الفاظ کا استعمال بھی طبع لطیف پر گراں گزرتا ہے۔

تاریخ کی بعض کتابوں میں مترجمین کی شعوری کوششوں سے خال خال سادہ اور بے تکلف نثر کے نمونے بھی نظر آجاتے ہیں لیکن جہاں شعور کی گرفت ذرا بھی کمزور پڑی ہے وہاں اصل ماخذ کا اسلوب حاوی ہوگیا ہے۔

شیدا کی "ہدایت الاسلام" کا موضوع مذہب ہے۔ لیکن موضوع کے لحاظ سے اس کتاب میں عالمانہ انداز بیان اختیار کرنے کی بجائے سادہ اور عام فہم اسلوب پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ شیدا کی ہی دوسری تالیف "جامع الاخلاق" کا موضوع مذہب، اخلاق، تصوف اور منطق سے متعلق ہے۔ یہاں شیدا کا اسلوب اپنے موضوع اور ماخذ دونوں سے متأثر ہے۔ اسکا اسلوب خشک اور بے کیف ہے۔ دقیق الفاظ کے استعمال نے زبان کو علمی تو بنا دیا ہے لیکن شگفتگی اور روانی کے وصف سے اسکا اسلوب یکسر عاری ہے۔

اشک کی تصنیف "رسالہ کائنات جو" کا موضوع سائنس ہے۔ اس کی زبان نہایت فصیح ہے۔ اور علمی واصطلاحی اسلوب کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے۔

اسلوب کے ضمن میں بہادر علی حسینی کی "نثر بے نظیر" کی مثال خاص طور سے قابل ذکر ہے جس کے دو نسخے تیار کئے گئے تھے۔ ایک مبتدیوں کے لئے تھا اور دوسرا منتہیوں کے لئے۔ منتہیوں کیلئے ترتیب دیئے گئے نسخے میں حسینی نے خواص کے محاوروں اور عربی، فارسی کے الفاظ کا اہتمام کیا ہے۔ مبتدیوں والے

نسخے میں انہوں نے عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔ جس میں ہندی کے الفاظ بکثرت ہیں لیکن ہندی الفاظ کے شعوری اور غیر فطری استعمال نے اکثر ایسے اسلوب کو جنم دیا ہے۔ جو انتہائی گنجلک اور ثقیل ہے۔ لیکن ایسی مثالیں کم ہی ہیں۔ دراصل اسلوب کی یہ بے راہ روی اردو نثر کے اس تشکیلی دور کی نمائندگی کرتی ہے۔ جب اس کی کوئی سمت و راہ متعین ہی نہیں ہوئی تھی اور اردو نثر اپنے نشو و نما کے لئے مناسب ذرائع کی تلاش میں سرگرداں تھی۔

فورٹ ولیم کالج کے ان چند ادبی کارناموں کے اسالیب بیان کے اس مختصر جائزے[1] کے بعد یہ کہنا دشوار نہیں کہ اگرچہ کالج کے ذمہ داران کی لسانی پالیسی ہر تصنیف کے سلسلے میں یہی تھی کہ زبان، سادہ، سلیس اور عوام کی بولی سے نزدیک ہو پھر بھی یہاں کا سارا ادب اس حکم کی بہترین تابعداری نہیں کرتا۔ یہاں جتنی داستانیں، قصّے، حکایات اور کہانیاں تالیف و ترجمہ کی گئیں، ان میں مصنفین سادگی و سلاست اور عام بول چال کی زبان کے استعمال میں زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ لیکن مذہب و اخلاق اور تاریخ سے متعلق دیگر تصانیف اس لحاظ سے کمزور نظر آتی ہیں۔ انکے اسلوب میں سادگی، روانی اور بے تکلفی کا عام فقدان ہے۔ اس کے علاوہ بعض مصنفین جن میں فطری صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں اور جنھیں زبان و بیان پر قدرت بھی حاصل تھی۔ انہوں نے سادگی اور سلاست کے عمدہ نمونے پیش کئے ہیں۔ ان کے اسلوب میں خاص و عام کی بولی، روزمرہ اور محاورے آسان ہندی الفاظ کے استعمال کی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن بعض مصنفین جنھوں نے اپنے مزاج کے خلاف سادہ اور بول چال کی زبان اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ انکا اسلوب عموماً بے جان، بے کیف اور مصنوعی نظر آتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے مروجہ طرز نثر سے بھی دامن نہیں بچا سکے ہیں۔

---

[1] کالج کی تمام تصانیف کے اسالیب بیان کا تفصیلی جائزہ باب سوم میں لیا جا چکا ہے۔

یوں ایک جانب کالج کے اغراض و مقاصد نے وہاں کے ادیبوں کی تصانیف میں اسلوب کی یک رنگی پیدا کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف ان ادیبوں کی شخصیت کے تنوع نے انکی تصانیف میں مختلف رنگ و آہنگ بکھیر دیئے۔

مستثنیات سے قطع نظر فورٹ ولیم کالج کا نمائندہ اسلوب سادگی اور بے تکلفی، سلاست اور روانی کے وصف سے مملو ہے۔ اور یہ انداز بیان تصانیف کے کسی نہ کسی حصے میں کسی نہ کسی طور سے ضرور نظر آتا ہے۔ اس لئے بنیادی طور پر اسی کو کالج کا مخصوص اسلوب قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہی صاحبانِ عالی شان کا مطمح نظر تھا اور یہی مصنفین کا مقصد۔ اگرچہ کالج کو اس عہد کے مشہور ادیبوں کی خدمات حاصل نہ ہو سکیں پھر بھی فورٹ ولیم کالج کے ادیبوں نے اسلوب کے بنے بنائے ڈھانچے کو توڑ دیا۔ اور اردو نثر کو آزاد فضا میں سانس لینے کی راہ ہموار کی۔ اور ادب کو جو اب تک صرف خواص کے لئے وقف تھا، کالج کے مصنفین نے بول چال کی زبان میں ترتیب دے کر عوام سے قریب کر دیا۔ وہ زبان جو ادب کی تخلیق کے لئے اپنے اندر کوئی کشش نہیں رکھتی تھی، ان مصنفین نے اپنے عمل اور جرأت سے یہ ثابت کر دیا کہ اس زبان میں بھی اتنی صلاحیت ہے کہ مختلف موضوع کے اظہار کا ذریعہ بن سکے۔

باب پنجم

اردو نثر پر فورٹ ولیم کالج کے اثرات

اردو نثر پر فورٹ ولیم کالج کے اثرات کا جائزہ لینے سے پہلے ان نثری کاوشوں کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے جو فورٹ ولیم کالج سے قبل دکن اور خصوصاً شمالی ہند میں معرضِ وجود میں آئیں۔

متفرق ملفوظات[1] سے قطع نظر دکن کا اوّلین نثر نگار عین الدین گنج العلم (۷۰۶ھ ۱۳۰۶ء - ۷۹۵ھ ۱۳۹۲ء) کو قرار دیا گیا ہے۔ ان سے چند رسالے بھی منسوب کئے گئے ہیں۔ عین الدین کے بعد خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا ذکر کیا جاتا رہا ہے[2]۔ لیکن اوّلین نثر نگار کی حیثیت سے عین الدین گنج العلم کا مقام مشتبہ اور ان کے رسالوں کا وجود ناپید ہے۔ ان کے رسائل کی غیر موجودگی میں ہم انکو اوّلین نثر نگار تسلیم نہیں کر سکتے۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (متوفی ۸۲۵ھ ۱۴۲۱ء) کو معراج العاشقین کا مصنف قرار دیا جاتا رہا ہے[3] لیکن جدید تحقیق سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ نہ تو وہ خواجہ بندہ نواز کی تصنیف ہے اور نہ ہی انکے عہد کی۔ بلکہ معراج العاشقین کے مصنف مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری ہیں۔ عین الدین گنج العلم اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے سلسلے کی غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز ہیں:-

> عین الدین گنج العلم (۷۰۶ھ - ۷۹۵ھ/۱۳۰۶ء - ۱۳۹۲ء) کا نام ہر ادبی تاریخ میں لیا جاتا ہے۔ لیکن انکی کوئی نثری تصنیف اب تک دستیاب نہیں ہوئی حتیٰ کہ

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اردو نثر کا آغاز و ارتقاء اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

اردوئے قدیم۔ شمس اللہ قادری ص ۴۱، داستان تاریخ اردو۔ حامد حسن قادری ص ۳۰۔ تاریخ ادب اردو۔ رام بابو سکسینہ ص ۲ (حصہ نثر)، ارباب نثر اردو۔ سید محمد ص ۵۔

عبدالحق، حامد حسن قادری، ڈاکٹر محی الدین زور۔ نصیر الدین ہاشمی۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ۔

وہ تین رسالے، جنکا ذکر شمس اللہ قادری نے اردوئے قدیم میں کیا ہے۔ ایک افسانے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (م ۸۲۵ھ ۔ ۱۴۲۱ء)........ کی تصنیف معراج العاشقین بھی جواب تک اردو کی پہلی نثری تصنیف مانی جاتی رہی ہے نہ صرف اس دور کی تصنیف نہیں ہے بلکہ اس کے مصنف خواجہ گیسو دراز کے بجائے مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری ہیں جنھوں نے گیارہویں صدی ہجری کے نصف آخر یا بارہویں صدی کے اوائل میں "تلاوۃ الوجود" کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا"[۱]

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے رسالہ جنونیہ" کو دکن کا اولین نثری کارنامہ قرار دیا ہے[۲]۔ مذکورہ رسالے میں اردو مقولوں کی تشریح فارسی زبان میں کی گئی ہے۔ لیکن رسالہ جنونیہ کے مختصر مقولوں کو ہم باقاعدہ نثر کا درجہ نہیں دے سکتے۔ اس کے مصنف کا بھی کچھ سراغ نہیں ملتا۔

سرزمین دکن کے بزرگ میراں جی شمس العشاق (متوفی ۹۰۲ھ/۱۴۹۲ء) سے بھی نثری رسالے منسوب کیے گئے ہیں[۳]۔ حکیم شمس اللہ قادری نے انکے دو رسالے جلترنگ اور گل باس کو دیکھنے کا دعویٰ بھی کیا ہے۔[۴]

---

[۱] تاریخ ادب اردو (حصہ اول) ڈاکٹر جمیل جالبی ص ۱۵۹، ۱۶۰۔

[۲] اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء ۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ص ۵۰، ۵۱، ۵۲۔

[۳] اردوئے قدیم ص ۱۱۶، ارباب نثر اردو ص ۵، تاریخ ادب اردو (حصہ نثر) ص ۲، اردو نثر کا دہلوی دبستان (ڈاکٹر عبدالرحیم جاگیردار) ص ۱۲۴۔

[۴] اردوئے قدیم ص ۱۱۶۔ رام بابو سکسینہ نے جل ترنگ اور گل باس کو میراں جی کے فرزند شاہ برہان الدین جانم کی تصنیف قرار دیا ہے (تاریخ ادب اردو، حصہ نثر ص ۲) لیکن یہ درست نہیں۔

حامد حسن قادری نے لکھا ہے کہ نثری تصانیف میں شرح "مرغوب القلوب"، جل ترنگ اور گل باس قلمی موجود ہیں[1]۔ لیکن ڈاکٹر حسینی شاہد نے جل ترنگ اور گل باس دونوں رسالوں کو ناپید قرار دیا ہے[2]۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کو بھی انکا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہو سکا تھا[3]۔ یوں میراں جی کے نثری کارنامے بھی مشتبہ ہیں۔

دکن میں نثری روایت کا سلسلہ صوفی بزرگوں کا مرہون منت ہے۔ نثر کی تاریخ کا باقاعدہ آغاز حضرت شاہ برہان الدین جانم (متوفی ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء) سے ہوتا ہے۔ یہ میراں جی شمس العشاق کے صاحبزادے اور سلطنت عادل شاہی بیجاپور کے مشہور صوفی تھے۔ انہوں نے تصنیف و تالیف سے رشد و ہدایت کا کام لیا۔ برہان الدین جانم کو ہم اولین نثر نگار قرار دے سکتے ہیں۔ انکے دو نثری کارنامے مستند بھی ہیں اور دستیاب بھی۔ "کلمۃ الحقائق" اور "وجودیہ"۔ انکا موضوع تصوف و اخلاق ہے[4]۔ کلمۃ الحقائق اردو نثر نگاری کی اوّلین کاوش ہے۔ اس کے اسلوب میں ادبیت کی بھی ہلکی سی جھلک ملتی ہے۔

شاہ برہان الدین جانم کے ہمعصر شیخ محمود الحق خوش دہاں ہیں۔ انہوں نے بھی اپنی تصنیف و تالیف میں تصوف کو موضوع بنایا ہے۔ اسی موضوع پر ان سے منسوب ایک اردو رسالہ "رسالہ محمود خوش دہاں" ہے[5]۔ خوش دہاں کی نثر میں سلیقگی اور ربط ہے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے ان کی نثری تصانیف کے بارے میں لکھا ہے:۔

"محمود خوش دہاں کثیر التصانیف بزرگ ہیں .... بعض نثری

---

[1] داستان تاریخ اردو ص ۴۳۔ [2] سید شاہ امین الدین اعلیٰ ص ۱۰۳۔

[3] اردو نثر کا آغاز و ارتقا ص ۱۳۵۔

[4] تاریخ ادب اردو (حصہ اوّل)، ڈاکٹر جمیل جالبی ص ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۱۰۔

[5] " " " " " " ص ۲۰۵، ۲۰۷، ۲۰۸۔

رسائل بھی ان سے منسوب ہیں یہ انتساب شبہ سے خالی نہیں"۔[1]

"خوش وہاں" کا صرف ایک مذکورہ رسالہ دستیاب ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کا اقتباس بھی نقل کیا ہے[2]۔ ہاں اس کے علاوہ کسی اور رسالے کا انتساب ضرور مشتبہ ہو سکتا ہے۔

اسی عہد کے ایک دوسرے صوفی نثر نگار سید شاہ امین الدین اعلیٰ (۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء - ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء) ہیں۔ شاہ امین الدین اعلیٰ، شاہ برہان الدین جانم کے صاحب زادے تھے۔ "گفتار حضرت امین" "رسالہ وجودیہ" اور "کلمۃ الاسرار" ان کی نثری تصانیف ہیں[3]۔ انکے علاوہ ڈاکٹر حسینی شاہد نے "ارشادات"، "رسالہ ظاہر و باطن"، "عشق نامہ" اور "شرح کلمہ طیب" کو بھی امین الدین اعلیٰ کی تصنیف قرار دیا ہے[4]۔ ان سب کا موضوع تصوف و اخلاق ہے۔

اس اجمالی ذکر سے اتنا تو واضح ہو جاتا ہے کہ عادل شاہی دور (بیجاپور) میں صوفیا رکرام کی مذہبی تصانیف سامنے آتی ہیں۔ ان سب کا مشترک موضوع تصوف اور اخلاق ہے۔ لیکن قطب شاہی دور میں تصوف و اخلاق کی روایت سے انحراف کی مثال سامنے آتی ہے۔

قطب شاہی دور کا مشہور شاعر ملا اسد اللہ وجہی (متوفی ۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء) تھا۔ اس نے دکنی نثر کو ایک نئی جہت سے روشناس کرایا۔ اس کی تصنیف "سب رس" اردو نثر کا اوّلین ادبی نمونہ ہے۔ یہ اس کی طبع زاد تصنیف نہیں ہے بلکہ محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کی فارسی تصنیف "دستور عشاق" (۸۴۰ھ/۱۴۳۶ء) کے نثری خلاصے "حسن و دل" سے ماخوذ ہے۔ وجہی نے "سب رس" میں کہیں

---

[1] سید شاہ امین الدین اعلیٰ۔ ڈاکٹر حسینی شاہد ص ۱۲۸۔

[2] [3] تاریخ ادب اردو (حصہ اول) ڈاکٹر جمیل جالبی ص ۳۰۷، ۳۰۸۔

[4] سید شاہ امین الدین اعلیٰ۔ ڈاکٹر حسینی شاہد ص ۳۹۴، ۴۰۰، ۴۱۱، ۴۱۲۔

بھی اس نکتے کی جانب اشارہ نہیں کیا ہے کہ وہ "حسن و دل" کا قصہ اخذ کر رہا ہے۔

"سب رس" اردو نثر کی تاریخ میں پہلی تمثیل ہے۔ اس میں حسن و دل کا قصہ تمثیلی پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ ملا وجہی نے "سب رس" میں نثر و نظم کو "گھلا ملا کر" لکھا ہے۔ "سب رس" میں اسلوب اور طرز بیان کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ نثر اور نظم کا یہی امتزاج طلسم ہوشربا اور فسانۂ عجائب میں نمایاں ہے۔

قطب شاہی دور کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس عہد میں جہاں فارسی سے ترجمے کئے گئے وہیں چھوٹے چھوٹے مذہبی رسالے بھی لکھے گئے۔ اس سلسلے میں میراں جی حسین خدا نما (۱۵۹۵ء ۱۰۰۴ھ - ۱۶۶۳ء ۱۰۷۴ھ) کا نام قابل ذکر ہے۔ یہ بھی صوفی اور مجذوب تھے۔ اپنے خیالات اور روحانی فیض کو عام کرنے کے لئے انہوں نے چند رسائل تالیف اور ترجمہ کئے تھے۔ ان کے نام ہیں۔ "چہار وجود"، "شرح تمہیدات ہمدانی" اور "رسالہ قربیہ"[۱]۔ تمہیدات ہمدانی (مصنفہ ابوالفضائل عبداللہ بن محمد عین القضاۃ ہمدانی۔ متوفی ۱۱۸۳ء ۵۲۴ھ) عربی کی تصنیف ہے۔ اس کی شرح خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے تقریباً تین سو سال بعد فارسی میں لکھی تھی۔ میراں جی حسین خدا نما کی شرح تمہیدات ہمدانی (۱۰۶۶ھ) اسی کا دکنی اردو میں ترجمہ ہے[۲]۔ میراں جی خدا نما نے ناہموار اور پیچیدہ نثر لکھی ہے۔

میراں یعقوب۔ میراں جی خدا نما کے ہم عصر تھے۔ انہوں نے خدا نما سے ہی فیض حاصل کیا تھا۔ شمائل الاتقیا (۱۶۷۳ء ۱۰۸۴ھ) انکا نثری کارنامہ ہے۔ یہ رکن عمادالدین دبیر معنوی کی فارسی تصنیف شمائل الاتقیا کا ترجمہ ہے[۳]۔ میراں جی یعقوب نے محض لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ وضاحت کے لئے اضافے بھی کئے ہیں۔ انہوں نے سادہ نثر لکھی ہے۔ اس نثر کے خد و خال شمالی ہند کے مذہبی تراجم میں نظ

---

[۱] [۲] [۳] تاریخ ادب اردو (حصۂ اول) ڈاکٹر جمیل جالبی ص ۹۰، ۹۸، ۹۹، ۱۰۵۔

آتے ہیں۔

دکنی نثر کے اس اجمالی جائزے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ صوفیائے کرام کی تصنیفی کاوشوں میں تبلیغ اور رشد و ہدایت کا مقصد غالب ہے۔ ان میں زبان اور اسلوب پر کم توجہ دی گئی ہے۔ طرزِ ادا اور اسلوب کا حسن خال خال نظر آ بھی جاتا ہے۔ غیر مذہبی تصانیف میں ملا وجہی کی "سب رس" اپنی نوعیت کی منفرد تصنیف ہے اور زبان و بیان کی سطح پر اس کی فوقیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

دکن کی طرح شمالی ہند میں بھی اردو نثر کے آغاز کی روایت غیر مستند بنیادوں پر قائم ہے۔ شمالی ہند کا اولین نثر نگار خواجہ سید جہانگیر اشرف سمنانیؒ (متوفی ۸۱۸ھ/۱۴۰۵ء) کو قرار دیا جاتا ہے۔ اور تصوف پر مبنی ایک رسالہ بھی ان سے منسوب کیا گیا ہے[1]۔ یہ رسالہ دستیاب نہیں اسلئے اردو نثر کے ارتقاً میں خواجہ صاحب کی اولیت مشتبہ اور غیر مستند ہے۔ میر جعفر زٹلی (۱۰۶۸ھ/۱۶۵۹ء – ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۳ء) سے منسوب نثری کارنامے "اخبار سیاسیہ" اور "اخبار دربار معلیٰ" بھی شمالی ہند کی اولین نثر کے ذیل میں شمار کیے جاتے ہیں۔ میر جعفر کے یہ دونوں کارنامے بھی ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔

ان مشتبہ کارناموں سے قطع نظر، جنھیں وقتاً فوقتاً شمالی ہند کی اولین نثر کا نمونہ قرار دیا جاتا رہا ہے، شمالی ہند میں نثر کے باقاعدہ آغاز کے سلسلے میں فضل علی فضلی (سنہ ولادت ۱۰-۱۱۱۷ء – متوفی تقریباً ۸۴-۷۹ء) کی کربل کتھا کا نام لیا جاتا ہے۔

کربل کتھا فضلی کی طبع زاد تصنیف نہیں ہے بلکہ یہ کمال الدین حسین بن علی واعظ کاشفی کی

---

[1] داستان تاریخ اردو۔ حامد حسن قادری ص ۱۷، تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند، جلد نمبر سات (۱۷۰۷ء–۱۸۰۳ء)۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ص ۴۶۸

فارسی تصنیف "روضۃ الشہدا" کا ترجمہ ہے۔

لیکن کربل کتھا روضۃ الشہدار کا محض لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ فضلی نے اس کے مضمون اور مفہوم کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی جانب سے کمی وبیشی بھی کی ہے۔ اور یوں کربل کتھا اپنی موجودہ شکل میں روضۃ الشہدار سے اسقدر کم مماثلت رکھتی ہے کہ اسے اگر فضلی کی طبع زاد تصنیف کا درجہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

روضۃ الشہدار کے ترجمے سے فضلی کا مقصد ادب کی تخلیق نہیں تھا بلکہ مذہبی ضرورت کے پیش نظر وہ اس جانب متوجہ ہوئے تھے۔ انہوں نے روضۃ الشہدار کو فارسی سے اردو میں اس لئے منتقل کیا کہ وہ حضرات جو مجلس عزا میں فارسی عبارت کا مفہوم نہیں سمجھ سکتے، وہ بھی سمجھ سکیں۔ لیکن اس کے باوجود کربل کتھا میں فارسی کا سحر زیریں لہر کی طرح جاری وساری ہے۔ خاص طور سے تمہیدی حصے میں انہوں نے مکمل طور سے فارسی روایات نثر کی پیروی کی ہے۔ یہاں انہوں نے عبارت آرائی سے کام لیا ہے۔ مقفیٰ و مسجع جملے لکھے ہیں اور رنگینیٔ عبارت کا کمال دکھایا ہے۔ ہاں ان حصوں میں جہاں وہ واقعات بیان کرتے ہیں انکی زبان سادہ ہے۔ تاہم وہ مقفیٰ عبارت لکھنے کے شوق کو یہاں بھی دبا نہیں سکے ہیں اور جہاں موقعہ ملا ہے انہوں نے قافیہ پیمائی کر ڈالی ہے۔ فارسی اور عربی کے ثقیل الفاظ بھی سادہ بیانات میں خال خال نظر آجاتے ہیں۔ وہ فارسی ترکیبوں سے بھی اپنا دامن نہیں بچا سکے چنانچہ انہوں نے فارسی اور ہندی الفاظ کے امتزاج سے نئی ترکیبیں اختراع کر ڈالی ہیں۔ آنے یہ ترکیبیں دلکش بھی ہیں اور نامانوس بھی۔ کربل کتھا میں پنجابی اور دکنی اثرات بہت نمایاں ہیں۔ فضلی نے ہندی کے الفاظ بھی کثرت سے استعمال کئے ہیں۔

کربل کتھا اس دور کا کارنامہ ہے۔ جب اردو عوام اور خواص میں رواج پا رہی تھی۔ زبان و بیان کے اصول ہنوز متعین نہیں ہوئے تھے۔ ان حالات میں فضلی نے کربل کتھا میں زبان و بیان کا نمونہ

انداز اختیار کیا ہے وہ خاصا ترقی اور اپنے عہد کا نمائندہ ہے۔ زبان و قواعد کی چند خامیوں اور پنجابی و دکنی لہجہ سے قطع نظر کربل کتھا دہلوی زبان کی نمائندہ تصنیف ہے۔

کربل کتھا میں شہدائے کربلا اور انکے متعلقین کے حالات بارہ مجلسوں پر مشتمل ہیں۔ یہ ساری مجلسیں زبان و بیان کے لحاظ سے درد و تاثیر کی پوری کیفیت رکھتی ہیں۔ فضلی نے مرثیے بھی کہے ہیں اور یہ مرثیے اپنے اندر سوز و گداز کا ایک جہان سموئے ہوئے ہیں۔

تاریخ نثر اردو کی کتابوں سے علم ہوتا ہے کہ فضلی نے کربل کتھا ۱۱۴۵ھ / ۳۳-۱۷۳۲ء میں تالیف کی۔ اور ۱۱۶۱ھ میں اس پر نظر ثانی کی۔ لیکن ڈاکٹر محمود الٰہی کے ایک عالمانہ مضمون سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کربل کتھا کی تکمیل ۱۱۸۶ھ سے پہلے نہیں ہوئی[۱]۔ یوں کربل کتھا کی اولیت بھی مشتبہ قرار پاتی ہے۔

عیسوی خاں بہادر کی "قصہ مہر افروز و دلبر" بھی حال ہی میں دستیاب ہوئی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اس کا زمانۂ تصنیف ۱۷۳۲ء سے ۱۷۵۹ء کے درمیان متعین کیا ہے[۲]۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے آغا حیدر حسن کے حوالے سے محمد حسین آزاد کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے دلی کے عیسیٰ خاں کو عیسوی خاں بہادر تسلیم کیا ہے[۳]۔ لیکن ڈاکٹر پرکاش مونس نے عیسوی خاں بہادر کو نرور (گوالیار) کے راجا چھتر سنگھ ۱۷۲۰ء سے ۱۷۵۴ء کے بعد تک م سے متعلق بتایا ہے۔ ان کے مطابق عیسوی خاں کا ذکر ہندی تذکروں میں موجود ہے۔ اور

---

[۱] کربل کتھا، شمولہ دوماہی اکادمی ص ۱۰۷۔

[۲] [۳] مقدمہ قصہ مہر افروز و دلبر ص ۹، ۱۰۔

عیسوی خاں نے راجا چھتر سنگھ کی سرپرستی کے زمانے میں بہاری ست سئی کی ٹیکا (شرح) "رس چندرکا" کے نام سے ہندی (برج بھاشا) نثر و نظم میں ۱۷۵۲ء میں لکھی تھی۔ ان کا خیال ہے کہ اس سے قبل عیسوی خاں نے اردو زبان میں بھی بہاری ست سئی کی ایک شرح لکھی تھی۔[1]

"قصہ مہر افروز و دلبر" ایک طبع زاد داستان ہے۔ جس میں روایتی داستانوں کے تقریباً تمام عناصر موجود ہیں۔ اس قصے کا آغاز دیگر داستانوں کی طرح عشق آباد کے بادشاہ عادل شاہ کی لاولدی سے ہوتا ہے۔ بادشاہ عالم مایوسی میں تخت و تاج چھوڑ کر جنگل کی راہ لیتا ہے۔ لیکن ایک فقیر کی دعا سے صاحب اولاد ہوتا ہے۔ شہزادہ مہر افروز سن شعور کو پہنچ کر طویل مہمات اور خوفناک واقعات سے نبرد آزمائی کے بعد پریوں کی شہزادی دلبر کو حاصل کرتا ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے خیال کے مطابق اس میں وہ تمام عناصر شامل ہیں جو فارسی داستانوں کی خصوصیت ہیں۔[2] لیکن اس داستان کی ایک خاص بات فضا اور ماحول ہے۔ جو مکمل طور سے ہندوستانی ہے۔ اس کے علاوہ قصے کے بیشتر بیانات ہم عصر ہند و معاشرت کے آئینہ دار ہیں۔ اس داستان کی جڑیں ہندوستان کی سرزمین میں دور تک پیوست نظر آتی ہیں۔

---

[1] اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر ص ۳۴۲، ۳۴۳۔

[2] مقدمہ قصہ مہر افروز و دلبر ص ۱۰۔

"قصہ مہر افروز و دلبر" کی زبان عموماً سادہ، سلیس، رواں اور واضح ہے۔ اس میں کھڑی بولی اور برج بھاشا کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ پوری داستان میں گفتگو کا سا انداز موجود ہے۔ طویل سے طویل بیانات میں بھی انداز بیان کی روانی مجروح نہیں ہوتی۔ منظر نگاری ہو یا جذبات نگاری، تہذیبی مرقعے ہوں یا رزم و بزم کی تصویر کشی مصنف کا قلم ہر بیان سے انصاف کرتا ہے۔ کہیں کہیں قصّے کا اسلوب غیر متوازن بھی ہو گیا ہے لیکن وہاں بھی نفس مضمون کی ادائیگی میں نقص پیدا نہیں ہوتا۔

مجموعی طور سے "قصہ مہر افروز و دلبر" اردو اور ہندی نثر کے خوشگوار امتزاج کا اوّلین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

کربل کتھا اور قصۂ مہر افروز و دلبر نے اسلوب اور بیان میں ایک حد تک سادہ نگاری کو رواج دیا تھا مگر سوداؔ کی نثر اس کے بالکل برعکس ہے۔ انہوں نے اپنے دیوان کا دیباچہ ۱۱۸۰ھ ۱۷۶۶ء میں لکھا۔[۱] اس دیباچے میں انہوں نے اپنے دور کی فارسی نثر کی تقلید کی ہے اور مرصع و مقفیٰ انداز اختیار کیا ہے۔ انکی رنگینیٔ عبارت نے جملوں کو پیچیدہ اور گنجلک بنا دیا ہے۔ مسجع و مقفیٰ انداز تحریر نے نفس مضمون کو ناقابل فہم بنا ڈالا ہے۔ قافیہ پیمائی اس زمانے میں عام تھی۔ دکن میں سب رس اس کی نمایاں مثال ہے۔ سوداؔ نے بھی قافیہ پیمائی میں سارا زور قلم صرف کیا ہے۔ اور انشاء پردازی کا کھل کر کمال دکھایا ہے۔ لیکن اس کے باوجود انکی نثر غیر متوازن ہے۔

سوداؔ کی نثر کے سلسلے میں میرؔ کی مثنوی "شعلۂ عشق" کے نثری ترجمے کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن

---

[۱] تاریخ نثر اردو (نمونۂ منثورات)۔ احسن مارہروی ص ۷۲۔

یہ ترجمہ اب دستیاب نہیں۔

شمالی ہند کی داستان نویسی میں سودا کی پیروی میر محمد حسین عطا خاں تحسین نے کی ہے۔ انہوں نے فارسی کے قصۂ چہار درویش کو رنگین اور دقیق اردو میں "نوطرز مرصع" کے نام سے ۱۷۷۵ء میں تصنیف کیا۔"نوطرز مرصع" میں انہوں نے اس قصے کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک بار وہ جنرل اسمتھ کے ہمراہ کشتی کے ذریعہ کلکتہ جا رہے تھے۔ اس طویل سفر میں تحسین کے ایک رفیق نے انہیں یہ داستان سنائی۔ تحسین کو یہ داستان اسقدر پسند آئی کہ انہوں نے اسے نوطرز مرصع میں لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔[1] تحسین نے اسکا آغاز ۱۷۶۸ء میں کیا تھا لیکن یہ ۱۷۷۵ء میں تمام ہو سکی۔[2]

نوطرز مرصع اس دبستان خیال کی نمائندگی کرتی ہے جس نے اول تو اردو نثر کو قابل اعتنا سمجھا ہی نہیں اور اگر شرف قبولیت کا درجہ بخشا بھی تو زبان وبیان کا وہ انداز اور معیار پیش کیا جو فارسی روایات کا تابع تھا۔ اور اس زبان میں جو فن پارے تخلیق کئے گئے وہ ایک خاص طبقے کے لئے تصنیف کئے جاتے تھے۔ نوطرز مرصع اسی سطح کی داستان ہے۔ تحسین نے بھی یہ التزام رکھا کہ جو کوئی اردوئے معلیٰ سیکھنے کا حوصلہ رکھتا ہو وہی اسکا مطالعہ کرے۔[3]

نوطرز مرصع کا محض قصہ ہی فارسی سے ماخوذ نہیں ہے بلکہ اول سے آخر تک اسکا ایک ایک جملہ گویا فارسی سے اخذ کیا گیا ہے۔ تحسین نے شعوری طور پر فارسی انشاء پردازی کی پیروی کی ہے۔ زیادہ سے زیادہ پر تصنع، پر تکلف اور مغلق انداز تحریر اپنانے کی کوشش کی ہے چنانچہ قصے میں ایک

---

[1] دیباچہ نوطرز مرصع ۔ میر محمد حسین عطا خاں تحسین ص ۳، ۴، ۵
[2] مقدمہ ۔ نورالحسن ہاشمی ۔ ص ۳۲۔
[3] دیباچہ نوطرز مرصع ۔ ص ۵۔

مصنوعی اور مسلط شدہ انشار پردازی کی فضا کا احساس ہوتا ہے۔ اگر ایک جانب تشبیہ و استعارے نقطۂ کمال کو چھو رہے ہیں تو دوسری جانب مبالغے اور تخیل کی بلند پروازیاں مائل بہ فلک ہیں۔ عربی اور فارسی کے ثقیل اور گراں بار الفاظ نے قصے کا سارا طلسم غارت کرکے رکھدیا ہے۔ داستان کے ابتدائی حصوں میں تحسین نے زیادہ سے زیادہ اپنی انشار، پر تصنع، اور پر تکلف عبارت کا کمال دکھایا ہے۔ لیکن جوں جوں قصہ آگے بڑھتا جاتا ہے انکا قلم نہ تو اس قدر مرصع نگاری کر سکا ہے اور نہ تشبیہ و استعارے کی وہ فضا برقرار رکھ سکا ہے۔ جو وہ ابتدار میں قائم کر چکے تھے۔ گنجلک اور پر تعقید عبارتیں بھی نسبتاً سہل انگاری کا شکار ہو گئی ہیں۔ یہاں انکا اسلوب سادہ اور بے تکلف نظر آتا ہے۔

زبان کی فارسیت نے تحسین کی نثر کو غیر متوازن اور ناہموار بنا دیا ہے۔ وجہی اور فضلی کی طرح تحسین کو بھی اس بات کا دعوا ہے کہ وہ نثر میں اپنے طرز کے موجد ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں :۔

"مضمون اس داستان بہارستان کے تئیں بھی بیچ عبارت رنگیں زبان ہندی کے لکھا چاہیئے۔ کیونکہ آگے سلف میں کوئی شخص موجد اس ایجاد تازہ کا نہیں ہوا۔"[1]

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے نو طرز مرصع کے اسلوب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"الغرض یہ تصنیف اپنے اسلوب کے اعتبار سے ان ہندوستانی فارسی کے ادیبوں کی یاد تازہ کرتی ہے۔ جن کی کتابیں سہ نثر ظہوری، مینا بازار، شبنم شاداب، پنج رقعہ، بہار دانش وغیرہ آخر عہد مغلیہ میں فارسی انشا پردازی

---

[1] دیباچہ نو طرز مرصع ۔ ص ۴۴

کی سنگِ میل سمجھی جاتی تھیں۔[1]

تحسین نے نوطرزِ مرصع میں جابجا اشعار کا بھی استعمال کیا ہے۔ یہ اشعار اساتذۂ سخن کے بھی ہیں اور بذاتِ خود تحسین کے بھی۔ اشعار کی کثرت بھی نثر کی روانی میں مانع ہوئی ہے۔

نوطرزِ مرصع کے بعد شمالی ہند کی ایک نثری داستان "نو آئین ہندی" (عرف قصہ ملک محمد و گیتی افروز) ہے۔ اسے مہرچند کھتری مہر نے ۱۲۰۳ھ ۸۹-۱۷۸۸ء میں تالیف کیا تھا۔[2] یہ داستان فارسی زبان کے قصۂ آذرشاہ اور سمن رُخ بانو کا ترجمہ ہے۔ یوں تو اسکا نام نو آئین ہندی ہے لیکن یہ داستان کے سب سے اہم ضمنی قصے ملک محمد و گیتی افروز کے نام سے مشہور ہے۔

نو آئین ہندی کے ترجمے تک حالانکہ عربی و فارسی کا سحر ٹوٹا نہیں تھا۔ اردو نثر اس وقت بھی واضح اور آزاد شکل اختیار نہیں کر پائی تھی لیکن مہرچند نے عربی و فارسی کے اس طلسم کو توڑ کر سادہ اور سلیس زبان میں قصہ بیان کیا ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ مہرچند نے اپنے انگریز آقا کو اردو زبان سے واقف کرانے کے لئے یہ انداز بیان اختیار کیا۔

نو آئین ہندی ایک مختصر داستان ہے۔ اس میں آذرشاہ بادشاہ کا قصہ داستانوں کے عام بادشاہوں سے قدرے مماثلت رکھتا ہے۔ داستان کا نصف سے بھی زیادہ حصہ ملک محمد اور پریوں کی شہزادی گیتی افروز کی واردات عشق پر مشتمل ہے۔ درمیان میں عجیب و غریب واقعات اور خطرات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن انجام بہرحال طربیہ ہی ہوتا ہے۔

پوری داستان میں ایک افسانوی دلکشی پائی جاتی ہے۔ مصنف نے غیر ضروری بیانات

---

[1] مقدمہ نوطرزِ مرصع۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ص ۴۸۔

[2] اردو کی نثری داستانیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین ص ۱۴۵۔

اور طوالت سے کام لیا ہے اور نہ لفظی و معنوی تکلفات اور تصنعات سے۔ قصے کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے مصنّف نے واقعات پر اپنی گرفت مضبوط رکھی ہے۔ موقع اور محل کے لحاظ سے وہ اپنا انداز بیان بھی تبدیل کرتا گیا ہے قصے میں ایسے الفاظ اور ایسی تراکیب خال خال نظر آتی ہیں جو اب متروک ہو چکی ہیں۔

مہر چند نے داستانوں کے طرز پر اپنی نثر میں بھی اشعار کو جگہ دی ہے۔ یہ اشعار معیاری بھی ہیں اور غیر معیاری بھی۔ اشعار کے علاوہ رباعی اور مثنوی کے ٹکڑے بھی مستعمل ہیں۔ مہؔر نے دوہوں کا بھی استعمال کیا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے مہؔر کی زبان وبیان پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:۔

"مہر کا طرۂ فخر بیانات کے وفور میں نہیں۔ انداز بیان کی سلاست میں ہے۔ انکی زبان اگرچہ کوثر و تسنیم سے نہیں تو آب زلال سے ضرور دُھلی ہوئی ہے۔ سوؔدا کے دیباچہ دیوان اور تحسینؔ کی نوطرز مرصع کے بعد مہؔر کی نثر گوئی ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اردو انشا کے ارتقا میں فورٹ ولیم کالج کو جس طرح نو کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ اسکی داغ بیل مہؔر ڈال چکے تھے"۔[۱]

نثر کے اس ارتقائی دور میں بھی شمالی ہند میں موضوعات میں تنوع ملتا ہے۔ یہاں داستانوں کے علاوہ قرآن شریف کے تراجم بھی ہوئے۔ اس سلسلے میں شاہ رفیع الدّین اور شاہ عبدالقادر کے ترجموں کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سُلطانہ نے شاہ رفیع الدّین والے نسخے کا سنہ ترجمہ سنہ ۱۲۰۰ھ (م ۱۷۸۶ء) اور شاہ عبدالقادر کے ترجمے کا سنہ ۱۲۰۵ھ (م ۱۷۹۰ء) درج کیا ہے۔[۲]

---

[۱] اردو کی نثری داستانیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین ص ۱۵۸۔ [۲] اردو نثر کا آغاز اور ارتقا۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ص ۳۹۵۔

یہی سنین حامد حسن قادری بھی درج کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ شاہ رفیع الدین صاحب نے اردو کا ترجمہ ۱۲۰۶ھ/۱۷۷۶ء[1] کے قریب مرتب کیا۔[2] اس ترجمے کے زبان و بیان کے متعلق مزید معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ترجمہ اس قدر لفظی اور بے محاورہ اور دشوار فہم ہے کہ ہمارے زمانے میں کیا، اس زمانے میں بھی بول چال کی زبان ایسی نہیں تھی لیکن اصل یہ ہے کہ عربی زبان کی وسعت و بلاغت اور قرآن مجید کی معجز نما عبارت ترجمہ کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ اور شاہ صاحب جیسے محتاط بزرگ کو آیت اور لفظ لفظ پر یہ خیال تھا کہ ہماری طرف سے کوئی ایسی کمی و بیشی نہ ہو جائے جس سے مطلب کچھ سے کچھ ہو جائے اس لئے انکے نزدیک بہترین صورت یہ تھی کہ ہر لفظ اور ہر حرف کا ترجمہ عربی کی ترتیب کے مطابق اسی موقع پر لکھدیا جائے خواہ اردو عبارت محاورہ کے خلاف ہو جائے۔"[3]

"نمونۂ منثورات" میں احسن مارہروی نے شاہ رفیع الدین کے ترجمے کا سنہ ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۸ء درج کیا ہے۔[4] لیکن آگے چل کر انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

"ترجمۂ اول کا سنہ تحریر صحیح معلوم نہ ہو سکا۔ صرف اتنا علم ہوا کہ ترجمۂ ثانی سے پہلے کیا گیا۔ اس لئے اسکا نمبر اول قائم کیا گیا۔ ترجمہ اول

---

[1] حامد حسن قادری نے سنہ عیسوی غلط درج کیا ہے۔

[2] [3] داستان تاریخ اردو ۔ حامد حسن قادری ص ۸۴۔

[4] تاریخ نثر اردو (نمونۂ منثورات)، احسن مارہروی ص ۷۷۔

بہت کم شائع ہوا"[1]

بابائے اُردو نے شاہ عبدالقادر کے ترجمے کو ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء کا بتایا ہے۔ لیکن شاہ رفیع الدین کے ترجمے کی اولیت پر شک کا اظہار کیا ہے۔ کیوں کہ شاہ عبدالقادر نے اپنے ترجمہ کے دیباچہ میں اپنے والد شاہ ولی اللہ کے فارسی ترجمے کا ذکر تو کیا ہے۔ لیکن اپنے بھائی شاہ رفیع الدین کے ترجمے کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے[2]۔ عبدالجلیل نعمانی نے شاہ رفیع الدین کے ترجمے کی فرہنگ مرتب کرتے ہوئے اس ترجمے کا سن ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء قرار دیا ہے[3]۔ لیکن انہوں نے اس سلسلے میں کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔

یوں تو مذہبی تراجم کے ضمن میں شاہ عبدالقادر دہلوی اور شاہ رفیع الدین سے بھی قبل بحیثیت مترجم حکیم شریف خاں دہلوی (۱۱۳۷ھ/۱۷۲۴ء ـ ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۷ء) کا نام آتا ہے۔ ان کے ترجمۂ قرآن مجید کو شاہ عبدالقادر کے ترجمے سے تقریباً بیس سال قبل کا ترجمہ قرار دیا گیا ہے[4]۔ حکیم صاحب کا یہ ترجمہ نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے اس لئے اس کے بارے میں کوئی رائے دینا ممکن نہیں۔ ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۱ء میں سید شاہ حقانی نے تفسیر قرآنی آسان اور صاف زبان میں تصنیف کی۔ یہ تفسیر غیر مطبوعہ ہے۔ احسن مارہروی نے اسکا نمونہ "نمونۂ منثورات" میں پیش کیا ہے[5]۔

---

[1] تاریخ نثر اردو (نمونۂ منثورات) احسن مارہروی ص ۸۰۔

[2] قدیم اردو ـ مولوی عبدالحق ص ۱۳۳۔

[3] " " ص ۱۳۲۔

[4] داستان تاریخ اردو ـ حامد حسن قادری ص ۱۴۵۔

[5] تاریخ نثر اردو (نمونۂ منثورات) احسن مارہروی ص ۸۱۔

شمالی ہند کا اوّلین دستیاب شدہ اور مقبول ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی کا ہے۔ یہ شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے تھے۔ انہوں نے ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء میں قرآن شریف کا ترجمہ کیا۔ اور اس کا نام "موضح القرآن" رکھا۔ اس ترجمے کے دیباچے میں شاہ صاحب نے خود ہی وضاحت کی ہے:۔

> "اس کتاب کا نام موضح القرآن ہے۔ اور یہی اس کی صفت ہے اور یہی اس کی تاریخ ہے۔"[1]

چنانچہ یہ محض لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ وضاحت اور تفسیری حاشیئے بھی مندرج ہیں۔ شاہ صاحب نے عربی الفاظ کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے کے بجائے مفہوم کی ادائیگی پر نظر رکھی ہے۔ عربی الفاظ کے مطالب کو انہوں نے ہندی اور اردو کے آسان اور سادہ الفاظ میں پیش کیا ہے۔ یہ الفاظ برجستہ اور برمحل ہیں۔ ان سے عبارت میں حسن پیدا ہو گیا ہے۔ اس ترجمہ کی زبان کے بارے میں خود شاہ صاحب کا بیان یوں ہے:۔

> "اب کئی باتیں معلوم رکھئے۔ اوّل یہ کہ اس جگہ ترجمہ لفظ بہ لفظ ضروری نہیں کیونکہ ترکیب ہندی عربی سے بہت بعید ہے۔ اگر بعینہٖ وہ ترکیب رہے تو معنے مفہوم ہوں (کذا) دوسرے یہ کہ اس زبان میں ریختہ نہیں بلکہ ہندی ہے تاکہ عوام کو بے تکلف دریافت ہو۔"[2]

شاہ عبدالقادر انشا پرداز نہیں تھے۔ انہوں نے موضح القرآن میں بامحاورہ اور سلیس

---

[1] قدیم اردو ۔ مولوی عبدالحق ص ۱۳۲۔

شاہ عبدالقادر کے ترجمے کا سنہ موضح القرآن سے نہیں نکلتا۔ بلکہ صرف "موضح قرآن" سے ۱۲۰۵ھ برآمد ہوتا ہے۔

[2] بحوالہ قدیم اردو ۔ مولوی عبدالحق ص ۱۳۱۔

زبان بھی استعمال نہیں کی ہے۔ اس کے علاوہ نحوی ترکیب کی بے قاعدگی بھی عبارت کی روانی میں مانع ہے۔ لیکن شاہ صاحب نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو کم سے کم الفاظ میں مفہوم صحت اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہیں۔

نثری داستانوں میں شاہ عالم ثانی کی "عجائب القصص" کا نام جلد ہی منظر عام پر آیا ہے۔ یہ شمالی ہند کی چوتھی داستان ہے۔

شاہ عالم ثانی ارباب شعر و ادب کے قدرداں اور سرپرست تھے۔ وہ خود بھی تخلیق ادب کا ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے ۱۲۰۷ھ ۱۷۹۲ء میں یہ قصہ لکھنا شروع کیا تھا[1]۔ شاہ عالم ثانی اس وقت نابینا ہو چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے یہ تصنیف خود نہیں لکھی بلکہ کسی نقل نویس کی مدد سے صفحہ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔

"عجائب القصص" کا ایک نا تمام نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں دستیاب ہوا اسے پاکستان سے شائع کر دیا گیا ہے۔

عجائب القصص میں خطا و ختن کے بادشاہ مظفر شاہ کے بیٹے شجاع الشمس اور وزیر زادے اختر سعید کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس داستان کا آغاز خالص داستانوی انداز میں بادشاہ اور وزیر کی لاولدی سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد بادشاہ زادے اور وزیر زادے کے محیر العقول کارنامے، وحشت خیزیاں، مہم جوئیاں اور واردات عشق بیان کی گئی ہے۔ اس کے اہم کردار پرستان کی پریاں اور روم کی شہزادی ملکہ نگار ہیں۔ عجائب القصص کے زیر نظر نا تمام نسخے کا اختتام طربیہ ہی کی جانب مائل ہے۔ اس قصے میں فارسی داستانوں کے سارے اجزا شامل ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اس

---

[1] دیباچہ عجائب القصص۔ شاہ عالم ثانی مرتبہ راحت افزا بخاری ص ۲۶۔

داستان میں سحرالبیان، ہفت سیر حاتم اور داستان امیر حمزہ کے اثرات کی نشاندہی کی ہے[1]۔

عجائب القصص کے بعض کرداروں کے نام علامتی ہیں۔ مثلاً خاصے کی داروغہ کا نام نعمت پری، قصہ کہنے والی کا نام افسانہ پری اور چراغ خانہ کی داروغہ کا نام روشن پری ہے۔ اس داستان کے نسوانی کردار زیادہ جاندار ہیں۔

اس قصہ کی تالیف میں یہ التزام کیا گیا تھا کہ کوئی لفظ ایسا نہ آنے پائے جو نامانوس، خلاف محاورہ اور خلاف روزمرہ ہو بلکہ :-

> "عام فہم اور خاص پسند ہووے کہ جسکے استماع سے فرحت تازہ اور مسرّت بے اندازہ مستمع کو حاصل ہو اور آداب سلطنت اور طریق عروض و معروض دریافت ہوں اور اگر جاہل پڑھے تو اس کے فیض سے عالموں سے بہتر گفتگو اور بول چال بہم پہنچائے"[2]

شاہ عالم ثانی نے مذکورہ بالا تمام پہلوؤں سے انصاف کیا ہے۔ عجائب القصص میں کسی حد تک انشار پردازی کا بھی مظاہرہ ہے۔ رسوم ورواج اور شاہی معاشرت کے مرقعے پیش کرنے میں مصنف نے قدرے جزئیات نگاری کا کمال دکھایا ہے۔ اس داستان میں فارسی طرز کے جملے ملتے ہیں۔ محاوروں پر بھی فارسی کا اثر ہے۔ فصلوں کے عنوانات فارسی میں ہیں۔ رنگینئ عبارت کے جلوے بھی نظر آتے ہیں لیکن اسکے باوجود اسکا اسلوب بیان پر تصنع اور پر تکلف نہیں ہے۔ عربی اور فارسی کے گرانبار جملوں سے احتراز کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر عجائب القصص کی زبان سادہ، سلیس اور بامحاورہ ہے۔

---

[1] اردو کی نثری داستانیں ۔ ڈاکٹر گیان چند جین ص ۲۰۳۔

[2] دیباچہ عجائب القصص ۔ شاہ عالم ثانی مرتبہ راحت افزا بخاری ص ۲۶۔

دراصل اس قصے کی سب سے بڑی خوبی اس کی زبان ہی ہے۔ جو اپنی سادگی اور سلاست میں بڑا ترقی یافتہ انداز اسلوب اور انداز نثر پیش کرتی ہے۔ یہ بڑی حد تک رواں ہے۔ سادگی، سلاست اور بے ساختگی کے ساتھ ساتھ یہ نفس مضمون کی ادائیگی میں بھی کامیاب ہے۔ یہ داستان اپنے عہد کے اس دور کی نمائندگی کرتی ہے۔ جب داستان میں دقیق طرز نگارش کے ساتھ ساتھ سادہ و سلیس انداز بیان بھی رواج پا رہا تھا۔

عجائب القصص میں جا بجا اردو، فارسی اور برج بھاشا کے اشعار مستعمل ہیں۔ ان میں سے اکثر خود شاہ عالم ثانی کے ہیں۔

شاہ حسین حقیقت بریلوی[1] نے ۱۲۱۱ھ/۱۷۹۶ء میں ایک داستان "جذب عشق" تصنیف کی۔[2] اس میں ۱۲۰۰ھ میں ظہور پذیر ایک واقعے کو بیان کیا گیا ہے۔

شاہ حسین نے اگرچہ اسلوب و بیان میں فارسی طرز کی پیروی نہیں کی ہے۔ تاہم رنگین اور مسجع عبارت لکھنے کی کاوش نمایاں ہے۔ اسکا انداز فارسی اور اردو کا امتزاج ہے۔ دیگر داستانوں کیطرح یہاں بھی اشعار کا کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ یہ داستان غیر مطبوعہ ہے۔ اسکا مخطوطہ مسعود حسن رضوی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔[3]

۱۷۹۹ء میں حیدر بخش حیدری نے "مہر و ماہ" کو فارسی سے سلیس اردو میں منتقل کیا تھا۔ لیکن یہ داستان اب دستیاب نہیں۔

یوں فورٹ ولیم کالج کے قیام (۱۰ر جولائی ۱۸۰۰ء) سے قبل شمالی ہند کی غالباً یہی آخری

---

[1] شاہ حسین حقیقت بریلوی جرأت کے شاگرد تھے۔

[2] [3] اردو کی نثری داستانیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین ص ۱۵۹۔

داستان ہے۔

فورٹ ولیم کالج سے قبل اردو نثر کے اس اجمالی جائزے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اٹھارہویں صدی میں سادہ، سلیس اور بے تکلف نثر لکھنے کی چند ایک انفرادی کاوشیں ہو چکی تھیں۔ "قصہ مہر افروز ودلبر"، "نو آئین ہندی" اور "عجائب القصص" سادہ اور بے تکلف اسلوب نثر کی جانب پیش قدمی کی نمایاں ترین مثالیں ہیں، لیکن علمی اور ادبی حلقوں میں اسی نثر کو شرف قبولیت حاصل تھی جو فارسی کے زیر اثر مقفیٰ اور مسجع پیرایۂ بیان میں تھی۔ چنانچہ اپنے وقت میں ان تصانیف کی جانب توجہ نہیں دی گئی اور یہ گوشۂ گمنامی میں پڑی رہ گئیں۔ لہٰذا ان تصانیف کا اردو نثر کی تعمیر و ترقی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

۲

دیگر سیاسی رموز و نکات سے قطع نظر اردو نثر کے سیاق و سباق میں فورٹ ولیم کالج وہ پہلا ادارہ ہے جہاں اجتماعی طور پر ایک منصوبے کے تحت اردو نثر کی ترویج و ترقی کے لئے کوششیں کی گئیں۔ اس ادارے نے اردو نثر کے جس اسلوب کو انگریزوں کے اغراض و مقاصد کے لیے ترقی دی وہ آگے چل کر سرسید اور ان کے رفقاء کے ذریعے قومی مفاد کے حق میں استعمال ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی کو نہ صرف یہ کہ ہم عصر ممتاز ادیبوں کی خدمات حاصل نہ ہو سکیں۔ بلکہ اسے عوام کی ہمدردی بھی حاصل نہ تھی۔ حالانکہ اس ادارے سے عوام کا کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ یہ کالج نو وارد انگریزوں کی تعلیم و تربیت کے لئے مخصوص تھا۔ لیکن یہاں کا ادب اور نثری پالیسی کالج کے باہر بھی عوام کو متاثر کر رہی تھی۔ اور چونکہ یہ ادارہ ارباب اقتدار کی سرپرستی میں قائم کیا گیا تھا اس لئے یہاں کا ادب عظیم ادبی شخصیتوں کی مخالفت کے باوجود گوشۂ گمنامی میں گم ہونے والا نہ تھا جو ادیب کالج کے

ملازم تھے وہ تو کالج کی نثری پالیسی کے تحت تصنیف و تالیف میں مصروف ہی تھے۔ کالج کے باہر بھی ادیبوں میں فورٹ ولیم کالج کے اسلوب کا چرچا تھا، اور وہ سادہ سلیس اور عام فہم زبان میں ادب کی تخلیق میں مصروف تھے۔ ان کا مقصد انگریزوں کی نیاضی سے مستفید ہونا تھا۔ اگر "صاحبان عالی شان" کو انکی تخلیق ناپسند بھی ہوتی تھی تب بھی باذوق حضرات میں اس کی نقلیں پھیل جاتیں۔ یوں فورٹ ولیم کالج کے نثری اسلوب نے بہت جلد اپنے آپ کو عوام و خواص سے متعارف کرالیا تھا، بینی نرائن جہاں کی تخلیقات نہ صرف یہ کہ فورٹ ولیم کالج میں قدر و منزلت کی حامل قرار پائیں بلکہ عوام میں بھی خاصی مقبول ہوئیں، بینی نرائن نے "نوبہار" (گل وصنوبر) کے دیباچے میں "قصہ دل آرام"، "قصہ یوسف زلیخا" اور "تفریح طبع" کی مقبولیت کا ذکر کیا ہے۔ ان کتابوں کی نقلیں شہر بہ شہر پھیل گئی تھیں۔ اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ کچھ اہل نظر حضرات زمانے کے بدلتے ہوئے مزاج کو بخوبی پہچان رہے تھے اور انہوں نے کالج کے اسلوب بیان کو قابل توجہ سمجھا۔ لیکن ابھی دلّی دور تھی ۔ اس وقت اردو ادب دلّی اور لکھنؤ کے دبستانوں کے حصار میں محصور تھا۔ دبستان دلی کا چراغ تو اپنی آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ لیکن دبستان لکھنؤ کی شمع اپنے پورے شباب پر تھی۔ جہاں کی ادبی بازی گری کے سامنے سادگی، سلاست اور بے تکلفی کا راہ پانا انتہائی مشکل تھا۔ لیکن اسی ادبی اکھاڑے کا ایک بازی گر سامنے آیا اور اس نے فورٹ ولیم کالج کی نثر کا قدرے مختلف انداز میں خیر مقدم کیا۔

انشاء اللہ خاں انشاؔ رگھوڑے پر چڑھ کر آئے اور "رانی کیتکی کی رانی" میں اپنے سارے کرتب دکھا گئے۔ حالانکہ "رانی کیتکی کی کہانی" کا اسلوب فورٹ ولیم کالج کی نثر کی نمائندگی نہیں کرتا، اسکا اسلوب بناوٹی اور غیر فطری ہے۔ لیکن ایسی کہانی کی تخلیق کا تصور جس میں "ہندوی کے چھٹ اور کسی بولی کی پٹ نہ ملے"۔ لاشعوری طور پر فورٹ ولیم کالج کے اثرات کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اس سے قبل زبان اردو (ہندوی) کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا تھا کہ اس میں ادب کی تخلیق کی جا سکے۔

صاحبان علم وادب کا ایک بڑا حلقہ جو فارسی آمیز اسلوب، رنگین بیانی اور مبالغہ آرائی کا دلدادہ اور قدردان تھا۔ اس حلقے میں فورٹ ولیم کالج کے اسلوب کی سخت مخالفت کی گئی۔ کالج کی نمائندہ اور سدا بہار تصنیف "باغ و بہار" کی زبان کا "فسانۂ عجائب" (۱۸۲۴ء) میں رجب علی بیگ سرور نے کھل کر مذاق اڑایا لیکن سرور کی اس حرکت پر جس طرح ادیبوں کا ایک گروہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ذریعے میر امن کی زبان و بیان کی جسطرح حمایت کی گئی اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کی تحریک ایک خاص انداز سے اثر انداز ہو رہی تھی۔ صرف باغ و بہار کے مسئلے پر اردو نثر میں بھی شاعری کی طرح دبستانوں کی تقسیم ہوئی۔ میر امن کی باغ و بہار اردو نثر کے دہلوی دبستان کی نمائندہ تصنیف قرار پائی۔ باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کے ادبی معرکے کا مفصل ذکر سید وقار عظیم نے اپنی تصنیف "ہماری داستانیں" میں کیا ہے[1]۔ اگر دیکھا جائے تو سرور پر بھی فورٹ ولیم کالج کے اثرات غیر شعوری طور پر مرتب ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

سرور نے فسانۂ عجائب کو اپنے ایک دوست کی فرمائش پر تصنیف کیا تھا، جنھوں نے سرور سے یہ واضح کر دیا تھا کہ:۔

> "......... جیسا کہ رطب و یابس کہے گا ہمیں پسند ہے بشرطیکہ جو روزمرہ اور گفتگو ہماری تمہاری ہے یہی ہو ایسا نہ ہو کہ آپ رنگینیٔ عبارت کے واسطے دقت طلبی اور نکتہ چینی کریں۔ ہم ہر فقرے کے معنی فرنگی محل کی گلیوں میں پوچھتے پھریں[2]۔

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ رنگینی اور پر تکلف اسلوب کی پسندیدگی کے زمانے میں بھی عوام کا مزاج سادگی کی جانب مائل ہو رہا تھا، لیکن فسانۂ عجائب میں رنگین بیانی، قافیہ پیمائی اور دقت پسندی

---

[1] ہماری داستانیں۔ ص ۱۷۲ تا ۲۸۴۔ [2] فسانۂ عجائب مرتبہ محمود اصل عثمانی۔

کا جو انداز ملتا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سرور نے اپنے زمانے کے عام اور پسندیدہ انداز تحریر کو پیش کیا ہے، انھوں نے اپنے مزاج و ماحول سے بغاوت نہیں کی حالانکہ دیباچے میں انھوں نے یہ صفائی بھی پیش کی ہے:۔

"نظر ثانی میں جو لفظ دقت طلب، غیر مستعمل، عربی و فارسی کا مشکل تھا اپنے نزدیک اسے دور کیا اور جو کلمہ سہل ممتنع محاورے کا تھا اسے رہنے دیا۔"[1]

یہ الگ بات ہے کہ سرور اپنے دعوے میں کامیاب نظر نہیں آتے لیکن دقت طلب الفاظ کا اخراج اور سہل ممتنع محاوروں کے استعمال کی شعوری کوشش فورٹ ولیم کالج کے انداز نثر سے بڑی حد تک مطابقت رکھتی ہے، اپنی تمام تر دقت پسندی اور پر تکلف اسلوب کے ساتھ ساتھ "فسانۂ عجائب" کے ایک بڑے حصے میں سادہ اور خوشگوار اسلوب بھی نظر آتا ہے۔ بقول امیر اللہ شاہین:۔

"جو لوگ سرور کے اسالیب میں ملّا ظہوری، عرفی، خاقانی، انوری اور عاقل خاں رازی کی صناعی کا عکس لطیف دیکھتے ہیں۔ انھیں میر انیس، میر تقی میر، میر سوز، مصحفی، انشا کی سادگی کا بھی پرتو نظر آئے گا۔"[2]

فورٹ ولیم کالج سے باہر کی ان نمائندہ تصانیف کے علاوہ عام بول چال کی زبان کو تصنیف و تحریر میں لانے کی جانب ایک اہم اور مثبت کردار اس زمانے کے اخبارات اور بعض مذہبی تراجم نے بھی ادا کیا ہے۔ اس سلسلے میں شخصی کوششیں بھی ہوئیں اور سرکاری بھی۔ یوں تو فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ساتھ ہی طباعت اور اشاعت کا کام بڑے اعلیٰ پیمانے پر شروع ہو گیا تھا۔ اسی زمانے میں کالج سے باہر سیرام پور میں پادریوں نے ایک مطبع قائم کیا اور وہاں ۱۸۱۴ء میں پادری مارٹن نے جدید

---

[1] فسانۂ عجائب مرتبہ محمد واصل عثمانی ص ۲۱۔ [2] اردو اسالیب نثر ص ۱۳۲، ۱۴۷

عہد نامہ کا یونانی سے اردو میں ترجمہ کیا۔[۱] اس کے علاوہ یہاں بائبل کا ترجمہ بھی پانچ جلدوں میں ہوا تھا۔

اردو اخبارات میں مولوی محمد باقر کے "اردو اخبار" کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ یہ ۱۸۳۶ء[۲] میں دہلی سے جاری ہوا تھا۔ جوں جوں تصنیف و تالیف کے میدان میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی مطابع کی تعداد میں اضافہ ہوا اور اردو اخبارات و رسائل کو فروغ ملتا گیا۔

انیسویں صدی میں اردو کے فروغ کے سلسلے میں عیسائی مشنریوں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ طباعت و اشاعت کی ترقی ان کے مقاصد کے حق میں سازگار ثابت ہوئی۔ ان مشنریوں نے اپنی تبلیغ کیلئے کثرت سے اردو میں مذہبی لٹریچر اور بائبل کے تراجم شائع کئے۔ ان تراجم کی خاص بات یہ تھی کہ ان میں سادہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ کیوں کہ اس اسلوب کے ذریعے وہ اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب ہو سکتے تھے اور خواص کے علاوہ عوام تک انکا مذہبی پیغام پہنچ سکتا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ انگریزوں کی مخالفت کے لئے بھی اردو کو استعمال کیا گیا۔ سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید نے اردو کو ہی تقریر و تحریر کا ذریعہ بنایا اور اسی زبان کے وسیلے سے وہ اپنے خیالات عوام تک پہونچایا کرتے تھے۔ شاہ اسمٰعیل شہید نے اپنی تصنیف "تقویت الایمان" (اردو) میں عوام میں رائج فضول رسم و رواج کی مذمت کرتے ہوئے دین کو اصلی شکل میں پیش کرنیکی کوشش کی۔ اس کی عبارتیں بعض خامیوں کے باوجود صاف اور واضح ہیں۔ مولانا نے اپنی تحریروں میں خیالات کو الفاظ کے جال میں نہیں الجھایا بلکہ انھوں نے شرعی معاملات کو روزمرہ کی بولی اور محاورے میں پیش کیا اور واضح طریقے سے اپنے مفاہیم و مطالب ادا کر گئے۔ مولانا کے اسلوب اور انکی تحریروں سے اس

---

[۱] اردو اسالیب نثر ص ۱۳۲، ۱۴۷۔ [۲] امیر اللہ شاہین نے اردو اخبار کے اجرا کا سنہ ۱۸۳۲ء درج کیا ہے (اسالیب نثر ص ۱۴۷) لیکن سید عبداللہ اور امداد صابری نے ۱۸۳۶ء لکھا ہے۔

خیال کو تقویت ملتی ہے کہ وہ بھی سادہ نگاری کی اس راہ پر گامزن تھے جس کو ان سے قبل کے مصنفین نے
ہموار کیا تھا۔ "تقویت الایمان" کے دوسرے حصے کا نام "تذکیر الاخوان" ہے۔ محمد سلطان نے ۱۸۱۰ء/۱۲۵۰ھ میں اس کا
اردو میں ترجمہ کیا[1]۔ یہ ترجمہ بھی بڑی حد تک صاف اور رواں اسلوب پیش کرتا ہے۔ ان کے علاوہ ایک
نثری سلسلہ اس بحث و مباحثے پر مشتمل ہے جو مولانا اسمٰعیل شہید کی تحریروں پر انکی مخالفت اور
مدافعت میں لکھے گئے۔ اس سے بھی اردو نثر کو فائدہ پہنچا۔

خواجہ غلام غوث بے خبر، سرور اور غالب کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں، انکی نثر
میں ایک جانب تو اس زمانے کا پر تکلف انداز تحریر ملتا ہے۔ دوسری جانب اس سادہ اور سلیس
اسلوب بیان کی آہٹ بھی ملتی ہے جو مرزا غالب کے یہاں نکھر کر ابھری۔ بے خبر نے ۱۸۴۶ء سے اردو
میں رقعات نویسی کا آغاز کیا۔ اویس احمد نے ان کو اردو خطوط نویسی کا موجد قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "خطوط نویسی کی وہ خصوصیات جو غالب کے خطوط میں موجود ہیں اور جن کی بنا پر
> غالب کو موجد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ سب بے خبر کے خطوط میں موجود ہیں غالب
> کی حیثیت صرف ایک مقلد کی سی ہے۔ انہوں نے بے خبر کے خطوط سے فائدہ اٹھایا"[2]

بے خبر مقفیٰ و مسجع انداز اور فارسی آمیز اسلوب بیان پر بھی قادر تھے اور سادہ و سلیس انداز بیان
پر بھی۔ ان کے خطوط میں بڑی حد تک سادہ سلیس او عام فہم انداز نظر آتا ہے۔ ان میں نہ تو قافیہ
پیمائی ہے اور نہ عبارت آرائی بلکہ وہ سیدھے سادے انداز میں نفس مطلب کی ادائیگی کرتے ہیں
یہ اور بات ہے کہ ان کے یہاں بے تکلفی کی وہ شان نہیں ملتی جو مرزا غالب کے یہاں اپنے عروج پر پہنچ گئی
فورٹ ولیم کالج کی نثری تحریک اور کالج کے باہر اردو میں جو کاوشیں معرض وجود میں

---

[1] اردو اسالیب نثر۔ ص ۱۵۱۔ [2] تنقیدیں۔ ص ۱۰۴۔

آئیں۔ ان سب کے بہت واضح اور نمایاں اثرات غالبؔ کی نثر میں ملتے ہیں۔ غالبؔ کا کل اردو نثری سرمایہ ان کے اردو مکاتیب پر مشتمل ہے۔ غالبؔ اپنی فارسی شاعری اور نثر پر فخر کرتے تھے لیکن عمر کے آخری دور میں ایک جانب تو وہ اس قدر "جاں کاہی" اور "محنت پژوہی" کے قابل نہیں رہ گئے تھے۔ دوسری جانب آسان اور سادہ زبان کا چراغ جلنا شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ غالبؔ نے مجبوری کے عالم میں اردو میں خطوط نویسی کا آغاز کیا اور اپنے خطوط میں جو زبان استعمال کی اس میں انہوں نے سادگی، سلاست اور شگفتہ بیانی سے ایک نیا انداز نگارش اختراع کر لیا۔ یہ اور بات ہے کہ انکی مجبوری نے اردو نثر میں بھی ان کا مرتبہ بلند کر دیا۔ غالبؔ کا بنیادی وصف جدت طرازی ہے۔ ان کے خطوط ان کی جدت پسند شخصیت کا بہترین نمونہ ہیں۔ انہوں نے اپنے خطوط میں بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔ ان خطوط میں موضوع کے لحاظ سے تنوع پایا جاتا ہے۔ لیکن وہ بڑی سادگی اور صفائی سے ہر موضوع پر لکھتے چلے گئے۔ ان کے خطوط میں سادگی و سلاست، رنگینی و رعنائی اور لطف انگیزی کا بڑا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔

غالبؔ کو اپنے عہد میں جس سادہ اور سلیس زبان کا ادراک ہوا تھا۔ اسکا سلسلہ براہ راست فورٹ ولیم کالج کی نثر سے ملا ہوا ہے۔ میر امن کی "باغ و بہار" نے کالج کے باہر بھی صاحبان فکر و نظر کے ایک حلقے میں مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ غالبؔ کے مراسلے کو مکالمہ میں بدلنے کا اعجاز اسی سادہ زبان کو حاصل ہے۔ ورنہ غالبؔ جیسے مشکل پسند انسان کیلئے "مہینہ ایک گھنٹہ برسے تو چھت چار گھنٹہ برستی ہے" والی زبان استعمال کرنا ناممکن تھا۔ انہوں نے شاعری میں سہل پسندی اختیار نہیں کی تو نثر میں کیسے کر لیتے۔ لیکن غالبؔ کی دوربین نگاہوں نے ماحول کے بدلتے ہوئے انداز کو بھانپ لیا تھا اور وہ سمجھ گئے تھے کہ فارسی انداز نگارش کا سکہ بہت جلد کھوٹا قرار دیا جانے والا ہے۔ اور وہی نثر زندہ اور باقی رہنے والی ہے جس کی علم برداری فورٹ ولیم کالج کے ہاتھوں میں ہے۔ "اردوئے معلیٰ" اور

عودِ ہندی" کے بیشتر خطوط فورٹ ولیم کالج کی سادہ نثر کے ترجمان ہیں۔ دوستانہ خطوط کے علاوہ بعض تحریروں میں انہوں نے فلسفیانہ اور صوفیانہ نکات بیان کئے ہیں۔ لیکن اندازِ بیان میں بڑی خوشگوار سی سادگی ہر جگہ نمایاں ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے نثر نگاروں کی طرح غالبؔ نے بھی فارسی و عربی تراکیب اور الفاظ استعمال کرلئے ہیں لیکن غالبؔ نے فارسیت اور سادگی کے امتزاج سے ایک نیا اندازِ بیان ایجاد کیا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کا عکس ہم دلّی کالج میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے ہی دلّی کالج کے قیام کو تحریک ملی۔ حالانکہ ان دونوں کالجوں کے اغراض و مقاصد میں بنیادی فرق ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے ادبی کارنامے "صاحبان نوآموز" کے لئے سادہ اور عام بول چال کی زبان میں تخلیق کئے گئے۔ اور یوں اسکا مقصد محدود تھا۔ لیکن دلّی کالج اپنے اغراض و مقاصد میں فورٹ ولیم کالج سے زیادہ وسعت رکھتا ہے۔ یہ کالج دیسی طلبہ کو اردو اور انگریزی میں مغربی علوم و فنون سے واقف کرانے کی غرض سے قائم کیا گیا تھا۔ یہاں پر اسلوب کی بجائے موضوع کو اولیت دی گئی۔ اس کالج میں اردو کے توسط سے جو گراں قدر تخلیقی کارنامے انجام دیئے گئے وہ تنوع اور موضوعات کی رنگارنگی میں فورٹ ولیم کالج پہ سبقت لے جاتے ہیں۔ لیکن واقعہ تو یہ ہے کہ دلی کالج نے جن خطوط پر اپنا قدم آگے بڑھایا اس کی راہیں فورٹ ولیم کالج نے ہی ہموار کی تھیں۔ فورٹ ولیم کالج اپنے ادبی کارناموں سے یہ ثابت کرچکا تھا کہ اردو میں مختلف موضوعات کو ادا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ چنانچہ دلّی کالج میں مختلف موضوع پر عربی، فارسی اور بعض مغربی زبانوں سے بھی اردو میں ترجمے ہوئے۔ ان تراجم سے ہماری زبان اور ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوا۔ اور ہماری زبان میں عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔

دلّی کالج نے جن نامور صاحبان قلم کی تربیت و پرورش کی ان میں ماسٹر رام چندر، ڈپٹی

نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ اور مولانا محمد حسین آزاد کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان بزرگوں نے اردو نثر کو علمی خصائص سے روشناس کرایا۔

ماسٹر رام چندر کی نثر فورٹ ولیم کالج اور سرسید کے علمی اور اصلاحی مشن کے درمیانی عرصے میں ابھری۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قدیم انداز تحریر کی خصوصیات بھی باقی تھیں اور دوسری جانب فورٹ ولیم کالج کی نثر کے اثرات بھی نمایاں ہو چکے تھے۔ ماسٹر رام چندر کی نثر قدیم وجدید اسالیب کے امتزاج کا نمونہ پیش کرتی ہے[1]۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ چنانچہ موضوع کے اعتبار سے ان کے انداز تحریر میں بھی فرق ہے۔ لیکن ان کی نثری خصوصیات میں جس چیز کو اہمیت دی جاسکتی وہ سادگی اور صراحت کے اوصاف ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے اسلوب میں صحافتی ضرورتوں کا احساس بھی نمایاں ہوتا ہے۔

سرسید احمد خاں سے اردو ادب میں ایک بالکل نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ یہاں سے اردو نثر علمی انداز لیکر ابھری۔ سرسید نے اپنی تحریروں سے مسلمان قوم کی اصلاح کا کام لیا تھا جب تک وہ اس مقصد سے میدان میں نہیں آئے تھے۔ وہ بھی تحریر کی دنیا میں اپنے عہد کی مخصوص روش کا شکار تھے مفرس اور معرب عبارتیں لکھنے کا انہیں بھی شوق تھا۔ آثار الصنادید اور اس سے قبل کی تحریریں اسی انداز نگارش کا نمونہ ہیں۔ لیکن جب انہوں نے اصلاح وتلقین کا سلسلہ شروع کیا تو ان کی تحریر کا انداز بالکل بدل گیا۔ ان کے سامنے فورٹ ولیم کالج سے لیکر ماسٹر رام چندر تک کی نثر کا نمونہ موجود تھا انہیں میر امن اور غالب کے انداز نثر نے بہت متاثر کیا۔ وہ جس انقلابی مقصد کو لے کر آگے بڑھے اس کا تقاضا بھی یہی تھا کہ لفظی بازی گری، قافیہ پیمائی اور عبارت آرائی کی بجائے سادگی اور بے تکلفی کو راہ دی جائے۔

---

[1] ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقاء میں ان کا حصہ۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر۔ ص ۹۳۔

سرسیّد کی ادبی خدمات پر نظر ڈالنے سے یہ علم ہوتا ہے کہ انہوں نے گوناں گوں موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ انہوں نے اردو ادب کو نئے انداز فکر سے روشناس کرایا، نیا ذہن دیا۔ "آزادیٔ موضوع اور آزادیٔ اسلوب" کی روایت قائم کی اس کے علاوہ اسلوب کو وہ ہمہ گیری عطا کی جسکا فرسودگی اور کہنگی سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ سرسیّد کی علی گڑھ تحریک صرف ایک سیاسی یا تعلیمی تحریک نہ تھی بلکہ اس میں فکری، تہذیبی، ثقافتی، علمی اور ادبی عناصر بھی شامل تھے۔ اور اس تحریک کے تحت جتنا ادب وجود میں آیا اس میں افسانویت اور عالم خیال کی باتیں نہ تھیں بلکہ ہوشمندی، موجودہ زندگی اور اس کے گوناں گوں اقدار کی کہانیاں بیان کی گئی تھیں۔ "تہذیب الاخلاق" کے اجرا کا مقصد قوم اور فرد کی اصلاح، بیداری، قوم کو جدید ترقیات کی جانب مائل کرنا اور علمی وادبی ذوق پیدا کرنا ہی نہیں تھا بلکہ اس رسالے نے مسلمانانِ ہند کی علمی، فکری اور ادبی بیداری و تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ "تہذیب الاخلاق" کے مضمون نگاروں میں سب سے زیادہ مضامین سرسیّد نے سپرد قلم کئے۔ ان کے اسلوب کی اہم خصوصیات تمثیلی اور مکالماتی انداز اور بیان کی سادگی، سنجیدگی اور استدلال ہیں۔

سرسیّد کی تحریر میں فطری اندازِ بیان کی اہمیت کا شعور نمایاں ہوتا ہے۔ ان کے اسلوب میں یوں تو بے تکلفی، بے ساختگی اور سادگی کے خصائص پائے جاتے ہیں اور بقول حالیؔ:۔

"جس سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ ابتدا میں مطلب نگاری شروع کی تھی اسی سیدھے سادے اور نیچرل اسٹائل میں ہر قسم کی تحریر برابر لکھتے رہے۔"[1]

لیکن ان کی سب تحریروں پر اسکا اطلاق نہیں ہوتا۔ موضوعات کے تنوع نے اسلوب میں بھی تنوع

---

[1] حیات جاوید۔ جلد دوم ص ۹۰۴ بحوالہ وجہی سے عبدالحق تک۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۲۹۹۔

پیدا کیا۔ ان کی تحریروں میں سادگی بھی ہے اور پیچیدگی بھی۔ بے تکلفی بھی ہے اور خشکی بھی۔ لفظوں اور عبارتوں میں سختی بھی ہے اور نرمی بھی، وہ اپنی نثر میں نفس مضمون کو اہمیت دیتے ہیں۔ طرز ادا اور دیگر لسانی خوبیاں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی تحریر پر ان کے مقصد کا غلبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شگفتگی اور خوش طبعی کے عناصر نمایاں نہیں ہوتے۔ جہاں زندہ دلی اور شوخی کے مواقع آتے ہیں، وہاں ذہن کسی خوشگوار کیفیت سے دوچار نہیں ہوتا۔ ان کا اسلوب تو اکثر اوقات اسقدر سادہ ہوتا ہے کہ بے رنگ ہو جاتا ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود سرسیّد کا طرز ادا متأثر کن ہے اور اسمیں ادبی چاشنی بھی موجود ہے۔

سرسیّد کے ادبی نظریات کو عام کرنے میں ان کے نامور رفقاء نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ مولوی محمد ذکاء اللہ اور مولوی چراغ علی کے اسلوب پر سرسید کے اثرات بہت نمایاں ہیں یہ افسانہ طرازی اور جذباتیت کی بجائے اصلیت اور واقعیت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ انداز بیان میں صفائی اور نکھار کی صفت نمایاں ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد کا تعلق نہ تو علی گڑھ تحریک سے تھا اور نہ کسی دوسری اصلاحی تنظیم سے۔ انہوں نے ادب برائے ادب کی بہترین مثال قائم کی۔ وہ دراصل ادبی مصور تھے۔ مدعا نویسی کو اولیت دینے کے باوجود انداز بیان کی صناعی اور خوشنمائی پر انکی توجہ برابر مرکوز رہتی ہے۔ آزاد جب اپنی بات شروع کرتے ہیں تو ان کا اسلوب فارسی آمیز اور پر تکلف ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ سادگی اور بے تکلفی کی جانب مائل ہوتا جاتا ہے اور فارسی انداز نگارش کا بوجھل پن موسیقیت کی خوشگوار فضا میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

نذیر احمد کی تحریریں یوں تو سادہ ہی کہی جائیں گی لیکن اکثر یہ اس حد سے باہر نکل جاتی ہیں۔ ان کی سادگی اسی وقت تک قائم رہتی ہے جب تک مقصد ان کے پیش نظر رہتا ہے۔ جب کوئی

اور غایت" یا "نفسی رکاوٹ" ان کے مدنظر ہوتی ہے تو بقول سید عبداللہ:۔

"مقتضائے حال کی حد سے آگے بڑھ کر وہ اس قلم رو میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں قلم کا مسافر اپنی تحریر اور اپنے مطالب کا ساتھ چھوڑ کر خود کی نمائش یا خود کے تماشے میں محو ہو جاتا ہے۔ نذیر احمد کی تحریروں میں یہ رقص اجمال خوب خوب تماشے دکھاتا ہے۔"[1]

نذیر احمد کا مطالعہ و مشاہدہ وسیع تھا۔ زندگی اور اس کی جزئیات پر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ ان سب خوبیوں نے ان کی زبان و بیان کی ترتیب و تنظیم میں اہم حصہ لیا۔ وہ اپنی تحریروں میں طبقاتی اعتبار سے زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ اس چیز نے نامانوسیت کی فضا تو ضرور پیدا کی ہے لیکن اردو ادب کو زبان و الفاظ کا ایک نایاب ذخیرہ بھی فراہم کیا ہے۔ نذیر احمد نے محاورات سے اظہار و ابلاغ کا بہترین کام لیا۔ ان کے اسلوب میں جوش اور اثر آفرینی کی کمی نہیں وہ عبارتوں میں جوش پیدا کرنے کے لئے ثقیل الفاظ و محاورات سے کام لیتے ہیں۔ اس سے انکی نثر رعب دار تو ہو گئی مگر خشکی پیدا ہو گئی ہے۔ اصطلاحوں اور انگریزی الفاظ کا کثرت سے استعمال بھی اکثر ناگوار محسوس ہوتا ہے۔

سرسید کے سب سے بڑے مقلد نواب محسن الملک تھے۔ ان کا اسلوب سرسید اور یہاں تک کہ حالی سے بھی زیادہ دلکش ہے۔ ان کے یہاں خشکی اور سنجیدگی نہیں بلکہ ادبی حسن لئے ہوئے سادگی جلوہ گر ہے۔ عبارت اور جملوں میں شیرینی اور حلاوت ہے۔

حالی کے اسلوب میں دھیما پن اور سادگی پائی جاتی ہے۔ ان کی سادگی کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں بے رنگی نہیں۔ ان کی سادہ نگاری یوں تو عام فہم اور بول چال کے الفاظ سے عبارت

---

[1] وجہی سے عبدالحق تک۔ ص ۳۴۲۔

ہے لیکن الفاظ کی خوبصورتی بھی مدنظر رہتی ہے وہ الفاظ کی شیرینی اور نرمی پر بھی توجہ دیتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں توضیح اور توازن کی خوبیاں موجود ہیں۔ حالی کے یہاں جوش اور شدت کے مواقع نہیں کے برابر آتے ہیں۔ ان کا قلم بیانات کی کارگاہ میں نشیب و فراز سے دوچار نہیں ہوتا۔ رفتار میں تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ آہستہ پن ہر جگہ برقرار رہتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ ان کی تحریریں جذبے سے عاری ہوں۔ دور سرسید کے ایک عام مرض کا شکار حالی بھی ہیں۔ انہوں نے بھی کثرت سے انگریزی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں علمیت پیدا کرنے کے لئے عربی اور فارسی کے الفاظ اور اصطلاحیں استعمال نہیں کرتے۔ حالی کی نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے نثر کو بطور نثر ہی برتا اور اردو کو خوبصورت انداز میں علمی نثر سے روشناس کرایا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حالی کا اسلوب سرسید سے زیادہ نفیس، شستہ اور ترقی یافتہ ہے۔

رفقائے سرسید میں سب سے کامیاب اسلوب کے مالک شبلی ہیں، ان کا اسلوب شگفتہ، رواں، متوازن اور علمیت سے پُر ہے۔ وہ بھی اپنے اسلوب میں تاثیر پیدا کرنے کے لئے شاعرانہ خوبیوں سے کام لیتے ہیں۔ لیکن اس سے ان کا اسلوب پُر تکلف نہیں ہوتا بلکہ بڑی لطیف سی شعریت ان کی نثر میں گھل مل جاتی ہے۔ شبلی کے یہاں ایجاز و اختصار اور صراحت و وضاحت کی خوبیاں بھی جلوہ گر ہیں۔ وہ طول نویسی کے شائق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جزئیات نگاری سے بھی اکثر دامن بچاتے ہیں۔ شبلی کے یہاں انقلابی اور جوشیلے مواقع اکثر و بیشتر نظر آتے ہیں۔ ان موقعوں پر ان کا قلم خوب خوب جادو جگاتا ہے۔ یوں تو ان کے اسلوب میں رجب علی بیگ سرور کی بھی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ اور میرامن کی بھی۔ غالب کے اثرات بھی ملتے ہیں اور سرسید و حالی کے بھی۔ لیکن ان سب سے الگ شبلی کا اپنا انفرادی رنگ ہے جسے ان کے مزاج اور شخصیت کے رچاؤ نے ڈھالا ہے اور اسی رنگ سے اردو کا بنیادی اور معیاری اسلوب تشکیل پذیر ہوا۔

فورٹ ولیم کالج سے عہد سرسید تک کے نمائندہ ادیبوں کے اسالیب کے اس مختصر جائزے کے بعد یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے کہ فورٹ ولیم کالج کی نثری پالیسی نے کالج سے باہر بھی ادبی حلقوں سے اپنی اہمیت منوالی تھی اور اس دور کے بڑے بڑے زعمائے فن نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کا اثر قبول کیا تھا۔ عبداللہ یوسف علی کی یہ بات درست نہیں لگتی کہ "کسی اہلِ علم نے کبھی باغ و بہار یا فورٹ ولیم کالج کی دوسری درسی کتابوں کو بطور ادب کے نہیں پڑھا"[1]۔ اگر یہ بات درست ہوتی تو باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کا ادبی معرکہ وجود میں نہ آتا۔ اردو نثر فورٹ ولیم کالج اور اس کے مصنفین کے احسانات سے چشم پوشی نہیں کر سکتی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر کالج کا قیام عمل میں نہ آتا تو اردو نثر کو اپنی صحیح نشو و نما کے لئے نہ جانے کتنے برسوں تک انتظار کرنا پڑتا۔

---

[1] انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ۔ ص ۱۴۰۔

مآخذ و مصادر

مآخذ و مصادر

	کتاب	مصنف	ناشر
۱ ۔	آب حیات	محمد حسین آزاد	مکتبہ اشاعت اردو دہلی
۲ ۔	آثار الصنادید	سر سید احمد خاں	سنیٹرل بک ڈپو اردو بازار دہلی ۱۹۶۵ء
۳ ۔	اخلاق ہندی	بہادر علی حسینی	مجلس ترقی ادب لاہور
۴ ۔	اخوان الصفا	اکرام علی	ہندوستانی پریس کلکتہ ۱۸۱۰ء
۵ ۔	اردو کی نثری داستانیں	ڈاکٹر گیان چند جین	انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۶۶ء
۶ ۔	ارباب نثر اردو	سید محمد	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس ۱۹۷۷ء
۷ ۔	اردوئے قدیم	حکیم شمس اللہ قادری	نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۶۷ء
۸ ۔	اردو نثر کا دہلوی دبستاں	عبد الرحیم جاگیردار	شالیمار پبلیکیشنز حیدرآباد ۱۹۷۹ء
۹ ۔	اردو مرثیہ	سفارش حسین رضوی	مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۶۵ء
۱۰ ۔	اردو زبان اور فن داستان گوئی	کلیم الدین احمد	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۶۲ء
۱۱ ۔	اردو کی قدیم داستانیں	ایم حبیب خاں	یوپی اردو اکیڈمی ۱۹۷۳ء
۱۲ ۔	آرائش محفل	شیر علی افسوس	مجلس ترقی ادب لاہور
۱۳ ۔	آرائش محفل (قصہ حاتم طائی)	حیدر بخش حیدری	نولکشور پریس لکھنؤ
۱۴ ۔	اردو اسالیب نثر	امیر اللہ شاہین	جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۷۷ء
۱۵ ۔	اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر	پرکاش مونس	نیشنل آرٹ پرنٹرس الہ آباد ۱۹۷۸ء
۱۶ ۔	اردو نثر کا آغاز و ارتقاء	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ	مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد (پہلا ایڈیشن)
۱۷ ۔	اردو اور بنگال	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	اشوک نگر ریجنٹ پارک کلکتہ ۱۹۶۹ء

۱۸ -	اسلوب	عابد علی عابد	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۷۶ء
۱۹ -	انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ	عبداللہ یوسف علی	ہندوستانی اکیڈمی یوپی الہ آباد (طبع اوّل)
۲۰ -	انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب	جاوید نہال	اردو رائٹرس گلڈ کلکتہ
۲۱ -	باغ اردو	شیر علی افسوس	مجلس ترقی ادب لاہور
۲۲ -	باغ اردو	شیر علی افسوس	ہندوستانی پریس کلکتہ ۱۸۰۲ء
۲۳ -	باغ و بہار	میر امن (مرتبہ ابوالخیر کشفی)	اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۶۵ء
۲۴ -	باغ و بہار	میر امن (مرتبہ ممتاز منگلوری)	مکتبہ خیابان ادب لاہور ۱۹۶۶ء
۲۵ -	بارہ ماسہ	کاظم علی جواں	ہندوستانی پریس کلکتہ ۱۸۱۲ء
۲۶ -	بزم سخن	حسن علی خاںؒ سلیم	ـــــــــــــــــــ
۲۷ -	بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	اشوک نگر کلکتہ ۱۹۶۳ء
۲۸ -	بنگال میں اردو زبان و ادب	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	نصرت پبلیشرز لکھنؤ ۱۹۷۶ء
۲۹ -	بنگال میں اردو	وفا راشدی	اردو پبلشنگ ہاؤس دہلی طبع اوّل
۳۰ -	بہار دانش (فارسی)	منشی عنایت اللہ	نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۱ء
۳۱ -	بہار دانش	مرزا جان طپش	مجلس ترقی ادب لاہور
۳۲ -	پریم ساگر	للوجی لال کوی	نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۳۰ء
۳۳ -	پنجاب میں اردو	حافظ محمود شیرانی	نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۷۰ء
۳۴ -	تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ	نولکشور پریس لکھنؤ تیسرا ایڈیشن
۳۵ -	تاریخ ادب اردو (حصہ اول)	جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۷ء

نمبر	کتاب	مصنف / مرتب	ناشر و سنہ
۳۶-	تاریخ نثر اردو (نمونۂ منثورات)	احسن مارہروی	______
۳۷-	تاریخ اودھ (جلد اوّل و دوم)	محمد نجم الغنی (تلخیص ذکی کاکوروی)	مرکز ادب اردو لکھنؤ ۱۹۷۶ء
۳۸-	تاریخ تعلیم ہند (۱۸۰۰ تا ۱۹۶۵)	سید نور اللہ و ناٹک (ترجمہ مسعود الحق)	مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۷۲ء
۳۹-	تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند (۱۷۰۷ تا ۱۸۰۳) (ساتویں جلد اردو ادب دوم)	وقار عظیم	پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۷۱ء
۴۰-	تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند (۱۸۰۳ء تا ۱۸۵) (آٹھویں جلد اردو ادب سوم)	کیپٹن فیاض محمود	پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۷۱ء
۴۱-	تحقیق کی روشنی میں	عندلیب شادانی	غلام احمد اینڈ سنز پبلشرز لاہور ۱۹۶۳ء
۴۲-	تذکرہ طبقات شعرائے ہند طبقہ دوم مع تالیقات	ایف فیلن و کریم الدین (مرتبہ عطا کاکوی)	عظیم الشان بکڈپو پٹنہ ۱۹۷۱ء
۴۳-	تذکرہ طبقات شعرائے ہند طبقہ سوم مع تالیقات	ایف فیلن و کریم الدین (مرتبہ عطا کاکوی)	ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ ۱۹۶۷ء
۴۴	تذکرہ ہندی (ریاض الفصحا)	غلام ہمدانی مصحفی (مرتبہ عبدالحق)	انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۳ء
۴۵-	تذکرہ گلشن گلزار	مبتلا و خلیل (مرتبہ عطا کاکوی)	عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ ۱۹۶۶ء

۴۶۔	تذکرہ نادر	کلب حسین خاں نادر (مرتبہ سعود حسن رضوی)	دین دیال روڈ لکھنؤ ۱۹۵۷ء
۴۷۔	تذکرہ شعرائے اردو	میر حسن	انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۴۰ء
۴۸۔	تذکرہ ریاض الوفاق ملخص (معہ حصّہ ۲، ۱)	ذوالفقار مست (مرتبہ عبدالمنان بے دل)	دائرۂ ادب پٹنہ ۱۹۶۷ء
۴۹۔	تذکرہ خوش معرکہ زیبا	سعادت خاں ناصر (مرتبہ عطا کاکوی)	عظیم الشان بکڈپو پٹنہ ۱۹۶۸ء
۵۰۔	تذکرہ خوش معرکہ زیبا	(مرتبہ) شمیم انہونوی	نسیم بکڈپو لکھنؤ ۱۹۷۱ء
۵۱۔	تذکرہ بہار بے خزاں	احمد حسین سحر (تصحیح ڈاکٹر نعیم احمد)	علمی مجلس دہلی ۱۹۶۸ء
۵۲۔	تذکرہ مسرت افزا	ابوالحسن (مرتبہ عبدالودود)	ادارہ تحقیقات اردو
۵۳۔	تذکرہ ہزار داستان (خمخانۂ جاوید) جلد اوّل	سری رام	منشی نولکشور واقع لاہور ۱۹۰۸ء
۵۴۔	تذکرہ حیدری (گلشن ہند)	حیدر بخش حیدری (مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی)	اردو دنیا کراچی ۱۹۶۸ء
۵۵۔	تذکرہ گلشن ہند	حیدر بخش حیدری (مرتبہ مختار الدین آرزو)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
۵۶۔	تذکرہ صبح گلشن	سید علی حسن (تلخیص عطا کاکوی)	عظیم الشان بکڈپو پٹنہ ۱۹۶۸ء

۵۷۔ تذکرہ گلشن بے خار	شیفتہ (مرتبہ کلب علی خاں فائق)	مجلس ترقی ادب لاہور سنہ ۱۹۷۳
۵۸۔ توتا کہانی	حیدر بخش حیدری	مجلس ترقی ادب لاہور
۵۹۔ تین تذکرے	نثار احمد فاروقی	مکتبہ برہان دہلی سنہ ۱۹۶۸
۶۰۔ تنقیدیں	اویس احمد ادیب	اردو پبلشنگ ہاؤس الہ آباد سنہ ۱۹۴۳
۶۱۔ تحارگلشن	بینی نرائن جہاں (مرتبہ عبادت بریلوی)	اردو دنیا کراچی
۶۲۔ حیات حافظ رحمت خاں	سید الطاف علی	نظامی پریس بدایوں سنہ ۱۹۳۳
۶۳۔ خرد افروز	حفیظ الدین احمد	مجلس ترقی ادب لاہور
۶۴۔ خزانۂ عامرہ	مولوی غلام علی	ـــــــــــــــــــــــــ
۶۵۔ خطبات گارساں دی تاسی	مرتبہ عبدالحق	انجمن ترقی اردو دکن سنہ ۱۹۳۵
۶۶۔ خطوط غالب	مرتبہ مالک رام	سرفراز قومی پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۶۲
۶۷۔ خلاصۃ التواریخ	منشی سجان رائے بھنڈاری	مطبع جی اینڈ سنس دہلی سنہ ۱۹۱۸
۶۸۔ داستان سے افسانے تک	وقار عظیم	پرویز بکڈپو دہلی ۶
۶۹۔ داستان ادب حیدر آباد	محی الدین قادری زور	سب رس کتاب گھر حیدر آباد سنہ ۱۹۵۱
۷۰۔ داستان تاریخ اردو	حامد حسن قادری	لکشمی نرائن آگرہ سنہ ۱۹۶۶
۷۱۔ دو تذکرے (جلد دوم)	کلیم الدین احمد	لیبل لیتھو پریس پٹنہ سنہ ۱۹۶۳
۷۲۔ دیوان جہاں	بینی نرائن (مرتبہ کلیم الدین احمد)	لیبل لیتھو پریس پٹنہ سنہ ۱۹۵۹

۷۳	دیوان حیدری	حیدر بخش حیدری (مرتبہ عبادت بریلوی)	اردو دنیا کراچی ۱۹۶۸ء
۷۴	ذوق و جستجو	خواجہ احمد فاروقی	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۶۷ء
۷۵	رانی کیتکی کی کہانی	سید انشاء اللہ خاں انشاؔ (مرتبہ ڈاکٹر سید سلیمان حسین)	نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۷۵ء
۷۶	رسالۂ کائنات	خلیل علی خاں اشکؔ (مرتبہ عبادت بریلوی)	اردو دنیا کراچی ۱۹۶۵ء
۷۷	سب رس	ملا وجہی (مرتبہ شمیم انہونوی)	نسیم بکڈپو لکھنؤ
۷۸	سخن شعراء	عبدالغفور خاں نساخ	نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۲۱ء
۷۹	سکنتلا	کاظم علی جواں	مجلس ترقی ادب لاہور
۸۰	سوانحات سلاطین اودھ (جلد اوّل)	سید محمد زائر	————
۸۱	سید شاہ امین الدین اعلیٰ	حسینی شاہد	انجمن ترقی اردو حیدرآباد ۱۹۷۳ء
۸۲	سیر المصنفین (جلد اول)	محمد یحییٰ تنہا (مرتبہ امیر اللہ شاہین)	ادارہ اشاعت ادب میرٹھ ۱۹۷۶ء
۸۳	شکنتلا ناٹک	کاظم علی جواں (مرتبہ عبادت بریلوی)	اردو دنیا کراچی
۸۴	صرف اردو	امانت اللہ شیدا	ہندوستانی پریس کلکتہ ۱۸۱۰ء
۸۵	عجائب القصص	شاہ عالم ثانی (مرتبہ راحت افزا بخاری)	————

۸۶۔ علم و عمل جلد اول	مترجمہ مولوی معین الدین	اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کراچی	
۸۷۔ عمدۂ منتخبہ (تذکرۂ سرور)	محمد خاں سرور		
۸۸۔ فسانۂ عجائب	رجب علی بیگ سرور (مرتبہ واصل عثمانی)	صفیہ اکیڈمی کراچی	۱۹۶۷ء
۸۹۔ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی	نادم سیتاپوری	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ	۱۹۵۹ء
۹۰۔ فورٹ سینٹ جارج کالج	محمد افضل الدین اقبال	معین پبلیکیشن حیدرآباد	۱۹۷۹ء
۹۱۔ قاعدۂ ہندی ریختہ عرف رسالۂ گل کرسٹ	محمد انصاراللہ	ادارہ المخدوم گڑپہ	۱۹۷۳ء
۹۲۔ قدیم اردو	عبدالحق	کل پاکستان انجمن ترقی اردو کراچی	۱۹۶۱ء
۹۳۔ قدیم دلی کالج	مالک رام	جمال پرنٹنگ پریس دہلی	۱۹۷۶ء
۹۴۔ قصہ مہرافروز و دلبر	عیسوی خاں بہادر (مرتبہ مسعود حسین خاں)	عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد	۱۹۶۶ء
۹۵۔ قواعد زبان اردو مشہور بہ رسالہ گل کرسٹ	مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی	مجلس ترقی ادب لاہور	
۹۶۔ کربل کتھا	فضلی (مرتبہ مالک رام و مختار الدین آرزو)	ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ	۱۹۶۵ء
۹۷۔ کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ	وحید قریشی	مکتبہ ادب جدید لاہور	۱۹۶۵ء
۹۸۔ کلکتہ کے قدیم اردو مطابع اور ان کی مطبوعات	سید مقیت الحسن	عثمانیہ بکڈپو کلکتہ	۱۹۸۲ء

۹۹۔ گل کرسٹ اور اسکا عہد	محمد عتیق صدیقی	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ اشاعت اول سنہ ۱۹۶۰ء اشاعت دوم سنہ ۱۹۷۹ء۔
۱۰۰۔ گلشن ہند	مرزا علی لطف (مرتبہ عبداللہ خاں)	رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور سنہ ۱۹۰۶ء
۱۰۱۔ گلشن سخن۔ تذکرہ شعرائے اردو	مردان علی خاں مبتلا لکھنوی (مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب)	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سنہ ۱۹۶۵ء
۱۰۲۔ گلشن ہند	حیدر بخش حیدری (مرتبہ مختار الدین آرزو)	———
۱۰۳۔ گل مغفرت	حیدر بخش حیدری	مجلس ترقی ادب لاہور
۱۰۴۔ گلزار دانش (دفتر اوّل)	حیدر بخش حیدری	یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سنہ ۱۹۷۶ء
۱۰۵۔ گلزار چین	خلیل علی خاں اشک (مرتبہ عبادت بریلوی)	———
۱۰۶۔ گنج خوبی	میر امن	مطبع احمدی کلکتہ سنہ ۱۸۴۶ء
۱۰۷۔ گنج خوبی	میر امن (مرتبہ خواجہ احمد فاروقی)	دہلی یونیورسٹی سنہ ۱۹۶۶ء
۱۰۸۔ لطائف ہندی	للوجی لال کوی	انڈیا گزٹ پریس کلکتہ سنہ ۱۸۱۰ء
۱۰۹۔ لطف حیات اور کارنامے	مرزا اکبر علی بیگ	ادارہ شعر و حکمت حیدر آباد سنہ ۱۹۷۹ء
۱۱۰۔ لفظ و پیکر	ایم، اے، نصر	وارث پبلیکیشنز کلکتہ سنہ ۱۹۷۶ء
۱۱۱۔ مادھونل اور کام کنڈلا	مظہر علی خاں ولا (مرتبہ عبادت بریلوی)	اردو دنیا کراچی سنہ ۱۹۶۵ء

۱۱۲۔ مثنوی لطف موسوم بہ نیرنگ عشق	لطف (مرتبہ ثمینہ شوکت)	مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد ۱۹۶۲ء	
۱۱۳۔ مثنویات میر حسن	میر حسن	تیج کمار پریس لکھنؤ ۱۹۶۶ء	
۱۱۴۔ مجموعہ نغز (دو جلدیں)	حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ قاسم (مرتبہ محمود شیرانی)	نیشنل اردو اکیڈمی دہلی ۱۹۶۲ء	
۱۱۵۔ مختصر تاریخ ادب اردو	اعجاز حسین	اردو کتاب گھر دہلی	
۱۱۶۔ مختصر کہانیاں	حیدر بخش حیدری (مرتبہ عبادت بریلوی)	اردو دنیا کراچی و لاہور	
۱۱۷۔ مذہب عشق	نہال چند لاہوری	محمدی پریس بمبئی ۱۳۶۸ھ	
۱۱۸۔ مذہب عشق	نہال چند لاہوری	مجلس ترقی ادب لاہور	
۱۱۹۔ معاصر (حصہ اول) مئی ۱۹۵۱ء	مرتبہ عبدالمنان	ادارۂ ادب پٹنہ	
۱۲۰۔ مفتاح التقویم	حبیب الرحمٰن خاں صابری	ترقی اردو بورڈ نئی دہلی ۱۹۷۷ء	
۱۲۱۔ مقدمات عبدالحق	مرتبہ عبادت بریلوی	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس ۱۹۰۲ء	
۱۲۲۔ مقالات شیرانی	حافظ محمود شیرانی	کتاب منزل، لاہور ۱۹۰۸ء	
۱۲۳۔ ملخص تذکرہ ریاض الوفاق	مرتبہ سید حسن	دائرۂ ادب، پٹنہ ۱۹۶۰ء	
۱۲۴۔ ملخص تذکرہ ریاض الوفاق	ذوالفقار علی مست (تلخیص ڈاکٹر عبدالرسول)	تبریز کتاب فروشی تہران سنہ ۱۳۴۳ھ	
۱۲۵۔ میر کی آپ بیتی	مرتبہ نثار احمد فاروقی	مکتبہ برہان دہلی ۱۹۵۰ء	
۱۲۶۔ نقلیات ہندی (جلد اول)	ڈاکٹر گل کرسٹ	ہندوستانی پریس کلکتہ ۱۸۰۲ء	
۱۲۷۔ نقلیات ہندی کا (جلد دوم)	ڈاکٹر گل کرسٹ	ہندوستانی پریس کلکتہ سنہ ۱۸۰۳ء	

نمبر	کتاب	مصنف / مرتب	ناشر
۱۲۸	نگارشات ادیب	سید مسعود حسن رضوی ادیب	کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۶۹ء
۱۲۹	نو طرز مرصع	تحسین (مرتبہ نور الحسن ہاشمی)	ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۹۵۰ء
۱۳۰	وجہی سے عبدالحق تک	سید عبداللہ	ـــــــــ
۱۳۱	وقائع زمان آصف الدولہ تفضیح الغافلین	ابوطالب اصفہانی (مرتبہ عابد رضا بیدار)	انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز رامپور ۱۹۶۵ء
۱۳۲	ہدایت الاسلام (جلد اول)	امانت اللہ شیدا	ہندوستانی پریس کلکتہ ۱۸۰۴ء
۱۳۳	ہفت گلشن	ولا (مرتبہ عبادت بریلوی)	اردو دنیا کراچی ۱۹۶۴ء
۱۳۴	ہماری داستانیں	وقار عظیم	اردو مرکز لاہور ۱۹۶۴ء
۱۳۵	ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں	گوپی چند نارنگ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۱۹۶۲ء
۱۳۶	ہندوؤں میں اردو (حصہ اول)	رفیق مارہروی	نسیم بکڈپو لکھنؤ

ـــــــــــــــــ

"ہندی کتابیں"

نمبر	کتاب	مصنف / مرتب	ناشر
۱	آدھونک گدیہ شیلی کا وکاس	ڈاکٹر شیام ورما	گرنتھم رام باغ کانپور ۱۹۶۲ء
۲	بھارتی شکچھا کا اتہاس	ڈاکٹر سرجو پرساد	رام نرائن لال کتب فروش الہ آباد ۱۹۵۹ء
۳	بھارتی پریم آکھیان کاویہ	ڈاکٹر ہری کانت سریواستوا	ہندی پرچارک پستکالیہ بنارس ۱۹۵۹ء
۴	چندراوتی	سدل مشر (مرتبہ شیام سندر داس)	ناگری پرچارنی سبھا بنارس ۱۹۰۳ء

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر
۵۔	چھترپرکاش	للّوجی لال کوی (مرتبہ شیام سندر داس)	ناگری پرچارنی سبھا بنارس ۱۹۰۳ء
۶۔	راج نیتی	للّوجی لال کوی	ہندوستانی پریس کلکتہ ۱۸۰۹ء
۷۔	سبھابلاس	للّوجی لال کوی	ـــــــــــ
۸۔	فورٹ ولیم کالج	لکشمی ساگروارشنے	یونیورسٹی الہ آباد
۹۔	ہندی ساہتیہ کا پرورتی گت اتہاس (حصہ نثر جلد دوم)	پرتاپ نرائن ٹنڈن	ودیک پرکاشن لکھنؤ ۱۹۶۸ء

"قلمی نسخے"

۱۔ آرائش محفل — شیر علی افسوس

۲۔ آرائش محفل — حیدر بخش حیدری

۳۔ اخلاق ہندی — بہادر علی حسینی

۴۔ انتخاب سلطانیہ — خلیل علی خاں اشک

۵۔ اقبال نامہ — سید بخش علی

۶۔ بیتال پچیسی — مظہر علی خاں ولا

۷۔ باغ سخن — مرزا مغل نشاں

۸۔ بہار عشق — نور علی

۹۔ بہار دانش — مرزا جان طپش

۱۰۔ بحر عشق — سید منصور علی

۱۱۔ تاریخ آشام — بہادر علی حسینی

۱۲۔ تاریخ نادری — حیدر بخش حیدری

۱۳۔ تاریخ شیر شاہی — مظہر علی خاں ولا

۱۴۔ ترجمہ قرآن شریف — جواں، حسینی، شیدا، فضل اللہ، غوث علی

۱۵۔ جہانگیر شاہی — مظہر علی خاں ولا

۱۶۔ جامع الاخلاق — امانت اللہ شیدا

۱۷۔ چار گلشن — بینی نرائن

۱۸۔ چشمۂ فیض — میر معین الدین فیض

۱۹۔ حسن و عشق — غلام حیدر عزت

۲۰۔ حسن اختلاط — میر ابوالقاسم

۲۱۔ خرد افروز — حفیظ الدین احمد

۲۲۔ خوان نعمت — سید حمید الدین بہاری

۲۳۔ دیوان جہاں — بینی نرائن جہاں

۲۴۔ دیوان افسوس — شیر علی افسوس

۲۵۔ دیوان ولا — مظہر علی خاں ولا

۲۶۔ دہ مجلس — محمد بخش

۲۷۔ دل آرام و دلربا — توتا رام

۲۸۔ سکنتلا ناٹک — کاظم علی جواں

۲۹۔ سنگھاسن بتیسی — کاظم علی جواں

۳۰۔ شہنامۂ ہندی — محمد علی

۳۱۔ ضرب الامثال — ——————

۳۲۔ قصہ تاج الملوک گل بکاؤلی — عزت اللہ بنگالی

۳۳۔ قصہ فیروز شاہ — محمد بخش

۳۴۔ قصہ رضوان شاہ — خلیل علی خاں اشک
۳۵۔ قواعد و پنجابی صرف — کاشی راج کھتری
۳۶۔ گلستان بزبان پنجابی — کاشی راج کھتری
۳۷۔ گلزار دانش — حیدر بخش حیدری
۳۸۔ گلشن اخلاق — سید علی
۳۹۔ گلشن ہند — باسط خاں باسط
۴۰۔ مذہب عشق — نہال چند لاہوری
۴۱۔ منتخب الفوائد — خلیل علی خاں اشک
۴۲۔ مثنوی کلکتہ معہ قصہ بلند اختر — نور خاں
۴۳۔ میرامن دہلوی اور ان کی نثری خدمات — عبدالمنان
۴۴۔ نثر بے نظیر — بہادر علی حسینی
۴۵۔ نقلیات — کاشی راج کھتری
۴۶۔ واقعات اکبر — خلیل علی خاں اشک
۴۷۔ ہفت پیکر — حیدر بخش حیدری
۴۸۔ ہفت گلشن — مظہر علی خاں ولا
۴۹۔ انوار سہیلی — مولانا حسین واعظ

"اخبار و رسائل"

۱۔ ہماری زبان (ہفتہ وار) علی گڑھ — جولائی ۱۹۶۳ سنہ
۲۔ ہماری زبان (ہفتہ وار) دہلی — اپریل ۱۹۶۰ سنہ
۳۔ ہماری زبان (ہفتہ وار) دہلی — مارچ ۱۹۶۹ سنہ
۴۔ نقوش (ماہنامہ) لاہور — ستمبر ۱۹۶۰ سنہ
۵۔ نیا دور (ماہنامہ) لکھنؤ — جولائی ۱۹۵۹ سنہ
۶۔ اورینٹل کالج میگزین — لاہور — شمارہ ۱۲۵، ۱۱۵، فروری مئی ۱۹۶۹ سنہ
۷۔ اکادمی (دو ماہی) لکھنؤ — جولائی ۱۹۶۱ سنہ

"فہرست کتب"

۱ ۔ باڈلین لائبریری (ٹرکش، ہندوستانی، پشتو) جلد دوم۔ ایتھے آکسفورڈ۔

۲ ۔ فہرست مخطوطات فارسی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ۔

۳ ۔ سلسلۂ اشاعت خواتین دکن انسٹی ٹیوٹ کتب خانہ آصفیہ (جلد اوّل)۔

۴ ۔ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری (اردو مخطوطات) ابراہیمیہ کٹلک منڈی حیدرآباد (نصیرالدین ہاشمی)۔

کتابیات و ماخذ انگریزی

1- Ahmad Shah Durrani	Ganda Singh	Asia Publishing House New york, 1959
2- Annals of the College of Fort William	Thomas Roebuck	Hindoostani Press Calcutta, 1819
3- An Introduction to the Study of Literature	W.H. Hudson	George G. Harp & Co.- Ltd. London, 1963
4- A Selection From The Despatches, Treaties and Other Papers of the Marquess of Wellesley K.G. During His Government of India	S.J. Owen	Macmillan London 1877
5- A Dictionary of Literary Terms	J.A. Cuddon	Indian Book Co. Andre Deutch, New Delhi, 1977
6- Appendix	J.B. Gilchrist	———

7- An English and Hindoostani Naval Dictionary	Thomas Roebuck	Hindoostani Press, Calcutta 1811
8- A Classical Dictionary of Hindu Mythology	John. Dowson	Munshi Ram Manoharlal Publishers, Delhi 1973
9, British Orientalism and the Bengal Renaissance	David Kopf	Firma K.L. Mukhopadhyay Calcutta 1969
10- Cassell's Encyclopeadia of Literature Vol. I	S.H. Steinberg	Cassell & Co. Ltd. London 1953
11- Current Literary Terms	A.F. Scott	Macmillan Press Ltd. 1965
12- College of F.W. In Bengal.	Cladious Buchanan	W. Bulmer & Co. St. james, 1805
13- Encyclopeadia Britannica Vol. XI, XXII	————	————

14_Encyclopeadia of Literature Vol. I	Joseph. T. Shipley	Philosophical Library, New york 1946
15_Encyclopeadia of Islam Vol. I	J. M. Kramers	H.A.R. Gibbs Elev. Provencal, 1954
16_Fall of Mughal Empire	Jadunath Sarkar	50, Sitala lala, Calcutta
17_Gilchrist and The Language of Hindoostan	S.R. Kidwai	Rachna Prakashan New Delhi, 1972
18_History of Vernacular Education in Bengal (1800_ 1854)	N.L. Basak	Nisil Kumar Ghosh Calcutta 1974
19_History of Education in India Under the rule of The East India Company	Major B.D. Basu	R. Chatterjee II Edn. Calcutta
20_History of British India	P.E Roberts (T.J.P. Spear)	Oxford University Press. 1952

21_History of India (from the earliest Period to the Close of Lord-Dalhousie's administration) Vol. II	John. Clark Marshman	Harrison & Sons St. Martin's Lane, 1867
22_History of India	N.K. Sinha & A.C. Banerjee	A.R. Mukherjee 2, College sq. Calcutta 1947
23. Hindee and Hindoostanee Selections which are Prefixed the Rudiments of Hindoostanee and Bruj Bhasha Grammar Vol. I	William Price	Hindoostani Press Calcutta 1827
24 Indian Record Series, F.W. __ India House Correspondence (Public Series) Vol. XIII 1796–1800	P.C. Gupta	Manager of Publications Delhi 1959

Title	Author	Publisher
25- India, Modern History	Persival Spear	————
26- International Dictionary of Thoughts.	————	J.G. Ferguson Publishing Co. Chicago, 1969
27- India Under Wellesley	P. E. Roberts	Vishwavidyalaya Prakashan, Gorakhpur, 1961
28- Judgement in Literature	W. Basil Worsfold	London, 1932
29- Linguistic Survey of India Vol. IX Part I	G. A. Grierson	Moti lal Banarsi-das. 1968
30- Life of Diwan Ram Comul Sen	Peary Chand Mitra	J.C. Bose & Co. Calcutta 1880
31 Mysoor Gazetteer Vol II Part IV	Heyvadana Rao	Govt. Press 1930
32- On the Art of Writing	Arthur Quiller Coach	Cambridge University Press 1923

Title	Author	Publisher
33- Problems of Style	J.M. Murry	Oxford University Press London 1975
34- Proceedings of the College of F.W. V.559	————	Hand Script (N.A.I. Delhi)
35- Poems of Dr. John Gilchrist	Ebadat Barelvi	Habib Press Lahore 1977
36- Strangers East-India Guide	Gilchrist	Hindoostani Press Calcutta, 1808
37- Style	Walter Raleigh	London, 1918
38- The Chronology of Indian History Medieval and Modern	James Burgess	Cosmo Publications, Delhi 1972
39- The Persian Influence on Hindee	Dr. Hardev Bahri	Bharati Press Allahabad, 1960
40- The Hindee Moral Preceptor	Gilchrist	————
41- The Hindee Roman Orthoepigraphical Ultimatum	Gilchrist	————

42 - The General East-India Guide and Vade Mecum	Gilchrist	M. Allen & Co. London 1825
43 - The Development of Hindi Prose Literature In the Early nineteenth Century (1800–1856)	Sharda Devi - Vedalankar	Lok Bharti Pub. Allahabad 1969
44 - The History of Bengal (1757–1905)	N.K. Sinha	University of Calcutta 1967
45 - The Educational Policy of the East India Co. In Bengal to 1854	D.P. Sinha	S. Bhattacharya Punthi Pustak Calcutta 1964
46 - The men who ruled India The founders Vol. I	Philip wood Rufe	VII Impression Oxford, 1957
47 Two Views of British India (1798–1801)	Edward Ingram	W. & J. Mackey & Co. Ltd. Great Britain 1970
48 The New Dictionary of Thoughts	Tryon Edwards	Standard Book Co. U.S.A. 1966

فہرست مصنفین و تصانیف فورٹ ولیم کالج

انگلش ڈکشنری۔ قصہ دل وحسن۔ برج بھاشا کے قواعد۔ ہندی فارسی لغت۔ قصہ فرعون مع تاریخ بمبئی۔
کُلا کام۔ دی اینٹی جار گونسٹ۔ حکایات نصیحت آموز۔ لال چندر کا۔ تفریح طبع۔ مادھو بلاس۔
جامع القوانین۔ کلیات میر کی ترتیب۔ چھتر سال کی ترتیب۔ باغ و بہار کی ترتیب۔ خرد افروز کی
ترتیب۔ گل بکاؤلی (مذہب عشق) کی ترتیب۔ نیا عہد نامہ۔ دیوان میر سوز کی ترتیب۔ دیوان سودا
کی ترتیب۔ دی ہندی رومن آرتھو پی گرافیکل الٹیمیٹم۔ ضرب الامثال۔ تواریخ بنگالہ۔ تواریخ السلاطین۔
تواریخ عالم گیری۔ تواریخ تیموری۔ الف لیلےٰ۔ اخلاق النبیؐ۔ در مجالس۔ مرثیہ مسکین (نثر میں)۔

تحقیق کی دُنیا میں روز نت نئے انکشافات ہوتے رہتے ہیں اور نقش ثانی کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ نقشِ اوّل میں یقیناً خامیاں رہ گئی تھیں سچ بات تو یہ ہے کہ حقیقت صرف ایک ہوتی ہے، مگر اس حقیقت تک پہنچنے کے جو راستے اختیار کیے جاتے ہیں، انھیں میں کچھ کمیاں، کچھ تسامحات رہ جاتے ہیں، جنھیں بعد کے محققین ڈھونڈ نکالتے ہیں اور اس طرح صحیح حقیقت منجلی ہوتی ہے۔

فورٹ ولیم کالج پر اُردو ہندی میں بہت کام ہوا ہے۔ تقریباً تمام کام میری نظر سے گزرے ہیں۔ حال ہی میں عُبَیدہ بیگم کا مقالہ "فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات" مجھے مطالعے کے لیے ملا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ابھی تک اُردو میں فورٹ ولیم کالج پر جو کچھ کام ہوا تھا، ان کے مصنفین نے صحیح ماخذ اور فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کے پوست کندہ حالات کا بھی صحیح طور پر مطالعہ شاید نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ فورٹ ولیم کالج کے کھلنے کی اصل تاریخ تک سے لوگ بے خبر تھے۔ اس مقالے میں عبیدہ بیگم نے لارڈ ویلزلی کی وہ تقریر تک ڈھونڈ نکالی، جو اس نے کالج کے افتتاح کے موقع پر کی تھی۔ اس سے کالج کے صحیح کوائف کا کماحقہٗ اندازہ ہوتا ہے اور کالج کے کھلنے کی اصل تاریخ کا بھی پتا چلتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے مصنفین، ان کی کتابوں اور ان کتابوں کے مشمولات وغیرہ پر بھی خاصی تحقیقی اور تنقیدی بحثیں کی گئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ کتاب پھر محققین پر فورٹ ولیم کالج کے مطالعے کے لیے نئے دروازے کھولتی ہے۔ اردو کی ادبی تحقیق میں یہ ایک قابلِ قدر اضافہ ہے جس کے لیے مصنفہ یقیناً قابلِ مبارک باد ہیں۔

(پروفیسر) سیّد محمد عقیل
صدر شعبۂ اُردو
الٰہ آباد یونیورسٹی